MAY 2017

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔
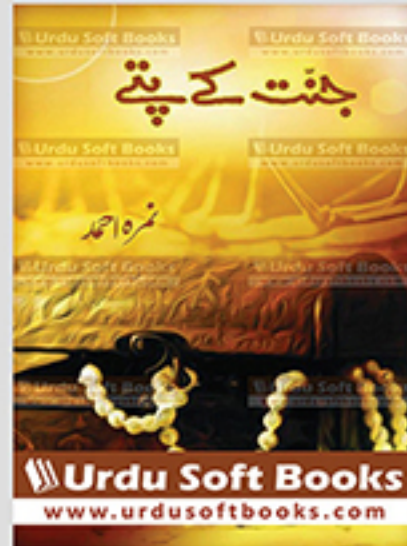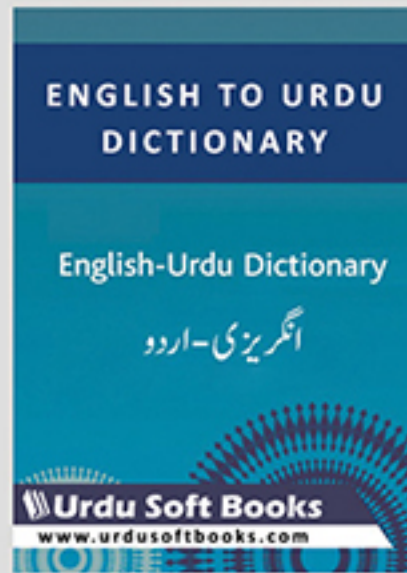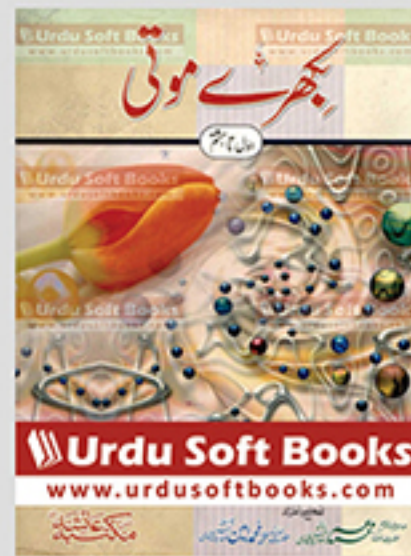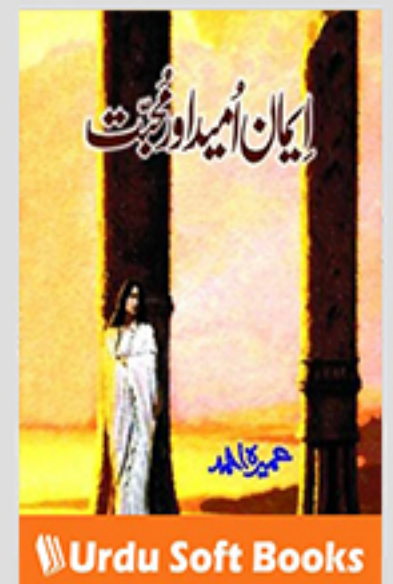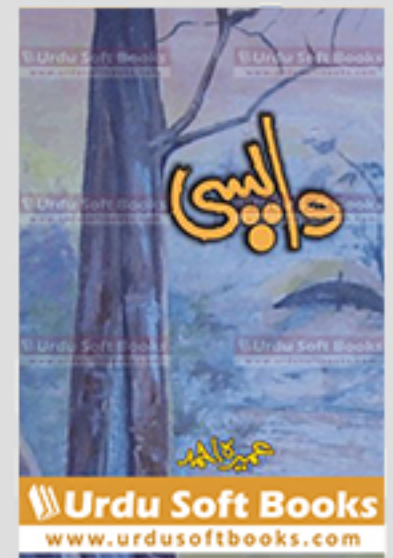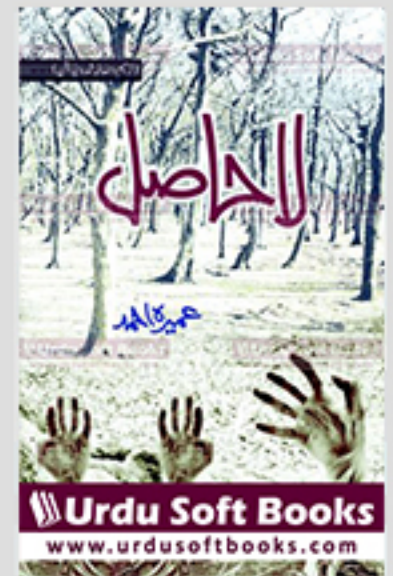
مزاح نگار

یو پی کے شہر بندرابن کے کوتوال منشی صدیق احمد اولاد کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے۔ شادی کو پورے بارہ سال گزر چکے تھے کہ بیوی نے خوشخبری سنائی تو وہ خوشی سے نہال ہو اٹھے۔ جیسے جیسے نو ماہ گزرے اور ولادت کا وقت قریب آیا اور لڑکی پیدا ہوئی۔ وہ اسی کو پا کر نہال تھے۔ مزید چار سال گزرے اور پھر امید نظر آئی۔ اس بار 2 فروری 1904ء کو ایک بیٹے کی پیدائش ہوئی جس نے اس گھر کی خوشیوں کو دوبالا کر دیا۔ سپاہیوں نے گولے داغے، بھانڈوں نے ڈھول بجائے، نٹوں نے کرتب دکھائے، ایک ہفتے تک خوشیاں منائی گئیں۔ عقیقہ ہوا اور نام محمد عمر رکھا گیا۔ تاریخی نام تسخیر احمد تجویز ہوا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ بچہ جب تک ہوش نہ سنبھالے وہ گھر بھر کے لیے صرف ایک کھلونا ہوتا ہے۔ سب اسے کھلونے کی طرح ہی اس سے کھیلتے ہیں لیکن محمد عمر کا بچپن کھلونے کی بجائے مریض کی صورت میں گزرا۔ ضعف معدہ کی حالت یہ تھی کہ طبیبوں نے اسے ہر چیز کے کھانے سے روک رکھا تھا۔ بے چارہ فاقہ مستی میں دن گزار رہا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ سات سال کی عمر میں اس نے شعر کے انداز میں فریاد کی" نہ دانا نہ پانی میں کس سے کہوں، ارے میرے اللہ میں اب کیا کروں"۔

کوتوال صاحب بھوپال منتقل ہو گئے۔ اس دور میں مسلمانوں کی ریاستیں کئی ایک تھیں جن میں ریاست حیدر آباد دکن اور ریاست بھوپال بڑی ریاستیں تھیں۔ انہوں نے پتا نہیں کس سوچ کے تحت بھوپال کو ترجیح دی تھی۔ بھوپال میں انہیں ایک عالیشان مکان عطا ہوا تھا۔ محمد عمر ہوشمندی کی عمر میں داخل ہو چکے تھے۔ اس لیے ان کی رسم بسم اللہ ہوئی۔ ایک ماسٹر صاحب کو ابتدائی تعلیم کے لیے بلایا گیا۔ ماسٹر صاحب نے مولوی محمد اسماعیل کی ریڈر رٹوانا شروع کر دیا۔ ایک دن کوتوال صاحب نے انہیں ایک لفظ کا تلفظ سکھاتے ہوئے پکڑ لیا۔ اسی وقت ماسٹر صاحب کا حساب کر دیا۔ اس کے بعد ایک اور ماسٹر کو بلایا گیا مگر چوتھے دن ہی انہیں نکال دیا گیا کیونکہ وہ ذرا سخت مزاج کے تھے اور ہاتھ کے تیز تھے۔ ہر غلطی پر طمانچہ مارنا ان کی عادت تھی اور یہ بات کوتوال صاحب کو پسند نہ آئی۔ اب جو ماسٹر آئے ان کا نام میر امجد علی تھا۔ ان کا حلیہ کچھ یوں تھا، بوٹا سا قد، ناک کی پھنگی پر رو پہلی عینک، منہ میں چند دانت باقی پان۔ جیب میں گھڑی اور اس کی چین میں لٹکا قطب نما۔ ماسٹر صاحب کے آتے ہی اندر سے چائے آ جاتی۔ وہ نوش فرماتے، پان آ جاتا جسے کلے میں دبا لیتے پھر کتاب کھلواتے محمد عمر کتاب سامنے رکھ کر جھومنے لگتے اور وہ اونگھنے لگتے، اونگھتے اونگھتے نعرہ لگاتے، سی اے ٹی کیٹ، کیٹ معنی بلی اور پھر اونگھ جاتے۔ جب محمد عمر کو یقین ہو جاتا کہ وہ سو چکے ہیں تو سی اے ٹی کیٹ رٹتے ہوئے ماسٹر صاحب کے چہرے پر گل بوٹے بنا دیتے اور اگر ماسٹر صاحب جاگتے رہتے تو سلیٹ پر مرغے کی تصویر بناتے رہتے۔ ایک دن کوتوال صاحب نے یہ منظر دیکھ لیا اور اسی دن ماسٹر صاحب کی چھٹی ہو گئی۔ لوگوں کے کہنے سننے سے کوتوال صاحب نے اسے الیگزینڈر ہائی اسکول میں داخل کرا دیا۔ سیاہ شیروانی، نیلے صافے میں ایک سپاہی کے ساتھ وہ اسکول جانے لگا۔ دوپہر میں ایک دوسرا سپاہی ٹفن کیریئر میں کھانا لے آتا۔ پڑھنے کے نام پر وہ وہاں بھی شرارتیں کرتا لیکن اسکول انتظامیہ اسے زبردستی پاس کر کے اگلی کلاس میں بھیج دیتی۔ 1914ء میں کوتوال صاحب نے بھوپال کی نوکری چھوڑ دی اور واپس لکھنؤ آ گئے۔ یہاں آ کر بھی محمد عمر کی شرارتیں عروج پر تھیں۔ ٹیوٹرز کی جدوجہد اپنی جگہ مگر بھائی جان مولانا ارشد تھانوی کی تربیت اس پر زیادہ اثر انداز ہو رہی تھی۔ مولانا نے اس کے لیے لاہور سے ماہنامہ پھول منگوانا شروع کر دیا جو اسے درسی کتب سے زیادہ عزیز تھا۔ پھر انہوں نے محمد عمر کے نام سے چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھ کر پھول میں بھیجنا شروع کر دیا۔ کہانی چھپ جاتی تو وہ ہمجولیوں کو فخر سے دکھاتا کہ یہ میں نے لکھا ہے۔ لکھنؤ آ کر اس کا داخلہ مدرسہ فرقانیہ میں کرا دیا گیا مگر وہ یہاں بھی پڑھائی سے زیادہ بڑے لڑکوں کی صحبت کو ترجیح دینے لگا۔ ماسٹر پیارے لال کو ٹیوٹر لگایا گیا۔ وہ بڑی محنت سے پڑھاتے جس کی وجہ سے انگلش اور حساب میں وہ کچھ تیز ہو گیا۔ اس دوران وہ شاعری کے نام پر الٹے سیدھے اشعار گھڑنے لگا۔ بھائی جان مولانا ارشد تھانوی لکھنؤ آئے تو انہیں بھی یہ خبر ملی اور انہوں نے ایک مصرع دیا "سب چاند ستارے ماند ہوئے خورشید کا نور ظہور ہوا۔ غم ناک سیاہی رات کی تھی اب اس کا اندھیرا دور ہوا" شعر سن کر بھائی جان اچھل پڑے اور گھر بھر سے تعریف کی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب وہ باقاعدہ شاعری کرنے لگا۔ وقت کے ساتھ شاعری میں نکھار آنے لگا اور وہ مشاعروں میں بلایا جانے لگا۔ دسمبر 1926ء میں وہ اپنی شریک حیات سعیدہ کو رخصت کرا لایا۔ زندگی گزر رہی تھی کہ 20 اپریل 1928ء کو کوتوال صاحب کو موت نے اپنی گود میں لے لیا۔ اب فکر معاش ہوئی تو وہ خان بہادر سید احمد حسین کے روزنامہ ہمدم میں 40 روپے ماہانہ پر لگ گئے۔ وہیں کام کرتے ہوئے "سودیشی ریل" لکھی جس نے ان کی پہچان بنا دی پھر اودھ اخبار پھر سرپنچ اور پھر روزنامہ ہند میں آ گئے۔ موج تبسم، بحر تبسم بھی مارکیٹ میں آ گئی۔ ریڈیو پر بھی آنے لگے کہ پاکستان کا قیام عمل میں آ گیا اور وہ پاکستان آ گئے۔ یہاں بھی ادبی دنیا میں خوب نام پیدا کیا اور عرش منیر نامی ٹی وی کی اداکارہ سے شادی کی۔ 1983ء میں بعد از مرگ صدارتی ایوارڈ پرائیڈ آف پرفارمنس دیا گیا جب کہ 4 مئی 1963ء میں وہ انتقال کر گئے تھے اور میانی صاحب قبرستان میں دفن ہوئے۔ اس ہر دلعزیز قلم کار کو ہم سب شوکت تھانوی کے نام سے پہچانتے ہیں۔

☆☆☆

قارئین کرام!

السلام علیکم!

اس ماہ پھر میں آپ کو ایک منی کہانی سنانا چاہتا ہوں جو کچھ اس طرح ہے:۔

”پارک کے اس گوشے میں بیٹھے محمد دین نے ملکہ بانو سے کہا۔ ”تم فکر نہ کرو، میں سی ایس ایس کی تیاری کررہا ہوں۔ انشاء اللہ کامیابی ہمارے قدم چومے گی۔ بہت جلد میں اعلیٰ افسر بن جاؤں گا۔ پھر تم زندگی بھر عیش کرو گی۔ اس لیے کہ تب تمہارے ابا میرے رشتے کو ٹھکرانے کا خیال بھی دل میں نہیں لائیں گے۔“ ملکہ بانو خوشی سے کھل اٹھی۔ اس نے کہا۔ ”مجھے پورا یقین ہے، تمہارے ایسا محنتی اسٹوڈنٹ ہی اعلیٰ نمبر لاسکتا ہے۔“ سہانے مستقبل کا خواب دیکھتے ہوئے وہ پارک سے باہر آگئے۔ اس لیے کہ امتحان کی تیاری کے لیے محمد دین کو وقت چاہیے تھا تاکہ وہ پڑھ سکے۔ اس شہر سے ایسے تین نوجوان تھے جن کی کامیابی یقینی تھی۔ سب سے زیادہ نمبر انہیں ہی ملتے۔ ان کے بعد جو دس تیز طرار نوجوان تھے وہ سب سیاسی خاندان سے تھے لیکن اس بار ان تین کی وجہ سے ان دس کا راستہ رک چکا تھا۔ امتحان کے ایام نزدیک آتے جارہے تھے۔ حسین مستقبل کے خواب دیکھنے والی آنکھوں کی چمک بھی تیز ہوتی جارہی تھی۔ ملک وملت کے معمار میں تین قابل قدر اضافہ یقینی تھا کہ اس رات ٹی وی چینلز پر بریکنگ نیوز کا ریلا آگیا۔ پہلی خبر تھی کہ مرکزی شاہراہ پر چلتی کار پر فائرنگ دو نوجوان ہلاک، شادی ہال میں لوٹ مار فائرنگ سے ایک نوجوان اور ایک خاتون ہلاک، کتب فروش کی دکان سے نکلتے ہوئے نوجوان سے موبائل چھیننے کے دوران ڈاکو نے اس کے سر میں گولی ماردی اور فرار ہوگئے۔ ایک رات میں چھ ہلاکتیں، ان میں تین وہ نوجوان بھی تھے۔ چینلز تبصرے کررہے تھے، بحث جاری تھی کہ یہ حادثے تھے یا سازش مگر تین روشن چراغ تو گل ہو ہی چکے تھے۔

اس کہانی کو پڑھ کر میں سوچ رہا ہوں کہ یہ ہمارے اطراف میں جو قتل وخوں ریزی ہے، کیا یہ ملک کو کمزور کرنے کی سازش نہیں ہے؟ اس کا سدباب صرف اتحاد ہے۔ شاید اتحاد و اخوت کی ضرورت اس سے پہلے اتنی کبھی نہ تھی۔

معراج رسول

جلد 27 ❖ شمارہ 04 ❖ مئی 2017ء

ماہنامہ کراچی

مدیرہ اعلیٰ: عذرا رسول

شعبۂ اشتہارات

منیجر اشتہارات	محمد شہزاد خان	0333-2256789
نمائندہ کراچی	محمد عثمان خان	0333-2168391
	راناحمد حمید	0323-2895528
نمائندہ لاہور	فراز علی نازش	0300-4214400

قیمت فی پرچہ 60 روپے ❖ زرِ سالانہ 800 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقام اشاعت: 63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ٭ پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200 Fax :35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

شہر خیال

☆ طاہرہ گلزار کی آمد پشاور سے۔ ''اپنا محبوب اپریل کا سرگزشت 28 مارچ کو ملا۔ سرگزشت تو کیا سسپنس اور جاسوسی بھی پشاور بہت لیٹ پہنچتے ہیں۔ مثال سرگزشت کی ہی لے لیں کراچی میں یہ 20 تاریخ کو آجاتا ہے اور پشاور ہر بار 7 یا 8 دن کے بعد آتا ہے۔ پھر تبصرہ کرنے میں ہمیں بھی 3 سے 4 دن لگ جاتے ہیں۔ باقی کسر ڈاکخانہ (جو ہم سب کا سوتیلا ماموں ہے) دیر کرا کے پوری کر لیتا ہے۔ پچھلے ماہ کے خط میں، میں نے یہ مشورہ ادارے کو دیا تھا کہ سرگزشت میں بھی سسپنس اور جاسوسی کی طرح دو، دو قسط وار سلسلے رکھیں۔ اُمید ہے ادارے والے ضرور غور فرمائیں گے۔ آگے کچھ لکھنے سے پہلے میں بھائی رانا محمد شاہد کی ایک تھوڑی سی غلطی صحیح کردوں کہ پشاور کو باغوں کا شہر کہتے ہیں۔ پشتو میں دا باغونو ښار کہا جاتا تھا لیکن اب تو صرف نام ہی نام رہ گیا ہے اور مجھے فخر ہے کہ میں اس شہر پشاور کے مرکز میں اپنے مشہور کالج فرنٹیئر برائے خواتین پشاور میں جاب کرتی ہوں۔ اب شہید بے نظیر فرنٹیئر ومن یونیورسٹی کا بھی درجہ مل گیا ہے۔ یہ کالج مادر ملت فاطمہ جناح کے ہاتھوں پشاور کی لڑکیوں کو تحفہ ملا ہے۔ 1949ء میں اس کا آغاز ہوا اور ماشاء اللہ اب یہ کالج 68 سال کا ہو گیا ہے۔ شروع میں متنازع قلم کار سعادت حسن منٹو کے بارے میں پڑھا تو سوچ میں پڑ گئی کہ کاش یہ بے چارہ 1912ء کے بجائے 1962 یا 1972ء میں پیدا ہو جاتا بلکہ اس صدی میں پیدا ہو جاتا تو اس کو سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا۔ موبائل اور نیٹ پر ہی ایسے کہانیاں Send کرتا اور لاکھوں لائیک اور کمنٹس ملتے مگر ہائے قسمت کیا کہہ سکتے ہیں۔ معراج رسول انکل نے ایک بار پھر حسد اور جلن کے جو انجکشن ہمارے دلوں و دماغ کو جھنجوڑنے کے لیے لگایا ہے۔ انکل ہم پاکستانیوں کی بھی تو ایک بڑی خوبی ہے کہ ہم میں حسد اور جلن بہت وافر مقدار میں موجود ہے۔ مجھے تو حیرت ہوتی ہے کہ ہم کیسے مسلمان ہیں جب کہ ہمیں قرآن اور رسولؐ نے فرمایا ہے کہ غرور، حسد اور جلن ہمارے ایمان کو ایسے کھاتے ہیں جیسے ریشم کا کیڑا شہتوت کے پتے کھا جاتا ہے۔ اللہ ہم سب پر رحم کرے اور ہمیں غرور، تکبر، حسد اور جلن سے بچائے، آمین ثم آمین۔ میرا خط تو ''معبر خیال'' میں تو کیا بلیک لسٹ میں بھی نہیں تھا دکھ تو ہوا۔ 'معبر خیال'' کا دروازہ جب اپنی سویٹ سی سسٹر سدرہ بانو ناگوری نے کھولا تو اس کا مسکراتا چہرہ دیکھ کے اپنا دکھ پرے ہو گیا۔ مبارکاں، ڈیئر مبارکاں۔ اے نیر اور عالمگیر میرے بھی پسندیدہ ہیں اور نئے لوگوں میں مجم شیرازی نے کیا حمد گائی ہے۔ واہ انسان وجد میں آجاتا ہے۔ ڈیئر تقریباً آپ نے بھی غور سے نہیں پڑھا۔ تقریباً کے معنی یعنی ہے کہ قریب ہی تھا۔ ہمیشہ کی طرح تبصرہ شاندار، جامع اور طویل تھا اور واقعی پہلے نمبر کے قابل بھی تھا۔ یہ مہینا ہم دونوں بہنوں اور صنف نازک کا ہی رہا۔ سرگزشت میں آپ پہلے نمبر پر اور اپریل کے سسپنس میں ماہ بدولت پہلے نمبر پر رہی۔ اعجاز حسین سٹھار بھائی بھی انسانی رویوں کا احاطہ کیے ہوئے تھے۔ بھائی بہن کو شکریہ نہیں کہتے۔ درمیان میں خود میں بھی بیمار رہی۔ ہمیشہ کی طرح آپ کا تبصرہ جامع اور جاندار رہا۔ عبدالمجید بھی غلطیاں سدھارنے میں لگے تھے۔ منظور علی خان صاحب بھی لاہور سے تشریف لائے۔ جناب میں محرومیوں کا شکار نہیں ہوں۔ اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں گورنمنٹ فرنٹیئر کالج میں جاب کرتی ہوں۔ میں نے ڈبل ماسٹر (اردو اینڈ اسلامیات) ہوں۔ ایجوکیشن فیملی اور محمد زئی قوم سے تعلق ہے۔ میری زندگی ایک مرد نے برباد کی ہے۔ باقی میں چٹان کی طرح مضبوط ارادوں اور اچھے دل کی مالک ہوں۔ میں نے شکست کھانا نہیں سیکھا۔ کاشف زبیر کو اللہ بخشے۔ جناب بھٹی صاحب بھی ایکشن میں ہیں۔ دیکھیں کہ ''ناسوز'' کہاں جائے گی۔ وہاب احمد صاحب بھی بہت بے تاب نظر آئے۔ اب پتا نہیں یہ بلاول بھٹو کے پرستار ہیں یا دشمن۔ اویس شیخ مجھ سے متفق ہونے کا شکریہ۔ ویسے آپ کا تبصرہ ہمیشہ بہت پیارا اور خوب صورت ہوتا ہے۔ عریشہ جی میں ہر خط میں تمام سچ بیانوں پر تفصیل سے لکھتی ہوں۔ کبھی تو میرے خط کو کبھی داستان حمزہ اور کبھی الف لیلیٰ کہا جاتا ہے۔ تبصرہ تو بہت اچھا کیا ہے لیکن ڈیئر بھٹی صاحب پر غلط تنقید مجھے بالکل اچھی نہیں لگی۔ عبدالحفیظ صاحب تو بہت طیش میں نظر آئے۔ لگتا ہے توے پر بیٹھ کے تبصرہ لکھا ہے۔ بھی رحمن یہ تو آپ کی عاجزی ہے ویسے بھی یورپ یا امریکا میں رہنے والوں کے پاس ٹائم نہیں ہوتا۔ یہ تحفہ تو ہم پاکستانیوں کو ملا ہے۔ آپ کا تبصرہ مختصر ہوتا ہے لیکن اچھا

ہوتا ہے۔ رانا محمد شاہد شیر، تبصرہ ایک بار پھر اپنے جوبن پہ آئے وسیم بھائی بڑے عرصے کے بعد ایک بار پھر خوب تفصیل سے تبصرہ کیا ہے۔ بھائی آپ بھابی اور بچوں سے چھ مہینے تک دور رہے خیریت تو تھی کہیں آپ نے بھی تو چپکے سے دوسری شادی نہیں کر لی؟ عزیز مے تبصرہ بہت ہی معیاری، جامع اور تفصیلی تھا۔ وصلی جی مختلف شہروں پر تحریر لکھنے پر مبارک باد قبول کریں۔ عبدالرحمٰن نے اچھی تجویز دی ہے واقعی ڈاکٹر ساجد امجد سے مسلمان ہیروز پر لکھوایا جائے۔ مزہ آ جائے گا۔ نزاہت افشاں بھائی بھی حاضر شاعروں کے پرستار نزاہت کو آخر ڈاکٹر ساجد کے مضمون میں تشنگی نظر آ ہی گئی۔ نزاہت بھائی سے لیڈروں کے ہم قائل نہیں ان کو ہم پھانسی پر لٹکا دیتے ہیں۔ بہت پیارا اور معیاری تبصرہ کرتے ہو اللہ سلامت رکھے۔ سیف اللہ ملک وال بھی اچھے انداز سے حاضر تھے۔ رضا احمد اعوان تو بہت گھن گرج سے حاضر تھے۔ جناب دوسروں پر ہاتھ ذرا ہولا رکھا کریں۔ ظہیر احمد تبسم کیوں اس بار میرا تبصرہ پسند نہیں آیا ویسے آپ تو اس بار بہت تنقید کے ساتھ حاضر تھے۔ غلطیوں پر غلطیاں نکال رہے تھے۔ بھائی انور عباس شاہ میرا تبصرہ پسند کرنے اور تعریف کا بہت بہت شکریہ۔ آپ کا تبصرہ بھی بہت شاندار اور جامع ہوتا ہے۔ ڈاکٹر روبینہ ڈیئر کہیں سیاست میں آنے کا ارادہ تو نہیں۔ اختر عباس شاہ، احسن راٹھور، آفتاب احمد خان اور اختر ہمایوں اختر کے مختصر تبصرے بھی اچھے رہے۔ آخر میں عزیز مے، بشریٰ افضل، حیدر بھٹی، ناصر حسین رند اور احمد توحیدی سے التجا ہے کہ پلیز حاضر ہوں۔ شکیل صدیقی کی تحریر ''قائد کا ڈان'' بہت ہی جامع اور معلوماتی تحریر، مدت تک یاد رہے گی۔ ایاز راہی کی مختصر تحریر ''لیلیٰ حرف شیریں'' شرف النساء بی بی کے بارے میں جامع تحریر لکھی۔ مختصر تحریر ابھرتے ستارے زریاب وصلی لے ندیم اقبال کی تحریر ہر بار کی طرح دلچسپ تھی۔ حاضر تھے اچھی اور معلوماتی تحریر تھی۔ ''اپریل کی شخصیات'' تحریر صائمہ اقبال بہت معلوماتی رہی چند میرے پسندیدہ شخصیات اے حمید، احمد رشدی، معین اختر اور نازیہ حسن بھی شامل تھے۔ اس بار منظر امام صاحب بچے خوابوں پر مختصر لیکن جامع تحریر لے کے حاضر تھے۔ بھائی رانا محمد شاہد شہروں کے نام پر مختصر لیکن جامع تحریر لائے۔ پشاور کو باغوں کا شہر کہتے ہیں۔ انور فرہاد کی تحریر ''دو نگینے'' بہت جامع اور معلوماتی تحریر تھی۔ انور فرہاد صاحب پلیز انڈیا اداکار گوندا پر بھی ایک جامع تحریر لکھیے نا۔ سلیم فرخی کی تحریر ''دانا و بینا'' مجرم کو عجیب طریقے سے گرفتار کرایا۔ اپنے فیورٹ رائٹر ڈاکٹر عبدالرب بھٹی ''ناسور'' کی تیسری قسط بھی بڑی شان آن بان کے ساتھ حاضر تھی۔ بہت ہی شاندار قسط تھی۔ اب چلتے ہیں سچی کہانیوں کی طرف پہلی سچ بیانی ''راندۂ درگاہ'' اف ایسے ماں باپ اور بہن بھائی پر لعنت ہے جسے اپنی بہن، بیٹی پر اعتبار نہیں۔ ڈاکٹر جی بھی تو انسان ہے اکثر ایسی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ دوسری سچ بیانی ''سزا'' بی بی آپ کیوں بھول گئیں کہ یہ مرد ذات ہیں۔ تم عورت ہو تمہیں ان سے کچھ بھی مانگنے کا حق نہیں۔ منصور بھی تو مرد ذات ہے مرد ذات سے امید رکھنا عبث ہے۔''

☆ رضا احمد اعوان دریا خان بھکر سے تشریف لائے ہیں۔ ''یک مٹھی میں اس بار سعادت حسن منٹو جلوہ افروز تھے۔ بے شک منٹو صاحب ایسے ادیب تھے جن کی ادبی خدمات کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ ''معبرِ خیال'' کی کھڑکی سے جھانکا تو ایک دو کو چھوڑ کے باقی سب ساتھی سرگزشت پر تعریف و تنقید کے ساتھ ساتھ خوش گپیوں میں مصروف نظر آئے۔ سدرہ بانو ناگوری، اعجاز حسین سٹھار، عریشہ، عبدالحفیظ، سیف اللہ، انور عباس شاہ، ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری اور آفتاب احمد خان کے تبصرے خوب تھے۔ عبدالحفیظ صاحب! آپ نے غلط کہا کہ قاسم رضا ''ایک صدی کا قصہ'' میں زبردستی ہر فنکار کو ملتان کا رہائشی بتاتے رہے۔ کسی فنکار کا کسی شہر میں تھوڑے عرصے کے لیے رہنا بھی اس شہر کے باسیوں کے لیے فخر کی بات ہوتی ہے۔ معروف گلوکار رجب عالم ضلع بھکر کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے میٹرک تک تعلیم بھکر کے ایم سی ہائی اسکول سے حاصل کی۔ ہمارے دوست سید طاہر زیدی کے کلاس فیلو رہے۔ پھر قسمت انہیں لاہور لے گئی، ہمارے لیے تو فخر کی بات ہے کہ ان کا تعلق بھکر سے تھا۔ قاسم رضا صاحب نے جن فنکاروں کا ذکر اپنے مضمون میں کیا ہے، آپ کسی ایک فنکار کی مثال دے دیں کہ قاسم رضا نے انہیں زبردستی ملتان کا رہائشی بتایا۔ البتہ مجھے قاسم رضا سے شکایت ضرور ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کا ابتدائی حصہ ملتان میں گزارنے والے تین لیجنڈ شخصیات، اداکار محمد علی، نغمہ نگار ریاض الرحمٰن ساغر اور ناہید اختر پر کچھ نہیں لکھا حالانکہ یہ شخصیات تفصیلی حالات لکھنے کے متقاضی تھے۔ اداکار محمد علی ملتان کے علاقہ گڑ منڈی میں رہائش پذیر رہے۔ ان کے والد مرشد علی سید گڑ منڈی کی مسجد میں پیش امام رہے، ریاض الرحمٰن ساغر بھی محمد علی کے محلے دار، کلاس فیلو اور دوست تھے۔ دونوں نے میٹرک تک تعلیم ملت ہائی اسکول ملتان سے حاصل کی۔ کبھی کبھی میں اداس ہو جاتا ہوں اور میرے آنسو نکل آتے ہیں جب سوچتا ہوں کہ کیسی کیسی خوب صورت اور حسین شخصیات تھیں جو مٹی میں مل گئیں۔ ابھی پچھلے دنوں اداکارہ شبنم پاکستان آئی تھیں۔ ایک شام انہیں ٹی وی چینل کے ایک پروگرام میں دیکھ کر بے اختیار آنسو آ گئے۔ وہ گزرے لمحوں کا سایہ لگ رہی تھیں، انہیں بولنے اور چلنے میں دشواری پیش آ رہی تھی جب کہ ایک زمانہ تھا کہ ان کے نام کے ڈنکے بجتے تھے۔ محمد علی، وحید مراد، سنتوش کمار، کمال، شمیم آرا، رانی منفرد لوگ تھے جن کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے ٹریفک بلاک ہو جایا کرتی تھی۔ آج یہ لوگ کہاں ہیں؟ انور فرہاد اس بار قلم نگری میں ''دو نگینے'' کے عنوان سے رخسانہ نور اور وجیہ مرزا کو لے کر آئے۔ دونوں کی وفات کا سن کر بے حد دکھ پہنچا۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریقِ رحمت کرے۔ (آمین)۔ عبدالحمید بہاولپوری کی تجویز سے اتفاق کرتا ہوں کہ سرگزشت کی خدمات کے صلے میں آفاقی صاحب پر کوئی سلسلہ شروع کیا جائے۔ سلمیٰ اعوان میری پسندیدہ رائٹر ہیں۔ ان کی کہانی ''ممتا'' بہت پسند آئی۔ ''شہروں کے نام'' رانا محمد شاہد کی بہترین کاوش تھی۔ ''رقصِ آتش'' نے واقعی رونگٹے کھڑے کر دیے۔ زوبیا اعجاز کی ''باغی'' بہت معلومات افزا اور دلچسپ تھی۔ جو ہر آباد (بڈالی) کی نامور شخصیات ''چراغ بالی'' پر بھی لکھیں تو کیا ہی بات ہے (ہم بھی منتظر ہیں)۔ ''ناسور'' کی اٹھان بتا رہی ہے کہ آگے چل کر پسندیدگی کے ریکارڈ توڑ دے گی۔ اپریل کی شخصیات میں اے حمید، احمد رشدی، معین

اختر، عمر شریف اور اقبال بانو جیسی شخصیات کی موجودگی نے مضمون کو چار چاند لگا دیے۔ بیت بازی میں سعید احمد چاند، عنبرین مشتاق اور نیلوفر شاہین کے اشعار معیاری تھے۔"

☆ محمد عمران خان ڈیلی نامدار بھکر سے لکھتے ہیں۔ "اپریل کا شمارہ 24 تاریخ کو ملا۔ معراج رسول کی چھوٹی سی کہانی نے سوچ کے سمندر میں دھکیل دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں حسد ایک بڑی معاشرتی بیماری ہے جو انسانی قدروں کو کھوکھلا کر رہی ہے۔ افسوس ہم لوگ سسٹم کو تو برا کہتے ہیں لیکن اپنی اصلاح نہیں کرتے خود کو بدلیں گے تو سسٹم بھی بدلے گا۔ اب آتے ہیں "شہر خیال" کے دوستوں کی طرف "شہر خیال" میں ہماری حاضری مستقل نہیں ہوتی کچھ تو محکمہ ڈاک کا قصور ہے اور کچھ ہماری اپنی مصروفیات بھی میرے بہت سے خطوط تو شاید بالکل پہنچے بھی نہیں کیوں کہ تاخیر سے موصول ہونے والے خطوط میں بھی ہمارا نام شامل نہیں تھا۔ "شہر خیال" میں ہم بھکر والے بازی لے گئے یہ دیکھ کر دل کو خوشی ہوئی۔ سدرہ بانو صاحبہ کرسی صدارت پر براجمان تھیں۔ تبصرہ بھی شاندار تھا۔ اعجاز حسین سٹھار صاحب کا تبصرہ بھی خوب تھا۔ عبدالحمید، رانا محمد شاہد، رضا احمد، انور عباس شاہ، بزابت افشال اور اویس شیخ کا تبصرہ بھی پسند آیا۔ ڈاکٹر روبینہ نفیس صاحبہ نے کہا کہ ہر بار ایک مزاحیہ سچ بیانی بھی ہونی چاہیے لیکن میرے خیال میں مزاحیہ کہانی سرگزشت جیسے سنجیدہ پرچے میں اچھی نہیں لگتی۔ سرگزشت کا معیار ایسا نہیں کہ اس میں مزاحیہ کہانی شامل کی جائے۔ ڈاکٹر ساجد امجد ہمیشہ کی طرح خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہوتے ہیں۔ "سردار سخن" بے حد پسند آئی۔ ڈاکٹر صاحب کی اس کاوش کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ "لیلیٰ حرف شیریں" متاثر کن تحریر تھی۔ ساتھ ہی مسلمانوں کی حالت زار کا نقشہ بھی خوب کھینچا گیا۔ "شہروں کے نام" بہت اچھی تحریر تھی لیکن انتہائی مختصر پیرائے میں لکھی گئی۔ "اپریل کی شخصیات" اس سلسلے کو اب بند ہونا چاہیے بہت طویل ہوتا جا رہا ہے۔ پہلی سچ بیانی "راندۂ درگاہ" اچھی تحریر تھی۔ ایک غلطی نے کس طرح اسماء کی زندگی کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ "موت کا کنواں" میں ناصر نے ساحرہ کو حاصل کرنے کے لیے غلط راستہ چنا پھر جا ہی تو آئی تھی۔ "فیصلہ" دلچسپ تحریر تھی لیکن بالکل فلمی انداز لگا۔ "انصاف" سبق آموز تحریر تھی۔ آج ہم اپنے والدین کو جو دیں گے عزت و احترام یا ذلت و رسوائی کل کو وہی سب کچھ ہماری اولاد ہمیں لوٹائے گی۔ ممتا، ناجو اور راہ پُرخار بھی پسند آئیں۔ "نیکی" نیکی کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ جمیل صاحب نے خلوص دل سے نیکی کی اور پھر اس کا صلہ بھی ملا کہ بڑی مصیبت سے چھٹکارا بھی مل گیا۔"

☆ اعجاز حسین سٹھار کا خلوص نامہ نور پور تھل سے۔ "جیسے خیالات کا اظہار قارئین کر رہے ہیں اور خطوط کی تعداد کے ساتھ جسامت نظر آ رہی ہے تو صفحات کم پڑتے دکھائی دے رہے ہیں۔ میں خود کھل کر اپنا موقف بیان کر سکتا ہوں نہ کہانیوں کے ہر ہر پہلو پر من مرضی کا تبصرہ لکھ سکتا ہوں اگر ساتھیوں سے ٹوک جھوک کی جائے تو دوسرے کام ادھورے رہ جائیں گے اس مسئلے پر ضرور سوچیں تا کہ مستقل قریب میں عمل کیا جا سکے۔ (آپ کا شکوہ بجا ہے لیکن ہماری بھی مجبوری ہے ہم آٹھ صفحات سے زیادہ صفحے مختص نہیں کر سکتے۔ اسی لیے ہر بار التجا کرتا ہوں کہ خطوط مختصر لکھیں)۔ جن دوستوں نے یاد کیا سراہا ان کے ساتھ محفل کے سب دوستوں کا شکریہ۔ "ابھرتے ستارے" اچھا سلسلہ ہے دلچسپ لگا اور مزہ بھی آیا۔ "اپریل کی شخصیات" میں اے حمید، معین اختر، عمر شریف، غلام فرید صابری قوال، غلام علی خان، اقبال بانو، نازیہ حسن، شان اور شکور رانا سے متعلق معلومات بھی بے مثال تحفہ ہیں۔ "ناسور" مار دھاڑ، قتل، اغواء اور تشدد سے پاک واقعات پر چل رہی ہے اور عذاب و مشکلات کے ساتھ بڑے صبر و استقامت سے سفر پر گامزن ہے۔ سچ بیانیاں ہمارے معاشرے کی سچی تصویر ہوتی ہیں۔ "راندۂ درگاہ" بھی ایسی ہی کہانی ہے۔ یہاں سارا قصور ماں کا ہے جس نے حقیقی ماں سے بڑھ کر لگائی بجھائی کرنے والی پڑوسن کا کردار ادا کیا ہے۔ وہ بیٹی کی بدنامی کا خود اشتہار بن گئی۔ اسے سارا معاملہ دبا کر اصل ذمہ دار تک پہنچ کر اس بوجھ سے نجات حاصل کرنا چاہیے تھی لیکن اس پر اسماء کی وضاحت اور واویلا کا الٹا اثر ہوا۔ بلکہ بیٹی کو بے گناہ ثابت کرنے کو کوئی قدم نہ اٹھایا۔ "سزا" میں نعیم اور نجمہ نے ایسا رویہ اپنایا کہ خوشیوں بھرا گھر اجڑ گیا۔ نعیم نے بیوی کو اعتماد میں نہ لیا اور دونوں کی معمولی غلطی نے پورے پچیس سال کی جدائی ڈال دی اس عرصے میں انہیں کتنے صدمات، عدم تحفظ اور مشقت کی سختی سہنا پڑی۔ یہ ماں بیٹا ہی جانتے ہیں کہ یہ لمبا عرصہ کتنی اذیت میں گزارا۔ اب میں نعیم کی تلاش کی کوشش اور نجمہ کے مصالحت کے فیصلے کو سراہتا ہوں۔ "موت کا کنواں" پڑھ کر ہماری اپنی نوعمری اور جوانی کا زمانہ یاد آ گیا۔ ہمارے گاؤں میں بھی ہر سال ایک بڑا مشہور میلہ شروع ہوتا ہے۔ جس کی رونقیں ہفتہ بھر رہتی ہیں۔ موت کے کنواں پر کافی رش ہوتا ہے۔ ناچنے والی لڑکیاں تماشائیوں کی طرف دیکھتیں تو ہم کئی غلط فہمیوں میں مبتلا ہو جاتے تھے۔ وہ بے چاری تو اپنی مجبوریوں، بے بسی کی وجہ سے ہماری بے فکری اور آزادی کو خراج تحسین پیش کرتی تھیں۔ ایسے ہی خیالات اور حالات ساحرہ کے تھے اسے نجات دہندہ مل گیا لیکن خوشیوں بھری زندگی قسمت میں نہ تھی کہ سانسیں گنی چنی رہ گئی تھیں۔ کتنے المیوں نے جنم لیا، دوستی کا دم بھرنے والے آستین کا سانپ نکلے، زندگی کے واحد قیمتی اثاثہ کو موت کی آگ میں جھونک دیا۔ گو سانپ کا سر کچل دیا گیا لیکن جن کے جسموں میں زہر اتر چکا تھا وہ نیک فطرت ہونے کے باوجود اپنی جنت کا اپنی جاگتی آنکھوں تماشا دیکھنے پر مجبور ہو گئے یہاں تک کہ سب کچھ جل کر راکھ بن گیا۔ "فیصلہ" کتنے اتفاقات کے ملاپ کے بعد وجود میں آئی ہے۔ کبھی دل کے فیصلے کسی غلط انتخاب کے نتیجے میں الٹی سمت پر ڈال دیتے ہیں۔ یہاں تینوں فریقین دل کے اندھے فیصلے مان کر انجان راہوں پر نکل پڑے تھے۔ راستے کی مشکلات، رکاوٹوں اور [illegible] سے متعلق معلومات [illegible] منزل پر پہنچنے کے لیے خونخوار جھاڑیاں

چہرے پر کھرونچیں اور کپڑوں کو لیر لیر کر دیتی ہیں۔ یہ ساتھی کے صبر و استقامت، معاملہ فہمی اور برتاؤ کا امتحان ہوتا ہے جو لڑکی اس مشکل کے مختصر وقت میں عقل مندی سے جائزہ... لے اسے کسی نتیجے پر پہنچنا آسان ہوتا ہے۔ زندگی گرداب میں آنے سے بچ جاتی ہے یہاں ثمرین کی عقل مندی اور قوت فیصلہ کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ شہلا کو بطور سوتن جس فراخ دلی سے قبول کیا، یہ بھی اعلیٰ ظرفی کی مثال ہے۔ نسیم ایک جہاندیدہ جوان ہیں ان سے انصاف کی توقع ہے۔ کہیں خطرے کی گھنٹی بجنے کا امکان نہیں ہے۔ سارے معاملات نارمل انداز میں خوش اسلوبی سے انجام پائیں گے۔ ''ممتا'' میں آپا زندہ تھی تو دل میں سلمان کے بے وفائی سے متعلق کتنے خدشات کو پالے رہی۔ شاید وہ ان کی وجاہت اور دولت سے خوف زدہ تھی پھر اپنی بیماری اس خوف کو سچائی کا روپ دینے میں معاون بنی رہی لیکن کتنے حیرت کی بات اور عجیب صورت حال ہے کہ اب سوت سے ہمدردی پیدا ہو چلی ہے اور یہ سامنے کی بات ہے کہ وہ اپنے بچوں کو محفوظ ہاتھوں میں دیکھ رہی ہے اور فہمیدہ حقیقی ماں کے روپ میں بچوں کے درمیان ہے اور یہ فقرہ سونے میں تولنے کے لائق ہے کہ ''عورت پریشان نہیں ہے، ممتا پریشان ہے۔'' کبھی یہ بات اولاد کے ذہن و دل کی تختی پر تاحیات کندہ ہو جائے تو گلے شکوے دور ہو جائیں جب ماں کا مقام ہماری سمجھ میں آجائے گا ہم اس کی خدمت ذمہ داری اور فرض جان کر پوری کریں گے تو اس کی دعائیں ہماری دنیا اور آخرت سنوار دیں گی اس سے بڑھ کر ہم کیا صلہ چاہتے ہیں۔''

☆ انجم فاروق ساحلی لاہور سے لکھتے ہیں۔ ''یک مئی سرگزشت ''متنازع قلم کار'' معلومات سے بھرپور تھی۔ علی سردار جعفری عہد آفریں شخصیت تھے۔ ''شہر خیال'' میں اوّلین خط کا آغاز اور انداز تجزیہ خوب تھا۔ باقی قارئین نے بھی اظہار خیال میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' اچھے انداز میں آگے بڑھ رہا ہے۔ قائد کا ڈان، باغی، رقصِ آتش اور خواب معیاری تحریریں تھیں۔ باقی مضامین بھی خوب تھے۔ ''دور نگیلے'' دلچسپ تحریر تھی۔ مغرب سے درآمد دلچسپ قصے کہانیاں شائع ہونی چاہئیں۔ ''انڈیا آفس لائبریری'' معلومات سے بھرپور اور جاندار اقتباس تھا۔ ''ناسور'' بھی زیر مطالعہ ہے۔ راندۂ درگاہ، سزا اور موت کا کنواں تینوں آپ بیتیاں خوب ہیں۔ پرانی یادیں، پرانی رفاقتیں اور پرانے نغمے بھلائے نہیں جا سکتے۔ چنانچہ سرگزشت کے شہر خیال میں حاضری دے دی۔ محترم مدیر سرگزشت متفرق تحریروں کے بعد الفاظ کے استعمال پر بے حد توجہ کے ساتھ ''وادی رفت کی بلا'' شکاریات کی تحریر بھیج رکھی ہے لیکن کافی ماہ گزرنے پر بھی شائع نہیں ہوئی (اگر آپ تحریر ارسال کرنے سے قبل اسے تنقیدی نظر سے پڑھ لیتے تو تاخیر نہ ہوتی)۔ ''ریشم کی موت'' تحقیقی مضمون اور ''الی گولا کا آدم خور'' تیار ہیں کیا انہیں بھیج دیا جائے؟ (پہلے سے رکھے مضامین شائع ہو جائیں تب بھیجیں)۔''

☆ سلیم رشید کا تبصرہ لاہور سے۔ ''اداریہ بہت خوب تھا۔ زندگی کا سچ لکھ کر آپ تمام قارئین کے دل جیت لیتے ہیں۔ معاشرہ اس قدر تباہ ہو چکا ہے کہ بھائی بھائی کا دشمن اور والدین کی قدر کم ہو گئی ہے۔ ہر شخص نے حلال و حرام کی تمیز ختم کر دی ہے۔ ہم لوگ مشرقی اقدار کی قدر کرتے تھے۔ محلے داروں کی عزت کرتے تھے ہر بڑے کو ہمیشہ اپنے بڑوں کی طرح سمجھا۔ عورتوں کی عزت کرتے تھے اور کرتے ہیں لیکن آپ نے جو تحریر فرمایا کہ اپنے رشتے دار نہیں چاہتے کہ ان کے برابر دوسرے عزیزوں کی اولاد ترقی یا تعلیم حاصل کرے۔ واقعی اگر آپ کسی بڑے عہدے پر موجود ہیں تو اپنے عزیز کو اپنے قریب نہ آنے دیں گے اور بہانے سے آپ اس کی تذلیل کریں گے میں نے جس محکمے میں ملازمت کی وہاں محنت، تعلیم کی کوئی قدر نہ تھی بلکہ ان لوگوں کی عزت کی جاتی تھی جو ناجائز طور پر دولت اکٹھی کر کے اپنے افسران کو تحفوں کی شکل میں نوازتے تھے۔ نوکری کے دوران جن لوگوں کو حق دلوایا خواہ وہ رشتے دار ہوں یا دوست ریٹائرمنٹ کے بعد ایک فون کال کرنا بھی ممنوع سمجھا۔ کبھی دنیا کو دیکھتا ہوں اور کبھی اپنے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکامات کو پڑھتا ہوں تو دل خون کے آنسو روتا ہے کہ ہم لوگ اپنے اللہ تعالیٰ کو کیا جواب دیں گے۔ عمر کے اس حصے میں نظر کمزور ہو گئی ہے لیکن سرگزشت کو پڑھے بغیر دل کو سکون نہیں ملتا۔ مختلف قارئین کی آرائیں پڑھیں سب نے بہت خوب لکھا خدا ان کو مزید ترقی دے، آمین۔ سب سے زیادہ دل کو لاہور کی نئی تعمیر سے دکھ ہوا۔ ایک خوب صورت شہر کو کھنڈر بنا دیا گیا ہے، تاریخی عمارت کا حلیہ بگاڑ دیا ہے۔ مینار پاکستان کا نام تبدیل کر کے گریٹر اقبال پارک رکھ دیا ہے۔ قائداعظم کی تصاویر کو صرف کرنسی نوٹوں تک محدود کیا جا رہا ہے، جو لوگ اسلام کی صحیح ترجمانی نہیں کر سکتے ان کو قلمدان دے دیا ہے۔ میں نے آپ کے رسالے میں ایک ''لیلیٰ حرف شیریں'' ایاز راہی صاحب کی لکھی ہوئی تحریر پڑھی جس میں علامہ اقبال کی مثنوی کے اشعار کی شکل میں جس عظیم خاتون شرف النساء بی المکور سرو والہ مقبرہ، جو کہ جی ٹی روڈ شالیمار روڈ لاہور پر واقع ہے۔ فارسی مثنوی کے اشعار کا ترجمہ پڑھ کر میرے دل کی کیفیت ہی تبدیل ہو گئی کہ ایسی عظیم ہستی جس کے بارے میں مفکر اسلام ڈاکٹر علامہ اقبال نے ایک مثنوی لکھ دی وہ کیا کمال مسلمان خاتون تھی۔ میں لاہور میں رہتا ہوں اور اس علاقے کو آج کل اورنج ٹرین کے لیے توڑا جا رہا ہے اور بڑے بڑے ستون لگائے جا رہے ہیں۔ افسوس ہوتا ہے کہ ہم ان عظیم لوگوں کی تاریخ جنہوں نے دین اسلام کے لیے قرآن سے راہ اور ہدایت حاصل فرمائی ان کی جگہوں کو چھپا کر اپنے نام کی تختیاں لگوانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چوبرجی یادگار جو کہ مغلیہ شہزادی زیب النساء کی وجہ سے مشہور ہے اس کو بلند ستون سے ڈھانپنے کی کوشش ہو رہی ہے جب کہ ہائی کورٹ نے تمام تاریخی عمارت سے 200 گز دور تعمیرات کرنے کا حکم دے رکھا ہے۔ کہاں ہے اس ملک کا قانون اور قانون دان، ادیب، اسکالر جو پہلے آواز اٹھاتے تھے۔ حبیب جالب مرحوم کو مال روڈ لاہور میں ایوب خان کے خلاف نظم پڑھتے دیکھا۔ ایک مفلس شاعر لیکن امیر دل، سرمایہ داروں سے

امیر تھا۔ انسان کو قلم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے۔ آپ جیسے لوگ اس ملک کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ سکتے ہیں۔ دل محترمہ شرف النساء بی بی کے بارے میں پڑھ کر اتنا افسردہ ہے کہ اس کے مقبرے کو ایک انسان کی جگہ سمجھا جا رہا ہے۔‘‘

☆ عریشہ کی ای میل سمندری سے۔ ’’جے ڈی پی کے رسائل کی آمد کی تاریخوں میں جب سے تبدیلی ہوئی ہے، وقت پر نہیں ملتے۔ ہاکر حضرات کئی بار کہنے کے باوجود پہلی تاریخوں پر ہی لا کر دیتے ہیں۔ پھر وقت پر تبصرہ بھیجنے میں بہت دقت ہوتی ہے۔ انکل جی! اب تبصرہ بھیجنے کی آخری تاریخ کیا ہے؟ (میل سے آپ 6 تک بھیج دیں)۔ یک حقی سرگزشت میں ایک بہادر قلم کار کی کہانی تھی۔ اس نے بہت مقدمات میں حتیٰ کہ پروپیگنڈہ کا سامنا کیا لیکن اپنی تحریروں میں سچائی کا تڑکا لگانا نہ چھوڑا۔ وہ ٹھیک ہی تو کہتا تھا۔ سعادت حسن مر جائے گا لیکن منٹو زندہ رہے گا۔ ’’شہر خیال‘‘ میں اس بار ایک خوشگوار تبدیلی نظر آئی۔ اکثر تبصروں میں جگ بیتیوں پر رائے شامل تھی۔ اعجاز حسین سٹھار کی طرح مجھے بھی وحید ریاست بھٹی کے سالانہ تجزیہ کا بہت انتظار تھا۔ پتا نہیں کیا ماجرا ہوا اس بار؟ ’’قائد کا ڈان‘‘ میں تاریخیں تھوڑی سی کنفیوزنگ لگیں مگر تحریر بہت اچھی تھی۔ ایاز راہی کی ’’تلخی حرف شیریں‘‘ میں اختتامی فقرات نے بڑا افسردہ کیا۔ زویا اعجاز لگتا ہے جلد ہی جے ڈی پی کا مستقل حصہ بن جائیں گی۔ اس بار بھی ان کی تحریر ’’باغی‘‘ بہت پسند آئی۔ ’’رقص آتش‘‘ اور ’’دانا بینا‘‘ بھی نارمل رہیں۔ ’’اپریل کی شخصیات‘‘ میں شکور رانا، غلام محمد، ایوب خان، معین اختر کا بڑا اچھا تعارف تھا لیکن نازیہ حسن سے ملاقات بہترین تھی۔ ’’خواب‘‘ اور ’’شہروں کے نام‘‘ بھی بہت معلوماتی تھیں۔ ’’دو نگینے‘‘ میں رخسانہ نور کے حالات زندگی پڑھے۔ ان کے لکھے گانے ہمیشہ ہی میری پلے لسٹ میں شامل رہے ہیں۔ ’’ناسور‘‘ میں کچھ الفاظ کی تکرار بہت زیادہ تھی۔ سچ بیانیوں میں ممتا بہترین تھی۔ ’’فیصلہ‘‘ میں دونوں خواتین کا فیصلہ بہت عجیب اور مصنوعی لگا۔ عورت شوہر کو کیسے شیئر کر سکتی ہے؟ ’’راندۂ درگاہ‘‘ میں اسماء کے گھر والے ایک بار ٹیسٹ کروا لیتے تو کیا بگڑتا۔ باقی رسالہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔‘‘

☆ رانا محمد شاہد بورے والا سے لکھتے ہیں۔ ’’اپریل کا شمارہ اپنے سسرال میں بیٹھ کر پڑھا۔ بیگم سلائی کڑھائی کورس کے لیے کالج گئیں تو واپسی پر ان کے ہاتھ میں سرگزشت تھا۔ کہہ رہی تھیں کہ ٹیچرز اور کلاس فیلوز نے آپ کی تحریر اور شمارے کو بہت سراہا ہے۔ انہیں رسالہ دلچسپ، منفرد اور معلومات کا خزانہ لگا۔ یہ حقیقت ہے کہ سرگزشت اپنی انفرادیت کی وجہ سے نئے قارئین کو ضرور متاثر کرتا ہے۔ یک حقی سرگزشت اردو کے سب سے بڑے افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کے بارے میں تھی۔ آپ نے لکھا کہ دو بار کی کوشش سے انہوں نے میٹرک کیا جب کہ میں نے تو یہ بھی کہیں پڑھا تھا کہ وہ اردو کے پرچے میں تین بار ناکام ہوئے لیکن اردو کے سب سے بڑے افسانہ نگار کہلائے۔ معراج رسول صاحب کا اداریہ حسد کے حوالے سے ہماری معاشرتی سوچ کا عکاس تھا۔ ہم چہرہ جیسا بھی بنا لیں لیکن دوسرے کے نقصان پر دل ہی دل میں خوش ضرور ہوتے ہیں۔ یہ ہمارا سب سے بڑا المیہ ہے۔ سدرہ بانو نا گوری! ملک کے حالات اگر ابتر ہیں تو اس کی وجہ بھی ہماری ناقص پالیسیاں ہیں۔ اپنے فرض سے بے اعتنائی ہے۔ اعجاز حسین سٹھار سال بھر کے تجزیے کو یاد کر رہے تھے۔ شاید اس دفعہ وحید ریاست بھٹی مصروفیات کی وجہ سے بھول گئے۔ عریشہ کی بات سے اتفاق ہے کہ ڈائجسٹ کے مندرجات پر کم بات ہوئی ہے۔ تاہم جگ بیتیاں لکھنے والوں کی تحریروں کو سراہا جاتا ہے۔ ہمیں یہ خوشی ہے کہ زویا اعجاز ایک تبصرہ نگار سے مصنفہ کی منازل طے کر چکی ہیں۔ یورپیوں اور یونانیوں کے حالات زندگی کے بعد یک حقی سرگزشت میں پاکستانیوں کے حالات زندگی بیان کر کے بہت اچھا کیا گیا ہے۔ کیونکہ قارئین کی اکثریت شاید ان یورپیوں و یونانیوں کے متعلق اتنا نہ جانتی ہو لیکن وہ پاکستانیوں کے بارے میں ضرور جاننا چاہتی ہے۔ عبدالرؤف صاحب کی تجویز اچھی لگی۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کی شخصیت پر اگر نہیں لکھا تو ان کی تحریر کا انتظار ہے۔ رضا احمد اعوان نے فنکاروں کے حوالے سے جو بات لکھی وہ دل کو لگی۔ یہ سچ ہے کہ یہ فنکار اپنے دور عروج میں جو کماتے ہیں اسے اگر صحیح طریقے سے استعمال کریں تو عمر کے آخری حصے میں انہیں مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ انہوں نے دو چار نام لکھے ہیں جب کہ حالیہ چند برسوں میں اسٹیج کے کئی اداکار کسمپرسی کی حالت میں دنیا چھوڑ گئے۔ حالانکہ ایک وقت میں وہ لاکھوں کماتے تھے۔ ڈاکٹر روبینہ نفیس، سرگزشت کے لاسٹ پیج پر برگر کا اشتہار تو کئی مہینوں سے آ رہا ہے۔ آپ نے شاید گزشتہ ماہ دیکھا ہو۔ مزاحیہ کہانی والی آپ کی تجویز معقول ہے۔ شکیل صدیقی نے ’’ڈان‘‘ اخبار کے بارے میں تفصیلی معلوماتی تحریر لکھی۔ اخباری صحافت میں ’’ڈان‘‘ کے کردار کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ایاز راہی کی ’’تلخی حرف شیریں‘‘ بھی دلچسپ تحریر تھی۔ تاہم زویا اعجاز کی ’’باغی‘‘ سب سے الگ تھی۔ ندیم اقبال کا سفر نامہ بھی دلچسپی کے مراحل طے کرتا جا رہا ہے۔ یہ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ ان کا پہلا سفر نامہ ’’نانگا پربت کا عتاب‘‘ کتابی صورت میں چھپ چکا ہے۔ یہ ملے گا کہاں سے؟ (ناشر کا پتا اشتہار میں موجود ہے)۔ اپریل کے لیے صائمہ اقبال نے کئی نئی شخصیات کا انتخاب کیا۔ سلسلہ دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ منظر امام صاحب نے ’’خواب‘‘ کی حقیقت کے حوالے سے تحقیقی مضمون لکھا۔ ’’شہروں کے نام‘‘ کی اشاعت کا شکریہ۔ کوشش کروں گا کہ کئی دوسرے شہر جو رہ گئے ہیں ان پر الگ سے لکھ کر بھجواؤں۔ انور فرہاد نے حال ہی میں بچھڑ جانے والی شوبز کی دو شخصیات کی یادوں کو تازہ کیا۔ سلیم فرخی کی ’’دانا بینا‘‘ بھی دلچسپ تحریر تھی۔‘‘

☆ ایم اے حفیظ کی آمد گوجرانوالہ سے۔ ’’اس بار مجموعی طور پر پرچا اچھا رہا۔ پہلے صفحے سے لے کر آخری ورق تک بہترین مواد موجود تھا۔ یک حقی سرگزشت بے مثال تھی۔ آپ اس سلسلے کو پچھلے پچاس سالوں تک رکھیے۔ بہت دور جانے کی ضرورت نہیں ہے (بالکل

ہماری خواہش بھی یہی ہے کہ ہم ماضی قریب میں ہی رہیں)۔ ''معمہ خیال'' میں میرا خط جگمگا رہا تھا۔ ڈاکٹر ساجد امجد اس بار اپنے شباب پر نظر آئے۔ علی سردار جعفری پر بہت معلوماتی مضمون تھا۔ شکریہ ادا کرنا تھا جناب شکیل صدیقی کا۔ ''قائد کا ڈان'' جیسا عمدہ مضمون ان کے قلم سے نکلا لیکن سب سے زیادہ کمال زویا اعجاز کے قلم کا شاہکار ''باغی'' نظام لوہار پر تقریباً چار پانچ فلمیں دیکھ چکا ہوں لیکن سوجا سنگھ اور اس کی والدہ کا کردار اس طرح کبھی نہیں دکھایا گیا۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' کی دلکشی برقرار ہے۔ ایک بات کہوں۔ ندیم اقبال اقرار نہ کریں۔ مگر۔۔۔ ان کا دل نسرین کی طرف ضرور کھنچا رہا ہے۔ اس بار ''ناسور'' میں کافی اتار چڑھاؤ دیکھنے کو ملے۔ سچ بیانیاں تقریباً سب ہی شاندار تھیں تاہم راندۂ درگاہ، سزائے موت کا کنواں اور ممتا بہت دنوں تک یاد رہیں گی۔ ایک بات بتاؤں کچھ عرصہ پہلے تک سرگزشت کا سرورق بہت بھیانک ہوتا تھا جیسے ایکشن انگلش فلم کا پوسٹر ہو۔ اب کافی سبک اور نرم خو ہو گیا ہے۔ شکریہ قبول کیجیے۔ اپریل کا سرورق بہت عمدہ رہا اور ہاں اداریہ بہت لاجواب ہوتا ہے مختصر لیکن پُراثر۔ اُمید ہے میرے دوبارہ آنے سے خوش ہوں گے میری طرف سے آپ سمیت سارے اسٹاف کو سلام۔''

☆ آفتاب احمد نصیر اشرفی کی تحریر کراچی سے۔ ''میٹرک کا نالائق طالب علم برصغیر کا نامور قلم کار بن گیا۔ متنازع ہی سہی ادب کے لیے ناگزیر سعادت حسن منٹو اپنی بے ادبی کی وجہ سے بہت سوں کے لیے آئینہ بھی تھے۔ معراج صاحب آپ سچ کہہ رہے ہیں کہ حسد اور جلن نے ہمارے خوب صورت رشتوں کو بھی بے رونق کر دیا ہے۔ ہر طرف عجیب سی افراتفری ہے۔ کوئی کسی سے خوش نہیں ہے اور نہ مطمئن۔ ہمارا پچھلا خط شرف قبولیت سے بچ گیا ضرور کوئی کمی رہ گئی ہوگی۔ سدرہ بانو ناگوری کا تبصرہ ہر لحاظ سے ممتاز تھا جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ بہت ساری دعائیں۔ اس کے علاوہ بھی تمام نامی گرامی دوستوں کی موجودگی نے ''معمہ خیال'' کو قوس قزح بنا دیا ہے۔ عریشہ صاحبہ کی اس بات سے ہم متفق نہیں ہیں کہ سرگزشت کے ابتدائی حصے میں دلچسپی کم ہوتی ہے۔ ممکن ہے کبھی کبھار ایسا ہو جاتا ہو لیکن جناب ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی ہر تحریر ہماری آنکھوں کے راستے ہمارے ذہن اور پھر دل میں گھر کر لیتی ہے۔ اس ماہ بھی وہ علی سردار جعفری صاحب سے ہمارا تعارف کرا رہے تھے۔ اب عریشہ صاحبہ آپ ہی بتائیں کہ اس تحریر پر کیا تبصرہ کیا جائے سوائے اس کے کہ تعریف میں اپنے دل کی ترجمانی بھی ہو جائے اور ڈاکٹر صاحب کی انتھک محنت کو خراج تحسین کے ساتھ شائع شخصیت کی مثبت باتوں سے استفادہ بھی کر لیا جائے۔ اب علی سردار جعفری کی اس خوبی کو ہی دیکھیے کہ وہ کمیونسٹ اور ترقی پسند ہونے کے باوجود اپنے بنیادی نظریات و عقائد کی خلاف ورزی کرتے ہوئے حضرت علامہ اقبال کی کردار کشی کے خلاف بغاوت کے مرتکب ہوئے۔ اب اتنی شاندار بات کی تعریف میں کیا کہا جائے؟ یہی بات قائد کا ڈان میں نامور صحافی الطاف حسین صاحب نے بھی کی کہ وہ بھی علامہ اقبالؒ کی شان میں ہمایوں کبیر کی گستاخی برداشت نہ کر سکے۔ یہ بڑے لوگوں کی بڑی باتیں تھیں۔ ''لیلیٰ حرف شیریں'' ایاز راہی کی اتنی ہی شاندار تھی جتنی گزشتہ بار ایاز تھی۔ راہی صاحب کا موضوع جو شخصیات ہوتی ہیں وہ خود اتنی مشکل نہیں ہوتیں جتنا ایاز راہی صاحب کی اردو نما فارسی انہیں بنا دیتی ہے۔ ہماری درخواست ہے کہ ہم جیسے لوگوں کے لیے ہاتھ ہولا رکھیں۔ کرکٹ کے ابھرتے ستارے، رقص آتش، خواب، شہروں کے نام اور داتا و ہما مناسب تھیں جب کہ ''دو نگینے'' انور فرہاد کی محنت کا تسلسل تھی۔ دلجیت مرزا ہماری فلم انڈسٹری کا مان رہے ہیں اور رخسانہ نور اس کے ماتھے کا جھومر، آخری ایام میں انہیں کینسر جیسے موذی مرض نے آگھیرا۔ جناب سید نور کی اداکارہ صائمہ سے شادی اس کا سبب بنی۔ ہماری خدا سے ان کی اور دلجیت مرزا کی مغفرت کی دعائیں اپنی التجاؤں کے ساتھ حاضر ہیں۔ ''اپریل کی شخصیات'' میں کوئی شخصیت ایسی نہیں تھی جو اضافی محسوس ہو رہی ہوں۔ سب کی سب شاندار تھیں۔ ندیم اقبال صاحب کا جادو تو ٹورنٹو میں سرچڑھ کر بول ہی رہا تھا کہ ہم عجز زدہ رہ گئے نانگا پربت کا عقاب کو کتابی شکل میں دیکھ کر۔ دلی مبارک باد کہ آپ صاحب کتاب بھی ہو گئے۔ ''ناسور'' کی اٹھان اچھی ہے۔ واجبی سے انداز بیان میں کہ کب یوٹرن لیتے ہوئے اپنی گرفت میں جکڑتی ہے، انتظار ہے۔ اب آتے ہیں سردار سخن کے بعد دوسری بڑی تحریر کی طرف اور وہ ہے ''باغی'' نظام۔ جبر و اور ملنگی ہماری جدوجہد آزادی کے ہیرو ہیں جنہیں باغی کہہ دینے سے ان کی حرمت میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ سوجا سنگھ کی ماں نے اپنے تجربے بیٹے کو اپنے ہاتھوں سے قتل کر کے نظام لوہار کو ایسا خراج تحسین پیش کیا جس کی عزت ہمیشہ کی جاتی رہے گی۔ سچ بیانیوں میں راندۂ درگاہ، تاجور اور راہِ پُرخار اچھی تھیں اور بقایا مناسب تھیں۔''

☆ سعید احمد چاند کا خلوص نامہ کراچی سے۔ ''اپریل کا شمارہ ملا۔ سرورق پر نظر ڈالتے ہوئے متنازع فنکار تک پہنچے۔ منٹو کے بارے میں اتنے تفصیل سے نہیں پڑھا۔ پڑھ کر خوشی ہوئی۔ اس کے بعد اداریہ میں پہنچے۔ اچھی مثال دی آپ نے۔ بہت عرصے بعد سدرہ بانو ناگوری کو مسند صدارت پر دیکھ کر خوشی ہوئی۔ اچھی جا رہی ہیں۔ طویل تبصرہ سرگزشت کی جان تھا۔ اعجاز حسین سنجار کا بھی اچھا تھا۔ اویس شیخ نے خوب چیک کیا۔ تجھ سے بھی بہت اچھا تبصرہ لکھا۔ باقی کے تبصرے بھی اچھے تھے۔ مثلاً عریشہ، محمد شاہد، نزاہت افشاں، سیف اللہ، رضا احمد، انور عباس شاہ، ظہیر احمد تبسم۔ مجھے سب سے اچھا تبصرہ ڈاکٹر روبینہ نفیس ثاقب انصاری کا لگا۔ ہم تو نظر آتے ہیں۔ تم ہی اکثر غائب رہتی ہو۔ تمہاری پریشانیوں کا کیا حال ہے۔ بھئی تم کچھ کھل کر لکھو تو سہی آخر تمہیں کیا پریشانی ہے۔ ہماری توقع ... خوش ... ڈاکٹر ساجد امجد کی ''سردار سخن'' انور فرہاد کی ''دو نگینے'' رانا محمد شاہد کا ''شہر دل'' کے

نام" ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی "ناسور" ابھی تک تو گوارہ ہی ہے۔ اس دفعہ مقابلہ بیت بازی میں سارے ہی شعر تقریباً اچھے تھے۔ سچ بیانیوں میں غلام رضا جعفری کی "راندۂ درگاہ" نجمہ ندیم کی "سزا" ناصر حسن کی "موت کا کنواں" غفران انصاری کی "انصاف" نسیم ریحان کی "فیصلہ" سلمیٰ اعوان کی "ممتا" جمیل بٹ کی "نیکی" آصفہ ضیاء احمد کی "راہِ پُرخار" میری طرف سے سرگزشت کے قارئین کو سلام۔"

☆ انور عباس شاہ کی تشریف آوری بھکر سے۔ "ضمیر خیال" میں نظر دوڑائی تو شہرت یافتہ تبصرہ نگار سدرہ بانو نا گوری کو کرسی صدارت پر براجمان پایا۔ بہت بہت مبارک ہو سسٹر۔ کافی عرصے سے سلیم قیصر بھائی محفل میں نظر نہیں آرہے خدا کرے خیریت سے ہوں۔ عریشہ سسٹر جن بہن بھائیوں کے پاس پرچا وقت پر نہیں پہنچتا وہ بے چارے کب رسالہ پڑھیں؟ اس پر غور کریں پھر تبصرہ لکھ کر خط پوسٹ کریں۔ اسی طرح تو ان کے خط لیٹ ہو جاتے ہیں اور "ضمیر خیال" میں شامل ہونے سے رہ جاتے ہیں۔ اس کے باوجود بھی ہر ماہ اچھا تبصرہ کرنے والے بھی شامل ہوتے رہتے ہیں جیسا کہ اسی ماہ میں دیکھ لیں۔ سدرہ بانو نا گوری، اعجاز حسین سٹھار، اولیس شیخ، رانا محمد شاہد، نزاہت افشاں اور خود آپ نے کتنا خوب صورت تبصرہ بھیجا ہے۔ اس دفعہ آپی طاہرہ گلزار نظر نہیں آئیں۔ ڈاکٹر روبینہ نفیس ثاقب بھی "ضمیر خیال" میں جگمگا رہی تھیں۔ ڈاکٹر صاحبہ خداوند کریم آپ کو منافقوں سے دور رکھے اور آپ کے گھر میں اپنی رحمتوں کی برسات عطا فرمائے، آمین۔ "راندۂ درگاہ" جلد بازی کرنے والوں کے لیے ایک سبق آموز تحریر تھی۔ ویسے اسماء اور اس کے گھر والوں کو چاہیے تھا کہ وہ اسی وقت میڈیکل رپورٹ کی تصدیق کرا لیتے اور اس ڈاکٹرنی پر تو کیس کرا دینا چاہیے تھا اس مقدس اور سیریس پیشے میں ڈاکٹرنی جیسے نالائق انسان ہونے ہی نہیں چاہئیں۔ "ناسور" بھی بھرپور انداز میں اپنے سفر کی طرف گامزن ہے۔ "اپریل کی شخصیات" میں ہمیں گلوکار احمد رشدی کا تذکرہ بہت بھلا لگا کیونکہ گلوکارہ مالا بیگم اور احمد رشدی ہمارے فیورٹ سنگر ہیں۔ جنرل پرویز مشرف کے دور میں احمد رشدی کو بعد از وفات ستارۂ امتیاز سے نوازا گیا۔ اسی طرح 2004ء میں گلشن اقبال کراچی کی ایک اسٹریٹ کو احمد رشدی اسٹریٹ کے نام سے منسوب کر دیا گیا۔ "قائد کا ڈان" پڑھ کر ہماری معلومات میں خاصا اضافہ ہوا۔ شہروں کے نام بھی بہت دلچسپ اور معلومات افزا مضمون تھا۔ کچھ شہروں کی معلومات ایسی تھیں جن کے بارے میں ہم پہلے نہیں جانتے تھے۔ "شمشال سے تورخم" دلچسپ انداز میں اپنے سفر کی طرف رواں دواں ہے۔ اس قدر بھرپور مضمون پیش کرنے پر ندیم اقبال صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں۔ "سردار خان" ڈاکٹر ساجد امجد کی ایک بے مثال تحریر تھی۔ اس کے علاوہ موت کا کنواں، رقصِ آتش، خواب، انصاف اور ممتا قابلِ تعریف تحریریں تھیں۔"

☆ سیف اللہ نے ملک وال سے لکھا ہے۔ "مضمون "قائد کا ڈان" میں اتنا ذکر اخبار کا نہیں جتنا الطاف صاحب کا ہے۔ "ابھرتے ستارے" میں زریاب صاحب نے صرف کرکٹ پر توجہ دی ہے اگر دیگر شعبوں کے ابھرتے ستاروں پر بھی لکھا جاتا تو زیادہ بہتر تھا۔ "رقصِ آتش" ایک حادثہ ہے۔ مضمون نگار نے ایک اخباری خبر کو تفصیل دے کر مضمون بنا دیا ہے۔ شہروں کے نام پڑھے۔ سیالکوٹ کے بارے میں کہیں پڑھا تھا کہ سیال قوم کے قائدین نے اس شہر کی بنیاد رکھی تھی۔ بہر حال مضمون نگار بہتر جانتے ہوں گے۔ تحریر "دو نگینے" میں دلجیت مرزا کے گانوں میں لکھا کہ 'نی چتے دے بن گلے تینوں میرے ولے رب نے بنایا' حالانکہ صحیح یہ ہے کہ 'نی چٹے دے بند گلے تینوں کیڑے ولے رب نے بنایا' سچ بیانی "راندۂ درگاہ" نے چونکا دیا۔ دوسری سچ بیانی میں لکھا ہے کہ محترمہ نے گھر پر بچیوں کو قرآن پڑھانا شروع کر دیا لیکن اپنے بچے کو قرآن پڑھنے کے لیے مسجد بھیج دیا کیوں؟ اپنا بچہ بھی گھر پر پڑھ سکتا تھا۔"

☆ عبدالجبار رومی انصاری نے لاہور سے لکھا ہے۔ "پاکستان کی غیور اور بہادر قوم پاکستان کے لیے ہمیشہ جان دینے کو حاضر ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ یہ وہ قومی جذبہ ہے جس کے لیے ہم تن من دھن سے سرشار ہو جاتے ہیں اور اس میں ہم ایک فرد سے لے کر معاشرے تک ملی جوش و جذبے اور زندہ دلان کی مثال نظر آتے ہیں جو کہ بہت ہی اچھی بات ہے اور ایسا ہی ہونا چاہیے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم معاشرتی طور پر باہم رشتوں ناطوں سے نالاں دکھائی دیتے ہیں۔ ہم کسی سے پیچھے کیوں رہ جائیں اور کوئی ہمارے برابر کیوں آجائے وہی معراج انکل کے ادارے والی مختصر کہانی۔ سسٹم تو ہمارا بہت اچھا ہے اور اسلام سے بڑھ کر کوئی بھی سسٹم نہیں ہے پھر ہم بحیثیت قوم اتنے گئے گزرے بھی نہیں ہیں کہ خود کو ٹھیک نہ کر سکیں اس میں ہم ایک فرد ہو یا معاشرہ تو اپنے اچھے سسٹم کے مطابق اس میں ڈھال سکتے ہیں اور اپنے رشتے ناطوں کی اچھی طرح سے قدر بھی کر سکتے ہیں کیونکہ ہم پاکستان کی بہادر اور قومی جذبے سے سرشار قوم ہیں۔ متنازع قلم کار ترقی پسند تھا سو شہرت بھی ملی اور دنیا میں خود کو بھی منوایا۔ سعادت حسن منٹو پر یک کی تحریر عمدہ رہی۔ "ضمیر خیال" سے سدرہ بانو کا بھرپور تبصرہ زبردست رہا۔ اعجاز حسین سٹھار کی طرح سالانہ تجزیے کے ہم بھی منتظر رہے۔ باقی تبصرہ بہترین رہا۔ عبدالمجید جانی، منظر علی، وہاب احمد، عریشہ، عبدالحفیظ، عبدالرحمٰن، ظہیر احمد تبسم اور احسن راٹھور کے تنقید و تعریف لیے بہترین خطوط رہے اور ماشاء اللہ سے بھی نام پہلی دفعہ سامنے آئے۔ نئے تبصرہ نگاروں کو دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ باقی اختر ہمایوں، آفتاب احمد، اختر عباس شاہ، ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری۔ لیجیے ہماری آواز بھی آپ کے ساتھ [illegible]

نزابت افشاں کی عقیدت اور رانا محمد شاہد کی میانوالی روانگی کے ساتھ تبصرہ نگاری بھی عمدہ رہی اور اویس شیخ کا تبصرہ بھی بہت اچھا لگا۔ صدیوں کا پرانا کھیل ہوں میں، میں مر کے امر ہو جاتا ہوں، ذہین و فطین علی سردار جعفری کی سرگزشت بہت عمدہ رہی۔ جو اپنی ادبی محنت کے بل بوتے سب میں ممتاز شخصیت کا حامل تھا وہ سردار سخن تھا۔ ''ناسور'' میں تو بی تو دہشت انگیز سین میں بھیانک سازشوں سے بال بال بچا اور وزیرہ کے ذریعے باہر ہی اپنی باعزت رہائی کروالی۔ حق دار باغی نظام لوہار کی حق داری کا ثبوت عوام نے اس کے جنازے میں شریک ہو کر ہی دے دیا لیکن ایک دوست سو جھا سنگھ دوستی نہ نبھا سکا اور غداری کا لیبل لگوا کر اپنی ماں کے ہاتھوں قتل ہوا۔ تاریخی کہانی عمدہ رہی۔ ''شہروں کے نام'' مختصر حوالوں سے زبردست رہی۔ ''لیلیٰ حرف شیریں'' کے لیے تلوار و قرآن سے محبت سبحان اللہ۔ اے پاکباز شرف النساء تجھے سلام ہے۔ عورت پریشان نہیں ہے ممتا پریشان ہے۔ ''ممتاز'' زبردست تحریر تھی۔ ''موت کا کنواں'' موت کا کنواں ہی ہوتا ہے ساحرہ نے ایک ہوس پرست کی جان لے کر خود جان دے دی اور ناصر نے دوست نما دشمن کی جان لے لی سب برابر ہو گیا اور دکھوں نے ڈیرہ ڈال لیا۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' میں محبت بھی ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔ دلچسپی کا سامان لیے اب امریکا بھی پہنچ گئے۔ بہت عمدہ تحریر ہے۔ سیاحت اچھی لگ رہی ہے۔ قلم نگری کے دو نگینوں میں غلام حسین سے دلجیت مرزا بننے والے اور ثروت سے رخسانہ آرزو دو نور بننے والے ستاروں کا احوال و معلومات بہت اچھی لگیں۔ مشہور لوگوں کے خواب اور ان کے سچ ہونے پر حیران کن تحریر تھی۔ ''اپریل کی شخصیات'' میں اے حمید، احمد رشدی، عمر شریف کا احوال بھی اچھا رہا۔ کہانی کے کردار ایک ایک کر کے چلے گئے، تب شاہ کو سوال سوجا۔ آپ کے خیالوں میں کہیں میرا ابھی گزر تھا۔ اور پھر شاہ کی زندگی میں ایک عمدہ گزر ہوا ''راہِ پُرخار'' انصاف ایسے ہی ہوا کرتا ہے منور نے اپنے والد سے جو سلوک کیا تھا اس کے ساتھ بھی وہی ہوا پھر بے چارہ غفران انصاری وہاں کیا کر سکتا تھا۔ ''بیت بازی'' میں مجی رحمٰن، زویا اور سید محمد حسین کے شعر اچھے رہے۔''

☆ رضوانہ قریشی، راولپنڈی کوٹ ''دسمبر 16ء کے 'معبر خیال' میں شامل ایک خط پر سخت اعتراض ہے کہ اس خط میں مردوں کو کتے کی دم کہا گیا ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ وہ اس خط کو دوبارہ پڑھیں۔ خط میں صاف لکھا ہے کہ ''دین محمد جیسے مردوں کی مثال کتے کے دم کی ہے'' کتے کی دم ایک محاورہ ہے جو اردو میں رائج ہے۔ سرگزشت ایک انفارمیٹو میگزین ہے اور اسے پڑھے لکھے افراد ہی پڑھتے ہیں۔ اس لیے کہ معلومات سے استفادہ کرنا ہر ایک کی دلچسپی کا باعث نہیں ہے۔ آپ کہانیوں کے پرچے پڑھیں۔ آپ نے ایڈیٹر کو جاہل کہا، اعتراض اس پر ہونا چاہیے کیونکہ ہر پرچے کا مدیر تب مدیر بنتا ہے جب اس کے پاس کم سے کم 20-25 سال کا تجربہ ہو لیکن ایڈیٹر کو ہر قاری عزیز ہوتا ہے اس لیے کسی بات کا وہ برا نہیں مانتا۔ آپ کا پچھلا خط تب ملا تھا جب پرچہ پریس جا چکا تھا۔ امید ہے اب آپ کی سمجھ میں آ گیا ہوگا۔ آئندہ کہانیوں پر ہی تبصرہ بھیجیں۔ وقت پر خط مل جاتا ہے تو شائع ہوتا ہے ورنہ ضائع کر دیا جاتا ہے۔''

☆ امیر حمزہ اشرف بستی کوٹ رب نواز ملتان سے لکھتے ہیں۔ ''ہمارے پیارے ملک پاکستان کی اساس دینِ اسلام ہے لیکن ہم اپنے اردگرد دیکھیں تو یہ کہیں سے بھی اسلامی معاشرہ نظر نہیں آتا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو بھٹکنے سے بچائے اور اسلام کے سنہری اصول اپنانے کی توفیق عطا کرے (آمین)۔ جو لوگ وقت کی آگ سے ڈر جاتے ہیں انہیں بھولنا نہیں چاہیے کہ کندن بننے کے لیے آگ پر تپنا ضروری ہے۔ واہ معراج انکل نے بہت خوب صورت انداز میں حوصلہ بڑھایا۔ یک کی اچھی لگی۔ جلدی سے ''معبر خیال'' میں پہنچے اس بار باجی طاہرہ گلزار غیر حاضر تھیں۔ بھائی احمد رضا انصاری سے ہم اتفاق کرتے کہ نئے نئے موضوعات پر مضمون ہونے چاہئیں اب۔ بھائی رانا محمد شاہد ہر ایجاد ہمارے فائدے اور سہولت کے لیے ہے اب وہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم اس کا استعمال پوزیٹو کرتے ہیں یا نگیٹو۔ بھائی عبدالجبار رومی انصاری آپ بہت اچھا لکھتے ہیں۔ فقیر غلام حسین ضیاء، قیصر خان، وہاب احمد، غلام سبحانی، انور عباس شاہ، آفتاب نصیر احمد، اویس شیخ، نزابت افشاں، اعجاز حسین سحاب، سدرہ بانو تاگوری، ندیم اقبال اور سعید احمد حامد کے خلوص نامے بھی خوب رہے۔ سب سے پہلے ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی معاشرتی مسائل اور مکروہ چہروں سے پردہ اٹھاتی تحریر ''ناسور'' پڑھی۔ واہ مزہ آ گیا بہت پُرایکشن آغاز ہے۔ اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار ہے۔ ندیم اقبال کی ''شمشال سے ٹورنٹو'' کی بات ہی الگ ہے سفرنامہ پڑھتے ہوئے بے ساختہ دل میں ندیم اقبال اور ان کے ساتھیوں سے ملنے کی خواہش مچلتی ہے۔ ''بے رحم'' میں خلیل بے رحم ہی تھا۔ زینت ایک عظیم عورت تھی جس نے خلیل کی سگی ماں کی طرح پرورش کی اعلیٰ تعلیم دلائی لیکن صلہ کیا ملا؟ خیر مائیں صلہ تھوڑی نہ مانگتی ہیں وہ تو ہر حال میں اولاد کا سکون چاہتی ہیں۔ ''میری اجالا'' میں تسنیم کے کردار سے سخت نفرت ہوئی۔ فضیلہ بھی انتقام لینے میں اس قدر اندھی ہو گئی کہ رشتوں کی قدر ہی کھو دی۔ سائرہ اور اجالا کی موت ''بیت بازی'' میں مجی رحمٰن اور انیس انصاری کے اشعار ٹاپ پر تھے۔ باقی رسالہ زیرِ مطالعہ ہے۔''

تاخیر سے موصول خطوط:

ملک ثاقب شاہ تنولی ایڈووکیٹ، حویلیاں ایبٹ آباد۔ رانا تنویر علی، سینٹرل جیل ملتان۔ عبداللہ شجاع سندھی، لاہوری محلہ لاڑکانہ۔ آصف خان، لاہور۔ ناصر جمشید، سرگودھا۔ واصف علی، ملتان۔ شہباز تنولی، کراچی۔

ادیبہ

ڈاکٹر ساجد امجد

ایسے دور میں جب عورت کی زندگی چار دیواری تک محدود ہو، نہ اسے باہر کی دنیا کا پتا ہو اور نہ اسے اس سے کوئی سروکار ہو، صرف کھانا بنانا اور بچوں کی پرورش کرنا ہی اس کی زندگی کا مقصد ہو اور وہ اسی میں خوش ہو تو دنیا یہی سمجھتی ہے کہ عورت کی یہی دنیا ہے لیکن اس چھوٹی سی بچی نے اس تاریک دور میں بغاوت کا پرچم بلند کردیا کہ وہ اس طرح کی گھٹن بھری زندگی جینا نہیں چاہتی. اپنے حدود میں رہ کر کچھ کر دکھانا چاہتی ہے. اس نے احساس کو اظہار کے سانچے میں ڈھال کر عورت کی بنجر آنکھوں کو شادابی عطا کرنے کی سعی کی. قلم کو بغاوت کا پرچم بنایا اور ایسی ایسی تحریریں پیش کیں کہ لوگ کہنے پر مجبور ہوگئے کہ وہ الفاظ کی ساحرہ ہے. وہ الفاظ کے نشتر سے گھٹن بھرے ماحول کا پوسٹ مارٹم کرنے والی ہے. اس کی تحریروں سے اردو ادب میں نت نئے اضافے ہورہے ہیں. وہ عورتوں کو گھٹن بھری زندگی سے باہر لانا چاہ رہی ہے. اس کی اسی خوبی نے اسے اردو ادب میں معتبر مقام عطا کیا.

اردو ادب کا معتبر نام ایک بڑی قلمکار کی زندگی کے مخفی گوشے

بزرگ نے مکان کے اوپری حصے میں جانے کے لیے آدھا زینہ طے کیا تھا کہ بچے نے نیچے سے پکارا ''بابا''۔ بزرگ اس آواز کو سنتے ہی زینے سے نیچے اتر آئے۔ بچے کو پیار کیا اور پھر اوپر جانے کے لیے سیڑھیاں طے کرنے لگے۔ بچے کو تکرار میں مزہ آنے لگا تھا۔ وہ بار بار پکارتا ''بابا'' اور وہ بزرگ پیرانہ سالی کے باوجود ہر مرتبہ نیچے اتر کر آتے اور اسے پیار کرتے۔

دالان میں ان بزرگ کی پوتی مشتاق فاطمہ اپنی بیٹی سیدہ خاتون کو گود میں لیے بیٹھی تھیں اور یہ تماشا دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے وہیں سے بچے کو ڈانٹا ''کیوں بابا کو تنگ کر رہے ہو۔ ادھر آؤ۔''

بچے کو ماں کا ڈانٹنا ایسا ناگوار ہوا کہ منہ بسور کر رونے لگا اور دوڑتا ہوا دالان میں آگیا۔ بزرگ بھی اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے دالان میں آگئے۔

''مشتاق فاطمہ، یہ بڑی غلط بات ہے۔ تم نے بچے کو رلا دیا۔ اچھا خاصا کھیل رہا تھا۔''

''کھیل کہاں رہا تھا۔ آپ کو تنگ کر رہا تھا۔ کتنی مرتبہ آپ سیڑھیاں چڑھے اترے ہوں گے۔ اس کا تو کھیل ہوا آپ بیمار پڑ جائیں گے۔''

''اچھا ہے اس طرح ہماری بھی ورزش ہو جائے گی۔''

بچہ اس دوران خاموش ہو گیا تھا اور دو بڑوں کی باتیں غور سے سن رہا تھا۔ وہ تو خاموش ہو گیا تھا لیکن ماں کی گود میں بیٹھی ہوئی سیدہ نے اچانک رونا شروع کر دیا۔

''اب ان محترمہ کو کیا ہو گیا۔''

''پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔ کل سے روئے جا رہی ہے۔''

''ادھر لاؤ مجھے دو۔ آج کل کی عورتیں بچے کو بہلانا ہی نہیں جانتیں۔'' بزرگ نے بچی کو اپنی گود میں لے لیا اور ٹہلنے لگے لیکن بچی کو ایسی ضد چڑھی تھی کہ چپ ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

''سیدہ اگر تم چپ ہو جاؤ تو ہم تمہیں شعر سنائیں

معزز قارئین آپ سے التماس ہے کہ ہم www.urdusoftbooks.com پر آپ حضرات کے لیے مسلسل اچھی کُتب فراہم کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں جس کے لیے وقت اور رقم دونوں صرف ہوتے ہیں جس کی غرض سے ہماری اِس ویب سائٹ کُچھ سپانسر اشتہارات لگائے گئے ہیں جب ویب سائٹ وزٹرز اُن اشتہارات میں سے کسی اشتہار پر کلک کرتے ہیں تو ویب سائٹ کو تھوڑی سی آمدن حاصل ہوتی ہے، یہ آمدن ویب سائٹ کے اخراجات کو برداشت کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے اس لیے آپ حضرات سے گزارش ہے کے اپنے Google Chrome یا Mozilla Firefox کی Adblocker Extension کو Pause کردیں یا صرف ہماری ویب سائٹ کے لیے Pause کردیں۔ نیچے نظر آنے والی تصویر میں دکھایا گیا ہے کے Adblocker کے Pause ہونے یا انسٹال نہ ہونے کی صورت میں اشتہارات **Green Box** والی جگہ پر ظاہر ہوں گے۔

گے۔" بزرگ نے کہا اور بچی واقعی چپ ہو گئی۔ "مشتاق فاطمہ دیکھا تم نے کیسی سخن فہم ہے ہماری سیدہ فوراً چپ ہو گئی۔"

"اب سنائیے شعر۔"

"ہاں ہاں سنائیں گے شعر کیا پوری نظم سنائیں گے لو بھئی سیدہ سنو!

سیدہ کیسی پیاری بچی ہے
صورت اچھی سمجھ بھی اچھی ہے
ہے ابھی دو برس کی خیر سے جان
پر ہے اچھے برے کی بہت پہچان
اوپری شکل سے ہے گھبراتی
ہے مگر جلد سب سے مل جاتی
پر ذرا بھائی سے ہے لاگ اس کو
کیونکہ اوپر تلے کے ہیں دونوں
پس جہاں بھائی ماں کے پاس آیا
اور وہیں اس نے ہاتھ پھیلایا
جا لپٹتی ہے دوڑ کر ماں سے
بھائی سے کہتی ہے ہٹو یہاں سے
یوں تو تھی جب ہی پیاری اس کی زباں
جب کہ کرنے لگی تھی وہ غوں غاں
پھر تو آتا ہے اس پر اور بھی پیار
ہوئی جاتی ہے پھر جس قدر ہشیار
نہیں منہ سے نکلتے پورے بول
بولتی ہے سدا ادھورے بول

بزرگ کی طبیعت اس وقت کچھ ایسی حاضر تھی کہ یہ سلسلہ نہ جانے کب تک چلتا کہ ملازم نے کسی مہمان کی آمد کی اطلاع دی۔

"لو بھئی سیدہ کو سنبھالو۔ اوپر دیوان خانے میں ڈپٹی صاحب ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔"

"دادا حضور، ان اشعار کو کسی جگہ لکھ لیجیے گا۔ میری سیدہ بڑی ہو گئی تو پڑھ کر خوش ہو گی۔" مشتاق فاطمہ نے کہا۔

"دیکھو جتنا یاد رہا لکھ کر محفوظ کر لیں گے۔" بزرگ نے کہا اور سیڑھیاں چڑھ کر بالا خانے کے اس بڑے دیوان خانے میں پہنچ گئے جہاں مہمان ان کے منتظر تھے۔

یہ بزرگ کوئی اور نہیں پانی پت کے مرد قلندر، مسلمانوں کے خیر خواہ، مسدس مد و جزر کے خالق، شاعری کے بانی سرسید کے دست راست مولانا الطاف حسین حالی تھے اور مشتاق فاطمہ ان کے سب سے بڑے بیٹے خواجہ اخلاق حسین کی بیٹی تھیں جو حالی کے بھتیجے خواجہ غلام الثقلین سے بیاہی گئی تھیں وہ جب بھی رہنے آتیں تو نیچے کے مکان میں دادی کے پاس آ کر ٹھہرتیں۔ غلام السیدین بڑا بیٹا تھا اس لیے اپنا یہ نواسہ حالی کو بہت عزیز تھا اور اس کی ضدیں پوری کر کر کے خوش ہوا کرتے تھے۔ مولانا کو یوں بھی بچوں سے بہت لگاؤ تھا۔ نوکروں کے بچوں تک کی دلداری کیا کرتے تھے۔ غلام السیدین تو ان کی چہیتی پوتی کا بیٹا تھا۔ مشتاق، فاطمہ کو وہ بہت چاہتے تھے اور ان کی تعلیم و تربیت پر ان کی خاص توجہ تھی اور ان کے شوق کو دیکھ کر انہیں لکھنا پڑھنا بھی سکھایا تھا جو اس دور میں لڑکیوں کے لیے معیوب سمجھا جاتا تھا لیکن حالی عورتوں کی تعلیم کے حق میں تھے۔ انہوں نے اس مقصد کے حصول کے لیے پانی پت میں اپنے گھر سے ملے ہوئے ایک مکان میں لڑکیوں کا ایک چھوٹا سا اسکول بھی کھولا تھا۔ یہ اسکول چوتھی جماعت تک کا تھا اور ان کے عزیزوں اور دوستوں کی لڑکیاں اس میں پڑھتی تھیں۔

☆......☆

مولانا حالی کی بڑی خواہش تھی کہ زندگی کے اس آخری زمانے میں سکون میسر آ جائے تاکہ جو کام ان کے ذہن میں ہیں انہیں انجام دے سکیں۔ پانی پت میں عزیز و اقارب کے جھرمٹ میں رہتے ہوئے یہ فرصت میسر نہیں آ سکتی تھی وہ کچھ دنوں کے لیے پانی پت سے باہر جا کر رہنا چاہتے تھے۔ ان کی اس خواہش کو دیکھتے ہوئے مولوی عبدالحق نے انہیں اورنگ آباد بہت اصرار سے بلایا لیکن حالی نے کمزوری اور ضعیفی کو عذر بنا کر مولوی عبدالحق کو خط لکھ دیا۔

"الحمدللہ آپ اورنگ آباد میں خوش ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ خوش و خرم رکھے۔ میرا بھی بے اختیار جی چاہتا ہے کہ چند روز وہاں آ کر رہوں مگر پیرانہ سالی میں اس قدر دور دراز مسافت پر کسی دوست کے پاس جا کر رہنا یا تو اس کو بیمار داری کی تکلیف دینی ہے یا اس پر تجہیز و تکفین کا بار ڈالنا ہے۔"

یہ قصہ تو ختم ہوا لیکن فرید آباد پانی پت سے قریب تھا لہٰذا اپنے ایک ہم وطن ڈاکٹر لیاقت کی دعوت پر فرید آباد چلے گئے۔ یہاں رہ کر انہوں نے اپنے عربی، فارسی کلام اور نثر کو ترتیب دیا اور اس کا دیباچہ تحریر کیا۔

وہ فرید آباد میں تھے کہ مشتاق فاطمہ نے ایک اور بچی کو جنم دیا۔

"8 اگست 1913ء کو آپ ایک اور نواسی کے نانا بن گئے ہیں۔ آپ کی چہیتی سیدہ خاتون کی ایک اور بہن دنیا میں آگئی ہے۔ اس کا نام مصداق فاطمہ رکھا گیا ہے۔ آپ اس کی صحت کے لیے دعا کریں۔ بچی بہت کمزور پیدا ہوئی ہے۔ ناک نقشے کی اچھی ہے۔ آپ پانی پت آئیں گے تو اسے دیکھ کر خوش ہوں گے۔"

مولانا حالی پانی پت میں قیام پذیر تھے لیکن کمزوری اور ضعیفی نے بے حال کر رکھا تھا۔ خواجہ تصدق حسین کو انہوں نے ایک خط میں لکھا۔

"عمر کے دن ختم ہوتے چلے جاتے ہیں اور کوئی کام ضروری و غیر ضروری سرانجام نہیں دے سکتا۔ سب سے ضروری کام اس وقت یہ تھا کہ دنیا کے تمام تعلقات قطع کر کے جو چند انفاس زندگی کے باقی ہیں ان میں خدا کی یاد کی جائے مگر اپنے کلام کا چھپوانا میرے حق میں شیطانی وسوسہ ہو گیا ہے۔ ہرگز طبیعت گوارا نہیں کرتی کہ جو کلام اب تک شائع نہیں ہوا اور جس کے چھپوانے اور شائع کرنے کی میرے بعد کسی سے امید نہیں ہے اس کو یونہی چھوڑ کر چلا جاؤں۔"

فرید آباد میں بھی انہیں عدیم الفرصتی کا سامنا تھا۔ وہاں بھی لوگ دن رات ملنے آیا کرتے تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنے عربی، فارسی کلام اور نثر کو ترتیب دیا اور اس کا دیباچہ تحریر کیا۔ اب اسے پریس میں جانا رہ گیا تھا کہ بیمار پڑ گئے اور پانی پت واپس آنا پڑا۔

مصداق فاطمہ کو دیکھنے کی آرزو ایسی تھی کہ آتے ہی اس کے بارے میں پوچھا۔ مشتاق فاطمہ بچی کو لے کر پہنچ گئیں۔ بڑی بہن سیدہ خاتون بھی چارپائی سے لگی کھڑی تھیں۔ مولانا تو مولود مصداق فاطمہ کو گود میں لے کر دیکھتے رہے۔

"تم نے ٹھیک لکھا تھا۔ یہ تو بہت نرم و نازک ہے لیکن اس کی پیشانی بتا رہی ہے کہ یہ بہت ذہین ہوگی۔ اس کا خیال رکھنا۔" حالی نے کہا اور پھر سیدہ سے مخاطب ہوئے۔ "اب تم اس کی بڑی بہن ہو گئی ہو۔ باجی ہو اس کی۔ اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھنا۔ پھر ہم تمہاری طرح اس پر بھی ایک نظم لکھیں گے۔"

مشتاق فاطمہ انہیں دیکھ کر فکرمند ہو گئی تھیں۔ وہ بے حد کمزور ہو گئے تھے۔ مختلف بیماریوں میں گھرے ہوئے تھے۔ ان کی صحت تو جوانی ہی سے خراب تھی۔ بڑھاپے نے ان بیماریوں کو خطرناک بنا دیا تھا۔

مشتاق فاطمہ کی یہ فکرمندی بلاوجہ نہیں تھی۔ بہت جلد ان کے اندیشے صحیح ثابت ہونے لگے۔ ان کے دماغ کے اعصاب پر کچھ ایسا اثر ہوا کہ بات چیت کرنے سے معذور ہو گئے۔ کوئی بات کرتا تو سمجھ جاتے، چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نظر آتی لیکن جب تک جواب دماغ سے زبان تک آئے اعصاب جواب دے دیتے اور مسکراہٹ بے بسی میں بدل جاتی۔

آخر 31 دسمبر 1914ء کو علم و ادب کا یہ گوہر گراں مایہ اس جہان فانی سے رخصت ہو گیا۔

☆......☆

مصداق فاطمہ کی دیکھ بھال بڑی توجہ سے کی جا رہی تھی۔ غلام السیدین اور سیدہ خاتون تو جیسے اس کے عاشق تھے۔ غلام السیدین تو اسے گود سے اتارتا ہی نہیں تھا اسکول سے آنے کے بعد دن بھر اسے گود میں لیے ٹہلتا رہتا تھا۔ سیدہ پر لکھی گئی نظم میں اس کا نام ڈال کر اسے سناتا رہتا تھا۔

مصداق کیسی پیاری بچی ہے
صورت اچھی سمجھ بھی اچھی ہے

بچوں کی یہ محبت اسی طرح چل رہی تھی۔ مصداق فاطمہ دو سال کی ہو گئی تھی۔ اب اس نے کچھ جان بھی پکڑ لی تھی کہ وہ ہو گیا جس کا وہم و خیال بھی نہیں تھا۔ اس کے والد غلام الثقلین پر دل کا دورہ پڑا اور دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہہ دیا۔

مولانا حالی کے انتقال کو ابھی سال ڈیڑھ سال ہی گزرا تھا کہ مشتاق فاطمہ کو اس دوسرے بڑے صدمے کا سامنا کرنا پڑا۔ حالی کی تو خیر عمر تھی لیکن غلام الثقلین کی تو جوانی کی موت تھی۔ ابھی بیالیس سال کی عمر تھی کہ بچوں کو چھوڑ کر چلے گئے۔

اب پانچ بچوں کی ذمہ داری مشتاق فاطمہ کے سر پر آگئی۔ شوہر کی ناوقت موت اور پانچ بچوں کی ذمہ داری نے انہیں بیمار ڈال دیا۔

اس گھرانے کا رہن سہن قصباتی تھا۔ مشترکہ خاندان تھا۔ سب مل جل کر رہتے تھے۔ گھریلو کاموں میں مددگار تک خاندان کے افراد کی طرح رہتے تھے۔

غلام الثقلین کی وفات کے ساتھ ہی ان کے چھوٹے

بھائی غلام السبطین نے اپنے یتیم بھتیجوں بھتیجیوں کی تعلیم کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔

اب تمام اُمیدیں غلام السیدین سے وابستہ تھیں کہ وہ پڑھ لکھ کر اپنی ماں کا سہارا بن جائیں۔ ان کی تعلیم بہترین خطوط پر کی جانے لگی۔

اس خاندان میں حالی کے اثر سے عورتوں کی حیثیت عام مسلم شرفاء کے گھرانوں سے بہت مختلف تھی۔ وہ پڑھی لکھی صاحب رائے ہوتی تھیں۔ مذہبی فضا تھی مگر قدامت پرستی نہیں تھی۔ پڑھنے کا چرچا تھا لہٰذا جب مصداق فاطمہ پڑھنے کی عمر کو پہنچی تو گھر میں رہ کر لکھنا پڑھنا سیکھنے لگی۔

لکھنے پڑھنے کا شوق ایسا تھا کہ بہت جلد لکھنا سیکھ گئیں۔ گھر میں بہت سا ایسا مواد تھا جو اس کے مطالعے میں رہنے لگا۔ حالی کی کتابیں بھی تھیں۔ کئی رسائل بھی گھر آتے تھے۔ وہ ان سے جی بہلانے لگی۔ کبھی کبھی اس کے دل میں آتا تھا کہ وہ بھی مضامین لکھے لیکن ابھی یہ سب اس کی استطاعت سے دور تھا۔ دونوں بہنیں آپس میں مشورے ضرور کرتی تھیں لیکن ہمت کسی میں نہیں تھی کہ قلم اٹھائے۔

''باجی یہ کون لوگ ہوتے ہیں جو اتنے اچھے مضامین لکھ لیتے ہیں؟'' مصداق نے اپنی بہن سیدہ سے پوچھا۔

''تم مولانا حالی کی نواسی ہو کر ایسی بات کر رہی ہو۔ بھئی یہ لوگ ہماری تمہاری طرح انسان ہی ہوتے ہیں۔ نانا جان کی کتابیں دیکھو۔ انہوں نے تو نئے ادب کی بنیاد رکھ دی ہے۔''

''ان کی کتابیں تو میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ مجھے تو رسالوں میں چھپے ہوئے مضامین اچھے لگتے ہیں۔''

''تمہارا مطلب ہے افسانے؟''

''جی باجی۔''

''ان کا لکھنا کون سا مشکل ہے۔''

''مشکل نہیں تو آپ کیوں نہیں لکھتیں۔ آپ تو مجھ سے بڑی ہیں۔''

''بڑے چھوٹے سے کچھ نہیں ہوتا۔ ویسے میں نے کئی چھوٹے چھوٹے مضامین لکھ کر محفوظ کر لیے ہیں۔ کسی وقت تمہیں دکھاؤں گی۔''

یہ باتیں دونوں بہنوں کے درمیان روز ہی ہوا کرتی تھیں۔

غلام السیدین کی تعلیم مکمل ہو گئی تھی۔ علی گڑھ سے خط آیا تھا کہ انہیں مسلم یونیورسٹی کے ٹیچرز کالج میں ملازمت مل گئی ہے۔

کچھ دنوں بعد وہ پانی پت آئے اور اپنے خاندان کو اپنے ساتھ علی گڑھ لے گئے۔ سیدہ خاتون اور مصداق فاطمہ کو علی گڑھ کے عبداللہ گرلز اسکول کی ابتدائی کلاسوں میں داخل کرا دیا۔ اس وقت طریقہ یہ تھا کہ درمیان میں پردہ ڈال دیا جاتا تھا۔ استاد پردے کے پیچھے بیٹھ کر پڑھاتا تھا۔ عصمت چغتائی بھی ان دنوں وہیں پڑھتی تھیں۔ دونوں میں خوب دوستی ہو گئی تھی۔ عصمت چغتائی بھی ادبی گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کی صحبت نے مصداق فاطمہ کو بھی نئی نئی کتابوں سے آشنا کیا۔ خود سیدین صاحب نے بھی گھر میں چھوٹی سی لائبریری بنا لی تھی۔ مصداق فاطمہ کی رسائی ادبی کتابوں تک ہونے لگی۔

مشتاق فاطمہ عرصہ سے بیمار چلی آ رہی تھیں۔ علی گڑھ میں علاج کی ہر سہولت موجود تھی لیکن بہترین علاج کے باوجود ان کا انتقال ہو گیا۔ یہ ایسا سانحہ تھا جس نے پورے خاندان کو ہلا کر رکھ دیا۔ دونوں بہنوں کی علی گڑھ میں تعلیم کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اس وقت مصداق فاطمہ کی عمر چودہ سال تھی۔ والدہ کی موت کا غم سب بچوں کو تھا لیکن مصداق سب سے چھوٹی تھی۔ اس نے اس جدائی کو بری طرح محسوس کیا۔ اس نازک وقت میں سیدہ خاتون کے کانوں میں مولانا حالی کے الفاظ گونجے۔ انہوں نے اسے مخاطب کر کے کہا تھا۔ ''اب تم اس کی بڑی بہن ہو گئی ہو۔ باجی ہو اس کی۔ اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھنا۔''

سیدہ خاتون نے اپنے آپ کو مصداق کے لیے وقف کر دیا۔ اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی۔ اسے سمجھاتی، مصداق کو یہ محسوس ہی نہیں ہونے دیا کہ اس کی ماں اس جہان سے اٹھ گئی ہے۔

اس کی ہمت افزائی ہوئی تو پڑھنے کے شوق نے اسے پھر بے قرار کیا۔ اس نے پانی پت میں لڑکیوں کے اسکول سے مڈل کا امتحان نہایت اچھے نمبروں سے پاس کیا۔

اس دور میں کسی لڑکی کا پانی پت جیسے پسماندہ قصبے میں مڈل پاس کرنا بھی بڑی بات تھی۔

ابھی وہ خود کو سنبھال ہی رہی تھی کہ اس کی سب کچھ اس کی بڑی بہن سیدہ خاتون عین جوانی میں انتقال کر گئیں۔

وہ بھری دنیا میں اکیلی رہ گئی۔ سیدہ خاتون صرف بہن نہیں اس کی رازدار بھی تھی۔ وہ دل کی ہر بات بہن سے کر لیا کرتی تھی۔ اب وہ سماعت ہمیشہ کے لیے اس سے

روٹھ گئی۔ اس سے پہلے کہ اس کے یہ غم اس کے اندر اتر جاتے اور اسے ہمیشہ کے لیے کسی نفسیاتی عارضے میں مبتلا کر دیتے۔ اس نے قلم سنبھالا اور چھوٹے چھوٹے مضامین لکھنے لگی۔ غلام السیدین پانی پت آئے اور اس کے ان مضامین کو دیکھا تو بہت خوش ہوئے۔

"تم تو بہت اچھے مضامین لکھتی ہو۔"

"بھائی جان، دل بہلانے کو لکھ لیتی ہوں۔"

"اس طرح لکھ لکھ کر رکھنے سے کیا فائدہ۔ اسے کہیں شائع کراؤ۔"

"مجھے کیا خبر کس طرح شائع کرائے جاتے ہیں۔"

"یہ مضامین مجھے دو۔ انہیں میں شائع کراؤں گا۔"

وہ ان اصلاحی اور مذہبی نوعیت کے مضامین کو اپنے ساتھ لیتے گئے۔ کچھ دنوں بعد صداق کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس کا مضمون "تہذیب نسواں" میں شائع ہوا ہے اور پھر اس کے مضامین نور جہاں اور عصمت میں بھی شائع ہونے لگے۔

جب اس کے لکھنے کا چرچا ہوا تو ایک روز اس کا چچا زاد بھائی خواجہ احمد عباس اس کے پاس آیا۔ احمد عباس اس سے ایک سال چھوٹا تھا۔ اسے ڈراما لکھنے اور اسٹیج کرنے کا شوق تھا۔ اس نے صداق سے فرمائش کی کہ وہ کوئی ڈراما لکھیں۔

"میں نے تو کبھی ڈراما لکھا ہی نہیں۔"

"اس میں کون سی مشکل ہے۔ ڈرامے کے معنی ہیں کرنا یا کر کے دکھانا۔ جو مضامین تم لکھتی ہو انہیں مکالموں کے حوالے کر دو۔ چند کرداروں کے ذریعے وہ مسائل بیان کر دو جو تم مضامین میں بیان کرتی ہو۔ ڈراما ہو جائے گا۔"

صداق پھر بھی مطمئن نہیں ہوئی۔ اس نے کوئی ڈراما لکھنے سے قبل چند ڈرامے پڑھ ڈالے اور پھر لکھنے بیٹھ گئی۔ اس نے ایک ڈراما "عفت" کے نام سے لکھا۔ یہ ڈراما تعلیم نسواں کے مسائل پر لکھا گیا تھا۔ اسے مسلم گرلز ہائی اسکول میں اسٹیج کیا گیا۔

اس ڈرامے کو پذیرائی ملی تو اسے ہمت ہوئی۔ اس نے ایک مزاحیہ ڈراما "الٹا منتر" کے نام سے لکھا۔ یہ بھی پانی پت حالی مسلم گرلز ہائی اسکول میں اسٹیج کیا گیا۔ اس کے بعد اس نے لگاتار چھ ڈرامے لکھے۔

غلام السیدین برابر اپنی محبت ان پر نچھاور کر رہے تھے۔ اس کے لکھنے کے شوق سے بھی بہت خوش تھے اور اچھے مشوروں سے نوازتے رہتے تھے۔

اس عرصے میں السیدین صاحب کی شادی ہو گئی تھی۔ صداق فاطمہ پانی پت میں اکیلی تھی لہٰذا وہ علی گڑھ ان کے پاس آ کر رہنے لگی۔

علی گڑھ کی ادبی دنیا میں اس کے شوق مطالعہ نے انگڑائی لی۔ دم گھر میں رہ کر مطالعہ کے ذریعے اپنی قابلیت بڑھاتی رہی اور لکھتی رہی۔

☆......☆

ڈاکٹر عابد حسین ان ارکان ثلاثہ میں تھے جنہوں نے جامعہ ملیہ کی تعمیر نو کی اور اسے مسلمانوں کا ایک مثالی ادارہ بنایا۔ ان کی شادی کم عمری میں اپنی چچا زاد بہن شفاعت فاطمہ سے ہو چکی تھی۔ کچھ دن ساتھ رہ کر یہ دونوں الگ الگ زندگی گزار رہے تھے۔ یہ حالات اتنا طول پکڑ گئے تھے کہ اب تو ان کے والد بھی یہ چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا دوسری شادی کر لے۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کا بیٹا ان کی بات نہیں مانے گا کیونکہ پہلی شادی بھی انہوں نے کرائی تھی جو کامیاب نہ ہو سکی لہٰذا انہوں نے عابد حسین کے دوستوں کو ان کے پیچھے لگا دیا کہ وہ ڈاکٹر صاحب کو دوسری شادی کے لیے مجبور کریں۔

ڈاکٹر صاحب کسی طرح تیار نہیں ہو رہے تھے لیکن دوست بھی کہاں پیچھا چھوڑنے والے تھے۔ تقاضے کرتے کرتے انہیں یہاں تک لے آئے کہ ڈاکٹر صاحب نے معاملہ ان پر چھوڑ دیا۔ "اچھا بھائی تم ہی کوئی لڑکی تلاش کر لو۔ خاندان مناسب ہوا تو میں تمہاری یہ خواہش پوری کر دوں گا۔"

ان کے دوستوں میں غلام السیدین بھی تھے۔ دوسرے دوستوں کو معلوم تھا کہ غلام السیدین کی ہمشیرہ ان کے ساتھ رہتی ہیں۔ ان کی شادی نہیں ہوئی ہے۔ وہ لڑکی یتیم بھی ہے۔ اگر وہاں رشتہ بھیجا جائے تو کامیابی ہو سکتی ہے۔ خاندانی اعتبار سے بھی یہ خاندان کسی سے پیچھے نہیں۔ الطاف حسین حالی کا خاندان ہے۔ عابد صاحب بھی انکار نہ کر سکیں گے۔

ان کے دوستوں نے ڈاکٹر عابد حسین کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ وہ سیدین صاحب کی چھوٹی بہن صداق فاطمہ کو پیام دیں۔ عابد صاحب اب بھی تیار نہیں ہو رہے تھے۔ پھر قدرے تامل کے بعد پیام دے دیا۔ سیدین صاحب نے اپنی بیوی سے ذکر کیا۔ انہوں نے تو شاید شوہر کی

خوشنودی کے لیے اس رشتے کو قبول کرلیا لیکن خاندان والوں کو بہت سے اعتراضات تھے۔

"دونوں کی عمروں میں بہت فرق ہے۔"

"ایک بیوی نام ہی کو سہی مگر پہلے سے موجود تو ہے۔"

"مالی حیثیت بھی کوئی ایسی قابلِ ذکر نہیں۔"

"ظاہری شکل وصورت بھی بس واجبی سی ہے۔"

"ہماری مصداق کنواری ہے اور وہ پہلے سے شادی شدہ۔"

"تم پر بہن ایسی بھاری ہے کہ دوحاجو کو بیاہ دو۔"

"ہمیں تو یہ رشتہ ہرگز قبول نہیں ویسے مصداق سے اور پوچھ لو۔"

اتنے اعتراضات کے بعد سدین صاحب نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ فیصلہ مصداق پر چھوڑ دیا جائے۔ اس سے پوچھا گیا تو وہ بھی کشمکش میں پڑگئی۔

وہ اپنے بھائی کے ان دوست کی تعریف اکثر سنتی تھی۔ عابد صاحب ادیب تھے، مترجم تھے، تعلیم یافتہ تھے۔ عمروں کے فرق کو اس نے اہمیت نہیں دی۔ اس نے سوچا تو یہی سوچا کہ اگر ایسا قابل اور نامور انسان اس سے شادی کرنا چاہتا ہے تو یہ اس کی خوش قسمتی ہے۔ اس نے بھاوج کو بتایا کہ اسے یہ رشتہ قبول ہے۔

اس رضامندی کے بعد سوال یہ تھا کہ عابد صاحب کے گھر سے باقاعدہ رشتہ لے کر کون آئے گا۔ عابد صاحب کی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ گھر میں والد تھے اور ایک چھوٹی بہن۔ عابد صاحب کی پہلی بیوی ان کے سگے چچا کی بیٹی تھیں لہٰذا والد خاندانی رواداری کا پاس کرتے ہوئے سامنے آنا نہیں چاہتے تھے اور یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ عابد صاحب نے یہ شادی اپنی مرضی سے کی ہے۔ وہ اس میں شریک نہیں ہیں۔ ادھر سدین صاحب اس بات پر اڑ گئے کہ عابد صاحب کی طرف سے کوئی تو بڑا ہو جس کے سامنے شادی کی تاریخ وغیرہ طے ہو۔

عابد صاحب کی پہلی بیوی خاندان کی تھیں اس لیے وہ اس شادی کی ہوا بھی کسی کو نہیں لگنے دینا چاہتے تھے۔ صرف والد تھے جو اس شادی کے حق میں تھے لیکن وہ سامنے آنے سے گریز کر رہے تھے۔ لہٰذا یہ طے ہوا کہ رات کے اندھیرے میں خاموشی سے سدین صاحب، عابد صاحب کے گھر جائیں اور ان کے والد سے مل کر تشفی کرلیں۔ وہ یہ باور کرادیں کہ عابد صاحب ان کی مرضی سے شادی کررہے ہیں۔

اس تگ و دو کا مطلب صرف اتنا تھا کہ یہ شادی بڑوں کے علم میں ہو کہ اگر کل کلاں کو کوئی بات ہو تو گواہ موجود ہوں۔

سدین صاحب چند دوستوں کے ہمراہ عابد صاحب کے گھر گئے اور ان کے سامنے بات ہوگئی۔ ان کی رضامندی کے لیے یہی بہت تھا کہ ان کے بیٹے کی شادی مولانا حالی کے خاندان کی ایک لڑکی سے ہو رہی ہے۔

7 اپریل 1934ء کو مصداق فاطمہ کی شادی ڈاکٹر عابد حسین سے ہوگئی اور وہ علی گڑھ سے رخصت ہوکر جامعہ ملیہ آگئیں۔

جامعہ ملیہ میں واقع عابد صاحب کا گھر یقیناً تنہائی اور ایک ایسے بے ڈھنگے گھر کا منظر پیش کر رہا ہوگا جو گھر میں عورت کے نہ ہونے سے ہوتا ہے۔ مصداق فاطمہ نے گھر میں قدم رکھا تو اس کا استقبال گھر کے ایک نوکر اور ملازمہ (بوا) نے کیا۔

مصداق فاطمہ نہایت نفاست پسند اور صفائی ستھرائی کی شوقین تھی۔ گھر کو الٹا پڑا دیکھا تو آتے ہی صفائی میں لگ گئی لیکن یہ کام اتنا آسان نہیں تھا گھر کو گھر بنانے میں کئی دن لگ گئے۔

جب گھر کچھ دیکھنے کے قابل ہوگیا تو اس نے عابد صاحب کے ذریعے جامعہ کے اساتذہ کی بیویوں کو اپنے گھر مدعو کیا۔ ان عورتوں کو خود بھی اشتیاق تھا کہ حالی کے خاندان کی لڑکی عابد صاحب کی بیوی بن کر آئی ہے اسے دیکھا جائے۔ یہ عورتیں نہ صرف اس سے ملنے آئیں بلکہ باقاعدہ منہ دکھائی کی رسم ادا ہوئی۔

مصداق فاطمہ خوش مزاج، خوش اخلاق اور زندہ دل تھی۔ وہ کچھ ہی دن میں گھر کی تنہائی سے گھبرا گئیں اور خود کو جامعہ برادری میں شامل کرنے کے لیے گھر سے نکلی۔ رفتہ رفتہ اس نے کیمپس کے گھروں میں اپنے لیے جگہ بنالی۔ کئی اساتذہ کی بیویاں اس کی اچھی دوست بن گئیں لیکن بعض خواتین ان سے کھنچی کھنچی رہتی تھیں۔ انہیں یہ خوف دامن گیر تھا کہ کہیں عابد صاحب کی دیکھا دیکھی ان کے شوہر بھی کہیں دوسری شادی نہ کرلیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ مصداق کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھ رہی تھیں لیکن رفتہ رفتہ مصداق کے حسنِ اخلاق نے انہیں بھی اپنا اسیر کرلیا۔ اب ہر طرف اس کی خوش مزاجی کے چرچے تھے۔

جامعہ برادری میں اپنی جگہ بنانے کے بعد اس نے کوششیں شروع کردیں کہ عابد صاحب کے رشتے داروں سے تعلقات استوار کیے جائیں تاکہ عابد صاحب کو یکسوئی حاصل ہو۔ وہ دیکھ رہی تھیں کہ عابد صاحب زبان سے کچھ نہیں کہتے لیکن انہیں یہ صدمہ ہے کہ وہ اس سے شادی کر کے پورے خاندان سے چھوٹ گئے ہیں۔ کوئی اور عورت ہوتی تو ہرگز نہ چاہتی کہ اس کی تنہائی میں کوئی دخیل ہو لیکن وہ برابر عابد صاحب پر زور دیتی رہی کہ وہ اپنے خاندان والوں سے تعلقات بحال کریں اور انہیں اپنے گھر لے کر آئیں۔ عابد صاحب بھی اس لیے رکے ہوئے تھے کہ نہ جانے نئی بیوی کا سلوک ان کے خاندان والوں کے ساتھ کیا ہو جب کہ کوئی بھی اس شادی میں شریک نہیں ہوا تھا۔ جب انہوں نے مصداق کی رضامندی دیکھی تو وہ خوشامد درآمد کر کے والد اور بہن کو گھر لے آیا۔ اس کے والد پڑھے لکھے انسان تھے۔ شاعر تھے خاص طور سے تاریخ کہنے میں ماہر تھے۔ انہوں نے پڑھی لکھی باذوق بہو سے ملاقات کی تو بیٹے کو مبارک باد دی۔ مصداق نے منہ سے بھی ایسا برتاؤ کیا کہ عابد صاحب کے دل میں بھی جگہ بنائی اور نند کو بھی گرویدہ کرلیا۔

یہ محبت ایسی بڑھی کہ عابد صاحب کے والد اور بہن ان کے پاس ہی آکر رہنے لگے۔

اس کامیابی کے بعد مصداق فاطمہ نے عابد صاحب کی پہلی بیوی سے بھی تعلقات استوار کرنے شروع کیے۔ یہ بڑا مشکل مرحلہ تھا۔ دوسری بیوی کبھی نہیں چاہے گی کہ اس کے شوہر کے تعلقات پہلی بیوی سے استوار ہوں لیکن مصداق نے اس کڑوی گولی کو میٹھی گولی بنا دیا۔ کچھ ایسا چکر چلایا کہ سوتن کا دل مٹھی میں کرلیا۔ پتھر کو موم بنا دیا اور پہلی بیوی نے دوسری کو قبول کرلیا۔ ساتھ رہنے کا سوال تو پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن آنا جانا ہوگیا۔

جب بیوی سے میل جول ہوگیا تو خاندان کے دوسرے افراد کی خفگی بھی دور ہوگئی۔ بکھرا ہوا خاندان سمٹ گیا۔ یہ عابد صاحب کے لیے بڑی تشفی کا سبب تھا اور یہ سب مصداق فاطمہ کی بدولت ہوا تھا۔ عابد صاحب دوسری شادی کرتے ہوئے اس لیے ڈر رہے تھے کہ مسائل اور بڑھ جائیں گے اور وہ پورے خاندان سے کٹ کر رہ جائیں گے لیکن مصداق فاطمہ نے تو کمال کر دکھایا۔ حسن اخلاق سے پورے خاندان کا دل جیت لیا۔

سوانحی خاکہ

نام: مصداق فاطمہ
ادبی نام: صالحہ عابد حسین
والد: خواجہ غلام الثقلین
والدہ: مشتاق فاطمہ
شوہر: ڈاکٹر عابد حسین
تعلیم: میٹرک
وطن: پانی پت
پیدائش: 18 اگست 1913ء
وفات: 8 جنوری 1988ء

شادی کے دو سال بعد مصداق فاطمہ کے ہاں بچہ ہونے کی خبر ملی تو خاندان بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ خوشی اس لیے بھی تھی کہ عابد صاحب کی پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی اور علاج معالجے کے بعد بھی کوئی امید نہیں تھی، اب یہ خوشی پوری ہو رہی تھی۔ عابد صاحب اور مصداق فاطمہ کو بھی یہ احساس ہوا کہ اب ان کی شادی شدہ زندگی کی خوشی دوبالا ہو جائے گی مگر بدقسمتی سے آٹھویں مہینے میں بچی پیدا ہوئی جو پیدائش کے بعد چند گھنٹوں زندہ رہی پھر ہمیشہ کے لیے آنکھیں موندھ لیں۔

یہ صدمہ اس کے لیے جان لیوا تھا۔ وہ اپنی بچی کو دیکھ بھی نہ پائی تھی کہ اس نے دم توڑ دیا۔ ہمیشہ کے لیے داغ محرومی چھوڑ گئی۔ اس صدمے نے اسے بیمار ڈال دیا۔ اس کے گردے میں پھوڑا ہوگیا اور بیماری کا ایک لمبا سلسلہ چل نکلا۔ عابد حسین نے دل و جان سے ان کا علاج کرایا اور اپنی حیثیت سے زیادہ خرچ کیا اور انہیں آہستہ آہستہ آرام آنے لگا۔

بچی کی جدائی اور بیماری کی جان لیوا تکلیف کو اس نے صبر و ہمت سے برداشت کیا اور بستر سے اٹھتے ہی اپنے غم کو لکھنے پڑھنے اور سوشل کاموں میں مصروف رکھ کر بھلانے میں لگ گئی۔ جو کتاب ہاتھ آئی اسے پڑھ ڈالا۔ کہانیوں اور ناولوں کے ساتھ شاعروں کو بھی پڑھنا شروع کردیا۔ عابد صاحب نے اس کے ذوق کو دیکھتے ہوئے دنیا بھر کی کتابیں گھر میں جمع کردیں۔ گھر کو کتب خانہ بنا دیا۔ مصداق فاطمہ خاموشی سے استفادہ کرتی رہی۔

اس کا ذاتی مطالعہ اور قابلیت تو بہت بڑھ گئی تھی لیکن

یہ احساس برابر رہتا تھا کہ اس کی نصابی تعلیم ادھوری رہ گئی ہے۔ اس نے اپنی اس کمی کا احساس اپنے شوہر کو دلایا۔ پھر انہی کے مشورے سے ادیب فاضل کا امتحان دیا اور بہت اچھے نمبروں سے پاس ہوئی۔

قناعت کا دامن اب بھی نہیں پکڑا۔ تاریخ ادب، تنقید وسوانح اور دوسری علمی کتابیں برابر مطالعے میں رہیں۔ ان کتابوں کے مطالعے سے یہ احساس بڑھتا گیا کہ ادب کا اصل خزانہ تو انگریزی میں چھپا ہوا ہے۔ اس کا یہ حال کہ انگریزی سے قطعی ناواقف۔ کالج کی تعلیم سے ناواقف تھیں اس لیے انگریزی پڑھنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ اب عابد صاحب اس کے ٹیوٹر بن گئے اور اس نے انگریزی پڑھنا شروع کردی اور جلد ہی اتنی استعداد پیدا کرلی کہ چھوٹی چھوٹی انگریزی کہانیاں اور آسان ناولز پڑھنا شروع کردیں۔ جہاں مشکل پیش آتی عابد صاحب رہنمائی کرتے۔

جب انگریزی خوب سمجھ میں آنے لگی تو میٹرک کا امتحان پنجاب یونیورسٹی سے دیا اور اس میں کامیابی حاصل کرلی۔ اب نہ صرف مغربی ادیبوں کی بلکہ بنگلہ ادیبوں خاص طور سے ٹیگور کے اکثر ناول اس نے انگریزی کے ذریعے پڑھ لیے۔ انگریزی کی اتنی قابلیت پیدا ہوگئی کہ وہ چھوٹی چھوٹی کتابوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے لگی۔

اب وہ خود بھی اچھا ناول لکھ سکتی تھی لیکن اس کے ناول نگار بننے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی۔

اس نے عملی میدان میں قدم رکھنے کا آغاز جامعہ سے کیا۔ وہ یہ دیکھ رہی تھی کہ عورتیں، مردوں سے بہت پیچھے ہیں بلکہ انہیں اپنی حیثیت کا ادراک ہی نہیں۔ اس نے خواتین میں بیداری پیدا کرنے کے لیے عورتوں کی ایک انجمن ''بزم خواتین'' بنائی۔ جامعہ کے کارکنوں کی بیویوں بیٹیوں کو گھر کی چار دیواری سے نکال کر سماجی اور ادبی کام کرنے پر اکسایا۔ اس کے ساتھ ہی وہ کہانیاں اور مضامین بھی لکھتی رہی جو ادبی پرچوں کی زینت بنتے رہے۔

یہ مضامین وہ صالحہ عابد حسین کے نام سے لکھ رہی تھی۔ اب اس کا گھریلو نام مصداق فاطمہ اور ادبی نام صالحہ عابد حسین ہوگیا۔ رفتہ رفتہ لوگ اس کا اصل نام بھول گئے۔ اب وہ سب کے لیے صالحہ عابد حسین تھی۔

بزم خواتین کے تحت جلسے ہونے لگے۔ ان میں مذہبی جلسے بھی ہوتے تھے ادبی جلسے بھی۔

اس وقت جامعہ قرول باغ میں تھی۔ صالحہ عابد حسین برقعہ پہنتی تھی۔ برقعہ کسی طرح اس کی زندگی میں حائل نہیں ہو رہا تھا۔ برقعہ پہن کر ہی جلسوں میں شریک ہوتی تھی۔ فوٹو گرافی کا شوق تھا۔ وہ اس شوق کو بھی برقعہ کے ساتھ پورا کرتی تھی۔ ربیع الاول کا مہینا آیا تو اس نے میلاد النبی کا جلسہ منعقد کیا اور اس کے لیے سیرت رسولؐ پر مضمون لکھ کر پڑھا۔ دوسری عورتوں کو بھی مضامین لکھ کر دیے یا ان کے لکھے ہوئے مضامین کی اصلاح کی۔

وہ مذہبی ضرور تھی لیکن اس نے اس حقیقت کو جان لیا تھا کہ اسلام صرف چند عبادات کے مجموعے کا نام نہیں بلکہ یہ ایک طرز زندگی ہے۔ اسی لیے وہ تنگ نظری اور تعصب سے پاک تھی۔ اس نے محرم میں اپنے یہاں مجالس عزا کرنی شروع کیں۔ جس میں انیس کے مرثیہ کے علاوہ دیگر مضامین بھی پڑھے جاتے تھے۔ اس نے ان مجلسوں میں ماتم کی رسم کو ختم کردیا کہ اس کی وجہ سے صرف شیعہ ہی ان مجالس میں آتے ہیں۔

وہ ہر مجلس اور میلاد میں اس بات پر زور دیا کرتی تھی کہ روایتی مجلس اور میلاد کرنا ہی ہمارا مقصد نہیں ہونا چاہیے بلکہ ہمیں ان نفوس قدسیہ کی زندگی کو سامنے رکھ کر اپنی زندگی گزارنا چاہیے۔

جامعہ کی ان تقریبات کی شہرت ہوئی تو اسے آل انڈیا ریڈیو پر تقریروں کے لیے بلایا جانے لگا۔ ریڈیو پر نیا نیا عورتوں کا پروگرام شروع ہوا تھا۔ اسے عورتوں کے مسائل پر تقریریں کرنے کے لیے بلایا جاتا۔ پھر جب پروگرام ''اردو مجلس'' شروع ہوا تو اسے ادبی پروگراموں میں بھی تقریروں کے لیے بلایا جانے لگا۔ ان تقریروں کی ایسی شہرت ہوئی کہ وہ ریڈیو کی ضرورت بن گئی۔ اس کی کہانیاں اور فیچرز بھی نشر ہونے لگے۔ مزاحیہ پروگرام بھی کرنے لگی۔

ریڈیو کے لیے لکھنے اور پڑھنے کا خاص انداز ہوتا ہے اور صالحہ عابد حسین ریڈیو رائٹنگ کی ماہر تھی۔ آواز بھی خوب صورت، پڑھنے کا انداز بھی دلکش۔

اس وقت برقعہ کا عام رواج تھا۔ اسی پابندی کی وجہ سے عورتیں باہر کے کاموں سے گریزاں رہتی تھیں لیکن اس نے برقعہ کو اپنے کاموں میں حائل نہیں ہونے دیا۔ وہ ریڈیو اسٹیشن بھی برقعہ میں جاتی تھی اور پردے کا پورا اہتمام کرتی تھی۔

وہ جب شادی کے بعد جامعہ آئی تو یہاں ڈرامے لکھے اور اسٹیج کیے جاتے تھے۔ یہاں پروفیسر مجیب موجود تھے جو ڈراما نگاری پر عبور رکھتے تھے۔ انہوں نے بہت سے طویل ڈرامے لکھے اور ڈائریکٹ کیے تھے۔ جامعہ کے دوسرے استاد بھی چھوٹے ڈرامے لکھتے اور اسٹیج کراتے تھے۔ خود ڈاکٹر عابد حسین نے کئی ڈرامے لکھے۔ ایک ڈراما ''معدے کا مریض'' تو جامعہ میں اسٹیج بھی ہوا تھا۔

صالحہ عابد حسین نے یہ ماحول دیکھا تو اسے اپنا لڑکپن یاد آگیا۔ جب وہ اپنے چچازاد بھائی خواجہ احمد عباس کے ساتھ مل کر ڈرامے لکھا کرتی تھی۔ کئی ڈرامے حالی مسلم گرلز ہائی اسکول میں اسٹیج بھی ہوئے تھے۔ اس نے بھی ایک ڈراما لکھنا شروع کیا۔ اس ڈرامے کا عنوان ''بنیادی حق'' تھا جس کا موضوع تھا پسند کی شادی کرنے کا حق ہر لڑکی کو ہے۔ اس ڈرامے کی انفرادیت یہ رہی کہ عورتوں کے لیے لکھا گیا اور جب اسٹیج ہوا تو مردوں کا پارٹ بھی عورتوں نے کیا۔ اس وقت جامعہ میں عورتیں ڈرامے میں پارٹ نہیں کرتی تھیں۔ اکثر ایسے ڈرامے لکھے جاتے تھے جن میں خواتین کا رول ہی نہیں ہوتا تھا۔ صالحہ عابد حسین نے عورتوں کے لیے لکھا عورتوں سے رول کرائے البتہ مرد اداکار اس میں شامل نہیں تھے۔ مردوں کا رول بھی عورتوں نے کیا تھا بعد میں جب فضا بدلی، مخلوط تعلیم ہونے لگی تو جامعہ کے اسٹیج پر مردوں کے ساتھ جو یہاں کے اساتذہ اور طالب علم ہوتے تھے جامعہ کی طالبات اور اسٹاف ممبر بھی حصہ لینے لگیں۔

اس کامیابی کے بعد جامعہ کے ٹیچرز کالج کے پرنسپل کی فرمائش پر اس کے سالانہ جلسے میں اسٹیج کرنے کے لیے اس نے ایک ڈراما ''امتحان'' لکھا جو اسٹیج ہوا اور داد تحسین پائی۔ مکتبہ جامعہ نے اسے کتابی صورت میں شائع بھی کیا۔

ایک ڈراما ''دھنک'' بھی لکھا جس کا موضوع ہندوستان کی مشترکہ تہذیب تھا۔

اس نے اتنے ڈرامے لکھ لیے کہ اس کے منتخب ڈراموں کا مجموعہ ''زندگی کے کھیل'' کے نام سے شائع ہوا جس کے دیباچے میں اس نے لکھا۔

''نہ ان میں فنی کمال ہے نہ ڈرامائیت، نہ شان نہ شکوہ، نہ پُراسراریت نہ جوش دلانے والے واقعات۔ اگر ان میں کوئی اور خوبی ہو سکتی ہے تو صرف اتنی کہ یہ ہندوستانی گھریلو معاشرت کی تصویر کشی کرتے ہیں اور اپنی تصویر دیکھنا کون پسند نہیں کرتا۔''

ان ادبی مصروفیات کے باوجود وہ گھر داری کے کاموں سے کبھی غافل نہ ہوئی۔ گھر کو سجانا، سنوارنا، صاف ستھرا رکھنا اس کا مشغلہ تھا۔ اسی طرح رشتہ داروں خاص طور پر سسرالی رشتہ داروں سے ملنے جلنے کے لیے وقت نکالنا بڑا مشکل تھا لیکن اس نے کبھی کسی سے تعلقات منقطع نہیں کیے۔

کفایت شعاری سے گھر کے خرچ کو پورا کیا۔ عابد صاحب کے جن عزیزوں کی امداد ضروری تھی اس میں کمی نہیں کی۔ اس کا خیال رکھا اور ضرورت مندوں کی مدد ہر حال میں کرتی رہی۔ اس لیے اس کی ازدواجی زندگی نہایت خوشگوار تھی جو اس کے ادبی کاموں میں معاون ثابت ہو رہی تھی۔ دونوں کے مزاجوں میں بہت فرق تھا لیکن یہ فرق کبھی کسی جھگڑے کا باعث نہیں بنا۔ اس فرق کو صالحہ نے اپنے سلوک سے کم کیا۔ عابد صاحب کی ایسی دلجوئی کی کہ اگر کبھی انہیں غصہ بھی آتا تو اس کے سلوک یاد کر کے اس پر مہربان ہو جاتے۔ جھگڑا ختم ہو جاتا۔ یہ صالحہ کی دانش مندی تھی کہ شوہر کو خوش رکھنے کے لیے ان کی بہن کے بچوں کو باری باری اپنے پاس بلا کر رکھتی اور ان کی تعلیم و تربیت کرتی۔ ایک بھانجی تو مستقل اسی کے ساتھ رہنے لگی تھی۔

اس کا تصنیفی شوق افسانوں اور مضامین سے گزرتا ہوا ناولوں تک آگیا۔ اردو میں ناول نگاری کی ابتداء انیسویں صدی کے آخر میں مولوی نذیر احمد کے ناولوں سے ہو چکی تھی۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار اور عبدالحلیم شرر نے اس سلسلے کو مزید آگے بڑھایا۔

مولوی نذیر احمد کے ناول عورتوں میں بہت مقبول ہوئے اور ان کے ناولوں کے زیر اثر بہت سی خواتین ناول نگار سامنے آگئیں۔ صالحہ عابد حسین سے پہلے محمدی بیگم، صغریٰ ہمایوں مرزا، عباسی بیگم، اکبری بیگم وغیرہ سامنے آچکی تھیں۔ ان خواتین کے ناولوں کے موضوعات زیادہ تر عورتوں کی تعلیم اور اس کے بدلتے تصورات تھے۔ یہ خواتین ناول کی تکنیک سے پوری طرح واقف نہیں تھیں۔

کچھ خواتین پنڈت رتن ناتھ سرشار کی پیروی کر رہی تھیں۔ ان ناولوں میں مزاح کی چاشنی فسانہ آزاد کی سی تھی۔

صالحہ عابد حسین نے یہ تمام ناول پڑھ ڈالے تھے۔ ان ناولوں ہی سے اسے تحریک ملی کہ وہ بھی کوئی ناول لکھے۔ اس سے پہلے وہ افسانے لکھتی رہی تھی لیکن افسانے اور ناول کی دنیا مختلف ہوتی ہے۔ وہ کسی بڑے پلاٹ کی تلاش میں تھی جس سے ناول کی دنیا تعمیر کی جا سکے۔ وہ یہ بھی چاہتی تھی کہ

اس کا ناول اب تک کی لکھنے والیوں سے مختلف بھی ہو۔ اس نے اب تک جو ناول پڑھے تھے ان میں جو عورتیں دکھائی گئی تھیں وہ گھر تک محدود تھیں۔ وہ تبدیلیوں کی خواہش مند تو تھیں لیکن دوسروں کی محتاج بھی تھیں۔ صالحہ ایک ایسے ناول کی تلاش میں تھی جس میں قدیم و جدید کا ٹکراؤ ہو۔ اس کی ہیروئن تبدیلی کی خواہش مند بھی ہو اور اس میں حصہ دار بھی ہو۔ گھر کی چار دیواری تک محدود نہ ہو بلکہ اس ناول میں باہر گلی کوچوں بازاروں جو سیاسی نعرے لگ رہے تھے وہ بھی سنائی دیں۔ اس ناول میں جنگ آزادی اور سرسید کی تحریک، خلافت تحریک اور کانگریس کے احوال بھی ہوں۔ قصباتی شرفاء کی زندگی بھی ہو اور وقت کے ساتھ آنے والی تبدیلیوں کو بھی دکھایا گیا ہو۔

ان سب باتوں پر خوب غور کرنے کے بعد وہ اپنا پہلا ناول ”عذرا“ لکھنے بیٹھ گئی۔ اس ناول کی ہیروئن عذرا ایک عام سی سیدھی سادی لڑکی ہے۔ عام طور پر ناولوں کی ہیروئن سے بالکل مختلف ہے مگر اپنے طور طریقوں، طبیعت اور انداز میں اپنے خاندان اور ماحول کی لڑکیوں سے الگ ہے۔ اسی وجہ سے لڑکپن ہی سے اپنے خاندان میں اسے نمایاں حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ ناول کے ہیرو انصار کے قریب آنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ انگریز حکومت کے خلاف ہے اور آئی سی ایس بننے کی بجائے جرنلزم کو اپنا پیشہ بناتا ہے۔

نئی اور پرانی تہذیب کے ٹکراؤ کو دکھانے کے لیے اس نے کئی اور کرداروں کو ناول کا حصہ بنایا۔ ان کرداروں میں ہیروئن کی ماں نسیمہ اور خالہ جمیلہ ہیں۔ دونوں کردار ایک ہی دور میں جی رہے ہیں مگر جمیلہ بیگم نئے رجحانات کو سختی سے رد کرتی ہیں اور لکیر کی فقیر بنی ہوئی ہیں جب کہ نسیمہ پرانی تہذیب کی خوبیوں کو قائم رکھتے ہوئے نئے رخ کو پہچان کر مفاہمت کا راستہ اختیار کرتی ہے گویا صالحہ عابد حسین نے بتا دیا کہ صحیح راستہ یہی ہے۔ اب زمانہ تبدیل ہو رہا ہے لہٰذا ہمیں بھی تبدیل ہونا چاہیے۔

معاشرے میں ایسے لوگ بھی تھے جو نئے زمانے کے ہوتے ہوئے بھی پرانی اقدار کو اپنائے ہوئے تھے۔ دوسرے لفظوں میں انگریز پرست تھے۔ صالحہ نے ایسے لوگوں کی نمائندگی کے لیے ریاض اور ہاجرہ کے کردار تخلیق کیے۔

یہ اس کا پہلا ناول تھا لیکن واقعہ نگاری، انداز بیان کی دلکشی، مکالموں کی بے تکلفی اور کرداروں کے نفسیاتی مطالعے کا ایک معیار رکھتا تھا اور اس کے مطالعے کی وسعت کی شہادت دیتا تھا۔

اس ناول کے بعد اس نے دوسرا ناول ”آتش خاموش“ لکھا۔ اس ناول کا پس منظر جامعہ ملیہ اسلامیہ تھا جو تحریک عدم تعاون کے تحت قائم ہوئی تھی۔ یہ ایسا موضوع تھا جس کا مشاہدہ وہ خود کر رہی تھی۔ وہ جامعہ ملیہ میں رہتی تھی اس کے مقاصد سے واقف تھی۔ اس کے تعلیمی ماحول سے آشنا تھی لہٰذا بڑی آسانی اور روانی سے کرداروں کو آگے بڑھایا ہے۔

اس ناول کی ہیروئن انجم کو پچھلے ناول کی عذرا کی طرح تعلیم حاصل کرنے میں مشکلات پیش نہیں آئی تھیں۔ وہ اعلیٰ تعلیم ملک سے باہر بھی حاصل کر سکتی تھی اور غیر شادی شدہ رہ کر ایک قومی ادارے کی خدمت کے لیے اپنی زندگی وقف کر سکتی تھی۔ وہ اس ناول کے ہیرو کے ساتھ مل کر اس ادارے سے خود کو وابستہ کر لیتی ہے۔ ناول کا ہیرو اس سے اظہار محبت کرتا ہے لیکن جب انجم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ شادی شدہ ہے تب وہ سوچتی ہے کہ ایک بھرے پرے خاندان کی خوشیوں کو ختم کر کے ایک عورت کے ساتھ ناانصافی کر رہی ہے تو وہ شادی سے انکار کر دیتی ہے اور اس کی رفیق بننے پر قناعت کر لیتی ہے۔

☆......☆

ڈاکٹر عابد حسین پکے گاندھی وادی تھے۔ صالحہ عابد حسین بھی گاندھی کی عقیدت مند ہو گئی۔ عابد صاحب کا گاندھی جی کے علاوہ پنڈت نہرو، مولانا آزاد سے قریبی تعلق تھا۔ وہ بھی ان سے متاثر ہوئی۔ ان کی تصانیف کا مطالعہ کیا۔ وہ اکثر عابد صاحب کے ساتھ مولانا آزاد اور نہرو سے ملنے جایا کرتی تھی۔ اس نے ان لوگوں پر مضامین بھی لکھے۔

وہ ان دنوں اپنے بھائی غلام السیدین کے گھر پونا میں تھی کہ 1947ء میں ملک تقسیم ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی فسادات پھوٹ پڑے۔ آزادی کی خوشی فسادات کے غم میں دب کر رہ گئی۔

آزادی کے بعد ہندوستان ایک انقلاب سے دوچار ہوا۔ ہندوستان کے دانش وروں اور قوم پرست ہندوستانیوں نے سوچا کہ آزادی اپنے ساتھ بہت بڑی ذمہ داریاں لائی ہے۔ ان ہی لوگوں میں جامعہ اسلامیہ کے لوگ بھی تھے۔ عابد حسین نے جامعہ سے چھٹی لے کر چندروزہ

اخبار "نئی روشنی" نکالا۔ ایڈیٹر وہ خود تھے اور مجلس ادارت میں صالحہ عابد حسین کا نام تھا۔

آزادی کے بعد اس نے بیشتر مسلمان عورتوں کی طرح برقع اتار دیا۔ بہت سے لوگوں نے اعتراض بھی کیا لیکن اس نے نہایت معقول جواب دے کر سب کے منہ بند کر دیے۔ "میں نے برقعہ اتارا ہے بے پردہ نہیں ہوئی ہوں۔"

باہر نکلتے وقت وہ اس بات کا پورا خیال رکھتی کہ لباس پوری طرح پردہ دار ہو۔

وقت کے ساتھ ساتھ اس کی مصروفیات میں بھی اضافہ ہونے لگا اور اس کی مقبولیت میں بھی۔ اس کی ادبی، سماجی اور تہذیبی دلچسپیاں صرف خواتین کے حلقے تک محدود نہیں رہیں۔ کئی اداروں میں ملازمت کی پیشکش بھی ہوئی۔ رسالوں کی ادارت کی دعوت دی گئی۔ سیاسی تنظیموں نے ممبر بنانے کی درخواست کی اور بعض جگہ اس کا دل بھی چاہا کہ قبول کر لے تاکہ آمدنی میں اضافہ ہو لیکن اس کے شوہر نے اسے منظور نہیں کیا۔ وہ عورتوں کی ملازمت کے خلاف نہیں تھے لیکن جانتے تھے کہ صالحہ کا مزاج ملازمت کے لیے موزوں نہیں۔ اس کے باوجود وہ کئی اہم اداروں اور کمیٹیوں کی ممبر رہی۔ ترقی اردو ہند، انیس کمیٹی بنی تو وہ اس کی ممبر ہوئی۔ پنجاب وقف بورڈ کی ممبر بنائی گئی۔ یہ بورڈ ہریانہ، ہماچل اور اتر پردیش تینوں صوبے کا مل کر بنا تھا۔ اس کے جلسوں میں وہ پابندی سے شرکت کرتی۔ بسوں میں سفر کر کے اس کی میٹنگوں میں شریک ہوتی۔ اس بورڈ کے تحت اس نے پابندی سے سماجی خدمات انجام دیں۔ بیواؤں کو وظیفہ دلوایا، غریب طلبہ کے لیے وظیفے جاری کروائے۔ ایک بڑا کام یہ کیا کہ مولانا حالی کا مزار پانی پت میں قائم کرانے کی تجویز پاس کرا دی۔

برسوں پہلے جب اس نے قلم اٹھانا اور کتابوں کا مطالعہ شروع کیا تھا اسے یہ احساس ہونے لگا تھا کہ مولانا حالی کی کوئی سوانح عمری اردو میں نہیں لکھی گئی۔ ایسا ہونا کسی سانحے سے کم نہیں تھا۔ وہ شخصیت جس نے سرسید کو زندہ جاوید بنا دیا خود اس کے کارناموں سے دنیا ناواقف ہے۔ وہ حالی جس نے غالب کو دریافت کیا خود اس کے کارنامے دنیا کی نظروں سے اوجھل ہیں۔ یہ سوچ کر اور بھی دکھ ہوتا تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ حالی کی زندگی پر مزید پردے پڑ جائیں گے۔ اس سے پہلے کہ ایسا ہو حالی کی سوانح مرتب ہو

ناول

عذرا، آتش خاموش، راہِ عمل، قطرے سے گہر ہونے تک، یادوں کے چراغ، اپنی اپنی صلیب، ابھی دور، گوری سوئے سیج پر، ساتوں آنگن۔

افسانوی مجموعے

نقشِ اوّل، سازِ ہستی، نراس میں آس، ٹوٹگے، درد و درماں، تین چہرے تین آوازیں۔

سوانح

یادگارِ حالی، سلسلہ روز و شب، جانے والوں کی یاد آتی ہے۔

ادبی تصانیف

خواتین کربلا، انیس سے تعارف، فن اور فنکار، ادبی جھلکیاں، بزمِ دانش وراں، سفرِ زندگی کے لیے سوز و ساز۔

تدوین

انیس کے مرثیے (دو جلدیں)، احباب نامے، انشائیات، آواز دوست، رہ نوردِ شوق، برائے خاطرِ احباب۔

بچوں کا ادب

بھولی نمہ، بہادر سمندر، زعفران پریوں کے دیس میں، ایک دیس ایک خون، سنہرے بالوں والے بچوں کا دیس، بچوں کے انیس، بچوں کے حالی، بچوں کے ذاکر صاحب، جادو کا ہرن، حالی کی ایک جھلک۔

تراجم

باپو (دو حصے)، بڑا پانی، کثرت میں وحدت، بیم کماری۔

مذہبی مضامین

سنگ گہر۔

جانی چاہیے۔ اسے اپنی ذمہ داری یاد آئی۔ وہ حالی کی معتقد بھی تھی اور خاندانی تعلق بھی تھا۔ اس سے بہتر یہ کام کون کر سکتا ہے؟ کم از کم وہ اتنا تو کر سکتی ہے کہ خاندانی ذرائع سے مدد لے کر اتنا مواد جمع کر دے کہ کبھی کوئی بڑا ادیب حالی کی سوانح لکھے تو اسے تمام معلومات ایک جگہ مل جائیں۔ اس نے کئی سال کی محنت کے بعد ''یادگارِ حالی'' کے نام سے مولانا حالی کی سوانح لکھ دی اور پہلی مرتبہ 1950ء میں انجمن ترقی اردو ہند سے شائع ہوئی۔

اس سوانح عمری کو اس نے تین حصوں میں تقسیم کیا۔ پہلے حصے میں حالی کے خاندان کے پس منظر میں ان کی زندگی کے حالات ہیں۔ دوسرے حصے میں ان کی شخصیت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور تیسرے حصے میں ان کی شاعری، سوانح نگاری تنقید وغیرہ پر بحث کی ہے۔

اس نے اس کتاب کے دیباچے میں لکھا تھا۔ ''دعا کیجیے کہ حالی کا کوئی اور قدردان ایک بہتر کتاب لکھ کر اس فرض کو ادا کرے۔ مجھے اس سے بڑی خوشی ہوگی۔''

مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی کتاب کے پیش لفظ میں لکھا تھا۔ ''بلاشبہ یہ خواجہ صاحب کی مطلوبہ سوانح عمری نہیں لیکن مطلوبہ سوانح عمری کا ایسا قیمتی مواد ہے جس سے زیادہ مستند مواد ہمیں نہیں مل سکتا۔ ہمیں بیگم صالحہ عابد حسین کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انہوں نے یہ خاندانی امانت قلم و قرطاس کے حوالے کر دی۔''

اس اعتراف اور اُمید کے باوجود ''یادگارِ حالی'' کو مطلوبہ سوانح عمری کا درجہ دے دیا گیا اور ''مطلوبہ سوانح عمری'' کبھی نہیں لکھی جاسکی۔ اس کے بعد کسی نے دوسری سوانح نہیں لکھی اور اسی کو حرفِ آخر سمجھ لیا گیا۔ یہ صالحہ عابد حسین کی بڑی کامیابی تھی۔

اس کتاب کے بعد اسے ممتاز و مستند ادیبہ کا درجہ حاصل ہوگیا۔

ادبی حیثیت سے اس کا ایک اور کارنامہ سامنے آیا۔ خواجہ غلام السیدین اپنی خودنوشت ''مجھے کہنا ہے اپنی زبان میں'' تحریر کر رہے تھے کہ ان کا انتقال ہوگیا۔ اس نے جہاں تک لکھا گیا تھا اسے پہلا حصہ قرار دے کر دوسرا حصہ ذکر جمیل کے عنوان سے لکھا۔

یہ ایک مشکل کام تھا کیونکہ انسان جو کچھ اپنے بارے میں لکھتا ہے اس کا انداز دوسرا ہوتا ہے۔ یہ اسی کا انتخاب ہوتا ہے کہ کیا لکھے کیا چھوڑے۔ صالحہ عابد حسین نے بار بار پہلے حصے کو پڑھا اور ان واقعات کو چنا جو اس میں آنے چاہئیں تھے اور وہ نہیں آسکے۔ ان نوٹس سے مدد لی جو سیدین صاحب نے اپنی خودنوشت کے لیے بنائے تھے اور اس طرح نہایت کامیابی سے ادھوری خودنوشت کو مکمل کیا۔

ان ادبی کاموں کے ساتھ ساتھ وہ ناول نگاری کی طرف پوری طرح متوجہ رہی۔ ''قطرے سے گہر ہونے تک'' اس کا تیسرا ناول منظرِ عام پر آیا۔ اس ناول کا موضوع انسانی رشتوں کی پیچیدگیاں تھیں۔ ناول کی ہیروئن انیس ان گتھیوں کو سلجھاتی ہے۔ مشکلات سے گزر کر وہ قطرے سے گہر تک کی منزل پر پہنچتی ہے اور بکھرے ہوئے خاندان کو سمیٹتی ہے۔ اقبال حسن کا کردار نہایت اہم ہے جو انیس کی ہر مرحلے پر مدد کرتے ہیں۔ کلثوم کا کردار منفی ہے جو انیس کی زندگی میں مشکلات پیدا کرتی رہتی ہے۔

اس کا یہ ناول اصلاح کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔

زبان کی صحت، مکالموں کی برجستگی اور منظر نگاری کے اعتبار سے یہ ناول بہت نمایاں تھا اور لگتا تھا کہ وہ ترقی کی منزل طے کر رہی ہے۔ اس کا ہر قدم آگے بڑھ رہا ہے۔ پڑھنے والے اس کے ایک اور ناول کے انتظار میں تھے اور اس کے نقاد پیش گوئی کر رہے تھے کہ اس کا آیندہ ناول فنی اعتبار سے اس سے بھی بہتر ہوگا۔

اس نے اپنے پڑھنے والوں کو مایوس نہیں کیا۔ جلد ہی ایک ناول ''راہِ عمل'' کے نام سے لکھا۔ یہ اس کا چوتھا ناول تھا۔ اس کا موضوع آزادی کے بعد ہندوستانی دیہات کی حالت اور ان کی تعمیر تھا اور ان کو ترقی یافتہ بنانے کی جدوجہد تھا۔

کرداروں کے توسط اس نے گاندھی جی کے اس نظریہ کو بیان کیا کہ ہندوستان کی ترقی جب ہی ہو سکتی ہے جب ہندوستان کے دیہات ترقی کریں۔

اس نے ایک اور ناول ''یادوں کے چراغ'' لکھا۔ اس ناول سے اس کی ناول نگاری میں ایک نیا موڑ آیا۔ اب تک اس کے فن پر اصلاح کا رنگ غالب آجاتا تھا لیکن اس ناول میں اصلاح اور مقصدیت بھی ہے تو پس پردہ۔ طویل تقریر نما مکالموں سے بھی پرہیز کیا۔

اس ناول میں مصنفہ ناول نگاری کے جدید اصولوں کی طرف بڑھتی نظر آنے لگی۔

اس ناول کا اکثر نقادوں نے نوٹس لیا اور اسے ایک اچھا ناول قرار دیا۔

صالحہ عابد حسین نے اس ناول میں ملک کے تعلیمی اداروں کی حالت کی بھی عکاسی کی۔ اس ناول کا مرکزی کردار کنول ہے جو یہ سوچ کر خوش ہوتی ہے کہ وہ یونیورسٹی میں پڑھے گی اور یونیورسٹی ٹاؤن ہال میں اسے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں سے ملنے کا موقع ملے گا مگر جب وہ یہاں آئی تو اسے سخت مایوسی ہوئی۔ وہ تو یہ سمجھے بیٹھی تھی کہ اس کے دماغ کی کھڑکیاں کھلیں گی۔ ذہنی غذا ملے گی۔ ادبی و شعری ذوق کو سنوارنے کا موقع ملے گا مگر اسے ایسے لوگ نہ ملے جو اس کے ذوق کی تسکین کر سکتے۔ بہت کم کسی کو علمی و ادبی گفتگو کرتے سنا۔ علم و ادب پر گفتگو ہوتی بھی تو عیب جوئی کے سوا کچھ نہ ہوتا۔

اس نے ایک ناول ''اپنی اپنی صلیب'' تحریر کیا اور ثابت کر دیا کہ وہ فن کی دنیا میں مسلسل آگے بڑھ رہی ہے۔ اس ناول میں اس کا فن اور زیادہ نکھر کر سامنے آیا۔ اس نے اپنے دوسرے ناولوں کے برعکس اس ناول کا محور ایک مرد کو بنایا اور نسوانی کرداروں کی حیثیت ذیلی رکھی۔ ناول کا پلاٹ سیدھا سادہ تھا لیکن کہانی دلکش انداز سے آگے بڑھتی رہی۔

اس ناول کا مرکزی کردار علی اصغر ہے جو متوسط طبقے کا ایسا فرد ہے جس میں آگے بڑھنے اور دولت کمانے کی خواہش نہیں نہ وہ بیرونِ ملک جا کر تعلیم حاصل کرنے پر تیار ہے۔ اپنی خالہ زاد حمرا کے ساتھ اپنی زندگی خودداری، ایمانداری اور سادگی سے گزارنا چاہتا ہے۔ اس سے زیادہ زندگی سے اس کو توقعات نہیں۔ حمرا بھی اسے پسند کرتی ہے اور اس سے شادی کی خواہاں ہے مگر خاندان کے لوگ علی اصغر کی شادی رضوانہ سے کر دیتے ہیں جو آئی سی ایس کی بیٹی ہے اور بے حد ناز و نعم میں پلی ہے۔ حمرا کی شادی کہیں اور ہو گئی ہے جسے وہ پسند نہیں کرتی۔

علی اصغر اور رضوانہ کی ازدواجی زندگی بھی ناکام رہتی ہے اور بالآخر اس کا اختتام علی اصغر کی موت ہوتا ہے۔

اس نے ایک اور ناول ''ابھی دور'' بھی لکھا۔ اس کے تمام ناول حقائق سے قریب اور اردگرد کے واقعات سے قریب تر ہوا کرتے تھے۔ اس ناول میں بھی متوسط طبقے کے لڑکے لڑکیوں کی نفسیات، الجھنیں، ذہنی کیفیات، جذباتیت، اخلاقی دیوالیہ پن، پرانی تہذیب اور رسم و رواج سے بےزاری اور نئی تہذیب کی چمک دمک اور اسے اپنانے کی خواہش کو پیش کیا گیا تھا۔

نئی چمک دمک کو حاصل کرنے کے لیے نوجوان لڑکیاں جس جہنم سے گزرتی ہیں اور اس کے جو نتائج خاندانوں کو بھگتنے پڑتے ہیں یہ ناول انہی کی ترجمانی کرتا ہے۔ غرض کہ یہ ناول اپنے عہد کی زندگی اور معاشرت کی ترجمانی کرتا تھا جسے بہترین کردار نگاری اور جذبات نگاری کا مرقع بنا کر پیش کیا گیا تھا۔ اسی لیے مقبول ہوا۔

اس کا ناول ''گوری سوئے سیج پر'' اپنی تکنیک کے اعتبار سے اس کا بہترین ناول ہے اور ناول نگاری کے جدید اصولوں پر پورا اترتا ہے۔ کہانی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ ناول کی ہیروئن مہرو کی میت رکھی ہے اور اس کا شوہر سہیل اس کے سرہانے بیٹھا ہے۔

مہرو دراصل پرانی تہذیب ہے جو مر چکی ہے۔ وفادار، پاکیزہ، شوہر پر نثار ہونے والی عورت مر چکی ہے۔ اب اس کا جنازہ اٹھنے والا ہے۔ اس کا شوہر سرہانے بیٹھا پرانی یادیں دہرا رہا ہے۔ یہی یادیں فلیش بیک کے ذریعے ناول کی تکمیل کرتی ہیں۔

''ساتواں آنگن'' اس کا آخری ناول تھا۔ اس ناول میں حزن و یاس کی فضا نظر آتی ہے کیونکہ مصنفہ ان دنوں بیمار تھی۔

اس ناول میں اس نے نئی اور پرانی نسل کے تضاد کو ابھارنے کی کوشش کی۔ نئی نسل کا ماتم کیا ہے کہ اسے گیلریاں، بالکونیاں، ہیٹر، ایئر کنڈیشن سب میسر ہے لیکن آنگن کہاں۔ بھلا یہ مصنوعات آنگن کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔

☆......☆

اس نے بڑوں کے لیے ادب تخلیق کرتے ہوئے اس ضرورت کو بھی محسوس کیا کہ بچوں کے لیے بھی ادب تخلیق کیا جائے۔ بچے ہی بڑے ہو کر کسی قوم کا فعال حصہ بنتے ہیں۔ ان کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ درکار ہونی چاہیے۔ بچوں میں مطالعہ کی عادت ڈالنے کے لیے ایسی کہانیاں تحریر ہونی چاہئیں جو ان کے ذہن سے قریب ہوں۔ بچوں کے لیے کہانیاں لکھتے ہوئے بڑوں کو بچہ بننا پڑتا ہے۔ اس کے اپنے بچے نہیں تھے اس لیے اسے بچوں سے ایک خاص انسیت تھی۔ یہی انسیت اسے مجبور کر رہی تھی کہ وہ بچوں کے لیے کہانیاں لکھے۔ تصور ہی تصور میں وہ اپنے بچوں کو کہانیاں سنا رہی تھی۔ اس نے بچوں کے لیے لکھنا شروع کیا۔ اس کی ان کہانیوں کو مکتبہ جامعہ کی طرف سے کتابی صورت میں تصویروں کے ساتھ شائع کیا گیا۔

ایک کہانی ''سنہری بالوں والے بچوں کا دیس'' پر

ایجوکیشن منسٹری کی طرف سے انعام بھی ملا۔

بچوں کے لیے لکھی گئی کہانیوں میں اخوت، آپسی میل ملاپ اور باہمی محبت پر زور دیا جاتا تھا۔ زبان آسان ہو اور انداز بیان زیادہ سے زیادہ دلچسپ ہو۔ وہ اس اصول کو جانتی تھی کہ بچوں کے لیے لکھتے وقت خود بچہ بننا پڑتا ہے۔ اسی لیے اس کی یہ کہانیاں بھی بچوں میں بہت مقبول ہوئیں۔

اس مقبولیت نے اسے ہمت دلائی اور اس نے بچوں کے لیے ایک ناول ''ایک دیس ایک خون'' لکھا۔ یہ ناول بھی مکتبہ جامعہ سے شائع ہوا۔ انگریزی میں لکھے گئے بچوں کے ناولوں کے تراجم بھی کیے۔

اس نے ان خیالی کہانیوں سے قطع نظر بچوں کو اردو ادب سے متعارف کرانے کے لیے ایک کتاب ''بچوں کے حالی اور بچوں کے انیس'' بھی لکھی۔

نیشنل بک ٹرسٹ کی فرمائش پر اس نے بچوں کے لیے گاندھی کی زندگی ''باپو'' کے نام سے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی۔

ترجمہ اس کا میدان نہیں تھا لیکن نیشنل بک ٹرسٹ کی فرمائش پر اس نے کئی انگریزی کتابوں کے ترجمے کیے۔

اس نے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے اتنی کتابیں مہیا کر دیں کہ بچوں کے ادب کا تذکرہ جہاں بھی چھڑے گا اس کا نام ضرور آئے گا۔

☆......☆

اسے سفر کرنے کا بہت شوق تھا۔ شادی سے پہلے دو ایک شہروں اور دو تین پہاڑی مقامات کے کہیں کہیں اور جانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ یہ آرزو دل میں مچل رہی تھی کہ کوئی ہو جو اسے لے کر سیر و سیاحت کے لیے نکلے لہٰذا جب اس کی شادی ڈاکٹر عابد حسین سے ہوئی تو اس نے پہلی فرمائش ان سے یہ کی کہ وہ اسے ہندوستان کے تمام قابل دید مقامات دکھائیں گے۔

''آپ کو معلوم ہے میں سیر و سیاحت کی دبی دبی آرزو لے کر آپ کے گھر آئی ہوں۔ یہ آرزو ایسی ہے کہ اگر میں مرد ہوتی تو ایک تھیلا لٹکا کر خود ہی سیاحت کے لیے نکل کھڑی ہوتی لیکن میں عورت ہوں۔ مجھے کسی مضبوط سہارے کا انتظار تھا۔ وہ سہارا آپ ہیں۔ آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ میرا یہ شوق پورا کریں گے۔''

''یہ پہلی خواہش ہے جس کا اظہار آپ نے مجھ سے کیا ہے۔ میں اسے کیسے ٹال سکتا ہوں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں آپ کو ہندوستان ہی کی نہیں یورپ کی بھی سیر کراؤں گا۔''

''مجھے بڑی آرزو ہے کہ میں جس مقام کی سیر کروں اس کا احوال کسی رسالے میں شائع کراؤں۔ دنیا کو بھی تو معلوم ہو کہ میں نے کن کن مقامات کی سیر کی۔''

''آپ کی یہ آرزو ضرور پوری ہوگی۔''

وہ اس وعدے سے خوش تو بہت ہوئی لیکن میاں کا یہ وعدہ محض وعدہ لگا کیونکہ اس وقت جو مالی حالات تھے اس میں گزر بسر ہی مشکل سے ہو رہی تھی سفر کے لیے پاؤں کہاں اٹھتے۔ اس نے اسے بھی غنیمت جانا کہ آدمی گر نہ دے گر کی سی بات تو کرلے۔

یہ وعدہ عابد صاحب نے کسی ایسے وقت کیا تھا جب قبولیت کی گھڑی تھی۔ بعد میں حالات ایسے بدلے کہ سفر کے مواقع ہاتھ باندھ کر پکارتے رہے۔ اس نے پورے ہندوستان کا سفر کیا اور یورپ کی سیر بھی کی۔ جرمنی میں تو چند مہینے رہی بھی۔ یہ لوگ امریکا اور روس بھی جانا چاہتے تھے لیکن ویزا نہیں ملا۔

اس نے زیادہ تر سفر تو اپنے بھائی خواجہ غلام السیدین کی وجہ سے کیے جہاں یہ لوگ گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے جاتے تھے۔ کشمیر، بمبئی اور پونا بار ہا گئے پھر دوسرے دوستوں کے بلاوے پر مختلف جگہوں پر جاتے رہے۔ عابد صاحب نے وعدے کے مطابق یورپ تک کی سیر کرادی۔

اس نے بھی اپنا وعدہ پورا کیا۔ وہ جہاں کا سفر کرتی وہاں کا سفرنامہ مضمون کی شکل میں ضرور لکھتی۔ یہ مضامین رسائل میں شائع ہوتے۔

بات یہیں ختم نہیں ہوگئی بلکہ جب وہ اپنی خودنوشت ''سلسلہ روز و شب'' لکھنے بیٹھی تو ان سیاحتوں کا حال تفصیل سے لکھا۔ یہ تفصیل اتنی زیادہ ہوگئی کہ خودنوشت کا حجم بہت بڑھ گیا لہٰذا پبلشر کے مشورے سے اس حصے کو الگ کر کے سفرنامے کی حیثیت دے دی۔

اس سفرنامے کو اس نے دو حصوں میں تقسیم کیا۔ پہلے حصے کا عنوان ''ہندوستان جنت نشان'' رکھا۔ اس میں ہندوستان کے مختلف علاقوں مثلاً حیدر آباد، میسور، اجنتا ایلورا وغیرہ کی سیاحت کی روئیداد بیان کی، دوسرے حصے کا عنوان ''مسافر نواز بہتیرے'' رکھ کر اس میں انگلستان، جرمنی، پیرس، سوئٹزرلینڈ اور اٹلی میں گزارے ہوئے لمحات کا بیان کیا۔

دعا

ایک دوسرے کو دعاؤں میں یاد رکھا کرو ہوسکتا ہے کسی کا بہت بڑا کام تمہاری چھوٹی سی دعا کا محتاج ہو۔

از: کامران خان، کوہاٹ

اردو میں سفرناموں کی روایت زیادہ پرانی نہیں اور ایسے سفرناموں کی موجودگی تو بہت ہی کم ہے جن میں وہاں کے انسانوں کے دلوں کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہوں۔ وہاں کے باشندوں کے کردار جیتے جاگتے سانس لیتے نظر آتے ہوں۔ صالحہ عابد حسین کے حساس قلم نے یہ تصویریں اس طرح بنائی ہیں کہ ہر ملک کے لوگ سبزہ، پھل پھول، برف، پرندسب کچھ اپنے سے لگنے لگتے ہیں۔ وہ تماشائی ضرور لگتی ہے لیکن بھیڑ میں گم ہوکر انہی جیسی لگنے بھی لگتی ہے اور یہ اسی لیے ہوا ہے کہ وہ راوی بن کر بیان نہیں کرتی بلکہ اس نے اپنے جذبات کو لفظوں کا پیراہن عطا کیا ہے۔ ایسے الفاظ منتخب کیے جو سیر کی ترجمانی بھی کرتے ہیں۔ سفر کی بھی اور سیاحت کی بھی۔

اس نے ثابت کردیا کہ وہ کثیر الجہت ادیبہ ہے۔ ناولوں کے ساتھ ساتھ اس نے پڑھنے والوں کو افسانوں کے بھی کئی مجموعے دیے۔

اس کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''نقش اول'' اس کے پہلے ناول ''عذرا'' سے قبل 1946ء میں شائع ہوا۔ اس میں شامل افسانوں کا موضوع رومان، عورتوں کی تعلیم و آزادی کی سماجی تیور کی مخالفت اور پرانے رسوم و رواج پر تنقید ہے۔ مغربی تہذیب کی اندھی تقلید کے برے نتائج کا تاثر بھی ملتا ہے۔

مولوی عبدالحق نے نقش اول کا تعارف کراتے ہوئے لکھا تھا۔ ''ان قصوں کا تعلق زیادہ تر ہماری تہذیب و معاشرت اور گھریلو زندگی سے ہے جن میں افسانوں کے لیے کافی سامان موجود ہے۔ نظر اور تخیل شرط ہے اور اس کے ساتھ بات کہنے کا سلیقہ۔ بیگم صالحہ عابد حسین میں یہ تینوں چیزیں پائی جاتی ہیں۔ ان قصوں کی زبان و بیان سادہ اور دلکش ہے۔ ان میں سے بعض پرلطف بھی ہیں بعض بہت پُر درد ہیں۔''

اسی سال دوسرا مجموعہ ''ساز ہستی'' کے نام سے شائع ہوا۔ اس نے اس کے دیباچے میں لکھا۔

''نقش اول کے بعض افسانے انگریزی سے ماخوذ تھے لیکن یہ افسانے طبع زاد ہیں۔ ان میں سے اکثر کے پلاٹ میرے مشاہدے پر مبنی ہیں۔ اس مجموعے کا ایک افسانہ ''سنبھالا'' بہت مشہور ہوا۔ اس افسانے سے اسے ملک گیر شہرت حاصل ہوئی۔

1948ء میں اس کا تیسرا مجموعہ ''نراس میں آس'' شائع ہوا۔ اس مجموعے میں سارے افسانے 1947ء کے خونیں اور انسانیت سوز واقعات کے بارے میں ہیں۔

ان افسانوں کے بیشتر پلاٹ ان واقعات سے بنے گئے ہیں جو مصنفہ کے عزیزوں اور دوستوں کو پیش آئے۔ ان واقعات کو تخیل کی پرواز عطا کرکے افسانوں میں ڈھال دیا اور یہ دکھایا کہ اس دور حیوانیت اور جنون میں بھی جگہ جگہ انسانیت کے نمونے بھی تھے جنہوں نے خود کو خطرے میں ڈال کر لوگوں کی جان اور عزت کو بچایا۔

ان افسانوں کے ذریعے اس نے یہ بتانے کی کوشش کی کہ یہ ایک وقتی جنون تھا۔ سیاست کی چالیں تھیں۔ یہ حاکم قوم چلتے چلتے آزادی کی قیمت اس طرح وصول کرگئی ورنہ برصغیر کی اصل پہچان اس کا بھائی چارہ ہے۔ اس نے اپنے ان خیالات کو مختلف کرداروں کے ذریعے دہرایا ہے۔

یہ افسانے مصنفہ کے وقتی اضطراب دکھ اور مایوسی کی کیفیت کے غماز ہیں۔

اس کا چوتھا مجموعہ ''نو نگے'' تھا۔ اس میں کئی افسانے ایسے ہیں جو بدلتے ہوئے حالات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ وقت کے ساتھ مسائل کی نوعیت بھی بدل گئی۔ اب ان افسانوں میں وہ عورت نظر آتی ہے جو گھر کی چاردیواری تک محدود نہیں گھر سے باہر بھی نکلتی ہے۔ اس نے ایک افسانے ''ملاپ'' میں ایک ایسی عورت دکھائی ہے جو اپنی گھریلو ذمہ داریاں نظر انداز کرکے میاں اور بچے کو چھوڑ کر سیاست میں حصہ لیتی ہے اور اسے اس کی بھاری قیمت چکانی پڑتی ہے۔ وہ اپنی مصروفیات میں بچے کا خیال نہیں رکھ پاتی اور اس کا بچہ مرجاتا ہے۔

یہ نئی زندگی کے نئے مسائل ہیں۔

درد و درماں اور تین چہرے تین آوازیں اس کے وہ افسانوی مجموعے ہیں جو فنی لحاظ سے زیادہ کامیاب ہیں۔ یہ افسانے بھی جدید مسائل کو پیش کرتے ہیں مگر اب ان میں تنوع ہے اور مصنفہ گہرائی سے ان مسائل کو دیکھتی ہے۔

یہ افسانے ظاہر کرتے ہیں کہ اس نے افسانے کے فن میں قدم بہ قدم ترقی کی ہے۔

تین چہرے تین آوازیں کے افسانوں نے ہندوستان و پاکستان ہی میں نہیں لندن، امریکا اور کینیڈا کے شہروں میں بھی مقبولیت حاصل کی۔ جس نے سنا اس نے یہی کہا کہ یہ کہانی تو ہماری ہے۔

اس مجموعے میں شامل افسانوں کا موضوع بھی عورت تھا لیکن یہ نئے زمانے کی عورت ہے۔ اس زمانے کی جب کہ انسانی حقوق کی باتیں ہو رہی ہیں۔ عورتوں کے تحفظ اور وقار کے قوانین بن رہے ہیں مگر یہ عورت آج بھی ظلم و جبر کا شکار بن رہی ہے۔

اس کا ایک افسانہ ''مگر وہ ٹوٹ گئی'' ہے یہ جدید زمانے کی اعلیٰ تعلیم یافتہ خود مختار عورت کی کہانی ہے جو اپنی انانیت کے شکار شوہر کے ساتھ ہر سمجھوتا کر کے اپنی شادی کو بچانا چاہتی ہے کہ اچانک اسے طلاق نامہ ملتا ہے۔

صالحہ عابد حسین کے ساتھ بھی نقادوں کا وہی رویہ رہا جو دوسری ناول نگار خواتین کے ساتھ رہا کہ یہ ناول چار دیواری تک محدود ہیں۔ نقادوں نے ایک دوسرے کی رائے سے متاثر ہو کر خواتین ناول نگاروں کے بارے میں یہ رائے قائم کر لی اور صالحہ کے ناولوں پر اصلاحی کا ٹھپا لگا کر اس کی ''فن'' سے ناواقفیت مسلم کر دی۔ ترقی پسند تحریک کے اصولوں پر ادب کو پرکھا جانے لگا۔ اس کے علاوہ سب بے کار لہٰذا صالحہ کے ناولوں کو بھی انہی اصولوں پر پرکھا جانے لگا اور قابل اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ یہی سلوک اس کے افسانوں کے ساتھ بھی روا رکھا گیا لیکن اس کے باوجود اس کی تحریروں کو پسند کیا گیا اور معتدل نقادوں نے اس کے ناولوں اور افسانوں کو کامیاب قرار دیا۔

''نقش اول کے افسانے ادبی خلوص و سادگی بیان اور افسانوی دلکشی کی بڑی اچھی مثالیں، ایک پیسا تار اور خواب آرزو خصوصاً ایسے افسانے ہیں جنہیں اردو کے افسانوی ادب کی صف اول میں رکھا جا سکتا ہے۔

''صالحہ عابد حسین کے افسانوں میں زندگی کی حقیقت چھپی ہوئی ہے۔ ان کا مطالعہ کرنے سے زندگی کی سچائی سامنے آتی ہے اور قاری اسے بے جھجک قبول کر لیتا ہے۔''

''صالحہ عابد حسین اعلیٰ پائے کی ناول نگار تھیں۔ مسلم معاشرہ اور اس کی تہذیب و تمدن ان کا خاص موضوع تھا۔ ان کے ناولوں میں سماجی شعور کے ساتھ اصلاحی رجحان کی کار فرمائی ہے۔''

''صالحہ عابد حسین کا یہ امتیاز ہے کہ وہ ہر موڑ پر متضاد جذبات کی عکاسی فنکاری کے ساتھ کرتی ہیں۔ رقابت، عشق و محبت یہاں تک کہ جنسی کیفیات کو بھی اس ڈھنگ سے پیش کرتی ہیں کہ مریضانہ خواہشات میں جنبش نہیں ہوتی۔ صالحہ عابد حسین کا قلم جو ایک حسن کار کی گرفت میں ہے، بے قابو نہیں ہوتا محتاط ہی رہتا ہے۔ یہ احتیاط زاہدانہ نہیں فنکارانہ ہے حسین اشاریت کے پردے میں وہ نازک مرحلے سے گزر جاتی ہیں۔''

☆......☆

انشا پردازی کی زندگی میں اس نے جتنی کامیابی حاصل کی اس سے زیادہ معاشرتی زندگی میں حاصل کر لی۔ میکے سے لے کر سسرال تک عابد صاحب کے دوستوں سے لے کر جامعہ کی برادری تک ہر جگہ اپنی ملنساری اور وضعداری کا سکہ بٹھا دیا اور سب سے عزیزانہ تعلقات قائم کر لیے۔ لکھنے پڑھنے سے وابستہ لوگوں میں دنیاداری کا عنصر کم ہوتا ہے لیکن صالحہ دونوں محاذوں پر کامیاب تھیں۔ اس کا قلم بھی سرپٹ دوڑ رہا تھا اور تعلقات کی کشتی پر بھی سوار تھی۔ شوہر کی دلداری میں بھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

اس خوشگوار زندگی میں اگر کوئی کمی تھی تو وہ یہ کہ اولاد نہیں تھی اور نہ ہونے کی امید تھی۔ اس کا ازالہ ان دونوں نے اس طرح کیا کہ اپنے بھائی بہنوں کے بچوں کو اپنا لیا۔ انہیں اپنے پاس بلا کر رکھا۔ ان کی تعلیم و تربیت کی۔ ان سب کو اعلیٰ تعلیم دلائی اور ان کو ان کے پیروں پر کھڑا کیا۔ اپنے محدود وسائل میں کئی بڑے کام کیے۔

عابد صاحب سے نباہ کرنا بھی آسان کام نہیں تھا کیونکہ دونوں کے مزاجوں میں بڑا تضاد تھا۔ عابد صاحب کے مزاج میں جھلاہٹ تھی، قوت برداشت کی کمی تھی جب کہ صالحہ کا مزاج تیز تھا۔ عقل پر جذبے کا غلبہ تھا۔ دونوں میں ٹکراؤ لازمی تھا اور شروع شروع میں ایسا ہوا بھی لیکن یہاں بھی اس کی صلح جو طبیعت نے کام دکھایا۔ اپنی کمزوری کو خود محسوس کیا اور مفاہمت کی راہ اپنائی۔ کمزوریوں کو نظر انداز کر کے شوہر کی خوبیوں پر نظر رکھی اور آہستہ آہستہ گھر جنت بنتے!

لگا۔ اس تبدیلی کی عابد صاحب نے بھی قدر کی۔

"جب گھر سجا سجایا رہنے کے قابل بن گیا اور اس میں لڑائی جھگڑے، شور و شغف کے بجائے امن و سکون کی فضا پیدا ہوگئی تو میری وحشت اور گریز پائی ختم ہوگئی۔ میں اپنا زیادہ وقت گھر پر کام میں اور اپنی بیوی کی صحبت میں گزارنے لگا۔"

صالحہ اپنے کو بہت خوش قسمت سمجھتی تھی جسے عابد صاحب جیسا شوہر ملا دوسری طرف عابد صاحب بھی کم خوش قسمت نہیں تھے جنہیں ایسی بیوی ملی۔

اسی مفاہمت نے ایسے مواقع اور ذہنی فرصت عطا کی کہ وہ اتنا ادبی کام کر سکی ورنہ مسائل سب کی زندگی میں آتے ہیں اس کی زندگی بھی اس سے خالی نہیں تھی۔

بڑھاپا دروازے پر دستک دینے لگا تھا۔ پہلی بچی کی پیدائش کے بعد ہی سے وہ مسلسل بیمار چلی آرہی تھی۔ علاج ہوتے رہتے تھے اور پھر جوانی تھی لیکن جوں جوں عمر بڑھتی گئی امراض بھی بڑھتے گئے۔ بھائیوں کی جدائی اور خاندان میں ہونے والی دیگر اہم اموات نے ایسے صدموں سے دوچار کیا کہ اس جیسی محفل پسند خاتون کو تنہائی کا احساس ہونے لگا۔ کبھی کبھی اس کی بے زاری بڑھ جاتی مگر پھر ہر صدمے کو بھلا کر زندگی میں دلچسپی لینا شروع کر دیتی باہر نہیں جا سکتی تو گھر میں ہی اکثر ادبی محفلیں کرتی لوگوں کو بلاتی۔ ٹی وی دیکھنے میں وقت گزارتی۔ فلموں کا بہت شوق تھا۔ ٹی وی فلمیں اور سیریل دیکھتی۔ سفر کی شوقین ہونے کے باوجود سفر سے گریز کرنے لگی تھی مگر پھر بھی پریم چند صدی تقریبات میں شرکت کے لیے دہلی گئی۔ لکھنو اور پٹنہ بھی گئی۔ مشاعروں اور جلسوں میں پانی پت اکثر جاتی تھی۔

جب انیس کی صد سالہ برسی منائی گئی تو جگہ جگہ سیمینار منعقد ہوئے۔ وہ یادگار انیس کمیٹی کی ممبر تھی اور مراثی انیس سے اس کی دلچسپی کے تحت اسے سیمیناروں میں مدعو کیا گیا۔

مکتبہ جامعہ نے اس سے فرمائش کی کہ وہ ایک مجموعہ مرتب کرے تاکہ مکتبہ اس کو انیس صدی یادگار سال میں پیش کرے۔ اسے پھر لکھنے بیٹھنا پڑا۔ اس نے کچھ سیمیناروں کے مقالوں اور دو ایک پہلے کے مضامین اس میں شامل کر کے ایک کتاب مرتب کی۔ "انیس سے تعارف" ان مقالوں میں انیس کے کلام کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی۔

اس مجموعے میں اس نے آٹھ مقالے شامل کر کے اسے مکمل کیا۔ "مرثیہ اور انیس" کے تحت اس نے یہ ثابت کیا کہ انیس نے اپنے مرثیوں میں وہ ادبی خوبیاں پیدا کیں کہ وہ اردو شاعری کی ایک اہم صنف قرار پایا۔ ایک مقالے میں کلام انیس کا جائزہ اس نظر سے لیا کہ اس نے مرثیہ لکھتے ہوئے کس طرح ہندوستانی تہذیب کو اس میں سمویا۔ ایک مضمون میں میر انیس کی سوانح کو نہایت تحقیق کے ساتھ بیان کیا۔ میر انیس کی منظر نگاری کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ وہ جس واقعے کو بیان کرتے ہیں اس کی تصویر کھینچ کر رکھ دیتے ہیں۔ اس نے انیس کی اس خوبی کو ایک مضمون میں تفصیل سے بیان کیا۔

اس کتاب میں ایک مضمون "مراثی انیس میں خاندانی زندگی کی جھلکیاں" وہ بھی تھا جو اس نے صد سالہ تقریبات سے پہلے لکھا تھا اور جسے لکھتے ہوئے اسے خیال آیا تھا کہ اس موضوع پر کتاب لکھی جا سکتی ہے اور اس نے ایک کتاب "خواتین کربلا" لکھی تھی۔ اس کتاب میں اس سے بحث کی گئی تھی کہ آخر اس معرکہ حق و باطل میں امام حسینؓ نے اپنے خاندان کی خواتین کو لے جانے کا فیصلہ کیوں کیا۔

اس کتاب کے بارے میں اور لوگوں کے علاوہ ماہر انیسیات سید مسعود حسن رضوی نے بھی بہت پسند کیا تھا اور عام طور پر اسے انیسیات میں اضافہ کہا گیا۔

وہ انیس کمیٹی کی فرمائش کے تحت ایک مجموعہ "انیس ایک تعارف" مکمل کر رہی تھی کہ اپنے شوہر کی بیماری کی تشخیص کا سن کر دہل گئی۔ عابد حسین کی گرتی ہوئی صحت کی طرف سے وہ بہت فکرمند رہتی تھی لیکن جب ڈاکٹروں نے یہ بتایا کہ انہیں کینسر ہے تو اس کی پریشانی کی انتہا نہ رہی لیکن وہ صالحہ عابد حسین کیا جو پریشانیوں میں ہمت ہار بیٹھے۔ اس پریشانیوں میں بھی اس نے اپنی ذمہ داریوں سے منہ نہیں موڑا۔ ادبی کاموں میں بھی مشغول رہی اور عابد صاحب کی تیمارداری بھی کرتی رہی۔ انہیں اسپتال لے کر جاتی۔ کئی مرتبہ وہ اسپتال میں داخل ہوئے تو وہ ان کے ساتھ رہی۔ علاج چلتا رہا۔ زندگی بھی چلتی رہی۔ آخر وہ اسٹیج بھی آگیا جب ڈاکٹروں نے کہہ دیا کہ اب انہیں اسپتال میں داخل کرنا ان کو تکلیف دینا ہے۔ وہ انہیں گھر لے آئی۔

وہ خود بھی بیمار رہنے لگی تھی۔ اسے سانس کی تکلیف تھی جو سردیوں میں زیادہ تکلیف دینے لگتی تھی۔ بڑھاپے کی اور بھی تکلیفیں تھیں جن سے وہ نبرد آزما تھی لیکن اب وہ سب کچھ بھول کر شوہر کی تیمارداری کر رہی تھی۔ گھر میں اور لوگ بھی تھے لیکن اسے کسی پر بھروسا نہیں تھا۔ وہ شوہر کی [illegible]

گئی بیٹھی تھی۔ عجیب بے چارگی تھی۔ ڈاکٹر جواب دے چکے تھے۔ دوائیں دی جارہی تھیں لیکن زندگی قطرہ قطرہ کم ہو رہی تھی۔ آخر 13 دسمبر 1978ء کو ڈاکٹر عابد حسین کا انتقال ہو گیا۔

یہ سانحہ ایسا تھا کہ خود فراموش ہو جاتی لیکن وہ خود کو نہ سنبھالتی تو دوسروں کا کیا حال ہوتا۔ غم گسار بہت سے تھے لیکن اپنی صلیب اسے خود اٹھانی تھی۔ اس کی راتیں اس کی آنکھوں میں جلنے لگیں۔

وہ جب اس گھر میں آئی تھی تو گھر اکیلا تھا۔ اب سب تھے مگر پھر بھی گھر اکیلا تھا۔ یہ تنہائی اسے پریشان کررہی تھی۔ اس کے بہت سے عزیز پاکستان میں تھے۔ بہت سے تعزیت کے لیے علی گڑھ آئے بھی تھے۔ جو نہ آسکے تھے وہ اس سے ملنے کے لیے بے چین تھے۔ ان کا اصرار تھا کہ وہ ایک پھیرا پاکستان کا لگالے۔ اس نے بھی تنہائی سے بچنے کا بہانہ یہی ڈھونڈا کہ وہ پاکستان جاکر عزیز و اقارب سے مل آئے۔ عابد صاحب کی بھانجی صغرا مہدی اس کے ساتھ رہتی تھی۔ اس نے اس کے ساتھ پاکستان کے لیے رخت سفر باندھا۔ وہ اس کے ساتھ لاہور اور اسلام آباد گئی۔ یہاں اس نے ایک ماہ قیام کیا۔ اس دوران اس نے رشتہ داروں سے ملنے کے علاوہ ادبی نشستوں میں بھی شرکت کی جو اس کے اعزاز میں سجائی گئی تھیں۔ مختلف جگہوں پر خطاب بھی کیا۔ اس کی یہ ہمت دیکھ کر رشتہ داروں کو اطمینان ہوا کہ وہ زندگی کی طرف لوٹ آئی ہے۔

ایک ماہ بعد واپس آئی تو بظاہر اپنے غموں کو بھلا چکی تھی لیکن گھر میں چند شب و روز گزارے تو اسے اپنے شریک حیات کی یاد ستانے لگی۔ اب وہ نہیں تھا اس کی یادیں رہ گئی تھیں۔ اب وہ نہیں تھا اس کے وہ خطوط تھے جو کبھی اس نے صالحہ کے نام لکھے تھے۔ وہ ان خطوط سے جی بہلانے لگی۔ اس میں اسے وہ خطوط مل گئے جو عابد صاحب نے مشرقی اور مغربی ممالک کا سفر کرتے ہوئے اس کے نام لکھے تھے۔ یہ سفر ڈاکٹر عابد حسین نے ہندوستان میں اسلام اینڈ دی ماڈرن ایج سوسائٹی کے قیام کے لیے کیا تھا تاکہ بعض مغربی ممالک کے اسلامی اسکالرز سے تبادلہ خیال کرکے اس کے مقاصد اور طریقہ کار طے کریں۔

یہ خطوط ذاتی اعتبار سے بھی اہم تھے اور اس اعتبار سے بھی کہ یہ عابد صاحب کی اسلامی خدمات پر روشنی ڈالتے تھے۔ اس نے سوچا ان خطوط کو عام ہو جانا چاہیے۔ اس کے

ان خطوط کو ترتیب دے کر ایک سفر نامہ ترتیب دینے کا منصوبہ بنایا تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ وہ کس تاریخ کو کہاں تھے۔ کیا باتیں ہوئیں، کس سے ملے وغیرہ وغیرہ۔ اسے مکتوباتی سفرنامہ کہا جا سکتا تھا جو اپنی نوعیت میں منفرد تھا۔

اس مکتوباتی سفرنامے کا نام اس نے ''رہ نوردِ شوق'' رکھا۔ اس نے ان خطوط کو تاریخ وار مرتب کیا اور ''ہم سفر'' کے عنوان سے ایک طویل مقدمہ لکھا جس میں عابد صاحب کے ان اسفار (سفر کی جمع) کا بھی ذکر ہے جو اس نے شادی سے پہلے کیے تھے اور ان کا حال بھی ہے جو دونوں نے ساتھ مل کر کیے۔

''نامہ ہائے سفر'' کے عنوان سے ترتیب وار خطوط درج کیے۔ ان خطوط کی مدد سے قاری یہی محسوس کرتا ہے جیسے وہ کوئی سفرنامہ پڑھ رہا ہے۔

اس سفر کی وہ تفصیلی رپورٹ بھی شائع کی جو عابد صاحب نے خود لکھی تھی۔

اسے تو مصروفیت درکار تھی۔ ان خطوط کو ترتیب دے چکی تو اس نے دوسرے خطوط کو کھنگالا۔ اس نے ''آوازِ دوست'' کے نام سے اپنے نام کے عابد صاحب کے خطوط مرتب کیے۔ احباب نامے کے عنوان سے مشاہیر کے خطوط عابد حسین کے نام مرتب کیے۔

تدوین کے سلسلے میں اس کا ایک اہم کام انیس کے مرثیوں کا انتخاب تھا جو اس نے دو جلدوں میں مکمل کیا۔ یہ ایک مشکل ترین کام تھا جو اس نے بیماری اور کمزوری کے باوجود پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

انیس کے مراثی کے مختلف نسخوں کو تلاش کرنا، ان کا موازنہ کرنا، چھان بین کے بعد کسی ایک نسخے کو بنیاد بنانا اور پھر ان مرثیوں کو واقعات کے اعتبار سے ترتیب دینا آسان نہیں تھا۔ اس نے اس مشکل کو اس وقت مزید مشکل بنا دیا جب اس نے کم استعداد والے حضرات کی سہولت کے لیے مختصر سی فرہنگ بھی آخر میں دے دی جس میں مشکل لفظوں، تشبیہوں، استعاروں وغیرہ کو واضح کیا۔ بعض جگہ پورے مصرعے یا شعر کا مطلب سمجھا دیا۔ تحقیق کرنے والوں کی خاطر اختلافِ نسخ بھی دے دیا گیا۔

اس کے بعد وہ اپنی ادھوری خودنوشت مکمل کرنے بیٹھ گئی۔

اس خودنوشت میں اس نے اپنے خاندان، وطن اپنے زمانے اپنے ملک کی تہذیب اور سیاسی حالات کے پس منظر میں اپنی زندگی کے حالات کو پیش کیا۔

پانی پت، علی گڑھ اور جامعہ اسلامیہ کا ذکر کیا۔ خاص طور سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کا جہاں اس کی زندگی کا بہت بڑا حصہ گزرا۔

یہ حصہ اس لیے بھی اہم ہے کہ اس سے مدد لے کر جامعہ ملیہ کی تاریخ لکھنے میں بہت مدد مل سکتی ہے۔

خودنوشت لکھنا آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ آسان تو اس لیے کہ اس کی زندگی کا سارا مواد اس کے حافظے میں ہوتا ہے لیکن مشکل اس لیے کہ ہر بات بتانے کی نہیں ہوتی۔ کون سی بات بتانی ہے کون سی چھپانی ہے۔ اس کا انتخاب کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ خاص طور پر اس وقت جب یہ خودنوشت کسی خاتون کی ہو اور خاتون بھی وہ جس کی تحریریں اعلیٰ اخلاق کی تبلیغ کرتی رہی ہوں۔

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اسے اپنی زندگی میں ایسے واقعات پیش ہی نہیں آئے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس نے ان معاملات کو خودنوشت میں شامل نہیں کیا لیکن اپنی شخصیت کی بعض کمزوریوں کو نظرانداز بھی نہیں کیا۔

خودنوشت ''سلسلہ روز و شب'' میں دوسرے لوگوں کی کمزوریوں کا ذکر ہے بھی تو اس میں بھی ہمدردی کا عنصر ہے۔ سفاکی نہیں۔ مثلاً عابد صاحب کی بہن سے تعلقات کی خرابی کا ذکر کرتے ہوئے اپنا قصور بھی تسلیم کرتی ہیں۔ نند کا قصور بیان بھی کرتی ہے تو اس کی نفسیاتی توجیہہ بھی پیش کرتی ہے۔

''ان کے دل میں میری نفرت تھی ہی نہیں بلکہ محبت اور قدر تھی جو بعض وجوہ سے نفرت کے قالب میں ڈھل گئی تھی۔''

اسی طرح اپنے شوہر کی پہلی بیوی کے بارے میں لکھتے ہوئے کہتی ہے۔

''اگر ان سے تعلقات خوشگوار رہے تو اس میں مجھ سے زیادہ ان کی طبیعت کی نیکی، محبت اور قدردانی کا ہاتھ تھا۔''

سلسلہ روز و شب کی سب سے بڑی کامیابی اس کا اندازِ بیان اور ایمانداری ہے جو پڑھنے والے کو اپنے سحر میں جکڑے رہتا ہے۔

اس خودنوشت کو تحریر کرتے ہوئے وہ کئی مرتبہ بیماری کے حملے سے بے حال ہوئی۔ اسپتال میں داخل بھی ہونا پڑا، تندرست ہو کر پھر لکھنے بیٹھ گئی اور بالآخر اسے مکمل کیا۔

اس دوران اس نے عابد حسین کے چچازاد بھائی حسن مہدی کے بیٹے اور بیٹی کی شادی طے کی اور اس کے انتظامات کیے۔ دونوں بچوں کو انہوں نے اپنے بچوں کی طرح پالا تھا۔

اس کی بیماری بڑھتی جا رہی تھی۔ دمہ تو تھا ہی اب ہارٹ کی تکلیف بھی رہنے لگی تھی۔ ان کے ہمدرد اور دوست اس کی صحت کی طرف سے فکرمند رہنے لگے تھے۔ یہاں رہ کر علاج کرا کے دیکھ لیا تھا۔ وقتی طور پر فائدہ ہو جاتا تھا مگر تکلیف پھر بڑھ جاتی تھی۔

اس کی عزیز دوست ظہیر علی رضا اور ان کی بیٹی ڈاکٹر عذرا کو معلوم ہوا تو انہوں نے امریکا آنے اور وہاں علاج کرانے کا مشورہ دیا۔ اس کی اس دوست کا قیام امریکا کے شہر ''بفلو'' میں تھا۔

وہ اس قدر طویل سفر کے لیے ہرگز تیار نہیں ہو رہی تھی لیکن صغرا مہدی (عابد صاحب کی بھانجی جو اس کے پاس رہتی تھی) نے بھی یہی مشورہ دیا کہ وہ امریکا جا کر اپنا علاج کرائے۔ بالآخر وہ مان گئی اور امریکا کی سیر کا ارادہ کر لیا۔ امریکا جاتے ہوئے وہ ایک ہفتے کے لیے لندن ٹھہری جہاں اس کی کزن حامدہ شوکت اور رشتے کے بھتیجے یعقوب علی تھے۔

لندن پہنچتے ہی وہاں کے موسم نے دمے کی تکلیف کو بڑھا دیا۔ اس تکلیف نے اسے گھر تک محدود کر دیا اس کے جاننے والے اس سے آ کر ملتے رہے۔

افتخار عارف اردو مرکز لندن میں موجود تھے۔ وہ کسی نہ کسی طرح اسے اردو مرکز لے آئے۔ لندن میں موجود ادیبوں نے اسے خوش آمدید کہا۔ اس نے یہاں اپنا افسانہ پڑھا جو بہت پسند کیا گیا۔

لندن میں ایک ہفتہ گزارنے کے بعد وہ امریکا کے شہر بفلو روانہ ہو گئی۔ یہاں پہنچ کر اس کی طبیعت اتنی خراب ہو گئی کہ اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ اسپتال میں اس کا مکمل چیک اپ ہوا۔ ایک ہفتہ اسپتال میں رہنے کے بعد اس کی طبیعت سنبھل گئی۔

علاج سے زیادہ اس کے میزبانوں کی والہانہ محبت اور خیال کا بھی اثر تھا کہ دو ہفتوں کے آرام کے بعد وہ بالکل ٹھیک ہو گئی۔

یہاں بھی اس کے اعزاز میں کئی ادبی محافل منعقد ہوئیں۔ ان محفلوں میں وہ کسی صحت مند خاتون کی طرح شریک ہوئی اور اپنی نگارشات پڑھیں۔

اس نے صغرا مہدی کو اصرار کر کے امریکا اور کینیڈا کے ان شہروں کی سیر کو بھیج دیا جہاں عزیز یا دوست قیام پذیر تھے اور خود واشنگٹن چلی گئی۔ واشنگٹن میں علی گڑھ کے لوگوں کا بڑا حلقہ تھا۔ یہاں پہنچتے ہی پذیرائی کے ہار اس کے گلے کے ہار بن گئے۔ اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ یہ لوگ اس کی تقریباً تمام تصانیف سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ انہیں پڑھ چکے ہیں۔ اس کی شامیں آباد ہو گئیں۔ اہل علم و اہل ذوق حضرات اس سے ملنے آتے۔ علی گڑھ کی یادوں سے واشنگٹن آباد ہو گیا۔ اکثر باہر بھی جاتی اور اپنی تعریفوں کے پھول سمیٹتی۔

واشنگٹن میں ایسے مصروف اور خوشگوار دن گزارے کہ بیماری کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا۔ وہ خود کو تندرست سمجھنے لگی۔

واشنگٹن سے روانگی سے کچھ دن قبل صغرا مہدی بھی واشنگٹن پہنچ گئی۔ واپسی کا سفر دونوں نے اکٹھے طے کیا۔ تقریباً چھ ہفتے امریکا میں گزارنے کے بعد اپنی سرزمین پر قدم رکھا۔

واپس آنے کے بعد اس سفر کی روئیداد ''برائے خاطر احباب'' کے عنوان سے لکھی۔ اس میں اس کے وہ تجربات بھی تھے جو بیماری کے سلسلے میں ہوئے۔ وہاں کا طریقۂ علاج، ڈاکٹرز، اسپتال، نجی محفلوں اور ادبی فضا کا احوال اپنے مخصوص انداز میں تحریر کیا۔

☆......☆

صغرا مہدی اس کی الماریاں درست کر رہی تھی۔ سامان کو درست کر کے اِدھر اُدھر رکھ رہی تھی کہ اس کی نظر صالحہ کے پاسپورٹ پر پڑی جو منسوخ ہو چکا تھا اور صالحہ نے اس کی تجدید بھی نہیں کرائی تھی۔ اس نے صالحہ کی توجہ اس طرف دلائی۔

''آپ کے پاسپورٹ کی مدت ختم ہو گئی ہے۔ اس کی تجدید تو کرا لیں۔''

''اب کون سا مجھے ملک سے باہر جانا ہے۔ تمہارے ساتھ جو امریکا ہو کر آئی، یہ آخری سفر تھا۔ اب میں نے طے کر لیا ہے کہ کہیں نہیں جاؤں گی۔ میری صحت بھی اب اجازت نہیں دیتی۔''

''آپ کون سی بیمار ہیں۔ چھوٹی موٹی تکلیفیں تو ہوتی ہی رہتی ہیں۔ اس کے لیے ڈاکٹر عاصمہ موجود ہیں جو آپ کو

آکر دیکھ جاتی ہیں۔ ڈاکٹر ماتھر بھی ہمارے خاندان پر مہربان ہیں۔ وہ بھی علاج معالجے کے لیے موجود ہیں۔"

"اس لیے تو کہہ رہی ہوں میں اب کہیں گئی تو ڈاکٹر عاصمہ اور ڈاکٹر ماتھر تو وہاں نہیں ہوں گے۔"

"پھر بھی پاسپورٹ تیار ہونا چاہیے۔ کہیں جانا پڑ گیا تو زحمت تو نہیں ہوگی۔"

"اے ہٹو اب میں کہیں نہیں جا رہی۔"

بات آئی گئی ہوگئی۔ صغرا نے بھی زیادہ زور نہیں دیا۔ اس نے پاسپورٹ کی تجدید نہیں کرائی۔

انہی دنوں ڈاکٹر عذرا رضا امریکا سے اپنے والدین سے ملنے پاکستان (کراچی) آئیں۔ وہ ہندوستان بھی آنا چاہتی تھیں تاکہ صالحہ سے مل لیں لیکن اسے ہندوستان کا ویزا نہیں ملا تھا۔ اس کا خط آیا کہ مصداق خالہ آپ کراچی آجائیں۔ اس نے ٹالنا چاہا لیکن پھر ڈاکٹر عذرا نے فون کا سہارا لیا۔ صبح شام فون آنے لگے۔ ان کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا۔ صالحہ کو ان کا حسن سلوک یاد آیا۔ جب وہ امریکا گئی تھی تو ڈاکٹر عذرا نے کیسی پذیرائی کی تھی۔ اس نے وعدہ کرلیا کہ وہ کراچی آئے گی۔ اب اسے یاد آیا کہ پاسپورٹ کی تجدید نہیں ہوئی ہے۔

ہندوستان میں اس کے تعلقات کی کمی نہیں تھی۔ اس نے ایک عقیدت مند کانگریسی لیڈر کو فون کیا۔ تین دن میں اس کا پاسپورٹ بن گیا۔ اس کا بھتیجا انور عباس ٹریول کمپنی میں تھا۔ اس کی کوشش سے ویزا بھی مل گیا گھر بیٹھے سیٹ بھی بک ہوگئی۔

وہ کراچی روانہ ہوگئی۔

یہ ایک بالکل نجی دورہ تھا۔ وقت بھی زیادہ نہیں تھا۔ عزیزوں اور دوستوں سے ملنے ہی میں وقت گزر گیا۔ دو چار ادبی محفلیں ضرور ہوئیں جن میں وہ شریک بھی ہوئی لیکن اسے ہندوستان واپس آنا تھا۔

دو ہفتے بعد وہ واپس آگئی۔

واپس آنے کے بعد وہ سخت بیمار ہوگئی۔ ہولی فیملی اسپتال میں داخل بھی ہونا پڑا۔ پھر ٹھیک ہو کر گھر آگئی۔ طبیعت اب بھی نہیں سنبھلی تھی۔ ڈاکٹر ماتھر گھر آکر دیکھ جایا کرتے تھے۔ لکھنے پڑھنے کا کام بالکل چھوٹ گیا تھا۔ اس دوران فالج کا معمولی اثر بھی ہوا۔ معائنے کے بعد معلوم ہوا کہ اثر ہوا ضرور تھا لیکن اب خطرے کی کوئی بات نہیں۔ اس کے باوجود وہ بستر پر آگئی۔ مہینوں فزیوتھراپی ہوتی رہی۔

اس کی قوت مدافعت کمال کی تھی۔ بڑی سے بڑی بیماری آتی تھی اور ٹل جاتی تھی۔ وہ فالج کے اس حملے سے بھی بچ گئی۔ اس کی قوت ارادی نے اسے تندرست کر دیا البتہ اس مرتبہ اس کی فطری شوخی ختم ہوگئی۔ وہ چپ چپ رہنے لگی تھی۔ اس کی اداسی اس وقت بے پناہ خوشی میں بدل گئی جب اس کی اپنی بھتیجی غلام السیدین کی سب سے چھوٹی بیٹی سیدہ حمید سترہ سال کینیڈا میں گزارنے کے بعد ہندوستان واپس آگئی۔ سیدین منزل جو اس کے بھائی کا گھر تھا پھر آباد ہو گیا۔

سیدین مرحوم کا ویران گھر بھی آباد ہوگیا اور خود صالحہ کی تنہائی بھی دور ہوگئی۔ سیدہ حمید اکثر آجاتی اور اس کی تنہائی میں باتوں کے پھول کھلا کر چلی جاتی۔ اس کے جانے کے بعد بھی وہ گھنٹوں اس کی باتوں میں محو رہتی۔ اس دلداری سے اس کی ایسی حوصلہ افزائی ہوئی کہ ایک مرتبہ پھر وہ لکھنے پڑھنے کی طرف راغب ہوئی۔ اس کے پاس کچھ سوانحی مضامین لکھے رکھے تھے۔ اس نے ان مضامین کو سمیٹا، نوک پلک درست کی۔ کچھ نئے مضامین لکھے اور "بزم دانش وروں" کے نام سے ایک مجموعہ مرتب کر دیا۔ یہ مضامین مختلف رسالوں میں شائع ہو چکے تھے۔ یہ مضامین اپنے بعض بزرگوں، دوستوں اور پیاروں کی یاد میں لکھے گئے تھے جو اب اس دنیا میں نہیں رہے تھے۔

"فن اور فنکار" کے نام سے بھی اس نے اپنے مضامین کا مجموعہ مرتب کیا۔ اس میں تمام مضامین ادبی نوعیت کے تھے۔ یہ مضامین بھی وہ تھے جو گزشتہ اٹھارہ بیس سالوں میں مختلف رسائل کی زینت بن چکے تھے۔ یہ مضامین یہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ صرف تخلیق کار نہیں تھی ایک ناقدانہ رائے بھی رکھتی تھی۔ ان مضامین میں بعض تنقیدی ہیں بعض تبصروں کے ذیل میں آتے ہیں۔ مثلاً ایک مضمون ٹیگور کے ایک ناول "کلموہی" پر ہے۔ یہ ناول اس نے اردو ترجمے کے ذریعے پڑھا۔ یہ ترجمہ ڈاکٹر عابد حسین نے انگریزی سے اردو میں کیا تھا۔

غالب کی نثر پر بہت مختصر مضمون ہے مگر بہت خوبی سے ان کے خطوط کے حوالے سے ان کی نثری خوبیوں کو پیش کیا ہے۔ اس طرح مرزا رسوا کا زندہ جاوید کردار، فسانہ آزاد، اقبال کی شاعری میں حب الوطنی وغیرہ اہم مضامین ہیں۔

وہ بنیادی طور پر ادیب تھی اس لیے ان مضامین میں

خشکی نہیں زبان و بیان کی چاشنی کا نمایاں حصہ جو پڑھنے والوں کی دلچسپی کو برقرار رکھتا ہے، بے جا تفصیل بھی نہیں جو پڑھنے والوں کا دھیان کسی اور طرف موڑ دے۔

عابد صاحب کی شاعری بھی اس مجموعہ کا اہم مضمون ہے جس میں اس نے ڈاکٹر عابد حسین کی شاعری کو جو مختلف رسالوں میں چھپی اس کو محبت سے جمع کیا اور اس پر اظہار خیال کیا۔ یہ ثابت کیا کہ عابد صاحب شاعری کی صلاحیت رکھتے تھے مگر انہوں نے اس کو اہمیت نہیں دی اگر وہ اس میدان کو اپناتے تو ان کا شمار اچھے شاعروں میں ہوتا۔

وہ افسانہ نگار بھی لہٰذا ایک مضمون ایسا بھی ہے جو اس نے غزل کی آپ بیتی کے عنوان سے غزل کو ایک زندہ کردار فرض کر کے اس کی تاریخ اور مختلف دور کے مختلف شاعروں کا تعارف ان کے اشعار کے حوالے سے کرایا۔

کیا دلچسپ انداز ہے۔

"آپ نے اتنا سمجھ لیا کہ میں صدیوں سے دنیائے شعر میں دلوں کی ملکہ اور ادب کی جان رہی ہوں اور آج بھی ہوں اور اپنی موجودہ مقبولیت کو دیکھتے ہوئے مجھے اگر یقین نہیں تو امید ضرور ہے کہ آیندہ بھی رہوں گی۔ کس روپ میں؟ یہ زمانہ بتائے گا مگر میری ایک بات یاد رکھیے اگر ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی تو میرا چہرہ مسخ ہو جائے گا۔"

"کہانی کی کہانی" کے عنوان سے اس نے افسانے کی خصوصیات اور اس کی خوبیوں سے بحث کی۔

چار مضامین ایسے بھی ہیں جنھیں نیم سوانحی نیم ادبی کہا جاسکتا ہے۔ یہ مضامین نذر سجاد حیدر، اے آر خاتون، رضیہ سجاد ظہیر اور خواجہ احمد عباس کی زندگی اور فن پر مشتمل ہیں۔

اس نے یہ مجموعہ مرتب تو کرلیا لیکن زندگی نے چھپوانے کی مہلت نہ دی۔ یہ مجموعہ اس کے انتقال کے بعد شائع ہوا۔

وہ اس مجموعے کو مرتب کرنے میں مگن تھی کہ گھر میں ایک اور خوشی نے سر ابھارا۔ دسمبر 1987ء ڈاکٹر عذرا مع اپنے شوہر ڈاکٹر ہاروی کے ساتھ دہلی پہنچ گئی۔ گھر کے سناٹے میں خوشیوں کے چند پھول کھل گئے، وہ کھل اٹھی۔ عذرا نے اپنے آنے کا مقصد یہ بتایا کہ وہ اپنے شوہر کو اس سے ملوانے کے لیے آئی ہے۔

وہ اپنی بیماری بھول کر اس کی خاطر داری میں لگ گئی۔ اسے اور اس کے شوہر کو سیدین منزل میں ٹھہرایا۔ سیدہ حمیدہ نے اپنی کار انہیں دے دی۔ صالحہ اسے پورے دہلی کی سیر کراتی پھر رہی تھی۔ مسز ہاروی پہلی مرتبہ ہندوستان آئے تھے۔ دہلی ان کے لیے کسی عجوبے سے کم نہیں تھا۔

اس زمانے میں اسے ہندوستان کا سب سے بڑا ایوارڈ "پدم شری" بھی ملا۔

ڈاکٹر عذرا ایک ہفتے کے لیے آئی تھی۔ یہ ایک ہفتہ باتوں، ملاقاتوں، تقریبوں میں گزر گیا۔ دسمبر کے آخری ہفتے میں امریکن مہمان رخصت ہوگئے۔

یہ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ مہمانوں کے رخصت ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ مہمانوں کے رخصت ہوتے ہی اس کی طبیعت بگڑنے لگی۔ اسے سانس کی تکلیف تھی جو ہمیشہ جاڑوں میں ہو جاتی تھی۔ تیمارداروں نے یہی سمجھا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ چند روز گزریں گے، سردی کم ہوگی تو طبیعت سنبھلنے لگے گی۔ پڑوس میں ڈاکٹر عاصمہ رہتی تھیں جو باقاعدگی سے آکر دیکھ جاتی تھیں۔ ڈاکٹر ماتھر کو خبر ہوئی تو انہوں نے بھی معائنہ کیا۔ دوائیں تجویز کردیں۔ ان دواؤں سے کبھی افاقہ ہو جاتا کبھی سانس اکھڑنے لگتی۔ اس کی بھتیجی سیدہ حمید اسی کے پاس آکر رہنے لگی۔ دوسری بھتیجی ذکیہ ظہیر بھی دہلی میں تھی مگر دور رہتی تھی۔ وہ بھی صبح شام آنے لگی۔ خاندان کے دیگر افراد بھی رات گئے تک اس کے پاس بیٹھے رہتے۔ اس کا دل بہلاتے رہتے تاکہ وہ جلد صحت یاب ہو جائے۔

اس کی طبیعت تھی کہ سنبھلنے ہی میں نہیں آرہی تھی۔ ایک تبدیلی اور نظر آرہی تھی جو عام طور پر بیماری کے دوران نظر نہیں آتی تھی۔ وہ باتوں میں دلچسپی نہیں لے رہی تھی۔ جھلاہٹ اور غصہ اس کی طبیعت میں پیدا ہوگیا تھا۔ آخر سب نے یہ طے کیا کہ اسے اسپتال میں داخل کرا دیا جائے۔ ڈاکٹر ماتھر اس کے فیملی ڈاکٹر تھے، انہوں نے بھی ہولی فیملی میں داخل کرنے کا مشورہ دیا۔ وہ بھی مطمئن تھے کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔

ابھی اسپتال میں داخل ہونے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ 8 جنوری 1988ء کو آٹھ بجے رات کو باتیں کرتے کرتے داعی اجل کو لبیک کہا۔

انتقال کے وقت اس کی عمر 74 سال تھی۔

ماخذات

صالحہ عابد حسین ...... از صغرا مہدی

یادگار حالی ...... از صالحہ عابد حسین

انسان جب تہذیب سے آشنا نہ تھا اور اسے راہِ حق کا ادراک نہ تھا۔ انبیاء، اولیاء انہیں خدا کی جبروتی کا قائل کرانے میں کوشاں رہے لیکن کچھ لوگ اس دور میں بھی شجر و حجر کی پرستش کرتے رہے اور آج بھی کرتے ہیں۔

ان درختوں کا بیان جن کی پرستش عام ہے

درخت زندگی ہیں۔

انسان کے سب سے قدیم ساتھی، بلکہ جب انسان نہیں تھا تو زمین پر درخت ہی درخت تھے۔ مہیب جنگل تھے، اونچے اونچے دیو قامت درخت، سایہ دینے والے اور خوراک کی ضروریات پوری کرتے ہوئے درخت۔ یہ درخت اس وقت کام آتے جب سردیوں میں الاؤ روشن کرتے ہوتے، چولہے جلانے ہوتے، گھر کے دروازے اور فرنیچر بنانے ہوتے۔

یہ درخت ہر لمحہ انسان کے دوست رہے ہیں۔ یہ ہمیں آکسیجن دیتے ہیں، ماحول میں پھیلے ہوئے کاربن کو جذب کرتے ہیں۔ ان کے سائے میں بیٹھ کر ہم تازہ دم ہو جاتے ہیں۔

ہمارے گھروں کی سجاوٹ ان درختوں کی وجہ سے ہے۔ دنیا کے ہر معاشرے، ہر مذہب اور ہر سوسائٹی نے درختوں کا احترام کرنا سکھایا ہے۔ ان سے محبت کی تاکید کی ہے۔

جیسے اسلام کہتا ہے۔ ”درخت لگانا صدقہ جاریہ ہے۔“

اور شاعر کہتا ہے۔ ”کچھ خانماں برباد تو سائے میں ر

معزز قارئین آپ سے التماس ہے کہ ہم www.urdusoftbooks.com پر آپ حضرات کے لیے مسلسل اچھی کُتب فراہم کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں جس کے لیے وقت اور رقم دونوں صرف ہوتے ہیں جس کی غرض سے ہماری اِس ویب سائٹ کُچھ سپانسر اشتہارات لگائے گئے ہیں جب ویب سائٹ وزٹرز اُن اشتہارات میں سے کسی اشتہار پر کلک کرتے ہیں تو ویب سائٹ کو تھوڑی سی آمدن حاصل ہوتی ہے، یہ آمدن ویب سائٹ کے اخراجات کو برداشت کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے اس لیے آپ حضرات سے گزارش ہے کے اپنے Google Chrome یا Mozilla Firefox کی Adblocker Extension کو Pause کر دیں یا صرف ہماری ویب سائٹ کے لیے Pause کر دیں۔ نیچے نظر آنے والی تصویر میں دکھایا گیا ہے کے Adblocker کے Pause ہونے یا انسٹال نہ ہونے کی صورت میں اشتہارات **Green Box** والی جگہ پر ظاہر ہوں گے۔

کھڑے ہیں۔ اس دور کے انسان سے یہ پیڑ بڑے ہیں۔"

یہ درخت ہمارے اتنے کام آتے ہیں کہ ہم ان کی مہربانیوں کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔ اگر درخت نہ ہوں تو زندگی ختم ہو کر رہ جائے۔ اس لیے انسان نے ہر دور میں درختوں سے پیار کیا ہے۔ اس کا احترام کیا ہے۔ اس کی خدمت کی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان درختوں کی پوجا بھی کی ہے۔

ان سے کہانیاں وابستہ کی ہیں۔ ان پر چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں۔ انہیں خوش رکھنے کی رسومات ادا کی جاتی ہیں۔

جیسے ہندوستان میں پیپل کا درخت اور تلسی کا پودا بہت مقدس سمجھے جاتے ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے یہ انسان کے شعور یا لاشعور کی بہت قدیم کہانی ہے۔

ہزاروں بلکہ لاکھوں برسوں سے ایسا ہی ہوتا آرہا ہے۔

بہرحال اس مضمون میں ہم ان کے عقیدوں کے غلط یا صحیح ہونے پر بحث نہیں کر رہے بلکہ آپ کو صرف معلومات دینا چاہتے ہیں کہ درختوں کے حوالے سے دنیا میں کیا کیا ہوتا ہے۔

اٹلی میں اریشا نامی قصبے کے پاس کے جنگل اور اس میں واقع معبد کے حوالے سے قدیم روایات پائی جاتی ہیں۔

ایک روایت کے مطابق اس جھنڈ میں دن کے وقت اور رات کے پچھلے پہر ایک خوفناک بلا دبے پاؤں اپنے شکاری کی تلاش میں پھرتی نظر آتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک تلوار ہے اور وہ اس طرح دبے پاؤں چلتی ہے جیسے اسے کسی دشمن کے حملے کا خطرہ ہو۔ یہ ایک قاتل پجاری کی بدروح ہے۔

ایک اور روایت بھی ہے اس معبد میں ایسے مقدس درخت تھے جن کی ایک ٹہنی بھی توڑنے کی اجازت نہیں تھی۔

جب معبد کے پجاری کو راستے سے ہٹانا ہوتا تو اس وقت ایک مقابلے کا اہتمام کیا جاتا۔ وہ مقابلہ یہ ہوتا تھا کہ کسی اجنبی کو درخت کی کوئی شاخ توڑنے کی اجازت دی جاتی لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ ہی پجاری سے مقابلہ کرے گا۔

مقابلے کے نتیجے میں اگر پجاری مارا جاتا تو اس کی جگہ اس شاخ کو توڑنے والے کو ہی پجاری اور حکمران بنا دیا جاتا تھا۔

ساگوان ایک مشہور درخت ہے۔ کسی زمانے میں ساگوان کی لکڑی سے رسولی کا علاج اس طرح کیا جاتا تھا کہ جادوگر لکڑی کا ایک سرا مریض کی گردن سے باندھ دیتا اور دوسرے سرے کو آگ لگا دی جاتی۔ اب جیسے جیسے آگ آگے بڑھتی رہتی ویسے ویسے رسولی غائب ہوتی چلی جاتی۔

اگر مریض صحت یاب ہونے کے بعد معالج یا جادوگر کو اس کا معاوضہ ادا نہیں کرتا تو جادوگر اس لکڑی پر پانی چھڑک کر کوئی منتر پڑھتا اور مریض کی رسولی واپس آجاتی۔

آپ نے کافور تو دیکھا ہی ہوگا۔ یہ بھی ایک درخت سے نکلتا ہے۔ کچھ علاقوں میں کافور کے درختوں سے کافور جمع کرنے والے لوگ اپنا کھانا کھانے کے لیے پام کے پتوں سے بنی پلیٹیں استعمال کرتے ہیں اور کھانے کے بعد پلیٹوں کو بغیر دھوئے چھوڑ دیتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اگر پلیٹ دھو دیے جائیں تو درختوں سے کافور بھی دھل جاتی ہے۔

سماٹرا کے کچھ علاقوں میں دھان کی فصل عورتیں لگاتی ہیں۔ دھان کے پودے لگاتے وقت عورتیں اپنے بال کھلے چھوڑ دیتی ہیں ان کا عقیدہ ہے کہ اس طرح چاول کی فصل اچھی ہوتی ہے۔

درختوں کی پوجا اور ان کے ٹوٹکوں کی تاریخ ہر جگہ مختلف اور دلچسپ ہے۔ یہ تاریخ مقامی رسوم و رواج کی تاریخ میں کہی جا سکتی ہے۔

درخت ان کے عقیدے کو بھی ظاہر کرتے ہیں اور علامتوں کو بھی یعنی جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ فلاں درخت کیوں لگایا گیا۔ اس کا کیا جواز ہے۔

1682ء میں ایک کتاب شائع ہوئی تھی جس کے مطابق یورپ کے تقریباً ہر گھر کے سامنے یوم مئی کے موقع پر سبز جھاڑیاں کھڑی کر کے اس پر زرد پھول لگایا جاتا ہے۔ تاکہ ان کا چمن ہرا بھرا رہے۔

انگلینڈ کے شمالی علاقے کے نوجوان آدھی رات گزرنے کے بعد اٹھ کر بینڈ باجے کے ساتھ جنگلوں کی طرف نکل جاتے ہیں اور وہاں جا کر درختوں سے شاخیں توڑ کر انہیں پھولوں سے سجاتے ہیں۔ تاکہ جس طرح درخت کی اس شاخ پر پھول لگ گئے ہیں اس طرح ان کی زندگی میں بھی کامیابیوں کے پھول آجائیں۔

ٹرانسلوانیہ اور رومانیہ کے خانہ بدوش ایسٹر یا سینٹ جارج کے دن (23 اپریل) بید مجنوں کا بڑا سا پودا کاٹ کر اسے پھول پتیوں سے سجاتے اور کھلی جگہ پر چھوڑ دیتے ہیں۔ اس کے بعد قبیلے کی حاملہ عورتیں اپنے استعمال شدہ کپڑے اس پودے کے نیچے ڈال دیتی ہیں۔ صبح کے وقت اگر ان کپڑوں پر پتے گرے ہوتے تو یہ سمجھا جاتا کہ ولادت کا وقت خیریت سے گزر جائے گا۔

درختوں کی پوجا یا ان کا احترام یا ان سے متعلق ٹوٹکے کوئی آج کی بات نہیں ہیں اور نہ ہی یہ صرف افریقہ یا ایشیا وغیرہ میں ہوا کرتے تھے۔ بلکہ پورے یورپ میں اس قسم کی خرافات عام تھیں۔

ایک زمانہ تھا کہ یورپ کی بیشتر زمین جنگلوں سے بھری ہوئی تھیں۔ یہ درخت انسانوں کو فائدے پہنچاتے اس لیے ان کی عبادت کی جانے لگی۔

انسان کا تصور خدا یہی تو رہا ہے کہ جو چیز ان کو فائدہ پہنچائے یا نقصان پہنچادے اس کی پرستش شروع کردی جاتی تھی۔

یورپ میں بسنے والے درختوں کی پوجا کرتے، کچھ علاقوں کے لوگ شاہ بلوط کی پوجا کرتے۔ قدیم جرمن قانون کے مطابق شاہ بلوط کی چھال اتارنے کی غلطی کرنا بھی بہت بڑا جرم تھا۔

مجرم کی ناف کاٹنے کے بعد کیلوں کے ساتھ اسے درخت کے ساتھ ہی ٹھونک دیا جاتا اور اس کی آنتوں کو درخت کے ساتھ بل دے دیا جاتا۔ یعنی زندہ انسان سے درخت کو زندگی دی جاتی۔

قدیم یونان اور اٹلی میں درختوں کی پوجا ہوتی تھی۔

شمالی امریکہ کے انڈینز کا عقیدہ تھا کہ ہر قدرتی چیز کی ایک روح یا ہمزاد ہے۔ درختوں کی عزت اور احترام ان کی ظاہری حالت کی وجہ سے تھا۔ مثلاً سنبل کا درخت سب سے بلند ہونے کی وجہ سے زیادہ عزت کا حقدار تھا۔ جھاڑیوں کو کمتر درجہ حاصل تھا۔

ان کا عقیدہ تھا کہ یہ درخت، پودے یا جھاڑی کی روح ہوتی ہے اور جب ہم ان پودوں کی خدمت اور پوجا کرتے ہیں تو ان کی روح ہمارا شکریہ ادا کرتی ہے۔

بعض درختوں کے بارے میں مشہور ہے کہ ان پر ارواح کا بسیرا ہے۔ خاص طور پر سفیدے اور شاہ بلوط کے درختوں پر۔

اگر کسی لکڑ ہارے کو یہ اندیشہ ہو جاتا کہ اس نے جس درخت کو کاٹا تھا اس پر ارواح کا بسیرا تھا تو ارواح کے انتقام سے بچنے کے لیے وہ ایک مرغی ذبح کرتا تھا۔

غربی افریقہ کے جنگلوں میں سربہ فلک سنبل کے درختوں کے متعلق لوگوں کو عقیدہ ہے کہ سینیگال سے نائجیریا تک کے علاقے کے ان درختوں پر ارواح کا بسیرا ہے اور بسیرا کرنے والی روح یا چڑیل کا نام ہین ٹن بتایا جاتا ہے۔

بھارتی پنجاب کے علاقے کانگڑہ کے پہاڑی علاقے میں سفیدے کا ایک ایسا درخت تھا جس پر ہر سال ایک نوجوان لڑکی کی بھینٹ دی جاتی تھی۔

کچھ لوگوں کا عقیدہ تھا کہ جب شاہ بلوط کے کسی درخت کو کاٹا جاتا ہے تو اس کی چیخ و پکار ایک میل تک سنائی دیتی ہے۔

وسطی افریقہ کے ایک قبیلے کے لوگوں کا عقیدہ ہے کہ درخت خاص طور پر چڑیل والا درخت کو کاٹنے کی سزا کے طور پر چڑیل گاؤں کے سردار اور اس کے خاندان کو ہلاک کردیتی ہے۔

لہٰذا درخت کاٹنے سے پہلے یہ لوگ گاؤں کے جادوگر سے رابطہ کرتے ہیں۔ جادوگر کی رضامندی حاصل کرنے کے بعد ایک مرغ اور ایک بکری ذبح کی جاتی ہے۔

درخت پر پہلا وار کرتے ہی وار کرنے والا شخص درخت کو لگنے والی کلہاڑی کے زخم پر اپنا منہ رکھ کر درخت کا رس چوس کر اس کا دودھ شریک بھائی بن جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ درخت کو بلاخوف وخطر کاٹ ڈالتا ہے۔

بہت سے درخت ایسے ہوتے ہیں جن پر پھل نہیں لگتے۔ اگر لگتے ہیں تو بہت کم یا بہت دیر سے۔ ایسے درختوں کو بانجھ درخت کہا جاتا ہے۔

ان درختوں کو پھل دار بنانے کے لیے کئی طرح کی رسومات ادا کی جاتی ہیں۔

ملایا کے لوگ اپنے درختوں کے اردگرد بیٹھ کر لوبان سلگاتے ہیں۔ منتر پڑھتے ہیں۔ اس کے بعد ایک آدمی درخت کے پاس کلہاڑی لے کر کھڑا ہو جاتا ہے جب کہ دوسرا آدمی اس درخت کے پیچھے چھپ جاتا ہے۔ اب کلہاڑی والا درخت سے کہتا ہے۔ ”کیا تم اس سال پھل دو گے یا نہیں اگر نہیں دو گے تو تمہیں کاٹ کر پھینک دوں گا۔“

اب درخت کے پیچھے چھپا ہوا آدمی درخت کی طرف سے جواب دیتا ہے۔ ”کیوں نہیں اس دفعہ میں ضرور پھل دوں گا۔ خدا کے لیے مجھے مت کاٹنا۔“

جاپانی ہلویا اور بلغاریہ میں بھی اس قسم کی رسومات ادا کی جاتی ہیں۔ اب خدا جانے بے چارہ درخت پھل دینا شروع کرتا ہے یا نہیں لیکن اس قسم کی رسومات درختوں کے ساتھ صدیوں سے ادا کی جارہی ہیں۔

کئی علاقوں میں درختوں کی شادی تک ہوتی ہے۔

یہ قانونِ فطرت ہے کہ نسلیں اس وقت بڑھتی ہیں جب

نر اور مادہ کا ملاپ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ ہم نے ہر چیز کو جوڑا جوڑا پیدا کیا ہے۔"

درختوں کے جنسی اعضا انسانوں اور جانوروں کے جنسی اعضا سے مختلف ہوتے ہیں۔ قدرت نے درختوں کے اندر ہی نر اور مادہ جوڑے بنا رکھے ہیں لیکن بعض درختوں کو نر اور مادہ کی صورت میں الگ الگ پیدا کیا ہے۔

غیر متمدن معاشروں کے لوگ بھی اس بات کو سمجھتے تھے اور انہوں نے نر اور مادہ درختوں کے نام بھی رکھے تھے۔

ہمارے یہاں توت اور برگد کے نر اور مادہ درخت مشہور ہیں اس طرح پام کے درختوں میں نر اور مادہ درخت الگ الگ ہیں۔

قدیم زمانے کے لوگ درختوں کی بار آوری کے موسم میں نر پودے کے زیرہ دانے (Pollen) مادہ پودے پر چھڑکاؤ کرتے تھے۔ اسے دیوتاؤں کو خوش کرنے کے تہوار کا نام دیتے۔ اس خاص دن وہ دیوی دیوتاؤں کی شادی کراتے۔

ہندو آم کا پودا لگانے کے بعد اس کا پھل اس وقت تک خود یا اپنے بیوی بچوں کو نہ کھانے دیتے جب تک آم کے درخت کی شادی املی کے درخت سے نہ کر دیں۔

اگر اس کا پودا قریب نہ ہوتا تو چنبیلی ہی کو آم کی دلہن بنا دیتے۔ درختوں کی شادی کے وقت برہمن کو بھی نذرانہ دیا جاتا۔ کیونکہ ایجاب وقبول کے وقت منتروں کا جاپ وہی کیا کرتا۔

جرمنی میں کرسمس کے موقع پر اپنے درختوں کے ساتھ اسٹرا کارنیاں بٹ کر باندھ دیتے اور یہ اعلان کرتے کہ فلاں درخت کی شادی ہو گئی ہے۔

آپ اندازہ لگا لیں کہ حضرت انسان نے درختوں کے ساتھ کیسے کیسے سلوک کیے ہیں اور کرتے چلے آ رہے ہیں۔ کیسے کیسے عقیدے اور توہمات ان درختوں کے ساتھ وابستہ ہیں۔

دنیا کے بہت سے ملکوں اور قوموں کا یہ عقیدہ ہے کہ درختوں پر بڑی روحیں یا جنوں بھوتوں وغیرہ کا بسیرا ہوتا ہے۔

خود ہمارے یہاں بھی ایسا ہی سمجھا جاتا ہے۔ فلاں رات کے وقت فلاں درخت کے نیچے سے گزرا تھا کہ اس پر جن کا سایا ہو گیا۔ یا فلاں کے گھر میں جو درخت تھا اس پر جنوں کا بسیرا تھا۔ اس درخت کو کاٹتے ہی اس گھر پر تباہی آ گئی، وغیرہ۔

فلپائن کے بعض جزائر میں اس قسم کے درخت کو کاٹنے سے گریز کیا جاتا ہے اگر کسی وجہ سے ایسے کسی درخت کو گرانا پڑ جائے تو اس کے پاس جا کر بلند آواز میں بولنا پڑتا ہے۔

"دیکھو بھائی یہ مجبور ہو کر تمہیں گرا رہے ہیں تم کسی اور درخت پر اپنا بسیرا کر لو۔"

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اونچے اور گھنے درختوں پر روحیں بسیرا کرتی ہیں۔ جب ہوا کی وجہ سے پتے کھڑکھڑاتے ہیں یا سائیں سائیں کی آواز آتی ہے تو وہ اس آواز کو روح کی آواز سمجھتے ہیں اور وہ اس کے پاس سے بھی نہیں گزرتے۔

ہر گاؤں میں اس قسم کا ایک بوڑھا درخت ضرور ہوتا ہے جو عام طور پر برگد، پیپل، جامن یا آم کا ہوتا ہے۔ اس درخت کی پوجا کی جاتی ہے اور روایات کہانیاں وغیرہ اس درخت سے وابستہ ہوتی ہیں کہ اگر اس درخت کو کاٹا گیا تو پورا گاؤں برباد ہو جائے گا۔

کوریا میں طاعون، حادثے یا زچگی کے دوران مرنے والی خواتین کی ارواح درختوں پر بسیرا کر لیتی ہیں۔ لہٰذا ان روحوں کو خوش کرنے کے لیے اس درخت کے نیچے کھانا، شراب اور گوشت رکھ دیا جاتا ہے۔

جزائر شرق الہند کے جزیرے والوں کا یہ خیال ہے کہ جنگلوں کے بہت سے درختوں پر روحوں کا بسیرا ہوتا ہے۔ یہ روحیں پورے چاند کی رات کو اپنی کمین گاہوں سے نکل کر گھومتی پھرتی ہیں۔ ان روحوں یا چڑیلوں کے سر بہت بڑے، ٹانگیں اور بازو اور جسم بھاری بھرکم ہوتا ہے۔ ان روحوں کی خوشنودی کے لیے لوگ ان کے مفروضی بسیروں پر کھانا، مرغیاں اور بکرے وغیرہ چڑھاتے ہیں۔ درختوں اور پودوں سے وابستہ عقائد کئی طرح کے ہیں۔

ان کا خیال ہے کہ درخت بذاتِ خود تو شاید کوئی فائدہ یا نقصانات نہ دے سکیں لیکن ان پر بسیرا کرنے والے بھوت کئی معاملات میں ان کے کام آتے ہیں۔ جیسے بارش برسانا، فصلوں کی نشوونما یا عورتوں کو صاحب اولاد بنانا۔

قدیم عقیدے کے مطابق جب ایک درخت پر کسی روح کا بسیرا ہو جاتا ہے تو کچھ وقت گزرنے کے بعد دیگر ارواح بھی اس درخت پر آ کر بسیرا کر لیتی ہیں۔ اور یہ روحیں لوگوں کو نظر بھی آنے لگتی ہیں۔

سب سے پہلے لوگ اس قسم کی روح کو دیوتا کا روپ دیتے ہیں۔ پھر اس سے بارش برسانے کا تقاضا کرتے ہیں۔

برما کے موتیو گاؤں کے لوگ گاؤں کے قریب سب سے بڑے املی کے درخت کو بارش کے دیوتا کے نام سے

منسوب کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ گاؤں کی رکھوالی روح کو ناریل، روٹی اور مرغی پیش کر کے کہتے ہیں۔ "اے آقا! ہم فانی انسانوں پر رحم فرما اور بارش کو نہ روک۔ ہماری عبادتوں کو قبول فرما اور دن رات ہم پر بارش برسا۔"

اس کے بعد دیوتا کے پینے کے لیے شراب انڈیلی جاتی ہے۔ پھر تین ادھیڑ عمر عورتیں عمدہ زیور اور لباس پہن کر بارش کا گیت گاتی ہیں۔

بارش کے بعد درختوں کے یہ بھوت فصل اگانے کے کام بھی آتے ہیں۔ مدراس کے ہر گاؤں میں ایک مقدس درخت ہوتا ہے۔ اس درخت کا بھوت فصل اگاتا ہے۔

سیاہ فاموں کا ایک قبیلہ ایک مخصوص بلند درخت کو مقدس قرار دینے کے بعد کہتا ہے کہ اگر یہ درخت گر گیا تو پوری دنیا کی فصلیں تباہ ہو جائیں گی۔

جرمن اور فرانس کے لوگ درخت یا بڑی ٹہنی کے ساتھ گٹھی باندھ کر کھیت سے آنے والے آخری چھکڑے میں لاد کر فارم ہاؤس لے آتے ہیں اور پورے ایک سال تک اس ٹہنی یا درخت کے فارم ہاؤس کی چھت سے باندھے رکھتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اس درخت یا ٹہنی میں طاقت ور روح ہوتی ہے جو فصلوں کو بہتر کرتی ہے۔

عورتوں کو صاحب اولاد بنانے کی ذمہ داری بھی ان درختوں یا ان کے اوپر بسیرا کرنے والی روحوں یا بھوتوں کی ہوتی ہے۔

بھارت میں آملہ کو ایک مقدس درخت کا درجہ حاصل ہے۔ پھاگن کی گیارہ تاریخ کو اس درخت کی جڑوں میں شراب انڈیلنے کے بعد سرخ یا زرد رنگ کی رسی اس کے تنے کے ساتھ لپیٹ دی جاتی ہے۔ اس کے بعد عورت، جانور یا فصل جو بھی بانجھ ہو اس کی بار آوری کے لیے پراتھنا کی جاتی ہے۔

سوئیڈن اور افریقہ کی عورتیں بھی آسانی ولادت کے لیے درختوں کی خدمات حاصل کرتی ہیں۔

سوئیڈن کے ایک ضلع میں ہر گھر کے پاس ایک نگران یا سرپرست درخت ہوتا ہے۔ کوئی بھی شخص اس مقدس درخت سے ایک پتا بھی نہیں توڑ سکتا کیونکہ مقدس روح اس شخص کو بیماری کی صورت میں سزا دیتی ہے یا بدقسمتی اسے گھیر لیتی ہے۔ حاملہ عورت آسان ولادت کے لیے اس درخت کو بازوؤں میں بھر لیتی ہے۔

کانگو کے بعض سیاہ فام قبائل کی حاملہ عورتیں آسان ولادت کے لیے مقدس درختوں کی چھال کا لباس پہنتی ہیں۔

قدیم زمانے سے ہی شاہ بلوط کے درخت کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ یورپ میں بسنے والی آریاؤں کی تمام شاخیں شاہ بلوط کی پرستش میں متحد تھیں۔

یونانی اور اطالوی شاہ بلوط کا تعلق اپنے سب سے بڑے دیوتا زیوس یا جوپیٹر سے قائم کرتے اور اسے بارش اور آسمان کا دیوتا ظاہر کرتے۔

قدیم جرمن بھی شاہ بلوط کے درخت کو مقدس مانتے تھے۔ وہ شاہ بلوط کا تعلق گرج چمک اور بارش کے دیوتا ڈونار سے جوڑتے۔

یورپ میں اس قسم کے دیومالائی قصوں کا تعلق زیادہ تر آریاؤں سے ہے۔ آریا جہاں بھی گئے اس قسم کی اوٹ پٹانگ باتیں ساتھ ہی لے گئے۔ پاک و ہند میں بھی ان خرافات کو لانے والے آریا ہی تھے اور اب تو اس قسم کی باتیں ان کی رگوں میں رچ بس چکی ہیں۔

پودے اور درختوں نے انسانوں کا کس کس طرح ساتھ دیا ہے۔ اس کا ایک انداز اور دیکھ لیں۔

روایات کے مطابق انسانی ارواح کو حفاظت کی غرض سے پودوں میں بھی رکھ دیا جاتا ہے۔ اس پودے کو نقصان پہنچنے سے اس فرد کو بھی نقصان پہنچتا ہے۔

مشہور مہم جو رائیڈر ہیگرڈ نے بھی ایک ناول میں ایسے پودوں اور درختوں کے بارے میں لکھا ہے۔

گیبرن کے ایک قبیلے میں ایک ہی دن میں پیدا ہونے والے دو بچوں کے نام سے دو پودے لگائے جاتے ہیں۔ وہ لوگ ان پودوں کے گرد رقص کرتے ہیں۔ اس طرح ان بچوں کی زندگی ان پودوں سے منسلک ہو جاتی ہے۔ پودے کی موت کے ساتھ ہی اس سے منسلک بچہ بھی مر جاتا ہے۔

پیپوان قبیلے کے لوگ نومولود کی پیدائش پر درخت کی چھال میں ایک پتھر رکھ کر اوپر سے چھال کو بند کر دیتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اس طرح بچے کی جان اس درخت میں محفوظ ہو جاتی ہے اور جب کوئی اس درخت کو کاٹے تو بچے کی موت ہو جاتی ہے۔

مرد قبائل نومولود کی ناف کو مقدس مقام پر دفن کرنے کے بعد اوپر ایک پودا لگا دیتے ہیں۔ پودے کے بڑھنے کے ساتھ بچہ بھی پھلتا پھولتا ہے اگر پودے کو کچھ ہو جائے تو والدین اس سے بدشگونی قرار دیتے ہیں۔

جب ہم دنیا بھر میں پھیلے ہوئے اس قسم کے رسم و رواج

اور عقیدوں کے بارے میں پڑھتے یا جانتے ہیں تو ہمیں حیرت ہوتی ہے۔

اس قسم کی روایات انسانی شعور کے ساتھ ساتھ پروان پاتی ہیں۔ انسان نے جس انداز سے چیزوں کو دیکھا یا ان سے استفادہ کیا اس انداز سے اس نے درختوں، بیلوں اور پودوں وغیرہ سے اپنی روایات منسوب کر دیں۔

سوال یہ ہے کہ درختوں اور پودوں میں ایسی کون سی بات تھی کہ انسان نے اس کی پرستش شروع کر دی۔ تو اس سلسلے میں قدیم مقدس روایات سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ انسان اپنی ابتدا ہی سے درختوں اور بیلوں کے حوالے سے کیا سوچتا چلا آیا ہے۔

مثال کے طور پر آگ کے آقا اولوفیت نے مودی نامی پرندے کو آگ دے کر زمین کی طرف بھیجا اور حکم دیا کہ اسے ہر درخت کے اندر چھپا دے اور جب انسان کو ضرورت پڑے درختوں کی لکڑیوں کو باہم رگڑ کر آگ حاصل کر سکے۔

چونکہ انسان کو اس طرح درختوں سے آگ ملنے لگی تو اس نے درختوں کی پرستش شروع کر دی۔

قدیم ویدوں کے مطابق اگنی دیوتا درختوں میں پیدا ہوا۔ جب اس کا دل چاہتا ہے وہ درختوں کی ارواح کو بلا کر آگ پیدا کر دیتا ہے۔

یورپی اقوام کا عقیدہ یہ تھا کہ آسمانی بجلی کی صورت میں آسمانی خدا شاہ بلوط کے درخت میں اتر آیا اس لیے ہم اس کی پرستش کرتے ہیں۔

جدید سائنسی تحقیقات کے مطابق سائنس دانوں نے شاہ بلوط میں دوسرے درختوں کی نسبت برق رو زیادہ پائی ہے۔

شاہ بلوط کی طرح امر بیل بھی مقدس ہے اور اس کا بھی احترام کیا جاتا ہے۔

یونانی تہذیب نے دنیا کو بہت کچھ دیا۔ علم، فلسفہ، نجوم اور نہ جانے کیا کیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے بے شمار دیوی دیوتا انسانی تاریخ کا حصہ بنا دیے۔

انہوں نے درختوں کی ایک دیوی تخلیق کر دی۔ یہ دیوی Dryad یا Nymph کہلاتی تھی۔ یہ ایک ایسی دیوی ہے جو بلا کی خوب صورت ہے اور اس کی عمر بھی بہت طویل ہے۔ جس نے بھی اس کو دیکھا ہے وہ بے قابو ہو گیا ہے۔

اس سے ملتی جلتی گویا اس کے قبیل کی کچھ اور ارواحیں یا دیویاں بھی ہیں۔ جیسے پانی میں رہنے والی Meqnraid خشکی پر رہنے والی Holdra وغیرہ۔

درختوں کی یہ دیوی جنس میں بے قابو ہونے والی ہے کوئی بھولا بھٹکا مسافر اگر رات کے وقت اس درخت کے نیچے رک جائے جس پر نائم کا بسیرا ہے تو درختوں کی یہ دیوی اسے کھینچ لیتی ہے اور بے قابو کر دیتی ہے۔

ناول نگار پیری سینا نے اپنے ایک ناول میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ ارلی اسٹینلے گارڈنر نے بھی جنس میں بے قابو ہو جانے والی عورتوں کے لیے یہ اصطلاح استعمال کی ہے۔ اس لیے شدید جنسی خواہش کو سائیکولوجی میں بھی Nymphamenia کہا جاتا ہے۔ یہ تو ایسے درخت ہیں جن کے توہمات اور کہانیاں غیر الہامی مذاہب کا حصہ ہیں۔ جیسے مہاتما بدھ کا درخت۔

وہ درخت جس کے نیچے بیٹھ کر مہاتما بدھ نے گیان حاصل کیا۔ وہ درخت آج بھی موجود ہے اور بدھ مذہب کے ماننے والوں کے نزدیک اس کی بہت اہمیت ہے۔

علم کا درخت ٹری آف نالج یہ وہ درخت ہے جو حضرت آدم اور حضرت حوا کے روایت کی بنیاد بنا۔

اسلام، یہودیت اور عیسائیت تینوں میں اس درخت کے حوالے سے روایت ملتی ہیں۔ قرآن شریف میں بھی زیتون کے درخت کو بہت مبارک کہا گیا ہے۔

یہودیوں کے یہاں چار معاملوں سے درخت بہت مقدس سمجھے جاتے ہیں اور تہواروں کے موقع پر ان درختوں کو لبھانے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ جس طرح عیسائیوں کے یہاں کرسمس کا درخت، اس درخت کو ہر کرسمس کے موقع پر سجایا جاتا ہے اس کی ابتدا جرمن میں سولہویں صدی میں ہوئی۔

کہا جاتا ہے کہ مارٹن لوتھر نے پہلی بار ان درختوں میں روشنی کا اہتمام کیا تھا۔

غرض یہ کہ درختوں اور انسانوں کے درمیان لاکھوں برسوں سے رشتے قائم ہیں۔ ان رشتوں کی بنیاد توہمات اور مفروضہ کہانیوں پر ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ اسلام نے ہمیں ایسی توہمات سے نجات دلا دی۔ اس نے درخت اور پودے کے بارے میں کہا ہے کہ یہ بھلائی کے لیے پیدا کیے ہیں، پرستش کرنے کے لیے نہیں۔

اسلام نے درختوں سے محبت کی تاکید کی ہے اب اس سے بڑا فرمان اور کیا ہو سکتا ہے کہ درخت لگانا صدقہ جاریہ ہے۔

موت کے نرغے میں

شکیل ادریس

سپاہی کی زندگی میدان جنگ ہے، یہیں اسے اوج کمال ملتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسا ہی سپاہی تھا۔ دشمن کو شکست دینا اس کا نصب العین تھا۔ اسی خیال کو عملی جامہ دینے کے لیے وہ آسمان کی بلندیوں پر اپنا جہاز لے کر اڑا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ دشمن کے تمام مورچوں کو تباہ کر کے لوٹے گا لیکن دشمن بھی ہوشیار تھا۔ طیارہ شکن توپوں نے جہاز میں آگ لگا دی، گویا موت کا جبڑا کھل چکا تھا کہ اس نے جہاز سے چھلانگ لگا دی۔

موت و حیات کی رسہ کشی پر مبنی واقعہ

''ہوشیار۔'' ہمارے فائٹر کے پائلٹ نے انٹرکام پر کہا۔ ''ٹارگٹ بالکل سامنے ہے۔ صرف آٹھ میل کے فاصلے پر، آسمان بالکل صاف ہے۔ حملہ کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ دس بجنے والے ہیں۔''

میں جس جگہ تھا وہاں سے میں نے کھڑکی سے جائزہ لیا۔ وہ دس میل کے فاصلے سے دھواں چھوڑ رہے تھے۔ وہی ہمارا ٹارگٹ تھے۔ میری حیثیت فائرنگ مین کی تھی۔

یہ اگست 1944ء کا وسط تھا۔ ہمارے اسکواڈرن

B-24 کے بمبار، وچنا جرمنی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ہمارے بمبار بالکل جدید تھے اور ان پر تباہ کن طیارہ شکن ہلکی توپیں فٹ تھیں۔ ''توپوں کے دروازے کھول دیے جائیں۔'' پائلٹ نے تحکمیہ انداز میں کہا۔

اس سے پہلے کہ دروازے کھولے جاتے، ہمارے دائیں ہاتھ جو طیارہ پرواز کر رہا تھا اسے جرمن طیارہ شکن توپ نے نشانہ بنا لیا۔ میرے جسم میں خوف و دہشت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس طیارے کے انجن سے سفید اور کثیف دھواں نکلنے لگا۔ شعلے بھڑکنے لگے، مگر آگ پر قابو پا لیا گیا اس لیے کہ آگ بجھانے والے آلے کھول دیے گئے تھے۔

اس طیارے کی بلندی کم ہوگئی اور وہ تیزی سے نیچے جانے لگا۔

مجھے معلوم تھا کہ اب وہ اپنے ٹھکانے اٹل برج، انگلستان تک جائے گا، لیکن اسے راہ میں ہالینڈ اور شمالی سمندر کو عبور کرنا پڑے گا۔ ہالینڈ اتحادیوں کے ساتھ تھا، لہٰذا اس کی طرف سے کوئی اندیشہ نہیں تھا، البتہ وہاں تک پہنچنے سے پیشتر وہ جرمنی میں ہی گر پڑتا تو لینے کے دینے پڑ جاتے۔

ہمارے اسکواڈرن میں جو طیارہ سب سے آگے تھا اور رہنمائی کر رہا تھا، اس نے غوطہ مار کر دھویں کا بم پھینکا۔ چاروں طرف دھواں پھیل گیا تو ہمارے طیارے نے فوراً ہی غوطہ لگا کر بم گرا دیے۔ وہ ٹھیک اپنے نشانے پر لگے تھے۔ دھماکوں سے فضائی میدان گونجنے لگا۔ نشانے کا تعین کیے بغیر زمین سے راکٹ چھوڑے گئے جن سے سفید دھویں کی لکیریں نکل رہی تھیں اور وہ فضا میں جا کر پھٹ رہے تھے۔ جرمنوں کی طیارہ شکن توپیں بھی چل پڑیں۔ ہمارا کوئی گولا غالباً ایمونیشن کے ذخیرے پر جا کر لگ گیا تھا اس لیے سرخ اور نارنجی شعلوں کی ایک دیوار سی بن گئی۔ جواباً رن وے کے آخری حصے سے طیارہ شکن توپوں نے گولے داغنا شروع کر دیے۔

ہمارا طیارہ دائیں جانب کو مڑ گیا۔ اب اس کی منزل اٹل برج تھی۔ ہمارے اسکواڈرن نے 33 حملے کیے تھے جس میں سے دو باقی رہ گئے تھے۔ گویا 35 پر ہمارا مشن مکمل ہو جاتا۔ اس کے بعد ہماری نفری کو امریکا واپس جانا تھا۔

''ساتھیو! ہم ہالینڈ کے قریب پہنچ چکے ہیں۔'' پائلٹ نے ہمیں بتایا۔ ''اس کے بعد شمالی سمندر صرف تین منٹ کے فاصلے پر رہ جائے گا۔ اس وقت ہم 25,200 فٹ کی بلندی پر ہیں۔''

اچانک توپچی چیخنے لگا۔ ''دشمن۔ دشمن۔ ہماری کھوپڑی پر ہے۔''

میں نے گھبرا کر دیکھا۔ کم از کم دس ME-109 فائٹر ہمارے سروں پر پہنچ چکے تھے اور ان میں سے دو نے فائر بھی کھول دیا تھا۔ جب وہ ہمارے قریب سے گزرے تو مجھے طیارے پر بنے ہوئے نشانات اور ان کے پائلٹوں کے ہیلمٹ تک نظر آئے۔ ہمارے چھ ساتھیوں نے ان کی فائرنگ کا جواب دیا۔ میں نے آٹھ یا نو برسٹ مارے۔ یکبارگی ایک طیارہ میری توپ کی زد میں آگیا تو میں نے ایمونیشن اسی پر خالی کر دیا۔ جس کے نتیجے میں وہ طیارہ سیاہ دھواں اگلتا ہوا نگاہ سے اوجھل ہوگیا۔

''ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ کچھ طیارے اور آ رہے ہیں۔'' پائلٹ نے خبردار کیا۔

اس سے پہلے میں سنبھلتا ہمارا طیارہ جھٹکا کھا تین چار طیارہ شکن گولے ایک ساتھ لگے تھے۔ میری حالت غیر ہوگئی۔ اس لیے کہ غالباً میں بھی زد میں آگیا تھا۔ سوچ و سمجھ کی طنابیں شکستہ ہو رہی تھیں۔ میں بے ہوشی کے قریب تھا۔ جب ذرا ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ میں طیارے کی دم کے قریب پڑا ہوں اور میرا ساتھی توپچی جونی کیپ مجھ پر جھکا ہوا ہے۔ ''اٹھو، جلدی اٹھو شاباش اور یہ پیراشوٹ پہن لو۔'' وہ چیخ رہا تھا۔ ''ہمیں طیارے سے چھلانگ لگانا ہے۔''

میرا سر چکرا رہا تھا، لیکن میں اس کی بات سمجھنے کے قابل ہو گیا تھا۔ میں نے اپنی توپ کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی جگہ سے غائب تھی اور اس کی جگہ ایک سوراخ بن چکا تھا۔ سوراخ اتنا بڑا تھا کہ اس میں سے ایک جیپ گزر سکتی تھی۔ میں نے پیراشوٹ پہنا اور اس دروازے کو کھول دیا جس سے ہوا باز چھلانگ لگاتے ہیں۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا اندر آیا اور میں گرتے گرتے بچا۔ میرے عقب میں جونی اور دوسرے ساتھی تھے۔ میں نے اپنے پیراشوٹ کا جائزہ لیا اور فضا میں چھلانگ لگا دی۔ میں تیزی سے نیچے گرنے لگا۔ پھر دائیں سے بائیں گھومتا رہا۔ جب تقریباً تین سیکنڈ گزر گئے تو میں نے وہ رسی کھینچ دی۔ ہلکی آواز کے ساتھ پیراشوٹ کھل گیا۔

میرا طیارہ میرے سر پہ تھا اور تیزی سے نیچے آ رہا تھا۔ دھویں کے مرغولے اس کی دم سے نکل رہے تھے اور وہ

کنٹرول سے باہر ہو چکا تھا۔ میرے قریب سے گزر کر جب وہ نیچے گیا تو ایک دھماکے سے پھٹ گیا۔ B-24 کے تین اور طیارے بھی نیچے جا رہے تھے۔ پیراشوٹ کے دو گروپ میرے سر پہ تھے۔ نیلے آسمان پر سفید دھبے۔ ہمارے گروپ کے باقی طیارے دائیں جانب مڑ کر نگاہ سے اوجھل ہو گئے۔

میں نے نیچے دیکھا۔ ذرا فاصلے پر ایک قصبہ تھا جس میں ایک چرچ درختوں میں گھرا دکھائی دیا۔ بالکل ٹھیک نیچے ایک فضائی میدان تھا۔ وہاں ہلچل مچی ہوئی تھی اور رن وے پر دو طیارے کھڑے تھے۔ ان کے پر گھوم رہے تھے۔ وہ ME-109 تھے۔ میرے جسم میں سنسنی دوڑنے لگی تو کیا میں جرمنی کے فضائی میدان میں اترنے والا تھا۔ میں خدا سے اپنی سلامتی کی دعا مانگنے لگا۔

میری عمر چھبیس برس تھی اور میں لیسنگ میں پلا بڑھا تھا۔ میرے والدین میں اس وقت ہی علیحدگی ہو گئی تھی جب میں نابالغ تھا۔ چنانچہ مجھے ان کی سرپرستی اور رہنمائی حاصل نہ ہو سکی۔ 1936ء میں جب میں نے ہائی اسکول کا امتحان پاس کر لیا تو سویلین کنزرویشن کور میں چلا گیا جو نوجوانوں کو روزگار دلاتی تھی۔ انہوں نے کئی فیکٹریوں میں کام دلایا لیکن میں کوئی خاص کارکردگی نہ دکھا سکا۔ پھر جنگ عظیم دوم شروع ہو گئی۔ مجھے ایئر فورس میں روزانہ کے معاوضے پر کام مل گیا۔ میری طرح سے 95 فیصد لڑکے اسی بنیاد پر کام کر رہے تھے اور ایک اسکواڈرن کے تحت تھے۔

جب میں آسمان کی بلندیوں سے نیچے آ رہا تھا تو میں نے تہیہ کر لیا کہ میں اب غیر ذمے دار اور لاابالی لڑکوں کی طرح زندگی بسر نہیں کروں گا۔

میں جب نیچے آ رہا تھا تو اچانک احساس ہوا کہ میرا فلائٹ سوٹ جل رہا ہے۔ سر بھی جل رہا تھا۔ میں نے اپنا فولادی ہیلمٹ اتار کر نیچے پھینک دیا۔ اس کے نیچے اونی ہیلمٹ تھا، اسے بھی اتار پھینکا۔ میرے جیکٹ کی آستین جل رہی تھی میں نے دوسرے ہاتھ سے اسے تھپتھپایا تو آگ بجھ گئی۔

آگ بجھانے میں مصروفیت کی وجہ سے میں یہ نہ دیکھ سکا کہ ایک جرمن ME-109 طیارہ میری طرف بڑھ رہا ہے۔ اس نے دو مشین گنوں سے مجھ پر فائرنگ کر دی۔ گولیاں پیراشوٹ پر لگیں تو وہ تار تار ہو گیا۔ وہ طیارہ گرجتا ہوا میرے نزدیک سے گزر گیا۔ پھر ایک امریکن طیارہ نظر آیا جو آگے جانے والے جرمن طیارے پر فائرنگ کرنے لگا۔ اس کی گولیاں نشانے پر بیٹھیں اور جرمن طیارے سے دھواں اٹھنے لگا۔ پھر شعلوں نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ فضا میں قلابازیاں کھاتا ہوا نیچے چلا گیا اور دو میل دور جنگل میں جا کر ہولناک دھماکے کے ساتھ گر گیا۔

سارا منظر کسی فلم کی طرح میری نظروں کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ فضائی میدان، شعلے اگلتے ہوئے طیارے، موت کے منہ میں پہنچانے والی گولیاں اور روتے چیختے انسان۔ سب کچھ خون میں لتھڑا ہوا تھا۔

میں ڈر رہا تھا کہ ایسا نہ ہو کہ میں گولیوں اور طیارہ شکن توپوں کے گولوں کی زد میں نہ آ جاؤں۔ مگر جب میں نیچے پہنچنے لگا تو تیز و تند ہوا نے مجھے ان درختوں کے قریب کر دیا جو ڈیڑھ سو فٹ دور تھے۔ میرا دل شدت سے دھڑک رہا تھا اور دماغ یہ مشورہ دے رہا تھا کہ اب مجھے وہاں سے فرار ہونا ہے۔ اس لیے کہ چند فرلانگ کے فاصلے پر چند جرمن فوجی دوڑتے نظر آ رہے تھے۔

جوں ہی میں درختوں سے نزدیک ہوا، میں نے اپنے ہاتھ چہرے پر رکھ لیے تاکہ میں زخمی نہ ہو جاؤں۔ میں چند شاخوں کے درمیان پھنس گیا۔ اب میں زمین سے صرف چند فٹ اوپر تھا۔ میں نے ایک ہاتھ سے شاخوں کو توڑا اور گھاس پر گر پڑا۔ میرے سر اور ہاتھوں پر خراشیں تو آ گئی تھیں، مگر خدا کا شکر ہے کہ میری کوئی ہڈی نہیں ٹوٹی تھی۔

میرا اعشاریہ 45 کا ریوالور گر گیا تھا، اس لیے میں نے اسے دوبارہ ہولسٹر میں لگا لیا۔ اس کے بعد میں اٹھا اور ریت کے ایک ٹیلے کی طرف دوڑنے لگا۔ تاکہ سڑک سے آڑ لے سکوں، مگر میں زیادہ دیر تک نہیں دوڑ سکا اور گر پڑا۔ میں نے خدا سے دعا مانگنا شروع کر دی کہ وہ مجھے جرمن کے ہاتھوں گرفتار ہونے سے بچا لے۔

وہ درختوں سے گھری ہوئی جھاڑیاں تھیں۔ البتہ جب میں نیچے آ رہا تھا تو میں نے ایک جنگل بھی دیکھا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں وہاں تک پہنچ جاؤں تو ممکن ہے کہ دشمن مجھے نہ پکڑ سکے۔ جنگل کے بعد قصبہ تھا اور وہاں ایک چرچ بھی تھا۔

میں خدا کے بھروسے پر درختوں سے گھری اس جگہ سے نکل کر جنگل کی طرف بڑھا۔ وہ 20 یا 30 جرمن فوجی اب بھی سڑک پر دوڑنے کی مشق کر رہے تھے۔ ان کی نظر مجھ

پر پڑ گئی۔ "ہالٹ..... ہالٹ۔" ان میں سے چند چیخے۔

"ہالٹ..... ہالٹ۔" میں نے بھی جواباً ہاتھ ہلایا۔ جیسے میں ان کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ میں دشمن نہیں کہ رکوں بلکہ ان میں ہی شامل ہوں۔ میں انہیں چکمہ دینے میں کامیاب ہو گیا اس لیے کہ ان کا اور میرا یونیفارم تقریباً ایک جیسا تھا۔ رنگت بھی ملتی جلتی تھی۔

وہ ہنس کر جرمنی میں کچھ کہنے لگے اور مصروف رہے۔ میرا خون خشک ہو گیا تھا۔ اگر ان میں سے دو چار دوڑ کر میرے قریب آ جاتے تو میں کیا کرتا؟ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ جس نے میری جان بچائی تھی۔ وہ ایک ریتیلی سڑک تھی جس پر میں دوڑ رہا تھا۔ وہاں جنگلی درختوں کی بہتات تھی۔

"اے، امریکن۔" اچانک پیچھے سے آواز آئی۔

میری رگوں کا خون منجمد ہو گیا۔ گویا مجھے شناخت کر لیا گیا تھا۔ میں آواز کی سمت مڑا اور میں نے غیر ارادی طور پر ریوالور کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ تین تھے اور اسی ریت کے ٹیلے پر کھڑے تھے۔ ان کے جسموں پر عوامی لباس تھے۔ ان میں سے جس کی عمر تقریباً 50 برس تھی اور جس نے بھاری بوٹ پہن رکھے تھے۔ آگے آ کر شستہ انگریزی میں بولا۔ "ہم تمہاری مدد کرنا چاہتے ہیں۔ جب تم جنگل میں داخل ہو گے تو دائیں جانب مڑ جانا، وہاں ایک گڑھا ملے گا۔ اس میں چھپ جانا۔ ہم بعد میں آ کر ملیں گے۔"

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور جنگل کی طرف دوڑنے لگا۔ گڑھے تک پہنچنے کے بعد میں نے اسے جھاڑیوں سے ڈھک لیا۔ پھر میں ان لوگوں کا انتظار کرنے لگا۔ متضاد خیالات مجھے پریشان کر رہے تھے۔ ایک یہ کہ مجھے وہاں سے نکل کر دوڑ جانا چاہیے۔ میں جرمنوں سے جتنا فاصلہ پیدا کر سکوں بہتر ہو گا۔ پھر خیال آیا کس سمت کا مجھے پتا نہیں ہے۔ اگر میں قصبے کے بجائے کسی اور طرف نکل گیا تو کیا ہو گا؟ اگر ان لوگوں نے تعاون کے لیے کہا ہے تو مجھے انتظار کر لینا چاہیے۔

اس وقت میرا ہاتھ ریوالور کے دستے پر جم گیا جب میں نے دوبارہ آوازیں سنیں۔ اس بار مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ ڈچ مین ہیں اور ان کا تعلق ہالینڈ سے ہے۔ ان کے ہاتھوں میں جھاڑیاں تھیں۔ انہوں نے نزدیک آ کر وہ جھاڑیاں اس طرح سے گڑھے کے منہ پر جما دیں کہ میں کسی کو باہر سے نظر نہ آ سکوں۔ "اگر تم گرفتار نہ ہوتے تو ہم کل آئیں گے۔" اسی نے کہا، جس نے پہلے مجھ سے گفتگو کی تھی۔

میں مایوسی سے سانس لے کر رہ گیا۔ اس وقت ڈیڑھ بجا تھا۔ آسمان پر بادل چھا رہے تھے اور موسم دل کش ہوتا جا رہا تھا۔ میں ایک موہوم سی امید میں سو گیا اور میری آنکھ ساڑھے چار بجے کھلی۔ اس بار چند افراد کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ وہ جرمنی میں گفتگو کر رہے تھے۔ میں نے ہولسٹر سے ریوالور کھینچ لیا۔ اگر انہوں نے مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو میں ان کے پرخچے اڑا دوں گا۔

وہ دو تھے۔ نیلی اور خاکستری یونیفارم پہنے ہوئے۔ ان کے پاؤں میں ٹخنوں تک اونچے جوتے تھے۔ ان کے شانوں میں پٹوں سے بندھی ہلکی مشین گنیں لٹک رہی تھیں اور وہ ہر جھاڑی کو ٹٹول کر دیکھ رہے تھے۔ میں مزید جھک گیا تا کہ انہیں اچھی طرح سے دیکھ سکوں۔ ان میں سے جس کا قد لمبا تھا اس کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی۔ میں نے جان لیا کہ اس نے مجھے دیکھ لیا ہے۔ پھر اس نے گھوم کر اپنے ساتھی سے کچھ کہا اور اپنی مشین گن کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ گن کی نال میری طرف اٹھی ہوئی تھی۔

میں نے مخالف سمت میں چھلانگ لگائی اور جھاڑیاں ہٹاتا ہوا گڑھے سے باہر آ گیا۔ پھر ٹریگر پر میری انگلی نے دباؤ ڈالا۔ "دھائیں۔ دھائیں۔ دھائیں۔ دھائیں۔" ریوالور چار بار گرجا۔ ایک گولی جرمن کی گردن پر لگی وہ گر گیا۔ دوسری گولی دوسرے کے سینے میں پیوست ہوئی۔ وہ بھی گر پڑا اور موت سے ہمکنار ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں دبی مشین گن کا ایک برسٹ میرے سر کے اوپر سے گزرا تھا، لیکن مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکا۔

مجھے یقین تھا کہ میرے ریوالور کی فائرنگ کی آواز دور تک سنی گئی ہو گی، اس لیے جتنی جلد ہو سکے اس مقام سے دور نکل جانا چاہیے۔ میں نے ان کے اسلحے پر قبضہ کر لیا اور فالتو گولیاں جیب میں ڈال لیں۔ پھر میں جنگل میں اندر ہی اندر دوڑتا چلا گیا۔ ایک جگہ پہنچ کر میں نے ایک درخت سے ٹیک لگا لی اور اپنا سانس درست کیا۔ جب دل کی دھڑکنیں اعتدال پر آ گئیں تو میں ایک بار پھر جنگل کے دوسرے سرے کی طرف چل پڑا۔ اس وقت مایوسی کے ایک غلاف نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا جب میں نے دیکھا کہ جنگل کے اختتام پر کچھ نہیں تھا۔ نہ کوئی مکان، نہ دکان اور نہ کوئی،

حیوان۔ میں نے سوچا کہ میں کسی کی نظر میں نہ آجاؤں اس لیے پیچھے ہٹ گیا اور جنگل میں ایک جگہ ٹھہر گیا۔

یہ سوچ کر مجھے عجیب سا لگا کہ میں نے اپنے ہی جیسے دو افراد کو موت کی نیند سلا دیا۔ مگر یہ اپنی بقا کی جنگ تھی۔ اگر میں اسے ہلاک نہ کرتا تو وہ مجھے موت کے گھاٹ اتار دیتا۔ دیکھا جائے تو یہ جنگ جرمنی نے ہی شروع کی تھی اور انسانیت کو خون میں نہلا دیا تھا۔ اب ہمیں اس کا جواب دینا تھا۔

رات ہونے پر میں نے درختوں کے پتے ایک جگہ جمع کیے اور انہیں بستر کی شکل دے کر ان پر لیٹا اور سو گیا۔ صبح اس وقت میری آنکھ کھل گئی جب میں نے بہت سے افراد کو باتیں کرتے سنا۔ میں نے اٹھ کر درختوں کی آڑ سے انہیں دیکھا۔ ان میں وہ تین بھی تھے جنہوں نے مجھ سے بعد میں ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ میں ان کی طرف بڑھا تو ان کے لیڈر نے میرے نزدیک آ کر میرا شانہ تھپتھپایا اور بتایا کہ اس کا نام کارل ہے۔ اس نے دو چار سینڈوچز اور ایک تھرمس دی جس میں چائے بھری ہوئی تھی۔ میں ان کا احسان مند ہوا۔

اس جگہ جہاں سے جرمن سپاہیوں کی لاشیں ملی تھیں اس سے اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا کہ امریکی سپاہی جس نے انہیں ہلاک کیا ہے (یعنی میں) اسی جنگل میں موجود ہے۔ اس نے اشارے سے مجھے بتایا کہ اب مجھے کہاں چھپنا چاہیے۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ شام پانچ بجے واپس آئیں گے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ میری مدد پر آمادہ ہیں، لیکن اپنے ہاتھ پاؤں بھی بچانا چاہتا ہے۔

اس نے مجھے ایسی سمت بتائی تھی جہاں سے ایک قصبہ ہیولیٹی نزدیک پڑتا تھا۔ اس کا نقشہ اس نے میرے بیگ میں ڈال دیا تھا۔ اس قصبے سے پانچ میل کے فاصلے پر میپل تھا جو نیدرلینڈ کے وسط میں تھا۔

کارل اور اس کے ساتھی اپنے وعدے کے مطابق پانچ بجے شام کو آ گئے۔ وہ اپنے ساتھ کمبل اور چند سینڈوچز لائے تھے۔ میں ان کی رہنمائی میں چند میل تک چلتا رہا۔ ”یہاں تمہیں رات کو ٹھہرنا ہے۔ جب تک کہ جرمن یہاں نہ آ جائیں یہ خطرناک نہیں ہے۔ ویسے ساری جگہیں خطرناک ہیں۔ اب میں صبح آؤں گا۔“

وہ جب صبح آیا تو میرے لیے ایک جوڑا سادہ لباس کا بھی لیتا آیا۔ میں نے کہا میں انہیں نہیں پہنوں گا، اس لیے کہ اگر میں پہچان لیا گیا تو مجھے فوراً گولی مار دی جائے گی اور

ماہم انگہ

اکبر کی دودھ پلانے والی ماں کا نام ماہم انگہ تھا۔ کیونکہ اس نے اکبر کو دودھ پلایا تھا اس لیے اکبر اس کو ماں ہی کی طرح عزیز رکھتا تھا۔ ماہم انگہ ادھم خان کی حقیقی ماں تھی وہ اپنی عقل و دانش اور بالغ نظری کی وجہ سے پوری سلطنت پر چھائی رہی اور ایک طرح سے حکومت اس کے ہاتھ میں تھی اسی کے مشورے سے سلطنت کے بڑے بڑے عہدے تقسیم کیے جاتے تھے لیکن وہ اپنے حقیقی بیٹے ادھم خان کے اقتدار کی خاطر دربار کی سازشوں میں اس طرح پھنس گئی کہ ادھم خان کے ساتھ اس کا انجام بھی بہت برا ہوا۔ ادھم خان نے وزیر سلطنت شمس الدین اتکہ خاں کو پہلے قتل کیا اور پھر اکبر پر قاتلانہ حملہ کیا جس سے اکبر نے مشتعل ہو کر اس کو محل کی فصیل سے نیچے پھنکوا کر ہلاک کروا دیا۔ بعد ازاں اکبر کو اس بات کا دکھ ہوا کہ اس نے اپنی مرضعہ (رضاعی ماں) کے بیٹے کو قتل کروا ڈالا ہے اس لیے اکبر خود اپنی رضاعی ماں ماہم انگہ کے پاس پہنچا جو اس وقت بستر علالت پر تھی اور جب اکبر نے اس کے حقیقی فرزند ادھم خاں کی موت کی خبر انہیں دی تو اس عاقلہ روزگار نے صرف اتنا کہا ”خوب کردند“ بیٹے کی موت کی خبر سن کر اسے انتہائی رنج ہوا لیکن اس نے اس کا اظہار نہ ہونے دیا اور اندر ہی اندر اس غم کو لے کر چالیس روز بعد وفات پا گئی۔

مرسلہ: اشفاق حسین، گجرات

بیگہ بیگم

اکبر کی سوتیلی ماں کا نام بیگہ بیگم تھا لیکن وہ حاجی بیگم کے نام سے مشہور تھیں۔ بیگا بیگم حمیدہ بیگم کے ساتھ حج کرنے گئی تھیں۔ اس لیے حج سے واپسی پر ان کا نام حاجی بیگم مشہور ہو گیا۔ اکبر اپنی حقیقی ماں حمیدہ بیگم کے بعد اپنی سوتیلی ماں حاجی بیگم ہی کو محبوب رکھتا تھا لیکن اکبر کی دودھ پلائی ماں ماہم انگہ کا امور سلطنت میں اہم کردار رہا یہاں تک کہ سلطنت کے اہم فیصلے اس کی مشاورت سے ہوتے تھے۔ بیگا بیگم عرف حاجی بیگم نے 1571ء میں ستر سال کی عمر میں وفات پائی۔

مرسلہ: اشفاق حسین، گجرات

کہا جائے گا کہ میں جاسوسی کر رہا تھا۔

”تم نے ان کے دو سپاہیوں کو ہلاک کیا ہے۔ اس لیے تمہاری موت تو لکھ گئی ہے۔ یہ تمہیں کس نے کہا ہے کہ وہ تمہیں زندہ چھوڑ دیں گے۔ موت کے بدلے موت۔“ کارل نے کہا۔ ”بچوں کی سی باتیں نہ کرو اور اسے پہن لو۔“

میں نے اس کے ہاتھ سے کپڑے لے لیے۔ پھر اس نے کاغذ کا ایک لفافہ مجھے دیتے ہوئے کہا کہ اس میں میرا لنچ ہے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

دوسرے دن صبح آ کر اس نے مجھ سے کہا کہ اب میرے محفوظ رہنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ میں ان کے ساتھ مزدوری کروں۔ جرمن ان سے ایک سڑک بنوا رہے ہیں۔ میں ان کے گروپ میں شامل ہو جاؤں۔ 17 اگست 1944ء کو میں ایئر فورس مین کی بجائے مزدور بن گیا۔ وہ سڑک نہیں بلکہ رن وے تھا۔ جب میں کام کر رہا تھا تو میں نے تقریباً 300 جرمن سپاہیوں کو جنگل کے چاروں طرف بکھرے دیکھا۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں جن پر زہریلے بایونٹ بھی لگے تھے۔ پھر ان میں سے ایک ایک کر کے سب جنگل میں جانے لگے۔ یقیناً انہیں میری ہی تلاش تھی۔

”اب وہ اس جنگل کا کونا کونا چھان ماریں گے۔“ کارل نے سرگوشی میں کہا۔ ”اگر تم فوجی لباس میں انہیں مل جاتے تو کیا وہ تمہیں زندہ چھوڑ دیتے؟“

میں سر ہلا کر رہ گیا۔ وہ درست کہہ رہا تھا۔

کام کے دوران کئی جرمن افسر میرے قریب آئے۔ میرا ان سے محض دس فٹ کا فاصلہ تھا۔ مگر وہ میری طرف نہیں بلکہ کام کی طرف دیکھ رہے تھے کہ ہم نے اسے کہاں تک مکمل کیا ہے۔ شام پانچ بجے چھٹی ہو گئی تو ہم نے اپنے اوزار اٹھائے اور جنگل کی طرف چل پڑے۔

”یہاں ایک زیر زمین تحریک چل رہی ہے۔ اسے تمہارے بارے میں بتا دیا گیا ہے۔ وہ تمہاری مدد کے لیے تیار ہیں۔ کل وہ تمہیں یہاں سے لے جائیں گے اور کسی محفوظ جگہ پر رہنے کا انتظام کریں گے۔“

اس نے مجھ سے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا اور میرے دونوں رخساروں کا بوسہ لیتے ہوئے بولا۔ ”ان دونوں جرمن سپاہیوں کو تم نے ہی ہلاک کیا تھا نا؟“

”ہاں۔“ میں نے یقین دلانے والے لہجے میں کہا۔ ”اچھا خدا حافظ۔“ اس نے کہا۔ ”میری دعا ہے کہ خدا تمہیں امریکا تک ضرور پہنچائے۔“

وہ حلاوت آمیز نظروں سے میری طرف دیکھتا ہوا چلا گیا۔ وہ رات میں نے اندیشوں اور وسوسوں میں گزاری۔ دوسرا دن گرم تھا۔ میں بھوکا اور پیاسا ان کا انتظار کر رہا تھا۔ جب چار بجے تک کارل نہیں آیا تو میں نے سوچا کہ ممکن ہے اسے جرمن نے گرفتار کر لیا ہو اور میرے بارے میں استفسار کر رہے ہوں۔

میں پتوں پر اوندھا لیٹا تھا کہ اچانک کسی نے بھاری آواز میں کہا۔ ”کیا یہاں کوئی ہے؟“

میں نے سر اٹھا کر دیکھا وہ تین تھے اور سائیکلوں پر تھے۔ ان کا رہنما بیس سالہ ایک لڑکا تھا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور ان کے سامنے آ گیا۔ اس لڑکے نے اپنا نام کوپر بتایا اور کہا کہ وہ مجھے کسی محفوظ جگہ پر لے جائے گا اور اس کے بعد ایسے انتظامات کرے گا کہ میں اتحادیوں کے علاقے تک پہنچ جاؤں۔

اس نے مجھے اپنی سائیکل پر سوار کرا لیا۔ سڑک ہموار اور مسطح تھی۔ چھدرہ چھدرہ آبادی تھی اور فارم بنے نظر آ رہے تھے۔ حیرت کی بات تھی کہ کوئی حیوان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے ان کی بابت پوچھا تو کوپر نے بتایا کہ جانور جرمن لے جاتے ہیں۔

شام کو ہم ایک چھوٹے سے قصبے کے نزدیک سے گزرے۔ وہاں جرمن سپاہیوں کا ایک گروپ طیاروں کی مشینری صاف کر رہا تھا۔ کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔ انہوں نے اپنے ہاتھ ہلا کر اپنی محبت کا اظہار کیا۔ مجھے تعجب ہوا کہ انہوں نے میری طرف کوئی توجہ نہ دی۔ ہم وہاں سے گزر کر آگے نکل گئے۔

جب ہم میپل کے نواحی علاقے میں پہنچے تو سورج اپنا سفر تمام کر کے غروب ہو رہا تھا۔ وہ قصبہ تقریباً ویران تھا۔ ہم ایک مکان کے سامنے ٹھہرے تو ایک بڑھیا نے دروازہ کھولا اور اندر آنے کو کہا۔ کچن میں دو نوجوان خواتین تھیں۔ کوپر نے ان میں سے ایک کو اپنی منگیتر بتایا۔ اس کا نام جولیا تھا۔

وہ دونوں جرمنوں کے لیے کام کرتے تھے۔ کوپر جرمن سپاہیوں کی خفیہ خبریں زیر زمین تنظیم تک پہنچایا کرتا تھا۔ انہوں نے مجھے کھانا دیا اور شیو کے لیے بلیڈ۔ پھر نہانے کا موقع فراہم کیا۔ میں نے جب چار دن کے بعد جسم پر پانی ڈالا تو عجیب سی فرحت محسوس ہوئی۔ ایسا لگا جیسے میں نے

ایک نیا جنم لیا ہو۔

انہوں نے میرے جعلی شناختی کاغذات بنائے اور بتایا کہ تھوڑی دیر بعد وہاں کرفیو لگنے والا ہے۔ مجھے جب تک تہ خانے میں چھپا رہنا ہے۔ اس نے انکشاف کیا کہ وہ تقریباً ایک سو امریکی فوجیوں کو نیدرلینڈ تک پہنچا چکا ہے یا اس کا راستہ بتا چکا ہے، جہاں سے وہ اپنے وطن واپس چلے گئے۔ پھر اس نے بہت سے ڈچ الفاظ مجھے سکھائے۔

رات خیریت سے گزر گئی۔ صبح وہ مجھے لینے آیا۔ راستے میں جرمن سپاہیوں کا ایک گروپ مل گیا۔ ہر چند کہ میں اب ڈچ لگ رہا تھا مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ انہوں نے ہمیں روکا پھر ان میں سے ایک نے میرے قریب آ کر کچھ کہا اور منہ میں سگریٹ دبالی۔ میں صرف ایک لفظ سمجھ سکا جس کا مطلب تھا ماچس۔ میں نے ماچس نکال کر ایک تیلی جلائی اور اس کا سگریٹ سلگا دیا۔ اس نے میرا شانہ تھپکا اور واپس چلا گیا۔

ہم آگے چلے گئے۔ جب دوسری گلی میں پہنچے تو میں نے کوپر کو بتایا کہ میں نے اس کا سگریٹ سلگا تو دیا تھا لیکن یہ سب سے بڑی حماقت تھی۔

”وہ کیسے؟“ اس نے پوچھا۔

”اس لیے کہ میں نے جس ماچس سے اس کا سگریٹ سلگایا تھا وہ امریکی تھی۔“ میں نے اسے ماچس دکھائی۔ ماچس پر امپائر اسٹیٹ بلڈنگ کی تصویر تھی۔ میری جیب میں ایسی چار ماچسیں تھیں۔ وہ میں نے اس کے حوالے کر دیں۔ اس نے لے کر جیب میں رکھ لیں اور ہنسنے لگا۔

وہاں سے وہ مجھے وگمین اور اس کے بعد فرائز لینڈ لے گئے۔ ان کا کہنا تھا کہ میں یہاں زیادہ محفوظ رہوں گا۔ وہاں زیر زمین تنظیم کے بہت سے افراد سے ملاقات ہوئی۔ دو روز وہاں گزار کر کوپر اور اس کا ساتھی جم مجھے شمالی سمندر تک چھوڑنے کے لیے سائیکلوں پر سوار ہوئے اور اس طرف بڑھنے لگے۔ میں ان کے ساتھ تھا۔ خشکی ختم ہونے پر مجھے ایک اسٹیمر کے ذریعے نیدرلینڈ پہنچنا تھا۔

وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ کوئی کشتی اور لانچ نہیں ہے۔ سب پر جرمن فوجیوں نے قبضہ کر لیا ہے۔ ہم وہاں سے بے نیل و مرام واپس آ گئے۔ خشکی کے بعد ایک چھوٹا جزیرہ آتا تھا ہمیں اس تک پہنچنا تھا اس کے بعد ایک بڑی کشتی میں اپنی منزل مقصود کی طرف بڑھنا تھا۔ میں نے دوسری رات کا منصوبہ بتایا اور پوچھا کہ پانی کتنا گہرا ہے۔ کوپر نے بتایا کہ چار یا پانچ فٹ۔

میں نے کہا۔ ”میں اپنا سوٹ کیس سر پر اٹھا کر وہ حصہ پار کرنا چاہتا ہوں۔“

وہ مجھے تحسین آمیز نظروں سے دیکھنے لگے۔

دوسری رات سوٹ کیس کو سر پر اٹھا کر چلنا ہمارے لیے کسی عذاب سے کم نہ تھا، اس لیے کہ پانی بہت سرد تھا اور آبی راستہ ناہموار۔ میں تین بار پانی میں گرا۔ جم اور کوپر کا کہنا تھا کہ ہمیں واپس چلنا چاہیے لیکن میں نے انہیں دلاسہ دیا کہ اگر ہم نے ہمت ہار دی تو ہم بھی یہاں سے نہیں نکل سکیں گے۔ وہ میرے ساتھ چلنے پر رضامند ہو گئے۔ پانی میں ڈھائی میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم اس جزیرے پر پہنچ گئے۔ وہاں ایک بڑا سا ہال بنا تھا جس کے اندر چٹائیاں پڑی تھیں۔ جائزہ لینے پر معلوم ہوا کہ میٹھا پانی بھی ہے اور ایک اسٹو جس پر کھانا گرم کیا جا سکتا ہے یا اس ہال کی ٹھنڈک دور کی جا سکتی ہے۔ کھڑکیوں سے سرد ہوا کے جھونکے آ رہے تھے۔ اس لیے ہم نے انہیں فوراً بند کر دیا۔

رات کو کسی وقت لانچ کو وہاں آنا اور سگنل دینا تھا۔ مگر وہاں کوئی لانچ نہیں آئی۔ ہم نے تین دن تک انتظار کیا۔ چوتھے دن ہمارا کھانا پانی ختم ہو گیا اور برفباری شروع ہو گئی۔ اگر کھڑکی دروازے بند نہ ہوتے تو ہماری ہڈیوں کا گودا تک جم جاتا۔

پانچویں دن جب برفباری تھم گئی تو ہم نے واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ پانی بے حد سرد تھا لیکن ہم نے وہ فاصلہ طے کیا اور خشکی پر پہنچ گئے۔ اپنے ٹھکانے پر پہنچ کر ہم نے کپڑے تبدیل کیے اور سوٹ کیس میں رکھا ہوا سامان سکھایا۔ معلوم ہوا کہ جرمن نے اس لانچ کو پکڑ لیا تھا جو لوگوں کو وہاں سے فرار کرا دیتی تھی۔

ایک بار پھر جرمن فوجیوں سے بچ کر رہنے اور بے تکے کام کرنے کی عادت ڈالی۔ تقریباً ایک ماہ بعد اتحادیوں نے ہالینڈ پر حملہ کیا اور اسے جرمنوں کی قید سے چھڑا لیا۔ میں اور جم ایک جہاز سے پیرس اور پھر وہاں سے امریکا پہنچ گئے۔ دو ماہ بعد صدر امریکا نے اعلا حسن کارکردگی پر اگست 1945ء میں مجھے سونے کے تمغے سے نوازا۔

جنریشن گیپ

ثناء ثاقب

بڑی سرعت سے معاشرے میں تبدیلی آرہی ہے اور لوگ کہتے نہیں تھکتے ہیں کہ معاشرہ تباہ ہو چکا ہے۔ پرانے لوگ اپنے دور کو مثالی بنا کر پیش کرتے ہیں اور نئے لوگ اسے جنریشن گیپ کہہ کر مسترد کردیتے ہیں۔ اس تبدیلی کی بڑی وجہ کیا ہے؟

بدلتے اقدار کی وجہ کیا ہے، ایک مختصر سا جائزہ

ہوسکتا ہے کہ یہ عنوان آپ کو حیران کردے۔
لیکن آپ حیران نہ ہوں۔ آپ جب اس مضمون کو پڑھ چکے ہوں گے تو یقین کریں کہ آنے والی نسل کے لیے دادی اماں یا نانی اماں کو تلاش کر رہے ہوں گے۔

یہ پجیکٹ بہت دنوں سے میرے ذہن میں تھا اور میں اس پر کچھ لکھنا چاہتا تھا۔ کوئی کام کرنا چاہتا تھا تو اب جاکر موقع ملا ہے کہ میں اس انوکھے موضوع پر کام کروں۔ موضوع ہے۔ دادی اماں آپ کہاں ہیں؟

دادی یا نانی اماں تو آج بھی ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے کہ اس رشتے کا وجود ہی ختم ہو گیا ہو۔ لیکن یہ ضرور ہوا ہے کہ اس رشتے کے ساتھ جو روایات تھیں۔ محبتوں اور شفقتوں کا جو خزانہ تھا وہ کہیں گم ہو گیا ہے۔

کیونکہ آج یا تو خود دادی یا نانی اماں کے پاس فرصت نہیں ہے یا پھر ان کے پاس فرصت نہیں ہے جن کو آپ تو بہت دینا چاہتے ہیں یا چاہتی ہیں۔

کیونکہ ان کو تربیت دینے والے دوسرے عناصر دادی یا نانی سے زیادہ ماڈرن یا دلکش ہیں۔ ٹی وی کے پروگرامز، دوستوں کی محفلیں، وڈیو گیمز، فیس بک، وہاٹس ایپ، موویز اور نہ جانے کیا کیا۔

بہت رنگین ہیں۔ بہت دلچسپ بھی۔ بہت معلومات ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ یہ تمام عناصر پیار سے، محبت سے بچے کے سر پر ہاتھ نہیں رکھ سکتے۔ اس کے ماتھے پر بوسہ نہیں دے سکتے۔ اس کی شرارتوں پر ہولے سے اس کو ڈانٹ نہیں سکتے۔ اگر بچے کو کھانسی آ گئی ہو تو اس کی ماں کو کوئی ٹوٹکا نہیں بتا سکتے۔

یہ سب ختم ہو کر رہ گیا ہے۔

تو آپ کو یاد ہوگا۔ شام کے وقت نماز کے بعد بچوں کا اپنا اپنا ہوم ورک مکمل کر لینا۔ پھر کھانا کھا کر عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر دادی یا نانی کے پاس آ کر بیٹھ جانا۔ اس وقت ان کی آنکھوں میں چمک ہوتی۔ ان کی سوچیں تجسس سے بھری ہوتیں کہ آج شہزادی ماہ بانو کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ کیونکہ کل تو جب وہ دیو کے محل سے بھاگنے کی کوشش کر رہی تھی تو دیو نے اس کو دیکھ لیا تھا۔

دادی اماں نے کہانی یہیں تک ختم کر دی تھی اور یہ کہا تھا کہ آگے کی کہانی اس وقت سنائی گی جب بچے وقت پر پڑھائی کریں گے۔ وقت پر کھانا کھائیں، نمازیں ادا کریں گے۔ ایک دوسرے سے لڑائی نہیں کریں گے، وغیرہ وغیرہ۔ اور بچے دن بھر ان ہدایات پر عمل کرتے رہتے تھے۔

دیکھ لیا آپ نے۔ تربیت کے لیے یہ کیسا طریقہ تھا۔

آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ آج کا دور کچھ اور ہے۔ آج قدریں بدل چکی ہیں۔ بالکل درست۔

قدریں بدل گئی ہیں۔ وقت بہت تیز رفتار ہو گیا ہے۔ اتنا تیز کہ زندگی نے اپنی روایات کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ لیکن یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ آج آپ جو یہ ریفریجریٹر دیکھ رہے ہیں۔ یہ دراصل مٹکے کا تسلسل ہے۔ اگر آپ مٹکے کو غائب کر دیں گے تو سمجھ میں نہیں آئے گا کہ اس کی اوریجن کہاں تھی۔ یہ ریفریجریٹر آپ کے گھر میں اچانک کہاں سے آ گیا ہے۔

ایک اور سوال آپ کے ذہن میں آ سکتا ہے کہ ہم بہت آگے جا چکے ہیں۔ آج ہم دادی اماں کے دیو اور جادوگروں کی کہانیاں کیوں سنوانا چاہیں گے۔

چلیں، آج کے ماڈرن والدین کی یہ بات مان لیتے ہیں تو پھر یہ ہیری پورٹر کی کہانیاں کیا ہیں۔ جس کی کتابیں آپ تلاش کر کر کے لا کر بچوں کو دیتے ہیں۔ صرف اس لیے کہ یہ کتابیں انگلش میں ہوتی ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ وقت آگے نکل چکا ہے۔ دادی اماں، نانی اماں اور ٹونی، ماریا، سونی وغیرہ کے درمیان جنریشن گیپ آ چکا ہے۔

لیکن یہ بھی تو مناسب نہیں ہے کہ ہم اپنے روٹس ہی کو فراموش کر دیں۔

اب یہ دیکھیں کہ یہ جنریشن گیپ ہے کیا۔

جنریشن گیپ نئی اور پرانی نسل کے درمیان کمیونیکیشن کی کمی کا نام ہے۔ ہم ایک دوسرے کو نہ تو سمجھا سکتے ہیں اور نہ سمجھ سکتے ہیں۔ یہی جنریشن گیپ ہے۔

موجودہ نسل ایک بالکل نئے مرحلے میں داخل ہو چکی ہے۔ بچہ اپنے والد کے نقش قدم پر نہیں چلتا۔ شرم محسوس کرتا ہے۔ وہ اسکول جاتا ہے۔ باپ اپنی دکان، دفتر یا کھیت جاتا ہے۔

یونیورسٹی سے فارغ ہونے تک بچہ بیس پچیس برس تک کا ہو چکا ہوتا ہے۔ ان پچیس برسوں میں اس کا اپنی سینئر جنریشن سے بہت کچھ وابستہ رہا ہے۔

باپ اس کے لیے اس کی ضروریات پوری کرنے کا ایک آلہ رہا ہے۔

ڈیڈ، آج نئے جوتے لینے ہیں۔ کل فیس ادا کرنی ہے، یا پھر اس ہفتے مجھے بائیک دلا دیں، وغیرہ وغیرہ۔

اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ کیونکہ دادی اماں کو تو آپ نے پرانے فرنیچر کی طرح بند کر کے اسٹور روم میں رکھ دیا ہے۔ ان سے کہانیاں سننے کا عمل ختم ہو چکا ہے۔

ان پچیس برسوں میں بہت سی چیزیں رونما ہو چکی ہیں۔ بچہ اپنے والدین سے زیادہ جانتا ہے۔ کیونکہ اس کے ماں یا باپ پچیس تیس برس پہلے اسکول گئے تھے۔ ان تیس برسوں میں علم بہت بڑی جست لگا چکا ہے۔

لیکن ان تمام مصروفیتوں اور ہنگاموں کے باوجود آپ اس پرانے فرنیچر کو اسٹور سے نکال کر اس کی گرد جھاڑ کر عزت اور احترام کے ساتھ کمرے میں لا کر رکھ سکتے ہیں۔ اور بچوں کو مجبور کر سکتے ہیں کہ جاؤ دادی اماں سے کہانی سنو۔ لیکن آپ اس قسم کا حکم اس وقت دے سکتے ہیں جب آپ خود اس ہستی کا احترام کرتے ہوں۔

یورپ میں بیڈ ٹائم اسٹوریز کا رواج آج بھی برقرار ہے۔

ویسے ایک بات اور بھی ہے۔

ان تمام پروسیس میں ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ پہلے مشترکہ خاندان ہوا کرتے تھے۔ ایک ساتھ رہنے کی روایت تھی۔

اسی لیے کہانی کے وقت خالہ زاد، ماموں زاد، چچا زاد، تایا زاد سارے بھائی ایک ساتھ بیٹھ جایا کرتے اور کہانیاں سنتے۔

اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوتا کہ یہ سارے کزن بڑے ہو کر ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ خاندان کی مضبوط ڈور سے بندھے رہتے تھے۔

بہر حال ابھی بھی وقت ہے۔ آپ دادی یا نانی اماں کو اپنے بچوں کے لیے واپس لا سکتے ہیں یا خود بھی ان کو ایسی کہانیاں سنا سکتے ہیں جو دلچسپ بھی ہوں اور ان میں اخلاقی پہلو بھی ہوں۔

ایک اور بات یہ ہے کہ والدین بچوں کو اچھی تعلیم تو دے رہے ہیں لیکن تربیت نہیں دے رہے۔ جو بچہ تین یا چار سال کا ہوتا ہے اسکولوں کی چہار دیواری اور انہیں ٹیچرز کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ وہ بے چارہ تربیت کہاں سے حاصل کرے گا۔ تربیت دینے والے ادارے تو یہی دادی یا نانی ہوا کرتی تھیں جو آج گم ہو چکی ہیں۔

آپ بچوں کو واپس لائیں، ان مضبوط اخلاقی کہانیوں کی طرف۔ جن کہانیوں نے تہذیبوں کی آبیاری کی تھی۔ آپ انہیں حکایات رومی سنائیں۔ بہت دلچسپ ہوتی ہیں۔ شیخ سعدیؒ کی گلستان اور بوستان تو صدیوں ہمارے کلچر کا ایک لازمی حصہ رہی ہیں۔

داستانیں امیر حمزہ سنائیں۔ آج کل بچوں کے لیے بھی اس کا ایک آسان آڈیشن مارکیٹ میں مل جاتا ہے۔

الف لیلہ کی کہانیاں سنائیں۔ آپ یقین کریں الف لیلہ کی کہانیاں ہیری پوٹر کی کہانیوں سے کہیں زیادہ دلچسپ ہیں اور ان میں اخلاقی پہلو بھی ہیں۔

بہت پرانی داستان کلیلہ دمنہ سنائیں اور یہ دیکھیں کہ عقل مندوں نے کہانیوں کے ذریعے کس طرح بچوں کو تربیت دی ہے۔

آپ ایسوپ کو نہ بھولیں۔ بچوں کو اخلاقی تربیت کے لیے بے مثال کہانیاں بننے والا یہ عظیم انسان ایک غلام تھا اور سیکڑوں سال پہلے یونان کے شہر ایتھنز کے چوراہے پر کھڑا ہو کر کہانیاں سنایا کرتا تھا۔

اس کی کہانیاں آپ نے بھی سنی ہوں گی۔ آپ کے والدین نے بھی سنی ہوں گی اور آپ اس روایت کو آگے بڑھائیں جیسے:

بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے گا۔ پیاسا کوا۔ انگور کھٹے ہیں۔ کچھوا اور خرگوش۔ شیر آیا شیر آیا، وغیرہ۔

ایسوپ کی ہر کہانی میں سبق کا عنصر ہے۔ اس میں حکمت کی باتیں ہیں۔ ان میں دانش ہے۔ ان میں زندگی کی ہر سچائی ہے۔

یہ بڑے لوگ ہوتے تھے جو اپنے حصے کا کام کر کے چلے گئے۔ اب آپ کے حصے کا کام یہ ہے کہ اس ورثے کو آگے بڑھاتے جائیں۔

ان کہانیوں کے ذریعے آپ بچوں کو سوچنے کا موقع دیں۔ ان کے خیالات کو آزاد چھوڑ دیں۔ دیکھیں کہ انہوں نے کیا حاصل کیا ہے۔

یہ آپ کی معمولی سی تربیت ہوگی۔ لیکن اس کے نتائج بہت خوش گوار نکلیں گے۔

آج جو کچھ ہم دیکھتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ والدین بچوں کو کس راہ پر لے جانا چاہتے ہیں۔

باپ بیٹے کی انگلی تھام کر مارکیٹ جا رہا ہے، اچانک بیٹے نے ایک کھلونا بندوق کی طرف اشارہ کر دیا۔ اب یہ باپ کا جیسے فرض منصبی ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے بیٹے کو وہ بندوق ضرور دلائے۔ یہ سوچے بغیر کہ جو بچہ ابھی سے بندوقوں اور پستولوں سے کھیل رہا ہے۔ وہ آگے جا کر کیا کرے گا۔ آپ گلیوں اور محلوں میں جا کر دیکھ لیں۔ بچے کیا کھیل رہے ہیں۔

گاڑیوں کے پیچھے چھپ کر ایک دوسرے کو ٹارگٹ کر رہے ہیں۔ یہی بچے آگے چل کر موبائل اچک کریں گے۔ بینکوں میں ڈاکے ڈالیں گے۔ کیونکہ آپ نے ان کی تربیت ہی ایسی کی ہے۔

آپ نے ان بچوں کو پھولوں، خوشبوؤں، تتلیوں، پہاڑوں، رنگ برنگے پرندوں کی کہانیاں کہاں سنائی ہیں۔ آپ نے تو ان کے ہاتھوں میں پستول اور بندوق پکڑا کر باہر گلی میں بھیج دیا ہے تو یہ چہرے سامنے آرہے ہیں۔ یہ ایک فطری امر ہے۔ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔

لیکن ان سب کے لیے خود آپ کو بھی محنت کرنی ہو گی۔ سب سے پہلے تو آپ کو بچے کے تعلیمی اداروں پر دھیان دینا ہوگا۔ یاد رکھیں کہ ہمارے تعلیمی ادارے بچوں کو تعلیم کے لیے نہیں بلکہ روزگار کے لیے تیار کرتے ہیں۔

تعلیمی اداروں سے ڈاکٹرز نکل رہے ہیں۔ انجینئرز کی کھیپ باہر آرہی ہے۔ ایم بی اے کرنے والے تو جوانوں کی بھیڑ لگی ہوئی ہے۔

آپ خود بتائیں کیا کوئی تعلیمی ادارہ انسان بھی تیار کر رہا ہے؟ کہیں شخصیت سازی بھی ہو رہی ہے۔

میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہو رہا۔ اگر ہو بھی رہا ہوگا تو بہت کم۔ اسی لیے اب بہت ضروری ہو گیا ہے کہ آپ خود اپنے بچوں کو تربیت دے کر انسان بنائیں۔

انسان بنانے کے جہاں اور بہت طریقے ہیں۔ وہاں کہانیاں بھی ایک اہم توڑ ہیں۔

کہانیاں تو ہر طرف بکھری ہوئی ہیں۔

آپ بچوں کو حکایات، محاورے، روزمرہ وغیرہ کے بارے میں بتائیں۔ اس طرح ایک تو ان کا رشتہ اپنی تہذیب اور اپنی زبان سے جڑا رہے گا۔ دوسری طرف انہیں اچھی اچھی کہانیاں سننے کو مل جائیں گی۔

آپ انہیں کہاوتوں سے روشناس کرائیں۔ بچوں کو بتائیں کہ اس کہاوت کا پس منظر کیا ہے۔ انہیں بتائیں کہ ایک کسان تھا۔ اس کے پاس بہت سی مرغیاں تھیں۔ ایک لومڑی روزانہ آ کر ایک مرغی کھا جاتی تھی۔

کسان نے بڑی محنت کے بعد ایک دن اس لومڑی کو پکڑ لیا۔ اور اس کی دم میں کپڑے باندھ کر آگ لگا دی۔ وہ لومڑی آگ سے بچنے کے لیے بلبلا کر بھاگی اور کسان کے کھلیان میں گھس گئی۔ جہاں کسان نے غلہ اسٹور کر رکھا تھا۔

اس کی دم میں لگی آگ نے اسٹور میں آگ لگا دی اور اس کا پورا غلہ جل کر راکھ ہو گیا۔ اب وہ کس کو الزام دیتا۔ کیونکہ اس نے خود ہی کیا تھا۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ اپنے کیے کا کوئی علاج نہیں ہوتا۔

اس کہانی کا میسیج بہت واضح ہے کہ جو قدم بھی اٹھاؤ، سوچ سمجھ کر اٹھاؤ۔ ورنہ پچھتاؤ گے۔

دیکھ لیا آپ نے۔ اس طرح بچوں تک ایک نصیحت بھی پہنچ گئی اور انہیں ایک دلچسپ کہانی بھی سننے کو مل گئی۔

اکیلے دکیلے کا اللہ بیلی۔ اب تو شاید یہ کہاوت بہت کم سننے کو ملتی ہے لیکن اس میں حکمت کا بہت بڑا پہلو موجود ہے۔

اس کا پس منظر کچھ یوں ہے کہ پرانی دہلی سے کچھ فاصلے پر ایک راستہ جنگل کے اندر جاتا تھا۔ اسی راستے پر ایک بوڑھی عورت بیٹھ کر بھیک مانگا کرتی تھی۔

جھاڑیوں کے پیچھے اس کی جھونپڑی تھی جس میں اس کا پورا خاندان رہا کرتا۔ اور وہ سب کے سب لٹیرے تھے۔

اب اگر ایک یا دو مسافر اس راستے سے گزرتے تو بڑھیا آواز لگاتی۔ ”اکیلے دکیلے کا اللہ بیلی۔“ اور اس کے خاندان والے سمجھ جاتے کہ کوئی اکیلا مسافر جا رہا ہے۔ پھر سب جھاڑیوں سے نکل کر اس بے چارے مسافر پر ٹوٹ پڑتے تھے اور لوٹ لیتے تھے۔

اور اگر زیادہ لوگ گروپ کی شکل میں آرہے ہوتے تو بڑھیا آواز لگاتی۔ ”جمعہ جمعرات کی خیر۔“ وہ لوگ سمجھ جاتے اور جھاڑیوں سے باہر نہیں آتے تھے۔

اس کہانی کا سبق یہ ہے کہ اگر اجنبی جگہ سے سفر کرو تو بہتر ہے کہ گروپ بنا کر چلو۔

بہرحال اس قسم کے سیکڑوں محاورے اور کہاوتیں ہیں۔ جن کی کہانیاں ہیں اور ہر کہانی میں کوئی نصیحت پوشیدہ ہے۔

آپ بھی کچھ محنت کر کے اچھی کہانیاں یاد کریں اور بچوں کو سنائیں۔

قصہ گوئی کا فن بہت پرانا ہے۔ جب لوگ چوپال میں بیٹھتے یا بہت مسافر ہوتے تو الاؤ روشن کر کے کہانیاں سنائی جاتیں۔ یہ کہانیاں نسل در نسل سینہ بہ سینہ سفر کرتی تھیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب گھر میں صرف بیوی ہوتی تھی۔ ٹی وی نہیں ہوتا تھا۔ اسی لیے مسائل اور الجھنیں بہت کم ہوا کرتیں۔

اس زمانے میں بریکنگ نیوز بیوی کی زبانی سننے کو ملتی تھی۔ جیسے آج فلاں پھوپی کا انتقال ہو گیا۔ فلاں خالو عمرے پر چلے گئے۔ یا فلاں نے چوری سے شادی کر لی وغیرہ۔

اور آج کا حال یہ ہے کہ اسکرین پر آتا ہے بریکنگ نیوز۔ اور وہ نیوز یہ ہوتی ہے کہ فلاں سیاست داں غریبوں کی دل جوئی کے لیے اپنی لینڈ کروزر لے کر پہنچ گئے اور انہوں نے اپنا دایاں پیر گاڑی سے باہر نکالا۔

تیسرا چینل خبر دیتا ہے کہ انہوں نے اپنے دونوں پیر ایک ساتھ باہر نکالے اور ہم نے اس کی فوٹیج حاصل کر لی ہے۔ یا سب سے پہلے ہم نے یہ نیوز بریک کی تھی، وغیرہ وغیرہ۔

اس قسم کی حماقتیں ہوتی رہتی ہیں۔

اور ان کے درمیان سے ہماری مہربانو، اس کی حسین زلفیں اور شہزادہ بہزاد اس کی بہادری سب کے سب کہیں غائب ہو گئے ہیں۔ صرف مسائل رہ گئے ہیں۔

بہرحال، قصہ گوئی کا فن بہت پرانا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک میر باقر علی داستان گو ہوا کرتے تھے۔ جب وہ کہانیاں سنانے بیٹھتے تو ایک سماں بندھ جاتا تھا۔

یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ داستان گوئی کی اس روایت کو آج زمیں نام کا ایک گروپ تازہ کر رہا ہے۔ یہ کراچی کے نوجوانوں کا گروپ ہے اور یہ بہت اچھی بات ہے۔

فرض کریں۔ آپ کے گھر میں کوئی دادی یا نانی نہیں ہیں۔ تو آپ خود بھی یہ کام کر سکتے ہیں۔ میں یہ بتا چکا ہوں کہ آپ کہانیاں کہاں سے لائیں گے۔

شیخ سعدی، مولانا رومی، داستان امیر حمزہ، الف لیلہ اور ایسوپ وغیرہ۔ اور کہانیاں سنانی شروع کر دیں۔

چلیں، اب میں آپ کو موثر انداز سے کہانیاں سنانے کے چند طریقے بتاتا ہوں۔

پہلی بات تو یہ دھیان میں رکھیں کہ کہانیاں سنانے کا انداز ایسا ہو کہ بچے اس میں گم ہو کر رہ جائیں۔ یعنی انہیں بوریت نہ محسوس ہو۔

کہانی اس طرح نہ سنائیں جیسے کوئی خط پڑھ کر سنا رہے ہیں۔

بلکہ ان میں ڈرامے کا عنصر بھی شامل کر دیں۔

آوازیں، کرداروں کی مناسبت سے کیفیات شامل کر دیں۔

جیسے شہزادہ اگر خوش ہے تو اپنی آواز میں خوشی کا تاثر پیدا کریں۔ اداس ہے تو اداسی کی کیفیت کا اظہار کریں۔

کوئی بادشاہ یا شیر غضب ناک ہے تو آواز میں گھن گرج لے آئیں۔ لیکن ڈرامائی تاثر بہت زیادہ نہ ہو۔ ورنہ بچے کی نیند اڑ جائے گی۔

کوشش کریں کہ کہانیاں تبدیل ہوتی رہیں۔ اگر آپ کی کہانی سے دلچسپی قائم ہو جاتی ہے تو بچے دوسری رات کا انتظار کریں گے کہ ظالم جادوگر نے شہزادی کے ساتھ کیا سلوک کیا۔

آپ جس کمرے میں بیٹھ کر کہانیاں سنا رہی ہیں۔ یا سنا رہے ہیں تو اس کمرے میں زیادہ روشنی نہ ہو۔ اندھیرا کر دیں۔ لیکن کھڑکی سے باہر یا کوریڈور میں روشنی ہوتی رہے۔ تا کہ آپ پورا ماحول بنا سکیں۔

جب کہانی شروع ہو تو اس دوران کوئی اور ایکٹیویٹی نہ ہو رہی ہو۔ ورنہ بچوں کا دھیان بٹ جائے گا۔

یہ بھی یاد رکھیں کہ آپ کا مقصد صرف کہانی سنانا نہیں، بلکہ بچوں کی ذہنی نشوونما اور تربیت بھی ہے۔

آپ بچوں کو دن بھر گزرے ہوئے وہ واقعات بھی بتا سکتے ہیں جن میں کوئی سبق ہو۔ جیسے: ''بچو! آج میں نے دیکھا کہ ایک صاحب نے اپنی گاڑی اس طرح کھڑی کر دی تھی کہ ایک ایمبولینس پھنس کر رہ گئی۔ اس میں ایک مریض بھی تھا۔ اب خود سوچو وہ بے چارہ مریض کتنی تکلیف میں ہو گا۔ وہ صاحب گاڑی اس طرح کھڑی کر کے شاپنگ کے لیے چلے گئے تھے۔ اب بتاؤ یہ کوئی اچھی بات تو نہیں ہے نا۔''

اب بچہ یقیناً کہے گا کہ نہیں۔ تو اس طرح آپ نے اسے ایجوکیٹ کر دیا ہے۔ اس کے ذہن میں بٹھا دیا ہے کہ وہ بڑا ہو کر خود ایسا نہ کرے۔

بچوں کی دلچسپی بڑھانے کے لیے مزاح کے پہلو بھی پیدا کرتے جائیں۔

جیسے انہیں وہ لفظ دیں۔ جو ایک دوسرے کے بالکل برعکس ہوں۔ اس Illogical Method کو Association کا طریقہ کار کہا جاتا ہے۔

جیسے کار اور پالک۔ ظاہر ہے یہ دو متضاد چیزیں ہیں۔ اب ایک دلچسپ سچویشن پیدا ہوتی ہے۔

اب بچوں سے کہیں کہ اس پر سوچو کہ کیا کیا ہو سکتا ہے۔

جیسے کار پہیوں کے بجائے پالک پر چل رہی ہے۔

کار میں پیٹرول کے بجائے پالک ڈالا جا رہا ہے۔ وغیرہ۔

جتنی اوٹ پٹانگ سچویشن ہو گی۔ اتنا ہی مزاح پیدا ہو گا۔

انہیں کوئی مشین یا اوزار بتائیں جو بولنا جانتی ہے۔

اور اس سے زبردستی کام بھی لیا جا رہا ہو۔ جیسے بال سنوارنے والی مشین۔

اس کو آرڈر دیا گیا ہے کہ ڈیڈی کے بال سنوارو۔ اب وہ بیٹھی رو رہی ہے کہ ڈیڈی کے سر پر تو بال ہی نہیں ہیں۔ وہ کیا کرے۔ اسی طرح کی کوئی اور چیز۔

قدیم کہانیوں کی سچویشن اور کرداروں کے مزاج بدل دیں۔ جیسے سنڈریلا۔ ایک مشہور شہزادی۔ جس کے بال بہت لانبے تھے۔

اب سنڈریلا کوئی شہزادی نہیں ہے بلکہ اسے کسی ہوٹل میں ویٹرس کی جاب مل گئی ہے۔ جہاں اس کے لانبے بال اس کے ساتھ پرابلم کر رہے ہیں۔ خود سوچیں کہ لانبے بالوں کے ساتھ اس پر کیا گزر رہی ہوگی۔

لوگوں کے کھانوں میں اس کے بال پڑے ہوں گے۔

وہ خود اپنے بالوں سے الجھ کر ٹرے سمیت گر گئی ہو گی۔ وغیرہ۔

آپ نے ایک گیم تو ضرور دیکھا یا کھیلا ہو گا کہ ایک بال کو ایک دوسرے کی طرف تیزی سے بڑھایا جاتا ہے۔ اس دوران میوزک ہوتی ہے۔ اور جہاں میوزک رک جائے اور بال اس وقت جس بچے کے ہاتھ میں ہوں اس پر ایک پوائنٹ ہو جاتا ہے۔

آپ اسی طرح بچوں کے ساتھ اسٹوری بال کھیل سکتے ہیں۔ جیسے آپ نے کہانی شروع کی۔ ایک آدمی جنگل میں چلا جا رہا تھا۔ بھوکا پیاسا اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے کہ اچانک بارش بھی ہونے لگی۔

اب یہاں پہنچ کر آپ رک جائیں اور ایک بچے سے کہیں کہ وہ اس کہانی کو آگے بڑھائے۔ اب بچہ اس کہانی کو دو چار جملوں تک روک کر آگے بڑھائے تو آپ اسے بھی روک دیں۔ اب دوسرے بچے کی باری ہو گی کہ وہ کس طرح اس کہانی کو آگے لے جاتا ہے۔

اس طرح جانتے ہیں کیا ہو گا۔ آپ کے بچوں کی Thinking Capacity بڑھ جائے گی۔ وہ نئی نئی باتیں سوچ سکیں گے۔

ان میں تخلیقی صلاحیتیں آتی جائیں گی۔ ان کے ذہنوں کو وسعت ملے گی۔

تو یہ ہیں وہ چند طریقے جو آپ کو اور ہمیں شاید اس عہد میں واپس لے جائیں جب دادیاں یا نانیاں کہانیوں کے ساتھ ساتھ تربیت بھی دیا کرتی تھیں۔

بہت ممکن ہے کہ آپ اس طرح بچوں کو سیل فون وغیرہ کے آسیب سے بچا سکیں۔

حیدر باندی

قاسم رضا

برصغیر میں فن و ثقافت کو ایک اہم مقام حاصل رہا ہے۔ خاص کر فن موسیقی کو اور اس کی ایک وجہ ہندو مذہب میں گیت سنگیت کا دخل ہے، پوجا پاٹھ میں موسیقی کا کلیدی کردار رہا ہے مگر اس میدان میں ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں نے بھی اپنا مقام بنایا۔ حیدر باندی بھی ان میں سے ایک اہم نام ہے جس کی شہرت کشمیر سے کنیا کماری تک پھیلی تھی۔

فن موسیقی سے رغبت رکھنے والے دوستوں کے لیے ایک تحفہ

دنیائے فن و ثقافت کی عہد بہ عہد تاریخ کے تذکرے میں جب 20 ویں صدی کا پڑاؤ آتا ہے تو اس صدی کے مختلف ادوار کی زنبیل میں کئی ایک ان کہی کتھاؤں کے موتی ملتے ہیں جو آج بھی وقت کی دبیز اور تہہ در تہہ گرد میں مدفون ہیں۔ بات اگر فن سنگیت کی ہو تو، تنگی حیات میں کیسا کشادہ بیاں کے مصداق یہ داستان سرائیکی وسیب سے تعلق رکھنے والی ایک ایسی ساحرۂ فن مغنیہ کی ہے، جس کے حسن صوت و صورت کے طلسم کی سحر انگیزی کا دائرہ صرف سرائیکی وسیب ہی نہیں

معزز قارئین آپ سے التماس ہے کہ ہم www.urdusoftbooks.com پر آپ حضرات کے لیے مسلسل اچھی کُتب فراہم کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں جس کے لیے وقت اور رقم دونوں صرف ہوتے ہیں جس کی غرض سے ہماری اِس ویب سائٹ کُچھ سپانسر اشتہارات لگائے گئے ہیں جب ویب سائٹ وزٹرز اُن اشتہارات میں سے کسی اشتہار پر کلک کرتے ہیں تو ویب سائٹ کو تھوڑی سی آمدن حاصل ہوتی ہے، یہ آمدن ویب سائٹ کے اخراجات کو برداشت کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے اس لیے آپ حضرات سے گزارش ہے کے اپنے Google Chrome یا Mozilla Firefox کی Adblocker Extension کو Pause کردیں یا صرف ہماری ویب سائٹ کے لیے Pause کردیں۔ نیچے نظر آنے والی تصویر میں دکھایا گیا ہے کے Adblocker کے Pause ہونے یا انسٹال نہ ہونے کی صورت میں اشتہارات **Green Box** والی جگہ پر ظاہر ہوں گے۔

بلکہ پورے برصغیر پر پھیلا تھا۔ اس منفرد ترین اور صاحب اسلوب گائیکہ کا عہد عنا پہلی جنگ عظیم کے بعد سے شروع ہوتا ہے جس نے اپنی نغمہ باری کے سحر سے نہ صرف وسیب بلکہ پورے متحدہ ہندوستان کو اسیر کیا۔ اس باکمال گلوکارہ و اداکارہ کو تھیٹریکل، فلمی دنیا میں حیدر باندی کے نام سے شہرت ملی لیکن ان کی ناموری کا ایک اہم ترین حوالہ برصغیر پاک و ہند کی عظیم مغنیہ ملکہ ترنم نور جہاں کی بہن ہونے کا بھی ہے لیکن اس سے پہلے کہ حیدر باندی کی سرگزشت بیان کی جائے ایک تاریخی مغالطے کا تذکرہ قارئین تک پہنچانا ضروری ہے کہ بہت سے مضمون نگاروں، یہاں تک کہ چند کتابوں کے مصنفین نے بھی حیدر باندی کو نور جہاں کی حقیقی بہن لکھا ہے حالانکہ تحقیق، حقیقت کچھ اور بیان کرتی ہے وہ یہ کہ حیدر باندی نور جہاں کی حقیقی بہن نہیں بلکہ کزن تھیں چونکہ رقص، موسیقی اور اداکاری کی دنیا میں نانی کو ماں، ماں کو بڑی بہن اور کزن کو بہن کہنے کا رواج صدیوں سے برصغیر کی فنی ثقافت کا حصہ رہا ہے تو اسی وجہ سے حقیقی رشتہ داری رازداری کے پردوں میں چھپ جاتی ہے، ویسے بھی نور جہاں نے حیدر باندی کو ہمیشہ اپنی بڑی بہن ہی سمجھا تو آج تک کسی محقق نے اس پہلو پر تحقیق کی ضرورت ہی نہ سمجھی اور حیدر باندی کو نور جہاں کی ''بہن'' ہی لکھا جاتا رہا۔ ویسے بھی بابا بلھے شاہ کی نگری کوٹ مراد خان جہاں 21 ستمبر 1926ء کو اللہ وسائی (نور جہاں) پیدا ہوئی۔ اس محلے میں نور جہاں کے رشتہ داروں کے کئی ایک گھرانے تھے جن کا وسیلہ رزق شادی بیاہ پر گانا بجانا تھا۔ جن کو عرف عام میں ''مراثی'' کہا جاتا ہے۔ ان گھرانوں کی کئی خواتین گڑوی یا ڈھولک کی تھاپ پر گاتی تھیں، مرد لوگ تھیٹرز اور تماشوں میں پرفارم کرتے تھے، ان خواتین گلوکاراؤں میں سے کچھ کی گلوکاری تو کوٹ مراد کے گلی محلوں تک ہی محدود رہی لیکن ان میں سے چند ایک گلوکاراؤں نے تھیٹر اور فلمی دنیا میں نام پیدا کیا۔ تقریباً ہر ایک نے نور جہاں کی بہن کے نام سے شہرت پائی۔ ''الٰہی جان'' اس دور میں سریلا گانے والی ایک گلوکارہ تھی جسے بعض نے نور جہاں کی بہن لکھا حالانکہ یہ نور جہاں کی سگی پھوپی تھیں جو نور جہاں کی پیدائش کے وقت وہاں موجود تھیں اور الٰہی جان نے ہی نور جہاں کو ''گھٹی'' دی تھی۔ جس دور میں نور جہاں کی پیدائش ہوئی ان دنوں تھل کے معروف علاقے لیہ کی نامور مغنیہ نور جہاں لیہ والی کے سنگیت کی پورے پاک و ہند میں دھوم تھی۔ نور جہاں کی پھوپی الٰہی جان کا طویل عرصہ سرائیکی وسیب کے مختلف علاقوں میں گزرا۔ نور جہاں لیہ والی اور الٰہی جان نہ صرف ہمعصر گلوکارائیں تھیں بلکہ وہ ایک ساتھ سردار خان دہلوی سے کلاسیکل موسیقی بھی سیکھتی رہیں۔ الٰہی جان کو نور جہاں کی گائیکی بہت پسند تھی یہی وجہ ہے کہ الٰہی جان نے ''اللہ وسائی'' نامی نومولود بچی کو دنیائے فن میں نور جہاں کا نام دیا۔ اس روایت کی تصدیق لیہ کے معروف محقق برکت اعوان (وفات 27 اگست 2014ء) نے راقم الحروف کے ساتھ ایک ملاقات میں کی تھی۔ ایک اور گلوکارہ ''گلزار'' نامی تھیں وہ بھی نور جہاں کی کزن تھیں اسے بھی نور جہاں کی بہن لکھا جاتا رہا، یہ بھی اپنے وقت کی بے حد سریلی آواز تھیں۔ ملتان کے معروف نقارچی گھرانے کے استاد خلیفہ رحیم بخش نقارچی و طبلہ نواز، حیدر باندی، نور جہاں، عیدن اور گلزار ایک ہی تھیٹریکل کمپنی میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔ اسی تھیٹر کمپنی سے برصغیر کے عظیم موسیقار ماسٹر غلام حیدر، ماسٹر شادی خان، ماسٹر چتی خان، استاد گامے خان (نور جہاں کے استاد) بھی وابستہ رہے تھے۔ گلزار کے آخری دن گمنامی، غربت اور بدحالی میں گزرے، قصور ریلوے مال گودام کے پلیٹ فارم پر اس کی رہائش تھی۔ نامور محقق محترم داؤد طاہر نے اپنے سفر نامے ''اک جہاں اور'' میں اس صاحب اسلوب مغنیہ کی بے کسی اور غربت کا نقشہ یوں کھینچا ہے ''بان کی ایک کھاٹ پر میلا بستر بچھا ہوا تھا جس میں ان کی جملہ ضروریات زندگی سمٹی ہوئی تھیں، ایک بالٹی، ایک لوٹا، مٹی کا گھڑا، ایک دھاتی گلاس اور دو بکریاں یہی اس کا سب کچھ تھا''۔ نور جہاں ہر ماہ باقاعدگی سے اپنی کزن کو خرچا بھجوایا کرتی تھی اور یہ سلسلہ ان کی وفات تک چلتا رہا۔ خالد حسن نے انگریزی زبان میں نور جہاں کی زندگی پر لکھی گئی اپنی کتاب میں ایک اور گلوکارہ ''بہارو مشین'' کو نور جہاں کی بہن لکھا ہے جس کا نور جہاں سے دور تک بھی تعلق نہیں تھا کیونکہ بہارو مشین 1913ء سے 1931ء تک خاموش فلموں کے دور کی معروف گلوکارہ تھی، یہ گراموفون ریکارڈز اور لاؤڈ اسپیکر کے آغاز کا دور تھا۔ بہارو کی آواز ''گراموفون مشین'' کی آواز جیسی تھی اسی وجہ سے لوگ اسے ''بہارو مشین'' کہتے تھے۔ معروف فلمساز و کہانی نویس ''مسکے دار'' نے اپنی خودنوشت ''ہوک'' میں اس گلوکارہ کا تذکرہ کیا ہے۔ بہارو کی شکل اتنی اچھی نہ تھی، لتا منگیشکر کی طرح چہرے پر چیچک کے داغ تھے، رنگ کالا تھا، بہارو بیگم المعروف بہارو مشین کا انتقال نور جہاں کی پیدائش سے پہلے ہی 2 دسمبر 1918ء میں ہو گیا تھا۔ ایک اور تھیٹریکل اداکارہ و گلوکارہ کو نور جہاں کی بہن لکھا گیا جو ''رشیدہ'' تھی جس نے

نورجہاں کے ساتھ 1936ء میں شیلا عرف پنڈ دی کڑی سمیت کئی فلموں میں ''پشپارانی'' کے نام سے اداکاری کی تھی۔
مستند کوائف کے مطابق نور جہاں کے والد کا نام مدد علی اور والدہ کا نام فتح بی بی تھا۔ فتح بی بی کے پہلے شوہر کا نام فرید علی عرف فریدا تھا جو مدد علی کے سگے بھائی تھے، فتح بی بی کے پہلے شوہر سے ایک لڑکا نواب اور ایک لڑکی پیدا ہوئی جبکہ نور جہاں کے چار سگے بھائی محمد شفیع، محمد صدیق، محمد حسین، عنایت علی اور ایک سگی بہن ''عیدن'' تھی، عیدن نور جہاں کی بڑی بہن تھی جس کے ساتھ حیدر باندی نے تھیٹر اور فلمی دنیا میں کام بھی کیا تھا۔ حیدر باندی اور عیدن بائی نور جہاں سے بڑی تھیں۔ عیدن بائی جو کہ نور جہاں کی حقیقی بہن تھی نے معروف فلمی نغمہ نگار تنویر نقوی سے شادی کی تھی لیکن کچھ عرصہ بعد اختلافات ہوئے اور علیحدگی ہوگئی۔ تنویر نقوی جن کا اصل نام سید خورشید علی شاہ تھا 6 فروری 1919ء کو لاہور میں پیدا ہوئے اور یکم نومبر 1972ء کو وفات پائی۔ تقسیم ہند سے قبل انمول گھڑی، لیلیٰ مجنوں سمیت ڈیڑھ درجن فلموں کے گیت لکھے، تقسیم کے بعد پاکستانی فلم عذرا، سلمیٰ، انارکلی، ایاز، ہمسفر، تاج محل جیسی یادگار فلموں کے لیے نغمہ نگاری کی، ان کی پہلی شادی اپنے وقت کی معروف فلمی ہیروئن ''مایا دیوی'' سے ہوئی تھی جبکہ دوسری شادی عیدن بائی سے کی تھی۔ تنویر نقوی برصغیر کی فلمی دنیا کے استاد شاعر تھے۔ پوری فلمی دنیا ان کی مٹھی میں تھی، اپنے عروج میں بہت پیسا بنایا لیکن عیاشیوں میں اڑا دیا جب وفات پائی تو المیہ دیکھیں اہل محلہ نے آپس میں چندہ جمع کر کے پاک و ہند کے اس عظیم استاد شاعر کے کفن دفن کا بندوبست کیا!!! نور جہاں عیدن بائی کی اپنی ماں کی طرح عزت کرتی تھیں۔ عیدن بائی کا 9 دسمبر 1985ء کو یونائیٹڈ کرسچن اسپتال میں انتقال ہوا تھا۔

حیدر باندی کی پیدائش بھی کوٹ مراد خان محلے میں ہوئی ان کے والد اور والدہ کا کیا نام تھا اس بارے میں کسی کتاب میں روایت موجود نہیں۔ روایت بیان کی جاتی ہے کہ نور جہاں کے والد یا والدہ میں سے کسی ایک کی حیدر باندی کی والدہ سے قریبی رشتہ داری تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ نور جہاں کی پیدائش کے وقت ان کی عمر کم وبیش 13 سال تھی۔ یوں حیدر باندی کی پیدائش 1914ء کی بنتی ہے۔ گھر والوں نے اہل بیت اور مولا علیؑ سے عقیدت کی نسبت سے بچی کا نام ''حیدر باندی'' رکھا، ان دنوں ''امام باندی'' کے نام سے بھی ایک خاموش فلموں کی اداکارہ و گراموفون سنگرز موجود تھی، ان دنوں گلوکاراؤں کے نام ان کے حسن و جمال، گائیکی کے مخصوص انداز، علاقہ یا پھر کسی غیر معمولی واقعہ کی نسبت سے معروف ہو جاتے تھے۔ راقم الحروف کے پاس 1913ء سے 1960ء تک برصغیر کی 225 گمنام و معروف گلوکاراؤں کے نام اور حالات زندگی محفوظ ہیں جن کے فنی سفر کی داستانیں تو داستانیں نام بھی انتہائی دلچسپ ہیں۔ ان مغنیوں کے ناموں پر بھی ایک تفصیلی دلچسپ اور معلوماتی مضمون رقم کیا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر ان دنوں ایک گلوکارہ ''چھپن چھری'' کے نام سے معروف تھیں، کہتے ہیں کہ کسی ریاست میں اس گلوکارہ پر گانے کے دوران ڈاکوؤں نے حملہ کیا اور چھریوں کے 56 وار کیے لیکن وہ اتنی سخت جان تھیں کہ زندہ بچ گئیں تب سے ان کا نام ''چھپن چھری'' پڑ گیا۔ اس واقعہ پر ایک فلمی ادارے ''اشوک سے ٹون'' نے ''چھپن چھری'' کے نام سے فلم بھی بنائی تھی، جس میں اس وقت کی معروف گراموفون سنگر ''جانکی بائی'' نے مرکزی کردار ادا کیا۔ دیگر کاسٹ میں پروفیسر پالی اور جے میسن تھے اور یہ فلم 18 اپریل 1934ء کو ریلیز ہوئی تھی۔ اسی طرح عیدن بائی کے عہد میں دو اور سنگرز بھی ''عیدن'' کے نام سے معروف تھیں، ان میں ایک عیدن اکھیاں والی تھی، اس کی آنکھیں اس قدر خوبصورت تھیں کہ جو دیکھتا دل پر ہاتھ رکھ کے بیٹھ جاتا، لکھ لکھ دی اکھ!! جبکہ دوسری عیدن ہنسلیاں والی تھی جس کے گلے میں تین پاؤ وزنی اصلی سونے کی ہنسلیاں (ایک قسم کا زیور جو گلے میں پہنا جاتا ہے) پہنی ہوتی تھیں۔ اسی وجہ سے انہیں عیدن ہنسلیاں والی کہا جاتا تھا، ایسی ان گنت گلوکارائیں 20 ویں صدی میں منظر عام پر آئیں جن کے نام کے ساتھ ایک داستان جڑی ہے لیکن اب ان گمنام ناموں کو کون کھوجے؟ یہ تمام سنگرز حیدر باندی کی ہمعصر تھیں، حیدر باندی نے فن موسیقی کے اسرار و رموز کس سے سیکھے اس بارے میں کئی نام آتے ہیں جن میں ماسٹر غلام حیدر، استاد گامے خان اور بابا جی اے چشتی شامل ہیں ان کے بارے میں سینہ بہ سینہ روایات ملتی ہیں کہ ان تینوں اساتذہ کی سنگت سے حیدر باندی مختلف اوقات میں موسیقی سیکھتی رہیں۔ ویسے بھی حیدر باندی تھیٹریکل دنیا کی آرٹسٹ تھیں جہاں تھیٹرز میں کئی ایک موسیقار اور سازندے ہوتے ہیں جو تھیٹرز کے (Live) گانوں کے لیے ریہرسل کروایا کرتے تھے۔

قصور کے محلہ کوٹ مراد میں کئی گھرانے فن موسیقی سے جڑے تھے جن کی خوبرو مغنیائیں صرف مقامی تقاریب میں

پرفارم کرتی تھیں۔ حیدر باندی، عیدن و دیگر لڑکیوں کی رسائی بڑے تھیٹروں تک نہ تھی۔ بمبئی، کلکتہ، دہلی، لاہور، انبالہ اور پنجاب کے مختلف شہروں میں جن میں ملتان بھی شامل تھا، ان شہروں کے میلوں، ٹھیلوں پر پڑاؤ ڈالا کرتی تھیں۔ چھوٹے قصبوں اور تحصیلوں کی حد تک ہونے والے مقامی میلوں میں ''تنبو تھیٹروں'' میں گاتی تھیں۔ نور جہاں جب کچھ بڑی ہوئیں تو حیدر باندی اور عیدن نے نور جہاں کو بھی اپنے ساتھ ہمسفر کرلیا اور میلوں میں پرفارم کرنا شروع کردیا، حیدر باندی تھیٹریکل دنیا میں نور جہاں کی استاد تھیں، اسی مغنیہ کی انگلی پکڑ کر اسٹیج پر پہلا قدم رکھا اور فن اداکاری کے کلیے قاعدے سیکھے۔ یوں ایک شہر سے دوسرے شہر کا سفر کرتے ہوئے نور جہاں بھی حیدر باندی اور عیدن بائی کے ہمراہ لاہور پہنچ گئیں۔ چونکہ بے بی نور جہاں حیدر باندی اور عیدن سے زیادہ نمر میں تھیں۔ نور جہاں کو بابا جی اے چشتی کے توسط سے ''مہابیر تھیٹر'' میں گانے کا موقع ملا، یہ 1930ء کی دہائی کا دور تھا جب یہ گلوکارائیں ملتان میں میلوں ٹھیلوں میں گانے اور محرم الحرام میں نوحہ خوانی کے لیے آیا کرتی تھیں۔

راقم نے مختلف اوقات میں استاد شریف خان (شہنائی نواز) نقارچی گھرانے والے، استاد حسین بخش خان (سارنگی نواز) بھیڈی پوترہ والے اور استاد شریف خان (سارنگی نواز) اور ماسٹر فقیر حسین امرتسری جو تھیٹر کے قدیم آرٹسٹ تھے، کے طویل انٹرویوز کیے تھے، ان سب اساتذہ فن نے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ عیدن، حیدر باندی، گلزار اور نور جہاں ملتان میں نوحہ خوانی و گانے کے لیے آیا کرتی تھیں۔ حیدر باندی، گلزار اور پھوپی الٰہی جان ملتان میں بہت عرصہ مقیم رہیں۔ ان دنوں ملتان کی نواب تنی، بدرو ملتانی، نگینہ جان کا بھی شہرہ تھا، اسی طرح عنایت بائی ڈھیرو والی بھی وسیب کے فنی افق پر چھائی ہوئی تھیں۔ 1930ء تک ملتان میں تین سینما گھر تھے باقی سب منڈوے تھے جہاں تھیٹریکل کمپنیاں ڈرامے کرتی تھیں۔ وہ تین سینما گھر رادھو ٹاکیز، امپریل سینما اور کراؤن ٹاکیز تھے۔ ملتان میں سینما انڈسٹری کے بانی لالہ حکومت رائے نے حسین آگاہی میں جب نیو کراؤن ٹاکیز سینما بنایا جو بعد میں رادھو پیلس اور پھر محفل سینما کہلایا تو اسی سینما میں حیدر باندی کی پہلی دو فلمیں ''شیلا عرف پنڈ دی کڑی'' اور ''ہیر سیال'' ریلیز ہوئیں۔ اسی طرح حشمت محل سینما جس کا قدیمی نام ستارہ ٹاکیز اور اس سے پہلے ''پرمانند تھیٹر'' تھا میں حیدر باندی نے کئی بار اپنے فن کا مظاہرہ کیا، اسی اسٹیج پر گوہر جان، مختار بیگم، جانکی بائی، سردار بائی، عنایت بائی ڈھیرو والی اور برصغیر کے عظیم گائیک سہگل نے پرفارم کیا۔ سہگل ان دنوں سمر سٹہ ریلوے اسٹیشن پر ملازمت کرتے تھے اور اپنے عرصہ گمنامی میں ملتان کا حصہ رہے، ان دنوں 17 کے قریب مقامی تھیٹر کمپنیاں تھیں جن میں سے کئی ایک میں حیدر باندی نے پرفارم کیا۔ یہ تمام معلومات مجھے ملتان کے قدیم اسٹیج آرٹسٹ بابا سجاد نے دی تھیں جن کا 2004ء میں 105 سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ وہ دہلی گیٹ کے رہائشی تھے۔ انہوں نے آغا حشر تھیٹر کے علاوہ دوسری کمپنیوں میں بھی کام کیا تھا وہ علامہ عتیق فکری کے والد ولی محمد قلندر کے ہمعصر تھے۔

دیوان سرداری لعل جنہوں نے پاکستان کی پہلی فلم ''تیری یاد'' بنائی تھی اس زمانے میں اسٹیج اور تھیٹر کی دنیا کے بہت بڑے پروموٹر شمار ہوتے تھے۔ وہ حیدر باندی، عیدن بائی اور نور جہاں کی شہرت سے متاثر ہوکر انہیں کلکتہ کی رنگین دنیا میں لے گئے۔ جہاں انہوں نے ''طوفان میل'' کے نام سے اسٹیج پروگراموں میں حصہ لیا۔ یہیں نور جہاں نے اللہ وسائی سے ''بے بی نور جہاں'' کے نام سے بطور چائلڈ اسٹار اداکاری کا آغاز کیا۔ اس طرح یہاں ''کورنتھین تھیٹر'' کا تذکرہ بھی ضروری ہے، جس میں حیدر باندی، نور جہاں، عیدن اور رشیدہ (پُشپا رانی) نے کام کیا، یہ دھرم تلہ اسٹریٹ کلکتہ میں تھا، اس کا مالک رائے بہادر کرتانی تھا جو کہ مارواڑی ہندو تھا۔ طبیعت اور رنگین مزاجی کے اعتبار سے وہ پورا ''راجا اندر'' تھا۔ اس تھیٹر میں بنگالی، اینگلو انڈین لڑکیاں کام کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ جہاں آرا کجن، اختری بائی فیض آبادی، بالو (صبیحہ خانم کی والدہ) بھی کام کرتی تھیں۔ رائے بہادر کرتانی نے کورنتھین تھیٹر کے لیے اپنے منیجر نصیر کے ذریعے پنجاب سے 20 لڑکیاں منگوائیں، ان لڑکیوں کا نام ''پنجاب میل'' پڑ گیا۔ اس پنجاب میل میں حیدر باندی، عیدن، پُشپا رانی اور نور جہاں بھی کام کرتی تھیں۔ حیدر باندی پنجاب میل کی ''ہیڈ'' تھیں۔ اس تھیٹر میں کچھ عرصہ حیدر باندی نے بھی کام کیا اس کے بعد جب بے بی نور جہاں نے فلمی دنیا میں کام شروع کیا تو حیدر باندی نے بھی تھیٹر چھوڑ دیا، ان دنوں نور جہاں کے نام سے ایک اور فلمی آرٹسٹ بھی کام کرتی تھی جس کو اس کے موٹاپے کے باعث نور جہاں موٹی کہا جاتا تھا۔ بے بی نور جہاں نے اس اداکارہ کے ساتھ 1935ء میں فلم ''آزادی عرف گھونگھٹ کے پٹ کھول'' میں کام بھی کیا تھا۔

یہاں ایک تاریخی مغالطے کا تذکرہ ضروری ہے وہ یہ کہ،

نور جہاں سوئی خاموش فلموں کے دور کی اداکارہ اور گراموفون سنگر تھیں۔ وہ بے بی نور جہاں کی فلموں میں آمد سے بہت پہلے خاموش فلموں میں اداکاری کر رہی تھیں اور تقسیم کے بعد بھی ہندی فلموں میں باقاعدگی سے اداکاری کرتی رہیں لیکن بعض فلمی محققین نے اپنی کتابوں اور مضامین میں نور جہاں سوئی کی خاموش فلموں کو بھی بے بی نور جہاں کے کھاتے میں ڈال دیا جو کہ ایک تاریخی مغالطہ ہے۔

حیدر باندی نے اپنی زندگی کا ایک طویل عرصہ سرائیکی وسیب میں گزارا۔ انہوں نے پہلے تو ملتان کو اپنا مسکن بنایا پھر جب ان کے فن کی خوشبو ملتان سمیت وسیب کے دیگر شہروں میں پھیلی تو نوابین بہاول پور اور سرائیکی خطے کے امراء نے اس حد تک پذیرائی کی کہ حیدر باندی نے ملتان کو خیر باد کہا اور مستقل بہاول پور سکونت اختیار کر لی۔ یہ 20 ویں صدی کی چوتھی دہائی کا زمانہ تھا۔ حافظ نصیر الدین خرم بہاول پوری جو کہ اپنی شاعری میں بے ساختگی، معنی آفرینی کے حوالے سے نہ صرف اعلیٰ شہرت کے حامل تھے بلکہ اشرافیہ کی محفل میں بھی انہیں مدعو کیا جاتا تھا۔ انہوں نے ایک محفل موسیقی میں حیدر باندی کو روبرو سنا تو ان کے معجزہ فن کا یوں اثر ہوا کہ حیدر باندی کی آواز خرم بہاول پوری کے وجود کو دیپک راگ کی طرح آگ لگا گئی اور وہ بے ساختہ کہہ اٹھے۔

واہ مکھڑا حیدر باندی دا
جیویں چندر چڑھیا ہے چاندی دا
اے ڈوجہاں وی مل گھٹنے نی
ہک رات دی بانہہ سراندی دا!!

(ترجمہ) ”کیا خوب چہرہ حیدر باندی کا ہے جیسے چاندی کا چاند نکل آیا ہو، میرے بازو کا تکیہ بنا کر اس کی محفل ایک رات کی استراحت دونوں جہانوں سے زیادہ بیش قیمت ہے“۔ وقت گزرتا رہا، خرم بہاول پوری نے حیدر باندی کے ناز نخرے اٹھائے لیکن ایک لمحہ وہ بھی آیا جب خرم بہاول پوری کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے۔ جس کی وجہ سے حیدر باندی محبوب سے معتوب ٹھہری تو ان کو اتنا بے وقعت اور ذلیل کیا گیا کہ خدا کی پناہ! اس رویے سے حیدر باندی اتنی دلبرداشتہ ہوئی کہ بہاول پور سے نقل مکانی کر کے دوبارہ ملتان آ بسی۔

حیدر باندی بنیادی طور پر تھیٹر کی اداکارہ و گلوکارہ تھیں، حیدر باندی اور عیدن نور جہاں سے سینئر آرٹسٹ تھیں لیکن انہوں نے نور جہاں کے ساتھ فلمی دنیا میں قدم رکھا۔ گراموفون کمپنیوں کے لیے چند کورس گیتوں میں گایا۔ اس کے SOLO گیتوں کی تعداد بہت کم ہے، اسی طرح 16 دسمبر 1937ء کو جب آل انڈیا ریڈیو نے اپنی نشریات کا آغاز کیا تو حیدر باندی بھی ابتدا میں پکے گانوں کے لیے ریڈیو اسٹیشن جاتی رہیں لیکن یہ سلسلہ مختصر رہا اور وہ بعد میں فلمی دنیا سے وابستہ ہو گئیں۔

حیدر باندی نے قیام پاکستان سے قبل کل 7 فلموں میں اداکاری کی، ان کی پہلی فلم ”شیلا عرف پنڈ دی کڑی“ تھی جو کہ نور جہاں کی پہلی فلم تھی۔ یہ فلم 12 اکتوبر 1936ء کو ریلیز ہوئی تھی، اندرا موویٹون کے بینر تلے بننے والی اس فلم کے

ہدایت کار کے ڈی مہرہ، کاسٹ میں حیدر باندی، بے بی نور جہاں، عیدن بائی، مبارک اور پُکھراج رانی شامل تھے۔ دوسری فلم "ہیر سیال" 19 مارچ 1937ء کو ریلیز ہوئی، جس کا فلمساز ادارہ اندرا مووی ٹون تھا اور ہدایت کار کے ڈی مہرہ، موسیقار ماسٹر جھنڈے خان، کاسٹ میں شمشاد بیگم، حیدر باندی، حسن دین، بے بی نور جہاں، ایم اسماعیل، پی این بالی شامل تھے۔ تیسری فلم "سسی پنوں" 20 ستمبر 1939ء کو ریلیز ہوئی جو فلمساز ادارہ، اندرا مووی ٹون کے بینر تلے بنی تھی اور اس کے ہدایت کار داؤد چاند تھے۔ موسیقار دھومی خان تھے کاسٹ میں حیدر باندی، بے بی نور جہاں، پُکھراج رانی، عبدالرحمٰن کشمیری، بابو اسلم تھے۔ چوتھی فلم "پورن بھگت" 16 جون 1939ء کو ریلیز ہوئی، جس کا فلمساز ادارہ اندرا الیوری پکچرز تھا اور ہدایت کار آر ایل شوری، موسیقار دھومی خان تھے کاسٹ، حیدر باندی، مس مونیکا، انوری، کرن دیوان، ڈار کشمیری، اے آر کپور تھے۔ پانچویں فلم "مرد پنجاب" 23 جنوری 1940ء کو ریلیز ہوئی، فلمساز ادارہ، اندرا مووی ٹون، ہدایت کار راج ہنس، موسیقار دھومی خان، کاسٹ، حیدر باندی، نذیر بیگم، سندر داس، اے آر کابلی اور گل زمان تھے۔ چھٹی فلم "مرچنٹ آف وینس" 28 ستمبر 1941ء کو ریلیز ہوئی۔ فلمساز ادارہ "رادھا فلم" تھا اور ہدایت کار جے جے مدن تھے اور موسیقار، برج لال شرما تھے کاسٹ میں حیدر باندی، پریم اتا، خلیل، جہاں آرا کجن، رانی شامل تھیں۔ حیدر باندی کی آخری فلم "میرا پنجاب" تھی جو کہ 21 نومبر 1941ء کو ریلیز ہوئی۔ فلمساز ادارہ انڈیا موویز، ہدایت کار راج ہنس، موسیقار نا معلوم۔ کاسٹ میں حیدر باندی، گل خان، مبارک شامل تھے۔ اس کے علاوہ اور کسی فلم میں حیدر باندی کی اداکاری کا ریکارڈ نہیں ملتا، ان فلموں میں حیدر باندی نے اداکاری کے علاوہ کورس گیت بھی گائے۔

ایک وقت تھا ملتان، بہاول پور سمیت سرائیکی وسیب کے دیگر شہر موسیقی، تھیٹر و دیگر فنون لطیفہ کے اساتذہ فن کا مسکن تھے۔ فن موسیقی کے حوالے سے بہت سے بڑے نام سرائیکی وسیب میں رہائش پذیر رہے۔ استاد توکل حسین خان، استاد عاشق علی خان، استاد امیر خان، استاد فدا حسین خاں جالندھری، استاد چھوٹے غلام علی خان، عنایت بائی ڈھیرو والی، زاہدہ پروین، الٰہی جان، گلزار، شام چوراسی برادران، طفیل نیازی جیسے اہل فن کے ساتھ حیدر باندی بھی شامل تھیں، ان دنوں معروف گراموفون سنگر نواب گنگی دہلی گیٹ میں رہا

کرتی تھیں۔ روایت ہے کہ جب حیدر باندی نے بہاول پور سے ملتان سکونت اختیار کی تو دہلی گیٹ کے معروف تاریخی ڈھنی گل والے محلے کی کسی گلی میں نیم تاریک بوسیدہ مکان میں گمنامی کا عرصہ گزارا۔ کہتے ہیں حیدر باندی کے مشورہ پر ہی نواب گنگی نے فلمیں بنانے کے لیے سرمایہ کاری کی اور اپنی پوری عمر کی پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھیں اور پھر اسی غم میں نشے کی لت پڑی اور گمنامی میں انتقال ہوا۔ 1940ء سے 1970ء تک کی تین دہائیوں میں کئی نامور آرٹسٹ ملتان میں مقیم رہے اور جب پذیرائی کا فقدان ہوا تو نقل مکانی کر گئے۔ نقل مکانی کرنے والوں میں اقبال بانو، شام چوراسی برادران، طفیل نیازی، عنایت بائی ڈھیرو والی، الٰہی جان، گلزار جیسے کئی نام شامل ہیں، دوسروں کے ساتھ حیدر باندی نے بھی ملتان کو خیر آباد کہہ دیا اور شادی کر لی۔

شادی کا قصہ یہ ہے کہ قصور کے نواح میں ایک علاقہ "کھارا" آتا ہے وہاں کا ایک سکھ سردار حیدر باندی عشق میں وہ سکھ سے مسلمان ہوا اور اپنا نام چودھری اصغر رکھا، چودھری اصغر کے سکھ والدین اور دو بھائی تقسیم کے وقت ہندوستان چلے گئے تو کھارے کا کثیر زرعی رقبہ، مال ڈنگر چودھری اصغر کے قبضے میں آ گئے۔ حالات کی ماری حیدر باندی کو اس نے شہزادیوں کی طرح رکھا۔ وہیں "کھارے" میں ہی حیدر باندی کا انتقال ہوا اور دفن ہوئیں۔

حیدر باندی کا انتقال کب ہوا اس بارے میں تاریخ موسیقی یا فن و ثقافت کی کسی کتاب میں تذکرہ نہیں ملتا اور نہ ہی کسی محقق نے برصغیر کی اس گمنام مغنیہ پر جاندار تحقیقی کام کیا۔ وہ جب تک زندہ رہیں نور جہاں اور عیدن سے باقاعدہ ملنے کے لیے لاہور آتیں۔ عیدن نے عمر کا آخری حصہ نور جہاں کی رہائش 72 ایف گلبرگ میں گزارا، تنویر نقوی سے اس کی کوئی اولاد نہ تھی، حیدر باندی عیدن کی مالی امداد بھی کرتی رہیں۔ ان کا انتقال بھی نور جہاں سے پہلے ہو گیا تھا۔ حیدر باندی، عیدن بائی اور نور جہاں برصغیر کی مایہ ناز مغنیائیں تھیں۔ ان آرٹسٹوں کی فنی خدمات کے بغیر برصغیر کی تھیٹریکل، فلمی اور سنگیت کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ حیدر باندی سرائیکی وسیب کی تاریخ موسیقی کا بھی ایک ایسا گمشدہ باب ہیں جن پر آج تک گمنامی کی چادر پڑی ہے۔ اسے ریکارڈ پر لانا ازحد ضروری ہے تاکہ سرائیکی وسیب کی تاریخ فن و ثقافت جامع صورت میں رقم کرنے میں مدد مل سکے۔

فلم نگری

پہلا سپر اسٹار

انور فرہاد

پاکستان کی فلمی صنعت کو اس کی اداکاری نے اوج بخشا تھا کیونکہ وہ اپنے دور کا سب سے کامیاب اداکار کہلاتا تھا۔ اس نے اداکاری کے وہ جوہر دکھائے تھے کہ لوگ اش اش کر اٹھتے تھے۔

پاکستان کے ایک باکمال اداکار کے شب و روز کا احوال

''لالہ! کیا بات ہے آپ سے کہیں جونیئر اور نئے اداکاروں کے انٹرویوز اور فیچر اخباروں اور پرچوں میں بہت چھپتی ہیں مگر آپ کی نہیں چھپتیں؟''

''پہلے یہ بتاؤ۔'' انہوں نے جواب دینے کی بجائے الٹا سوال کر دیا۔ ''تم کسی اخبار کے نمائندے ہو؟ کسی اردو یا انگریزی میگزین سے تمہارا کوئی تعلق تو نہیں؟''

''نہیں لالہ! میں تو آپ کا ایک فین ہوں۔ ایک پرستار ہوں۔''

"پھر ٹھیک ہے۔ میں تمہارے سوال کا جواب دے سکتا ہوں اور میرا جواب یہ ہے کہ میں نے اخبار اور میگزین کا بائیکاٹ کر رکھا ہے۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں لالہ؟"

"اخبار والے ہم فنکاروں اور فلم والوں سے کسی بات پر ناراض ہو کر ہمارا بائیکاٹ کرتے رہتے ہیں نا؟"

"جی ہاں؟"

"مگر...... میں نے اخبار والوں کا بائیکاٹ کر دیا ہے۔ ان کا کوئی سپورٹ اور سہارا نہیں لیتا۔ اخبار والے سمجھتے ہیں کہ وہ ہم آرٹسٹوں کو شہرت اور مقبولیت دلاتے ہیں مگر میں ان سے اتفاق نہیں کرتا۔ میرا ایمان ہے کہ ہمارا کام ہماری مقبولیت کا سبب ہوتا ہے۔ جب تک میں اچھا کام کروں گا۔ عوام مجھے پسند کریں گے اور میری ساکھ برقرار رہے گی۔"

لالہ سدھیر سے میری یہ گفتگو بہت پرانی ہے۔ اس وقت میں نوجوان تھا۔ ایک دن میں اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ ڈھاکے کے نواب پور روڈ سے گزر رہا تھا کہ دیکھا وہ آ رہے ہیں۔ یہ لوگ ڈھاکے میں کسی تقریب میں شرکت کی نیت سے آئے تھے اور اس وقت ڈھاکے کی سڑکوں پر پیدل چل کر لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ان سے یہ مکالمہ اسی دوران ہوا تھا۔ جب فنکاروں کا یہ ٹولہ آگے چلا گیا تو میرے ساتھیوں نے مجھے ٹوکا۔ "یار! تم نے یہ کیا کہہ دیا کہ تمہارا کسی اخبار سے تعلق نہیں؟"

"اگر کہہ دیتا تو...... تو وہ مجھ سے بات نہیں کرتے۔ تم نے دیکھا نہیں لالہ سدھیر نے کہا تھا۔ "پھر ٹھیک ہے۔ میں تمہارے سوال کا جواب دے سکتا ہوں۔"

"مگر یار! انہوں نے یہ بات کیوں کہی کہ میں نے اخبار والوں کا بائیکاٹ کر رکھا ہے؟"

"قصہ یوں ہے کہ کراچی کے ایک بڑے اخبار والے سے لاہور کے ایک نگار خانے میں ان کی ٹھن گئی تھی۔ اخبار والے نے ان کے بارے میں کوئی ناپسندیدہ بات لکھ دی تھی۔ وہ جب لاہور میں انہیں نظر آئے تو انہیں دیکھ کر ان کا پارہ چڑھ گیا۔ ان کا جنگجو ہیرو کا روپ سامنے آ گیا۔ پہلے تو تو...... میں میں...... پھر نوبت اس سے آگے چلی گئی۔ کچھ لوگوں نے بیچ بچاؤ کرایا۔ اخبار والے نے اپنا غصہ اپنے اخبار کے ذریعے نکالا۔ بس اس واقعے کے بعد ہمارا تمہارا یہ جنگجو ہیرو اخبار اور انٹرویو یا اس کی زیرِ تکمیل فلموں کے بارے میں بات کرنے کی کوشش کرتا تو......" وہ سرد لہجے میں کہہ دیتے۔ "مجھے آپ سے کوئی بات نہیں کرنی ہے۔"

"مگر لالہ! کیوں؟ مجھ سے کیوں بات نہیں کرنا چاہتے؟"

"میں نے اخبار والوں کا بائیکاٹ کر رکھا ہے۔ مجھے میڈیا کے کسی تعاون کی ضرورت نہیں۔"

لالہ سدھیر کی یہ ناراضگی آخری دم تک برقرار رہی۔ اخبارات و جرائد کے لیے انہوں نے کوئی انٹرویو نہیں دیا۔ کبھی اپنی کسی فلم کے بارے میں فیچر یا کوئی آرٹیکل لکھنے کو نہیں کہا۔ اخبار والے ان کے یا ان کی فلم کے بارے میں جو لکھ دیتے، جو چھاپ دیتے ان پر کوئی تبصرہ یا تنقید نہیں کرتے۔

یہ درست ہے کہ میڈیا آرٹسٹوں اور ہنرمندوں کی تشہیر اور پبلسٹی کے لیے بہت معاون و مددگار ہوتا ہے مگر لالہ سدھیر شروع ہی سے بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ اللہ نے انہیں ابتداء ہی سے فنی صلاحیتوں سے مالا مال کیا تھا۔ انہوں نے اپنے کام پر توجہ دی، محنت کی اور خداوند قدوس نے انہیں کامیابی عطا کی۔ لالہ سدھیر نے جس وقت اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا۔ اس وقت میڈیا آج کی طرح پاور فل نہیں تھا۔ چند اخبارات و جرائد تھے الیکٹرونک میڈیا تو بہت بعد کی پیداوار ہے۔

لالہ سدھیر کو پاکستانی فلمی صنعت کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے جب کہ برصغیر کی تقسیم سے پہلے سے وہ اداکاری کے شعبے سے وابستہ تھے۔ ان کی پہلی فلم "فرض" تھی۔ اس فلم میں ان کی ہیروئن آہو چشم راگنی تھیں۔ یہ فلم قیام پاکستان سے چند ماہ پہلے 1947ء میں ریلیز ہوئی تھی اس کے ہدایت کار رنجیت تھے۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ قیام پاکستان سے پہلے جو فسادات ہوئے اس میں لاہور کے اسٹوڈیوز کے ساز و سامان لوٹ لیے گئے یا بھارت جانے والے ہندو اپنے ساتھ لے گئے۔

پاکستان بننے کے بعد لاہور کے آرٹسٹوں اور ہنرمندوں نے فلم سازی کی ابتداء کی۔ بچے کھچے ساز و سامان کو جوڑ کر اور قابلِ استعمال بنا کر فلم سازی کی ابتداء کر دی۔ اس طرح پاکستان کی پہلی فلم "تیری یاد" 7 اگست 1948ء کو ریلیز ہوئی اس کے بعد "شاہدہ" بنائی گئی جو 18 مارچ 1949ء کو نمائش پذیر ہوئی۔ ان دونوں فلموں کے ہیرو ناصر خان تھے جو دلیپ کمار (یوسف خان) کے بھائی تھے۔

ان دونوں فلموں میں کام کرنے کے بعد ناصر خان نقل مکانی کر کے بھارت چلے گئے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ انہیں اس وقت کی صورتِ حال میں پاکستانی فلم انڈسٹری کا مستقبل کچھ نظر نہ آیا ہو۔ بہر حال پاکستان میں بے سروسامانی کے باوجود فلمسازی کی جو گاڑی چل پڑی تھی وہ چلتی رہی۔ ''تیری یاد'' اور ''شاہدہ'' کے دوران ''ہچکولے'' نامی فلم بنی جو 11 مارچ 1949ء میں ریلیز ہوئی۔ یہ سدھیر کی پہلی پاکستانی فلم تھی جس کے وہ ہیرو تھے۔ اس فلم میں ان کے مقابل بھارتی اداکارہ نجمہ ہیروئن تھیں۔ جب کہ اس کے ہدایت کار داؤد چاند تھے۔ جنہوں نے ''تیری یاد'' کو ڈائریکٹ کیا تھا۔ اس فلم کے دیگر اداکاروں میں کیریکٹر ایکٹر ایم اسماعیل، مایا دیوی اور اختری بھی شامل تھے۔ اس کے موسیقار ماسٹر عنایت حسین تھے۔ پاکستان میں ان کی بھی یہ پہلی فلم تھی جب کہ ان کے کریڈٹ میں ایک ہندی فلم ''کملی'' بھی ہے۔ اگرچہ عنایت حسین نے ہچکولے کے لیے بڑی خوب صورت دھنیں بنائی تھیں اور سدھیر نے ایک گلوکار کا کردار بڑی خوبی سے ادا کیا تھا مگر باکس آفس پر کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کی وجہ ٹیکنیکی طور پر فلم کی کمزوری ہو سکتی ہے۔ ہچکولے کی کہانی اور مکالمے نویس کے علاوہ نغمہ نگار سیف الدین سیف تھے۔ یہ ان کی پہلی فلم تھی۔ بطور عکاس اے حمید کی بھی یہ پہلی فلم تھی۔ اس فلم میں نو گیت تھے۔ جنہیں علی بخش ظہور، منور سلطانہ، نسیم اختر، کملی بیگم اور اقبال بیگم لائل پوری کی آوازوں میں ریکارڈ کیا گیا تھا۔ ان گیتوں میں علی بخش ظہور کا گیت ''جب پیار کا دیا جلاتا ہوں۔ تو چپکے چپکے آجا'' اس دور میں بہت مقبول ہوا تھا۔ ماسٹر عنایت حسین کا کہنا ہے کہ نامور موسیقار نوشاد نے اس گیت کی عمدہ کمپوزیشن پر انہیں ایک توصیفی خط ارسال کیا تھا۔

سدھیر نے پاکستان میں اپنی پہلی فلم ''ہچکولے'' کی ریلیز کے تقریباً تین سال بعد سبطین فضلی کی نغمہ بار فلم ''دوپٹا'' میں ایک ہمدرد اور غمگسار محبت بھرا دل رکھنے والے فرض شناس ڈاکٹر کے کردار میں اپنی تمام تر فنی صلاحیتوں کے ساتھ اداکاری کی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اسی فلم سے ابھر کر سامنے آئے۔ گو کہ دوپٹا کے روایتی ہیرو اجے کمار تھے مگر سدھیر نے اپنی جاندار کردار نگاری سے اور آواز کے بہترین زیر و بم کے تاثرات سے فلم بینوں کے دل موہ لیے تھے۔ یہ ملکہ ترنم نور جہاں کی پاکستان میں پہلی اردو فلم تھی۔ اس سے پہلے وہ پنجابی فلم ''چنوے'' میں بطور ہیروئن کام کر چکی تھیں۔ ''دوپٹا'' 3 مارچ 1952ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس فلم میں بھی نور جہاں نے ہیروئن کا کردار بڑے دل موہ لینے والے انداز میں کیا تھا۔ اس فلم دوپٹا کی کہانی اور آرٹسٹوں کی اداکاری جہاں بہت جاندار تھیں وہاں اس کی موسیقی اور گیتوں کا جواب نہیں تھا۔ اس دور میں ہی ان گیتوں نے دھوم نہیں مچائی تھی۔ 65 سال گزرنے کے باوجود آج بھی ان کی مقبولیت برقرار ہے۔ ''دوپٹا'' کے موسیقار فیروز نظامی تھے۔ ان کی بنائی ہوئی دل کش، مسحور کن اور اثر انگیز دھنوں نے اس فلم کے گیتوں کو دوام بخشا۔ ان کی شہرت اور مقبولیت سرحد پار تک جا پہنچی۔ سبطین فضلی کی یہ فلم کلکتہ (بھارت) میں ایک ساتھ نو سینما گھروں میں ریلیز ہوئی تھی اور کامیاب فلم کی حیثیت سے بے حد پسند کی گئی تھی۔ جس کے بعد بھارت کے دیگر شہروں میں بھی پیش کی گئی اور اپنی کہانی، اداکاری اور خاص طور پر گیتوں کی وجہ سے ہندوستان بھر میں ذوق وشوق سے دیکھی گئی۔ موسیقار فیروز نظامی کی دل کش دھنوں پر مشیر کاظمی اور عرش لکھنوی نے یہ سدا بہار گیت لکھے تھے جو آج بھی سماعتوں میں شہد ٹپکاتے ہیں۔

☆ چاندنی راتیں۔ چاندنی راتیں
سب جگ سوئے ہم جاگیں
تاروں سے کریں باتیں
چاندنی راتیں

(شاعر مشیر کاظمی)

☆ تم زندگی کو غم کا فسانہ بنا گئے۔
آنکھوں میں انتظار کی دنیا بسا گئے

(شاعر عرش لکھنوی)

☆ میں بن پتنگ اڑ جاؤں رے
ہوا کے سنگ لہراؤں رے

(شاعر مشیر کاظمی)

☆ جگر کی آگ سے اس دل کو جلتا دیکھتے جاؤ
لٹی جاتی ہے ارمانوں کی دنیا دیکھتے جاؤ

(شاعر عرش لکھنوی)

☆ بات ہی بات میں
چاندنی رات میں
جیا میرا کھو گیا
ہائے کسی کا ہو گیا

(شاعر مشیر کاظمی)

☆ میرے من کے راجا آجا
سونا تیا دکھا جا
(شاعر مشیر کاظمی)

☆ چھم چھم چھم ناچے جیا
چھائی گھٹا آجا پیارے پیا
(شاعر مشیر کاظمی)

☆ سانوریا تو ہے کوئی پکارے
آجا سوئے چاند ستارے
آجا رے آجا رے
(شاعر مشیر کاظمی)

اچھی دھنوں پر اچھے بول لکھے جائیں اور آواز بھی اچھی ہو تو گیت سر چڑھ کر بولتے ہیں۔ دوپٹہ کے گیتوں نے بھی اپنی خوبیوں کی وجہ سے دھوم مچادی۔ فلموں کی کامیابی میں موسیقی کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ دوپٹہ کو بھی اس کی جاندار موسیقی سے جو کامیابی ملی۔ اس سے سدھیر اور اس کے دیگر آرٹسٹوں کو بھی شہرت ملی۔ سدھیر اس لحاظ سے بڑے خوش قسمت ثابت ہوئے کہ اپنی دوسری پاکستانی فلم سے پاکستانی اور بھارتی فلم بینوں میں پسند کیے گئے۔ اس فلم کی کاسٹ میں غلام محمد، بیو بیگم، نفیس بیگم، آزاد، زرینہ، ریشماں شامل ہیں۔ جب کہ اجے کمار اور نور جہاں اس فلم کا رومانی جوڑا ہے۔ دوپٹہ کی کہانی انور کمال پاشا کے والد حکیم احمد شجاع نے لکھی جب کہ عکاسی جعفر بخاری نے کی۔

کبھی کبھی کچھ شعروں کا نزول کسی خاص واقعے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ''دوپٹہ'' کے ایک گیت کے بارے میں بھی یہ بات قابل ذکر ہے کہ مشیر کاظمی ایک دن فاقہ مستی کے عالم میں لکشمی چوک لاہور کے چوراہے پر رات کے بارہ بجے گھاس پر لیٹے ہوئے تھے کہ اس عالم میں اس شعر کا نزول ہوا۔

سب جگ سوئے ہم جاگیں
تاروں سے کریں باتیں
چاندنی راتیں

اگلے دن انہوں نے یہ بول موسیقار فیروز نظامی کو سنائے تو انہوں نے اس کی دھن بنا کر فضلی صاحب کو سنائی۔ انہوں نے بھی اسے پسند کیا اور پھر یہی گیت اس فلم کا سپرہٹ گیت بن گیا۔

''دوپٹہ'' کی کامیابی سے سدھیر کے لیے آگے بڑھنے کی راہیں استوار ہوگئیں اور یکے بعد دیگرے فلم سازو ہدایت کار انہیں اپنی فلموں میں ہیرو کے طور پر کاسٹ کرنے لگے۔ ہدایت کار اسلم ایرانی نے اپنی پہلی فلم ''تڑپ'' میں ہیرو کاسٹ کیا۔ گلشن آراء، نگہت سلطانہ اور علاؤالدین نے اس فلم میں دیگر کردار ادا کیے۔ ہدایت کار انور کمال پاشا نے اپنی فلم ''گمنام'' میں ہیرو بنایا۔ ہدایت کار داؤد چاند نے اپنی فلم ''سسی'' میں پنوں کے کردار میں شامل کیا۔ واضح رہے کہ ''سسی'' کو پاکستان کی پہلی گولڈن جوبلی فلم ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ ''سسی'' کی کامیابی سے متاثر ہو کر ہدایت کار ایم جے رانا نے سوہنی بنائی اور سدھیر کو ماہی وال کے کردار میں پیش کیا۔ ''سوہنی'' میں پہلی بار زیر آب (انڈر واٹر) کچھ مناظر کی عکس بندی عکاس ریاض بخاری نے بڑی مہارت سے کی۔ ہدایت کار ایم جے رانا کی یہ پہلی اردو فلم تھی۔ اس فلم کو سسی جیسی سپرہٹ کامیابی نہیں ملی۔

''بلبل'' ہدایت کار داؤد چاند کی پنجابی فلم تھی جس میں سدھیر نے بطور ہیرو کام کیا۔ یہ ان کی پہلی پنجابی فلم تھی۔ ''جھیل کنارے'' عکاس نظام ناخدا کی بطور ہدایت کار پہلی فلم تھی۔ انہوں نے بھی سدھیر کو ہیرو کے رول میں پیش کیا۔ ''طوفان'' ہدایت کار رحید رشاہ کی فلم تھی جس کے ہیرو سدھیر پر یہ گیت پکچرائز ہو کر بہت مقبول ہوا۔

آج کس کی نظر کے سامنے پاتا ہوں

یہ گیت گلوکار فضل حسین نے بڑی دلگیری کے ساتھ گایا تھا۔ سدھیر نے بھی اس گیت کی بیجز ایکسپریشن میں بڑی عمدہ پرفارمنس دی تھی۔

اس کے بعد ہدایت کار خادم محی الدین کی فلم ''خزاں کے بعد'' تھی۔ سدھیر کی یہ فلم خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ کر سکی مگر اس کے بعد ریلیز ہونے والی ان کی پنجابی فلم ''دلا بھٹی'' نے فقید المثال کامیابی حاصل کی۔ ایس ایم ڈار اس فلم کے ہدایت کار تھے۔ موسیقار بابا غلام احمد چشتی نے بیشتر گیتوں کی بے حد عمدہ دھنیں بنائی تھیں۔ ان گیتوں میں ایک گیت ''واسطہ ای رب دا تو ں جاویں اے کبوترا'' نے دھوم مچادی۔ اس گیت کے بول طفیل ہوشیار پوری کے زور قلم کا نتیجہ ہیں۔ جنہیں منور سلطانہ نے گا کر امر کردیا۔ یہ گیت بھی موسیقی کے شائقین بڑے شوق سے سنتے ہیں۔ ''دلا بھٹی'' چھ جنوری 1956ء کو نمائش پذیر ہوئی تھی۔ اس فلم کی سپرہٹ کامیابی نے سدھیر کی ساکھ کو بہت مستحکم کردیا تھا اور وہ اردو فلموں کے علاوہ پنجابی فلموں کے بھی مقبول ہیرو تسلیم کر لیے گئے۔ اس فلم نے اس دور میں باکس آفس پر اتنا کمایا کہ اس

کی آمدنی سے اس کے فلم ساز آغا جی اے گل نے اپنا ذاتی اسٹوڈیو ایورنیو قائم کیا۔

''دلا بھٹی'' کی فقید المثال کامیابی کے بعد ایک اور پنجابی فلم ''ماہی منڈا'' بنائی گئی۔ جس کا کلیدی کردار سدھیر سے کرایا گیا۔ اس فلم نے بھی ''دلا بھٹی'' کی طرح سپرہٹ کامیابی حاصل کی۔ ایم جے رانا اس فلم کے ہدایت کار تھے اور باری ملک فلم ساز۔ اس فلم میں مسرت نذیر، سدھیر کی ہیروئن تھیں۔ فلم کی سپرہٹ کامیابی کے بعد سدھیر اور مسرت نذیر کی جوڑی کو بھی بے حد پسند کیا گیا۔ اس فلم کے موسیقار بھی بابا چشتی تھے۔ جن کی خوب صورت دھنوں پر کئی گیت بہت مقبول ہوئے۔ یہ فلم 16 مارچ 1956ء کو ریلیز ہوئی۔

سدھیر نے پنجابی فلموں میں بھی کامیاب ہیرو کے طور پر اپنا لوہا منوالیا تھا مگر انہوں نے اردو فلموں سے اپنی ساکھ بنائی، لہٰذا ''ماہی منڈا'' اور ''دلا بھٹی'' جیسی کامیاب پنجابی فلموں کے بعد بھی انہیں اردو فلموں کے لیے کاسٹ کیا جاتا رہا۔ ایسی ہی فلموں میں ''چھوٹی بیگم'' بھی تھی جس میں ٹائٹل رول صبیحہ خانم نے ادا کیا تھا جب کہ سدھیر نے ان کے شوہر کا کردار نبھایا تھا۔ سدھیر کی غیر معمولی کردار نگاری نے فلم بینوں سے زبردست داد وصول کی۔ کامیابی کے لحاظ سے یہ سدابہار فلم ثابت ہوئی۔ جب بھی دکھائی نئی فرسٹ دن کی طرح کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔

''چھوٹی بیگم'' 10 مئی 1956ء کو نمائش پذیر ہوئی تھی۔ یہ بات قابلِ غور ہے اس دور میں آج کی طرح جدید ٹیکنالوجی کی سہولت حاصل نہیں تھی اس کے باوجود بڑی رفتار سے فلمسازی کا سلسلہ جاری تھا۔ ایک ہی سال میں کئی ریلیز ہو رہی تھیں جن میں بیشتر کامیابی سے ہمکنار بھی ہوتی تھیں۔

''مرزا صاحباں'' بھی لوک رومانوی فلم تھی جو ''ہسی'' اور ''سوہنی'' کی کامیابی سے متاثر ہو کر بنائی گئی تھی۔ سدھیر نے مرزا اور مسرت نذیر نے صاحباں کے کردار نبھائے تھے۔ اس کے ہدایت کار داؤد چاند اور موسیقار خواجہ خورشید انور تھے۔ یہ فلم باکس آفس پر ''ہسی'' اور ''سوہنی'' کی طرح بڑی کامیابی حاصل نہ کر سکی۔

اس کے بعد سدھیر کی ریلیز ہونے والی اردو فلم ''پون'' تھی جس کی ہیروئن اداکارہ شمی تھی۔ اس فلم کی تکمیل کے دوران سدھیر شمی کی زلفوں کے اسیر ہو گئے اور بالآخر

زندگی نامہ

خاندانی نام: شاہ زمان خان

فلمی نام: سدھیر

پیدائش: 2 ستمبر 1924ء

مقام پیدائش: پشاور

والد: سردار محمد اسلم خان

پہلی فلم: فرض (یہ فلم قیام پاکستان سے پہلے ریلیز ہوئی)

پہلی پنجابی فلم: بلبل

پہلی پاکستانی فلم: ہچکولے (اردو زبان کی فلم، یہ فلم 1949ء میں ریلیز ہوئی)

شادی: تین شادیاں کیں۔ (پہلی نے تادم مرگ ساتھ دیا۔ باقی دو تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد علیحدہ ہو گئیں)

اکلوتے شہزادے: اپنے پورے خاندان میں واحد نرینہ اولاد تھے۔ اس لیے سب کے لاڈلے تھے۔

فلمی کیریئر: ابتداء اداکاری سے کی۔ پھر فلم سازی بھی کی اور ہدایت کاری بھی۔ فلم ساز کی حیثیت سے 8 فلمیں پروڈیوس کیں۔ ہدایت کار کے طور پر ''ساحل'' اور ''بغاوت'' کی ڈائریکشن بھی دی۔

مہمان اداکار: مہمان اداکار کے طور پر 15 فلموں میں کام کیا۔

فلمیں: اردو اور پنجابی فلموں میں یکساں طور پر کامیاب رہے۔ ابتداء میں رومانوی کردار نگاری کی۔ پھر ایکشن فلموں میں بھی اپنا لوہا منوایا۔ ہر طرح کے کردار کر کے اپنے آپ کو وراسٹائل منوایا۔

ساتھی فنکار: ہر نامور ہیروئنوں کے مقابل ہیرو آئے۔ ان کی ہیروئنز کی تعداد 30 سے زائد ہے جب کہ تمام ہی بڑے ہیروز کے ساتھ کام کیا۔

انتقال: 19 جنوری 1997ء کو ہوا۔

دونوں شادی کے بندھن میں بندھ گئے اور کامیاب ازدواجی زندگی گزاری۔ جب کہ ''پون'' نے واجبی کامیابی حاصل کی۔

سدھیر کی اگلی فلم فلمساز و ہدایت کار اشفاق ملک کی اردو فلم ''باغی'' تھی۔ اس فلم میں سدھیر نے غیر معمولی کردار

نگاری کر کے پاکستان کے جنگجو ہیرو کا خطاب حاصل کیا۔ اس فلم نے اپنی عمدہ کہانی، دل خوش کن موسیقی اور فن کاروں کی اعلیٰ اداکاری کی وجہ سے کامیابی کا ایک نیا ریکارڈ قائم کیا۔ اس کے ہر شو میں سینما گھروں میں تماشائیوں کا رش ہوتا۔ اس فلم نے ملک گیر کامیابی ہی نہیں حاصل کی بلکہ دوست ملک چین سے بھی زبردست پسندیدگی کی سند حاصل کی۔ اس فلم کو چینی زبان میں ڈب کر کے ریلیز کیا گیا تھا۔ چین کے ہر شہر میں ریلیز ہونے کے بعد اس فلم کو وہ کامیابی ملی جو تاریخ ساز ہے اور پاکستان کو اس پر ناز ہے۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ چین میں "باغی" کی عظیم الشان نمائش کے موقع پر چینی ڈسٹری بیوٹر کی خصوصی دعوت پر فلم ساز و ہدایت کار اشفاق ملک اور فلم کی ہیروئن اور ہیرو مسرت نذیر اور سدھیر چین گئے تھے۔

سدھیر جو اب تک اپنی اردو اور پنجابی فلموں میں کامیاب رومانوی کرداروں میں اپنی فنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے رہے تھے۔ "باغی" کے بالکل مختلف کردار میں انہیں پیش کیا گیا تھا۔ یہ ایک اینگری مین کا کردار تھا۔ ایک باغی جنگجو کا کردار تھا۔ اب تک وہ لائٹ اداکاری کرتے رہے تھے۔ باغی کے کردار میں انہوں نے ایسی جاندار اور شاندار کردار نگاری کی کہ انہیں ناقدینِ فن نے ورسٹائل اداکار تسلیم کرلیا۔ اس بات پر سب متفق ہو گئے کہ سدھیر مشکل سے مشکل کردار کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

باغی کی زبردست پرفارمنس کے بعد سدھیر کو اسی نوعیت کی اردو اور پنجابی فلمیں ملنے لگیں اور سراپا رومانوی اداکار اینگری مین کے کرداروں میں بھی اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھانے لگا۔ باغی 14 ستمبر 1956ء کو ریلیز کی گئی تھی۔ اس فلم کی خوب صورت اور دل موہ لینے والی موسیقی ترتیب دینے والے موسیقار رحمٰن ورما نے اسی فلم سے پاکستان میں اپنے فلمی کیریئر کا آغاز کیا تھا۔

فلم ساز و ہدایت کار سدھیر کی صلاحیتوں پر بھروسا کرتے تھے اس لیے اسے ہر طرح کے کردار کے لیے منتخب کر لیتے تھے۔ ہدایت کار داؤد چاند نے فلم حاتم بنائی تو حاتم جیسے سخی انسان کے لیے سدھیر ہی کا انتخاب کیا اور سدھیر نے بھی ہدایت کار کے اعتماد کو ٹھیس نہیں لگائی ایک نرم دل اور ساری انسانیت سے محبت کرنے والے شخص کا ٹائٹل رول انتہائی کامیابی سے ادا کیا۔

سدھیر کی خداداد اداکارانہ صلاحیتوں کے پیشِ نظر اسے ہر طرح کی اردو اور پنجابی فلموں میں کاسٹ کیا جاتا رہا۔ جن میں گڈی گڈا (پنجابی فلم ہدایت کار و فلم ساز ولی صاحب) شالیمار جس کی ہیروئن بھارتی اداکارہ ریحانہ تھی اور ہدایت کار ایس ایچ زیدی اور موسیقار مبارک علی خان تھے۔ "داتا" ہدایت کار عطا اللہ شاہ ہاشمی، ریلیز 22 فروری 1957ء "یکے والی" بھی اسی تاریخ کو نمائش پذیر ہوئی اور فقید المثال کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ اس گولڈن جوبلی ہٹ پنجابی فلم نے فلم ساز باری ملک کو اس قدر مالا مال کیا کہ انہوں نے اس کی آمدنی سے باری اسٹوڈیو بنالیا۔ مسرت نذیر نے سدھیر کے مقابل ہیروئن کا ٹائٹل رول ادا کیا۔ بابا چشتی اس فلم کے بھی کامیاب موسیقار ثابت ہوئے۔

"آنکھ کا نشہ" سدھیر کی بطور فلمساز اردو فلم تھی جسے سبطین فضلی نے ڈائریکٹ کیا تھا۔ اس کے موسیقار ماسٹر عنایت حسین تھے۔ مسرت نذیر نے اس فلم میں صبیحہ خانم کی والدہ کا کردار ادا کیا تھا۔ اگرچہ مسرت نذیر صبیحہ سے عمر میں کچھ کم ہی تھیں۔

اس کے بعد سدھیر کی ریلیز ہونے والی فلمیں "نوراں" (پنجابی) اور مراد اردو فلم تھیں۔ "نوراں" میں نور جہاں نے ٹائٹل رول کیا تھا۔ فلم باکس آفس پر نرم گئی۔ "مراد" میں سدھیر نے ٹائٹل رول کیا تھا۔ یہ فلم ساز و ہدایت کار داؤد چاند کی فلم تھی۔ جانِ بہار فلم ساز و ہدایت کار سید شوکت حسین رضوی کی اردو فلم تھی۔ اس فلم میں اداکارہ حسنہ، سدھیر کی بیٹی کے کردار میں نمودار ہوئی تھی۔ جانِ بہار" 21 اپریل 1958ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس کے بعد سدھیر کی ریلیز ہونے والی فلم "انارکلی" تھی۔ جو سید امتیاز علی تاج کے مشہور ڈرامے سے ماخوذ تھی۔ اس فلم میں سدھیر نے شہزادہ سلیم کا کردار بڑی خوبی سے ادا کیا تھا۔ یہ فلم اپنی دلکش موسیقی اور ملکہ ترنم نور جہاں کے گانوں کی وجہ سے بہت پسند کی گئی تھی۔ اس کے موسیقار رشید عطرے اور ماسٹر عنایت حسین تھے۔ نور جہاں نے سدھیر کے مقابل ہیروئن کا کردار پلے کیا تھا۔

لالہ سدھیر اب پاکستانی فلموں کے ناقابلِ تسخیر ہیرو تھے۔ فلم کی کہانی کسی بھی نوعیت کی ہو فلم ساز و ہدایت کار اس اعتماد کے ساتھ اسے کاسٹ کرتے کہ ان کی فلم کے لیے وہی موزوں ہے۔ اس ضمن میں ان کی جو فلمیں ریلیز ہوئیں ان میں جٹی، آخری نشان، سوسائٹی، یار بیلی (خلیل قیصر کی بطور ہدایت کار پہلی فلم)، کرتار سنگھ، جھومر،

گلشن، ایک تھی ماں، ساحل (سدھیر فلمز کی اس فلم کے فلم ساز و ہدایت کار لالہ سدھیر خود تھے)، عجب خان (جس میں لالہ سدھیر کے مقابل حسنہ ہیروئن تھی) گل بکاؤلی، غالب جو سید عطاء اللہ شاہ ہاشمی کی فلم تھی اور انہوں نے اس جنگجو ہیرو سے غالب کا کردار کروایا تھا۔ "بغاوت" یہ بھی سدھیر کی ذاتی فلم تھی جس کی ہدایت کاری بھی انہوں نے خود کی تھی۔ پنجابی فلموں کے مقبول ہیرو اکمل نے ولن کا کردار کیا تھا جب کہ لالہ سدھیر نے باغی نوجوان کا کردار ادا کیا تھا۔ دیگر فلموں میں کالا پانی، نیلم، چاچا خواہ مخواہ، ڈاچی (اسلم ایرانی کی یہ فلم بے حد کامیاب رہی)، ماماجی، خیبر پاس، باغی سپاہی (اس فلم میں ان کی ہیروئن زیبا تھیں) فلم ساز و ہدایت کار خلیل قیصر اور مصنف ریاض شاہد کی یہ گولڈن جوبلی فلم تھی جو ہر دور میں پسند کی گئی۔ سدھیر نے اس فلم میں حریت پسند اکبر خان کا کردار بڑی خوبی سے ادا کیا تھا۔ چھنے خان، مجاہد، ہدایت کار جمیل اختر کی یہ فلم جنگ ستمبر 1965ء کے دوران ریلیز ہوئی اور اس کے ترانے "ساتھیو! مجاہدو! جاگ اٹھا ہے سارا وطن" نے دھوم مچادی۔ من موجی، جی دار، اس پلاٹینم جوبلی فلم کے ٹائٹل رول سدھیر اور حبیب نے ادا کیے تھے۔ "قبیلہ" اس فلم میں سدھیر نے ڈبل رول کیا تھا۔ جی، معجزہ، جوکر، جوش، اقبال یوسف کی فلم جس میں پہلی بار پانچ ہیروز اور پانچ ہیروئنز نے کام کیا تھا۔ نغمہ صحرا، کوہ نور، ایاجی، چٹان، حکومت، منگیتر، کافر، شعلہ و شبنم (جس میں لالہ سدھیر نے ڈاکو کا کردار ادا کیا جب کہ درپن نے ان کے چھوٹے بھائی کا کردار ادا کیا جو پولیس افسر ہوتا ہے) جانی دشمن، میدان، پنڈ دی کڑی، چھین لے آزادی، مغرور، چن مکھناں، جگ بیتی۔ پگڑی سنبھال جٹا، ایک ہی راستہ، ہر فن مولا، میں زندہ ہوں (اس فلم کی فلم ساز سدھیر کی بیگم شمی تھیں)، اوکھا جٹ، بھائیاں دی جوڑی، دریام، خون ناحق، حکیم جی، شیراں دے پتر شیر، (اس فلم نے پلاٹینم جوبلی کی) چور نالے چتر، بہرام، درندہ، (شوکت ہاشمی اس فلم کے ہدایت کار تھے) قتیل شفائی کے علاوہ احمد ندیم قاسمی نے بھی اس فلم کی نغمہ نگاری کی۔ غیرت شان جواناں دی، ریشماں، رنگو جٹ، چن دا سورج، شیر پتر جوڑ جواناں دا، بابا دینا (یہ رحم کمار کی بطور مہمان اداکار واحد پنجابی فلم ہے)، گھنگرو، یار بادشاہ، سجاول، غیرت میرا ناں، بچپن بھرا، دل اور دنیا

پہلی فلم

☆ پہلی فلم "قرض" (تقسیم ہند سے پہلے کی)

☆ پہلی پاکستانی فلم: "ہچکولے"

☆ پہلی گولڈ جوبلی فلم: "سسی"

☆ پہلی ایکشن فلم: "باغی"

☆ پہلی پلاٹینم جوبلی فلم: "جی دار"

☆ پہلی پنجابی فلم: "بلبل"

☆ پہلی بطور فلم ساز فلم: "ساحل"

☆ پہلی بطور ہدایت کار فلم: "ساحل"

☆ پہلی رنگین پنجابی فلم: "چن دا سورج"

☆ پہلی رنگین اردو فلم: "العاصفہ"

سدھیر کی سدابہار جوانی

یہ بات خاصی دلچسپی ہے کہ اداکارہ راگنی، سدھیر کی پہلی فلم "قرض" میں ان کی ہیروئن تھیں۔ گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ وہ عمر رسیدہ ہو گئیں اور اولڈ کیریکٹر کرنے لگیں مگر لالہ سدھیر آخری دم تک فلموں میں ہیرو کے کردار کرتے رہے۔ اسی طرح ان کی مقبول ہیروئن صبیحہ خانم نانی دادی کے کردار کرنے لگیں مگر سدھیر ہیرو ہی بنے رہے۔

لالہ سدھیر کی گولڈن جوبلی فلمیں

فرنگی، ان داتا، سسی، صورت اور سیرت، چھوٹی بیگم، ماہی منڈا، جادو۔

لالہ سدھیر کی پلاٹینم جوبلی فلمیں

ماں پتر، جی دار، ولا بھٹی، یکے والی، شیراں دے پتر شیر۔

لالہ سدھیر نے بطور مہمان اداکار ان فلموں میں کام کیا

پہلا وار، دور جگمگیلے، شیشے کا گھر، دیوانہ، حسینوں کی بارات، جھلی، ریشماں جوان ہو گئی، جرنیل بخت، غلام، بے گناہ، میرا نام راجا۔

(مہمان اداکار کے روپ میں)، عشق بنا کی جینا، العاصفہ (یہ لالہ سدھیر کی پہلی مکمل رنگین فلم تھی)، خون پسینا، (یہ حسن عسکری کی بطور ہدایت کار پہلی فلم تھی) اک ڈولی دو کہار، ہیرا موتی، قرض اور محبت، سوہنے پھل پیار دے، پتر دا پیار، یار بھائیاں دے یاریاں، نظام، ٹھاہ، انتقام، سوہنا ویر، دکھ سجناں دے، غیرت میرے ویر دی، سوہنا بابل، جھلی، خبردار، غلام، وچھڑیا ساتھی، بگڑی داتا دی۔ زر زن تے زمین، لاٹری، بول بچن، کئی سال پہلے، تیرے جیسے پت جمن ماراں۔ لمبے ہتھ منوں دے، جادو (جس نے گولڈن جوبلی کی) سردا بدلہ، عادی مجرم، اسے تک میرے ویر دی، دھن جگرا ماں دا، مرداں ہتھ میدان، اگ تے خون، صورت اور سیرت، سلطانہ ڈاکو، چور نوں مور، واردات، باغی تے فرنگی، ان داتا، (یہ فلم مجموعی طور پر 67 ہفتے چلی، سدھیر کی اداکاری قابلِ دید ہے) جنگ آزادی، مفرور، جرم میں کیتا ای، جینے کی راہ، شیشے کا گھر، دشمن کی تلاش (سدھیر کی ذاتی فلم جسے دل جیت مرزا نے ڈائریکٹ کیا) اس فلم میں سدھیر نے اپنے صاحبزادے زمان خان کو بطور ہیرو پارہ شریف کے مقابل پیش کیا تھا مگر یہ فلم باکس آفس پر ناکام ثابت ہوئی تھی۔ "عداوت" جنرل بخت خان، سرعام، ماما بھانجا، طوفان تے چٹان، آخری قربانی، بلیک وارنٹ، بڑا بھائی، سرکاری آرڈر (لالہ سدھیر کی آخری پنجابی فلم 17 فروری 1984ء کو ریلیز ہوئی جب کہ سن آف ان داتا سدھیر کی آخری اردو فلم تھی جو 6 اگست 1987ء کو ریلیز ہوئی)۔

ان فلموں کے علاوہ بھی لالہ سدھیر کی کچھ اور فلمیں ہیں جنہیں میں تلاش نہ کر سکا۔ جس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

متذکرہ بالا جن فلموں کا ذکر کیا گیا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ یہ بات بتائی جائے کہ لالہ سدھیر کو فلمسازوں اور ہدایت کاروں نے ہر طرح کی فلموں میں ان کی خداداد فنی صلاحیتوں پر بھروسا کرتے ہوئے پیش کیا۔ فلموں کی کامیابی یا ناکامی سے قطع نظر لالہ سدھیر نے اعتماد کرنے والوں کو مایوس نہیں کیا۔ جہاں انہوں نے کامیاب ترین اردو فلمیں کیں۔ وہاں پنجابی زبان کی سپرہٹ فلمیں بھی دیں۔ اس کے باوجود ان پر اردو یا پنجابی فلموں کی چھاپ نہیں لگی۔ انہوں نے رومانوی ہیرو کے کرداروں میں بھی تماشائیوں سے پسندیدگی کی سند حاصل کی اور جب جنگجو ہیرو بنے تو اینگری مین کے کرداروں میں بھی اپنی فنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ ایسی مثال بہت کم ملتی ہے کہ ہر رنگ میں کوئی فنکار پورا اترتا ہو۔

لالہ سدھیر کی انہی فنی صلاحیتوں کی وجہ سے وہ اتنے طویل عرصے تک فلم انڈسٹری پر بے تاج بادشاہ کی طرح

لالہ سدھیر کی فلموں کے کچھ مقبول گیت

☆ چاندنی راتیں
سب جگ سوئے ہم جاگیں
تاروں سے کریں باتیں
چاندنی راتیں (فلم دوپٹا)

☆ جگر کی آگ سے اس کو جلتا دیکھتے جاؤ
لٹی جاتی ہے ارمانوں کی دنیا دیکھتے جاؤ
(فلم دوپٹا)

☆ واسطہ ای رب دا توں
جاویں اے کبوترا (فلم دلا بھٹی)

☆ میں پیار کا دیپ جلاتا ہوں
تو چپکے چپکے آجا (فلم ہچکولے)

☆ جھوٹے جہان دیے
نی کچے زبان دی اے (فلم ماہی منڈا)

☆ آ سینے نال لگ جا
ٹھاہ کر کے (فلم ٹھاہ)

☆ ساتھیو مجاہدو!
جاگ اٹھا ہے سارا وطن! (فلم مجاہد)

☆ نظاروں نے بھری آہیں
ستاروں کو نہ نیند آئی (فلم نغمہ صحرا)

☆ چمپا اور چمیلی
یہ کلیاں نئی نویلی (فلم دل اور دنیا)

☆ ارے لے چل رے بیلو
سجناں کے گاؤں (فلم دل اور دنیا)

☆ صدقے تیرے سبز پری
ہر دم ہر پل پری ہری (فلم جینے کی راہ)

☆ آج یہ کس کی نظر کے سامنے پاتا ہوں میں
(فلم طوفان)

راج کرتے رہے۔ سوچیے اور غور و فکر کیجیے تو یہ بات بڑی عجیب لگے گی کہ وہ سدھیر جس نے پاکستان کے وجود میں آنے سے پہلے اپنا فلمی کیریئر شروع کیا تھا۔ اس نے 1987ء تک پاکستانی فلموں کو اپنی اداکاری سے سرفراز کیا اور ہر دلعزیز ہیرو کی حیثیت سے نئی نسلوں سے اپنے فن کی پذیرائی حاصل کی۔ لالہ کا خطاب انہیں یونہی نہیں ملا، لالہ پشتو اور ہندکو زبان میں بڑے بھائی کو کہا جاتا ہے۔ لالہ سدھیر نے ہمیشہ خود کو اس لقب کا اہل ثابت کیا۔ اپنی فنی صلاحیتوں سے سب کے دل جیتے۔ لالہ سدھیر نے ایکشن، رومانٹک کامیڈی، ڈرامائی، جذباتی ہر قسم کے کردار کر کے اپنے آپ کو آل راؤنڈر تسلیم کروایا۔ انہیں بعض ایسے منفرد اعزاز بھی حاصل ہیں جو ان سے پہلے اور نہ ان کے بعد کسی فنکار کو ملے۔ لالہ سدھیر پاکستان کی پہلی گولڈن جوبلی اور پہلی پلاٹینم جوبلی فلموں کے ہیرو ہیں۔ لالہ سدھیر پاکستانی فلمی صنعت کے واحد ہیرو ہیں جن کی دو فلموں "ڈِلا بھٹی" اور "یکے والی" کی آمدنی سے پاکستان میں دو نگار خانے ایورنیو اسٹوڈیو اور باری اسٹوڈیو تعمیر ہوئے جب کہ ان کی فلم "جی دار" کی کمائی سے اس کے فلم ساز نے لاہور میں مبارک سنیما بنایا۔

لالہ سدھیر کی سپرہٹ فلموں کی تعداد بہت معقول ہے۔ ان کی کامیاب اردو فلموں میں دوپٹہ، سسی، گمنام، چھوٹی بیگم، انارکلی، آخری نشان، عجب خان، بغاوت، خیبر پاس، باغی، صورت اور سیرت، باغی سپاہی، فرنگی، جوش اور ان داتا جیسی فلمیں ہیں۔ جب کہ پنجابی فلموں میں ڈِلا بھٹی، گڈی گڈا، یکے والی، جٹی، یار بیلی، کرتار سنگھ، ڈاچی، چھینے خان، جی دار، میدان، چن مکھناں، پگڑی سنبھال جٹا، وریام، خون پسینا، ہیرا موتی، نظام، ٹھاہ، لاٹری، جادو، نشان، سلطانہ ڈاکو، باغی تے فرنگی اور دو چور جیسی اپنے وقت کی کامیاب ترین فلمیں شامل ہیں۔

لالہ سدھیر کے بارے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ انہوں نے کبھی کسی کو کاپی نہیں کیا۔ کسی سے متاثر ہو کر اس کی طرح اداکاری نہیں کی۔ ان کا اپنا اوریجنل اسٹائل تھا۔ جسے بعد میں سلطان راہی، بدر منیر، عجب گل، شاہد خان اور بالی وڈ کے دھرمیندر جیسے فنکاروں نے اپنایا۔

وہ حقیقی معنوں میں پاکستان کے سپر اسٹار تھے۔ ان میں سپر اسٹار کی تمام خوبیاں موجود تھیں۔ انہیں عوامی مقبولیت حاصل تھی۔ ان کا اپنا اوریجنل اسٹائل تھا۔ وہ اپنے

سال بھر میں سدھیر کی ایک ساتھ ریلیز ہونے والی فلمیں

لالہ سدھیر کی عوامی مقبولیت کے بعد وہ فلم سازوں کے لیے لازمی ہیرو بن گئے تھے۔ سال بھر میں ان کی جتنی فلمیں ریلیز ہونے لگیں اتنی فلمیں پہلے یا بعد میں کسی ہیرو کی نہیں ہوئیں۔ اس کی ایک جھلک ہم آپ کو دکھاتے ہیں۔

1970ء: اس سال لالہ سدھیر کی 10 فلمیں ریلیز ہوئیں۔ جن میں ایک اردو فلم "ریشماں" جب کہ 9 فلمیں پنجابی تھیں۔ جن میں ماں پتر، بہرام، چوڑ نالے چتر، ورندہ، غیرت شان جواناں دی، خون دا بدلہ خون، رنگو جٹ، چن دا سورج اور شیر پتر۔

1971ء: اس سال بھی لالہ سدھیر کی 10 فلمیں ریلیز ہوئیں۔ جن میں 8 فلمیں پنجابی اور 2 اردو تھیں۔ اردو فلموں "الحاحفظ" اور "دال اور دنیا"۔ جب کہ پنجابی فلموں میں جوڑ جواناں دا، بابا دینا، کھنگرو، یار بادشاہ، سجاول، غیرت میرا ناں، تیسں بھرا اور عشق بنا کی جینا۔

1972ء: اس سال لالہ کی فلموں کی تعداد 11 تھی۔ یہ ایک سال میں ریلیز ہونے والی فلموں کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔ ان میں 10 فلمیں پنجابی اور ایک اردو تھی۔ اردو فلم "دو رنگیلے" جب کہ پنجابی فلمیں خون پسینا، ایک ڈولی دو کہار، ہیرا موتی، سونے پھل پیار دے، پتر دا پیار، یار نبھاندے یاریاں، پنج دریاواں دا، نظام، ٹھاہ اور انتقام۔

1973ء: اس سال 10 فلمیں ریلیز ہوئیں۔ جن میں "پہلا وار" اردو فلم جب کہ دیگر فلمیں پنجابی تھیں۔ شان، غلام، سوہنا ویر، سوہنا بابل، دکھ سجناں دے، غیرت، میرے ویر دی، بہادر، خبردار و وچھڑیا ساتھی۔

1974ء: اس سال لالہ سدھیر کی فلموں کی تعداد 8 تھی جن میں 7 پنجابی اور ایک اردو فلم تھی۔ اردو فلم "کئی سال پہلے" جب کہ پنجابی فلمیں پگڑی داتا دی، زن زر تے زمین، لاٹری، بول بچن، تیرے سجنے پت جمن ماواں، لہے ہتھ خون دے اور جادو۔

1975ء: اس سال لالہ سدھیر کی 9 فلمیں ریلیز ہوئیں جن میں ایک اردو "صورت اور سیرت" جب کہ پنجابی فلمیں سردار بدلہ، سلطانہ ڈاکو، دھن جگرا ماں دا، مرداں ہتھ میدان، عادی مجرم، اے پگ میرے ویر دی، اگ کے خون اور ریشماں جوان ہوگئی۔

1976ء: اس سال فلموں کی تعداد 7 تھی۔ "ان داتا" اردو فلم تھی، ایک پشتو فلم "داز وے منہ" جب کہ دیگر پانچ فلمیں پنجابی کی تھیں جن میں چور نوں مور، واردات، یارانہ، باغی کے فرنگی اور مفرور شامل ہیں۔

کردار اور صورت و سیرت میں ہر لحاظ سے پرفیکٹ تھے۔ وہ پاکستانی فلموں کے ایکشن اور لاؤڈ ازم کے بانی تھے۔

لالہ سدھیر عام زندگی میں بھی خوب صورت شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا قد، لہجہ اور جسم دیہاتی کڑیل جوان، سپاہی یا جنرل کے لیے نہایت موزوں تھا۔ فلم انڈسٹری میں ان کی بہادری ضرب المثل تھی۔ وہ نہ صرف فلموں میں غیرت اور بہادری کی علامت تھے بلکہ ذاتی زندگی میں بھی وہ اسی کردار کے مالک تھے۔ کراچی سے لے کر خیبر تک لاکھوں دلوں پر راج کرنے والے اس نامور ہیرو کو ان کے پرستاروں نے سدا بہار ہیرو، جنگجو ہیرو کے القابات سے نوازا تھا۔

بہت سے فنکار اور ہنر مند فلم انڈسٹری کو صرف کمانے کی جگہ سمجھتے ہیں۔ اس کی بہتری اور بہبود کے لیے کچھ نہیں کرتے۔ جیسے ان پر فلمی صنعت کا کوئی حق نہیں مگر لالہ سدھیر ایسے نہیں تھے۔ انہوں نے پاکستانی فلموں سے جہاں بہت کمایا وہاں اپنے کمائے ہوئے پیسے کو فلم انڈسٹری میں لگایا بھی۔ یعنی اس پیشے سے فلم سازی بھی کی۔ ایک دو نہیں کئی فلمیں بنائیں۔

فلموں کے لیے سرمایہ کاری کرنا ایک رسکی سودا ہوتا ہے۔ فلم کامیاب ہوگئی تو اصل کے ساتھ منافع بھی حاصل ہو گا۔ ناکام ہوئی تو سرمایہ ڈوب جائے گا۔ لالہ سدھیر نے نفع نقصان کے خیال سے بالاتر ہو کر فلمیں بنائیں۔ کبھی نقصان ہوا کبھی نفع اور یہ سوچا کہ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ فلم انڈسٹری نے اگر مجھے کچھ دیا ہے تو میرا بھی فرض ہے کہ میں بھی اسے کچھ دوں۔ صرف لینا اور کچھ نہ دینا تو بڑی خود غرضی ہے۔

انہوں نے فلمیں پروڈیوز بھی کیں اور ڈائریکٹ بھی۔ فلم سازی اور فلم میکنگ کے بارے میں جو کچھ سیکھا تھا۔ اس تجربے کو بروئے کار بھی لایا۔

اس کے علاوہ وہ فلمی صنعت کی بہبود اور بھلائی کے لیے بھی ہمیشہ تن من دھن سے کام کرتے رہے۔ ان کی خدمات کو دیکھتے ہوئے فنکاروں اور آرٹسٹوں نے انہیں اپنی انجمن ''ماپ'' کا چیئرمین بھی بنایا۔ جب تک وہ اس عہدے پر فائز رہے آرٹسٹوں کے حقوق کے لیے نیک نیتی اور دیانتداری کے ساتھ جدوجہد کرتے رہے۔

لالہ سدھیر کے آباؤ اجداد کے بارے میں چھان بین کی تو معلوم ہوا ان کا تعلق افغانوں کے مہمند قبیلے سے تھا۔

سدھیر کے دادا سردار میر عالم خان اپنی جوانی ہی میں ہجرت کر کے ہندوستان آ گئے تھے۔ لالہ کے والد سردار محمد اسلم خان کو انگریز سرکار نے بغاوت کے جرم میں پھانسی دے دی تھی۔ برطانوی پولیس اور فوج کے خلاف نفرت کا ابلتا ہوا لاوہ لالہ سدھیر کو ورثے میں ملا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ برطانوی سامراج کے خلاف بنائی ہوئی فلموں میں وہ دل کی گہرائیوں سے کام کرتے تھے اور برطانوی سامراج کے باغی کے کردار کو خود پر طاری کر لیتے تھے۔

لالہ سدھیر 2 ستمبر 1924ء کو پشاور میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا خاندانی نام شاہ زمان خان تھا۔ وہ خاندان بھر کے لاڈلے اور اکلوتے فرزند تھے۔ ان کے تایا سردار نور عالم خان (خان بابا) اور چچا سردار غلام حسین خان کے ہاں بھی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ اس لیے وہ سارے گھرانے کے چہیتے تھے۔

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ خاندان بھر کے چہیتے فرزند شاہ زمان خان نے جب خاندانی روایات کو پامال کرتے ہوئے فلموں میں اداکاری شروع کر دی تو اس خبر سے ان کے بڑوں اور بزرگوں کو دھچکا سا لگا تھا۔ انہوں نے ناپسندیدگی اور ناراضگی کا اظہار بھی کیا۔ ان کے تایا سردار نور عالم خان نے ان پر گھر کے دروازے بند کر دیے تھے۔ اگرچہ انہوں نے اپنے اداکار بننے کو پوشیدہ رکھنے کی نیت سے اپنا خاندانی نام استعمال نہیں کیا تھا۔ سدھیر کے ہندوانہ نام سے کام کر رہے تھے مگر یہ چھپنے یا چھپانے والی بات نہیں تھی۔ ان کی فلمیں اسکرین کی زینت بنیں تو گھر والوں کو پتا چل گیا کہ ان کے لاڈلے نے ان کی بے پناہ محبتوں کا یہ صلہ دیا ہے کہ ان کی خاندانی عزت خاک میں ملا دی۔ ان دنوں اشرافیہ فلم والوں کو اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھتے تھے۔ گھر والوں نے لالہ سدھیر پر گھر کے دروازے بند کیے تو جوانی کے جوش میں انہوں نے بھی یہ فیصلہ کر لیا کہ جب تک وہ کچھ بن نہیں جائیں گے اپنے گھر کا رخ نہیں کریں گے اور بعد میں ایسا ہی ہوا۔ سدھیر فلموں میں کام کرتے رہے اور اس دوران اپنے خاندان کے نام و نمود کو بھی برقرار رکھتے رہے۔ جب گھر والوں نے دیکھا کہ فلموں میں کام کرنے کے باوجود شاہ زمان خان نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی ہے جس سے اس کے خاندان کے عزت و وقار کو ٹھیس پہنچے تو انہوں نے خاندان کے اس باغی کو

معاف کردیا۔ لالہ سدھیر نے اپنے 45 سالہ فلمی کیریئر میں اپنے آپ کو ہمیشہ صاف ستھرا رکھا۔ بہت سے فلمی ہیروؤں کی طرح اخلاقی برائیوں اور خرابیوں میں ملوث نہیں ہوئے۔ جب اپنے لیے ایک شریکِ حیات کی ضرورت محسوس کی تو شادی کرلی۔ بعد میں دو اور خواتین نے بھی ان سے ازدواجی رشتہ قائم کیا مگر وہ لالہ سدھیر کے ساتھ ان کی مرضی کے مطابق یہ رشتہ استوار نہ رکھ سکیں اور تھوڑے تھوڑے دنوں تک ساتھ رہ کر علیحدہ ہوگئیں۔ ان دونوں کا بھی تعلق فلم انڈسٹری اور فلموں سے تھا۔

لالہ سدھیر نے اپنے فلمی کیریئر میں 175 فلموں میں اداکاری کر کے اپنی اداکارانہ انمٹ نقوش چھوڑے۔ ان میں 160 فلموں میں ہیرو یا اہم کلیدی کردار ادا کیے۔ جب کہ کوئی 15 فلموں میں مہمان اداکار کے طور پر کام کیا۔ ان کی 3 فلموں کو پشتو زبان میں بھی ڈب کر کے پیش کیا گیا۔ جن میں پنجابی فلم ''پتر دا پیار'' کو ''وزدیے مینہ'' اور اردو فلم ''بڑا بھائی'' کو ''پٹ خامار'' اور ان کی ذاتی فلم ''دشمن کی تلاش'' کو ''دوشمن تلاش'' کے پشتو ناموں سے پشتو زبان میں پیش کیا گیا۔

اگر چہ وہ بنیادی طور پر پٹھان تھے مگر انہوں نے اردو اور پنجابی فلموں میں ایک کامیاب اداکار کے طور پر اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ ان کی مقبولیت کو ایکشن ہیرو کے طور پر چار چاند لگے مگر انہوں نے رومانوی، تاریخی اور لائٹ کامیڈی کے کردار بھی نہایت خوش اسلوبی سے ادا کیے اور ہر طبقہ سے داد حاصل کی۔ پاکستان فلمی صنعت کا آسمان سینکڑوں عظیم ستاروں کی شان سے سجا ہوا ہے لیکن اس آسمان کا سورج ہونے کا اعزاز صرف اور صرف لالہ سدھیر کے پاس ہے۔ اس بات سے کسی کو انکار نہیں کہ ہیرو تو بہت آئے اور بہت آئیں گے مگر اتنا بے خوف، جنگجو اور وراسٹائل سدا بہار ہیرو اب کبھی نہیں آئے گا بقول شاعر

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

لالہ سدھیر کی 175 فلموں میں 76 اردو، 95 پنجابی، تین پشتو اور ایک ڈبل ورژن فلمیں شامل ہیں۔ ان میں سے 9 فلموں نے سپرہٹ کامیابی حاصل کی جب کہ تین فلموں کی آمدنی سے دو نگار خانے اور ایک سینما گھر تعمیر کیا گیا۔ ان کی فلم ''باغی'' کو اس بات کا بھی اعزاز حاصل ہے کہ اس نے بیرونِ ملک بھی زبردست کامیابی حاصل کی۔ یہ پاکستان کی پہلی فلم تھی جس نے دوست ملک چین کے طول و عرض میں کامیابی کے نئے ریکارڈ قائم کیے۔ اسے چینی زبان میں ڈب کر کے ریلیز کیا گیا اور چینی عوام نے اسے بے حد پسند کیا۔ لالہ سدھیر نے اپنی فلموں سے جو اعزازات حاصل کیے وہ کسی دوسرے پاکستانی فنکار کو حاصل نہ ہو سکے۔ مگر یہ بڑے افسوس کا مقام ہے کہ انہیں سرکاری سطح پر کوئی اعزاز یا ایوارڈ سے نوازا نہیں گیا۔ پرائیویٹ ایوارڈز بھی انہیں ایسے نہیں ملے جس کے وہ حقدار تھے۔ شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ انہوں نے بھی میڈیا والوں کو دوست نہیں بنایا۔ اپنی پبلسٹی اور تشہیر کے لیے میڈیا کا سہارا نہیں لیا۔ وہ اپنی کامیابی کو اپنی فلم کی کامیابی کا مرہونِ منت تصور کرتے تھے اور عوامی مقبولیت ہی کو اپنے لیے سب سے بڑا اعزاز اور ایوارڈ سمجھتے تھے۔

لالہ سدھیر کے چاہنے والے پرستار آج ان کی وفات کے 20 سال بعد بھی حکومت وقت سے اس بات کے درخواست گزار ہیں کہ اس عظیم فنکار کو بعد از مرگ پرائیڈ آف پرفارمنس سے نوازا جائے۔

لالہ سدھیر کی فلم ''ان داتا'' میں انہیں خصوصی نگار ایوارڈ دیا گیا تھا۔ اگر چہ نگار ایوارڈ والوں سے ان کی پرانی چپقلش تھی اس کے باوجود اس فلم میں لالہ سدھیر نے مرکزی کردار میں جس طرح جم کر اداکاری کی تھی اور اپنے سامنے کسی اور کو ٹھہرنے نہیں دیا تھا۔ ان کے چہرے کے تاثرات، آواز کا اتار چڑھاؤ، نشست و برخاست میں مکمل پرفیکشن نے ان کے اس کردار کو یادگار بنا دیا تھا اور ان کا بڑے سے بڑا مخالف بھی ان کی اس کردار نگاری کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

لالہ سدھیر کی آخری پنجابی فلم ''سرکاری آرڈر'' تھی جو 17 فروری 1984ء کو نمائش پذیر ہوئی تھی جب کہ ان کی آخری اردو فلم ''سن آف ان داتا'' 6 اگست 1987ء کو ریلیز ہوئی تھی۔ کچھ لوگ ان کی فلم ''حسینوں کی بارات'' کو بھی ان کی آخری فلم قرار دیتے ہیں جس میں وہ بطور مہمان اداکار جلوہ گر ہوئے تھے۔

لالہ سدھیر 19 جنوری 1997ء کو اپنے لاکھوں چاہنے والوں کو سوگوار چھوڑ کر اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے مگر وہ اپنی عظیم فنکارانہ خوبیوں کی وجہ سے ہمیشہ زندہ و تابندہ رہیں گے۔
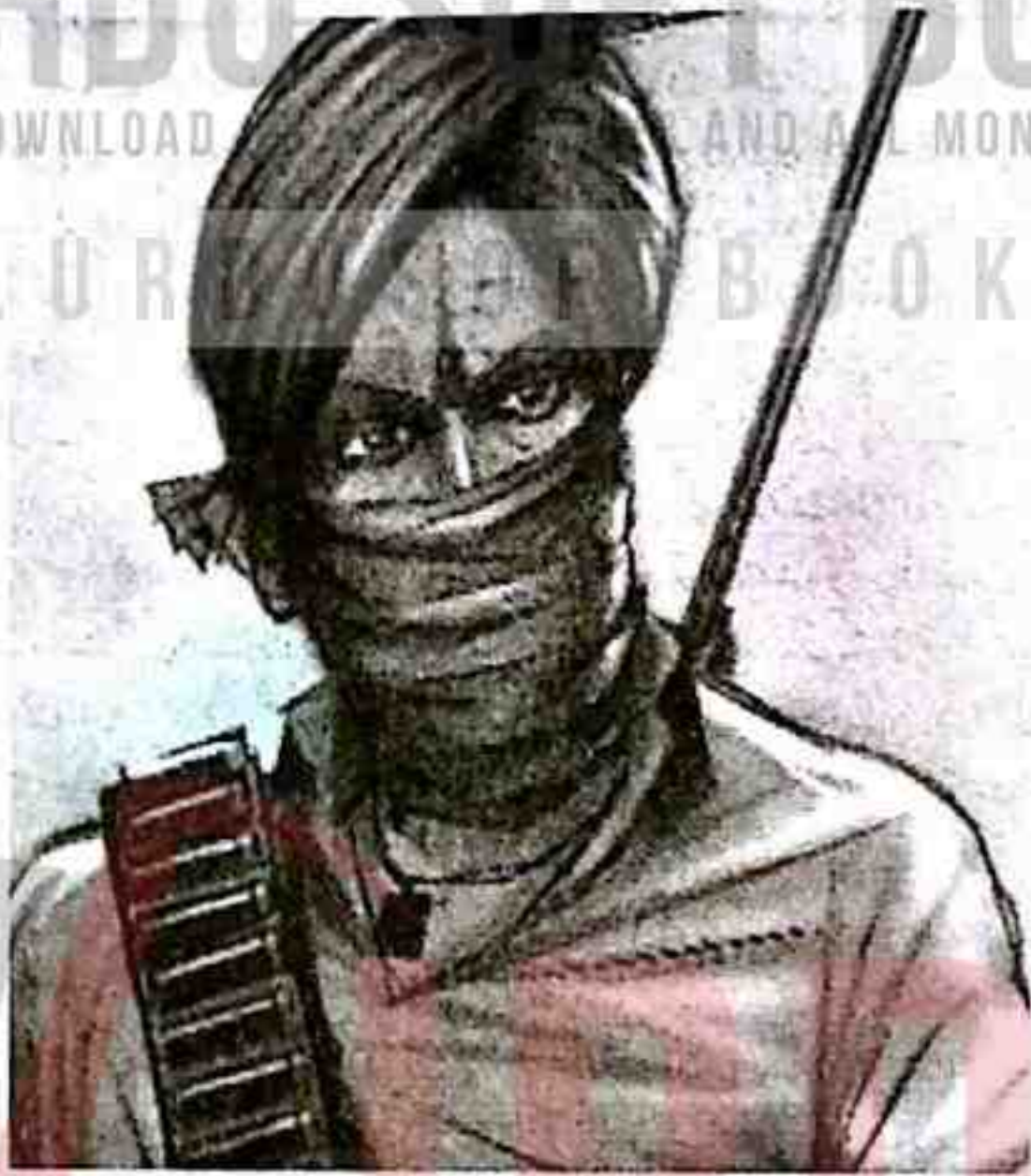
چھین لے آزادی

زویا اعجاز

انگریز حکمرانوں نے برصغیر پر حکومت قائم کر کے من مانی کرنا اپنا حق سمجھ لیا تھا۔ ظلم و جبر سے آزادی حاصل کرنے کا ایک طریقہ اسلحہ اٹھانا بھی ہے۔ انہوں نے بھی اسلحہ اٹھا کر بغاوت کا پرچم بلند کردیا تھا۔ ان کا ایک ہی مشن تھا ظالموں کا احتساب اور غریبوں کی داد رسی۔

پنجاب کی سرزمین سے بلند ہونے والی بغاوت کا بیان

بیسویں صدی کا آغاز ہو چکا تھا۔

ضلع قصور کے گاؤں 'لکھا' (Lakha) میں ایک خدا ترس اور عاجز 'فقیر' لوگوں میں بہت مقبول تھا۔ وہ اسم بامسمّیٰ تھا۔ تھوڑی بہت زمین' جائیداد کا مالک ہونے کے باوجود وہ اپنے گاؤں کے نچلے طبقے کے افراد سے بہت گھل مل کر رہتا۔ آزاد منش اور درویش صفت تھا۔ امیروں سے جدا نہ غریبوں کو حقیر سمجھتا۔ بہت زیادہ مذہبی تو نہ تھا لیکن اپنے عقائد میں قدرے راسخ تھا۔

علاقہ کی آبادی مخلوط تھی۔ مسلمان' ہندو اور سکھوں میں خوشگوار تعلقات تھے۔ مسلمانوں اور سکھوں کی اکثریت کاشتکاری سے وابستہ تھی جبکہ ہندو 'بنیے' اور ساہو کار تھے۔ زمین' زیورات وغیرہ گروی رکھ کر قرض فراہم کرتے۔ سود کا کاروبار بھی زوروں پر تھا۔

قدرت نے اسے ہر آسائش سے مالا مال کیا۔ اچھا معاش' بہترین اور جانثار شریکِ حیات' مخلص دوست اور اب اولاد کی انمول نعمت ملتے ہی وہ رب کے حضور سجدہ شکر

بجا لاتے نہ تھکتا۔ بیٹے کا نام ''ملنگی'' رکھا گیا۔

ملنگی کی ولادت کے چھ ماہ بعد ہی 'فقیر' کے سانسوں کی مالا بکھر گئی۔ اس کی ناگہانی موت سیدھی سادی بیوی اور نومولود بچے کے لیے زندگی بھر کا ایک روگ بن گئی۔ عزرائیل کی خاموش آمد ان کی زندگیوں میں کبھی نہ ختم ہونے والی بازگشت ثابت ہوتی رہی۔ عدت ختم ہوتے ہی ملنگی کی والدہ کو مصائب و مشکلات کی ایک باڑ نے شرابور کر دیا۔

عورت اگر جوان' خوبصورت اور پھر بے اماں بھی ہو تو ہر کوئی اسے مال غنیمت کی طرح لوٹنے کے درپے رہتا ہے۔ اور بانو کے پاس تو زمین جائیداد کی صورت میں مرحوم شوہر کا ترکہ بھی موجود تھا۔ اس کے ارد گرد گدھوں کی تعداد میں ہولناک حد تک اضافہ ہونے لگا۔ مال و متاع کے بعد عزت و آبرو کے لالے پڑے تو وہ حواس باختہ ہو گئی۔ اس دنیا میں اکلوتا سہارا صرف ملنگی تھا جس کی پرورش بھی کوئی آسان امر نہ تھا۔ عدت مکمل ہونے تک 'فقیر' کی زمین پر گاؤں کے حریص زمیندار نے قبضہ کر لیا۔

گھر میں موجود جمع جتھا ختم ہوا تو جان کے لالے پڑ گئے۔ اس دوران فقیر کا دیرینہ دوست 'چرن سنگھ' ان کا احوال دریافت کرنے آجایا کرتا تھا۔ جگری دوست کے بچے کھچے خاندان کی کسمپرسی دیکھ کر وہ بہت دکھی ہو جاتا۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے ایک حتمی تجویز پیش کر دی۔

''چریا تو نہیں ہو گیا چرن سنگھ! ایسا کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟'' وہ حسبِ توقع بھڑک اٹھی۔

''ٹھنڈے دماغ سے سوچو گی تو اس کے سوا کوئی بہترین چارہ نظر نہیں آئے گا۔'' وہ تحمل سے بولا۔

''میں سوچنا ہی نہیں چاہتی۔ تیرا اور میرا انجوگ ممکن ہی نہیں۔ ہمارے مذہب بالکل الگ ہیں۔''

''میری نیت میں کوئی کھوٹ نہیں! میں صرف تجھے اور ملنگی کو پناہ دینا چاہتا ہوں۔ زمیندار کی نظریں اب زمین ہتھیانے کے بعد تجھ پر گڑی ہیں۔ جس دن اس کا داؤ چلا' وہ اپنی ہوس پوری کر کے تجھے اپنے چاکروں کے حوالے کر دے گا۔ اس گاؤں میں بسنے والا کوئی مسلمان معاشی طور پر اتنا طاقتور نہیں ہے کہ اس سے ٹکر لے کر تیرا ہاتھ تھام سکے۔ میرے ساتھ بیاہ کے بعد اس کے ناپاک ارادوں سے خود بھی محفوظ رہو گی اور ملنگی کو بھی تحفظ دے سکو گی۔'' چرن سنگھ صاف گوئی سے کہتا ہوا اٹھ گیا۔

بانو کے لیے نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن جیسی صورتِ حال کا سامنا تھا۔ تمام تر پہلوؤں پر سوچنے کے بعد اس نے انتہائی کرب سے چرن سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ زمیندار کے لیے یہ بہت بڑی سبکی تھی لیکن وہ چرن سنگھ کا فی الوقت کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا اس لیے خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

یہ بے جوڑ شادی بانو کے لیے روح کا آزار تھی۔ چرن سنگھ نے اسے اور ملنگی کو ہر آسائش اور محبت دی تاہم مذہبی تفاوت ایک خلیج کی مانند اس رشتے میں ہمیشہ حائل رہا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ان کے آنگن میں تین پھول مزید کھلے۔ ان بچوں کی پرورش مکمل سکھ مذہب کے خطوط پر ہوتی رہی لیکن ملنگی کی شناخت اور خمیر میں مسلم عقائد کا واضح عکس تھا۔ اس لیے اس نے کیس بڑھائے' نہ دیگر لوازمات پر توجہ دی۔ چرن سنگھ نے بھی کبھی کوئی قدغن نہ لگائی۔

☆☆☆

بچپن کے نقوش اس کے ذہن سے کبھی بھی مٹ نہ پائے تھے۔ دل دکھانے والے ان گنت واقعات کا آسیب ہمیشہ اس کے ساتھ رہا جن کی بازگشت اس کی سماعتوں کے لیے امتحان بنی رہتی۔

اپنے سوتیلے بھائی ہرنام سنگھ سے اس کے تعلقات مثالی تھے۔ وہ دونوں یک جان دو قالب تھے۔ ان کا کھانا پینا' سونا جاگنا' کھیلنا کودنا ہم آہنگی کا نمونہ تھے۔ بچپن کے معصوم فطری تقاضوں کے تحت وہ اپنے سنگی ساتھیوں سے ملنے جلنے کے مواقع کی تلاش میں رہتے لیکن اکثر یہ کوشش ناکام ہی رہتی۔

ایک روز وہ گاؤں کے کنویں کے گرد کھیلنے والے بچوں کے گروہ میں جا پہنچے اور غیر محسوس طریقہ سے ان کے کھیل میں شامل ہو گئے۔ ایک قدرے ہوشیار بچہ ان کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

''کون ہو بھئی تم؟ یہاں کیسے آ نکلے؟'' وہ دانستہ بے نیازی سے بولا۔

''میں ملنگی ہوں..... اور یہ میرا بھائی ہرنام سنگھ۔'' اس نے تن کر کہا۔

''تمہارے باپو کا کیا نام ہے؟''

''چرن سنگھ کے بچے ہیں ہم۔ لیکن تم یہ سوال کیوں کر رہے ہو؟'' ہرنام نے بھی آنکھیں دکھائیں۔

”چرن سنگھ اور تم نے کیس بڑھا رکھے ہیں‘ کڑا بھی پہنتے ہو‘ کرپان بھی استعمال کرتے ہو۔ مگر یہ ملنگی پانچ ونشکے‘ استعمال کیوں نہیں کرتا؟“ اس نے آنکھیں مٹکائیں۔ ”اگر ہمارے ساتھ کھیلنا ہے تو ملنگی کو واپس بھیجو۔“

”میں لعنت بھیجتا ہوں تمہارے کھیل پر۔ ملنگی کے بغیر مجھے نہیں کھیلنا۔“ ہرنام غصے سے بولا اور بھائی کا ہاتھ تھامے وہاں سے لوٹ آیا۔

اس علاقہ میں علم کی شمع بھی کبھی روشن نہ ہوئی تھی۔ جہالت‘ لاعلمی اور انگریز راج کے ذہنی دباؤ کی وجہ سے سارا نظام تلپٹ تھا۔ ان حالات میں پروردہ ملنگی کا متجسس ذہن اسے اردگرد ہونے والے واقعات کی گہرائی میں پہنچ کر تجزیہ کرتا۔

شب و روز کی اس گردش میں وہ بچپن کی سرحدوں سے نکل کر جوانی کی حدود میں آ گئے۔ شعور پختہ ہوا تو زندگی میں کچھ مقاصد اور راہیں بھی متعین ہونے لگیں۔ ملنگی کی زندگی کا مدار دو انتہاؤں پر محیط تھا۔ اپنے خاندان سے بے پناہ محبت اور انگریز راج میں پنپنے والے نظام سے نفرت۔

ہندوستان کے طول و عرض میں انگریزوں کا شکنجہ بہت مضبوط تھا۔ ان کے زیر سایہ سیاسی و معاشی نظام میں عوامی احساسات کا کبھی پاس نہ ہوتا۔ گاؤں میں مقامی جاگیردار حکومت کی جانب سے ’ذیلدار‘ مقرر ہو چکے تھے۔ زمینوں کا مکمل حساب کتاب رکھتے ہوئے ان کے مزاج کی فرعونیت سوا نیزے پر رہتی۔

دوسرے نمبر پر ہندو بنیے اور ساہوکار تھے جو حکومتی چھپر چھاؤں میں سود کا کاروبار کرتے۔ ساہوکار و بنیے زیورات‘ زمین اور گھر گروی رکھ کر بھاری سود پر قرض فراہم کرتے۔ نسل در نسل رسنے والا یہ ناسور بہت سی زندگیوں کے چراغ گل کر چکا تھا۔ اسلم نامی اپنے ایک دوست پر بیتنے والی قیامت تو ملنگی کبھی فراموش کر ہی نہ سکا۔

اسلم کا تعلق نچلے طبقے سے تھا۔ کچھ سال قبل اس کے والد نے اپنی بہن کی شادی کے لیے قرض اٹھایا۔ غربت‘ افلاس اور معاشی جبر کے اس دور میں وہ سود کی رقم بمشکل ادا کرتے کرتے اصل رقم چکانے کی حسرت دل میں لیے پرلوک سدھار گیا۔ ساہوکار کے گماشتے اس کی موت کے اگلے ہی روز اسلم کے درپے ہو گئے۔

”قرض کی ادائیگی کے لیے دی گئی مہلت ختم ہو چکی ہے۔ اس لیے پیسا لوٹا دو ورنہ اچھا نہ ہوگا۔“

مصحف علی میر

پاک فضائیہ کے چیف آف اسٹاف وہ 1947ء لاہور میں پیدا ہوئے، یہیں اپنی تعلیم کی اور 1965ء میں پی اے ایف میں شمولیت اختیار کی۔ 1967ء کو انہیں پی اے ایف میں کمیشن ملا اور مختلف عہدوں پر فائز ہوئے جن میں کمانڈنگ آفیسر جنوبی ایئر کمانڈ، چیئرمین ایئرو ناٹیکل کمپلیکس بورڈ کامرہ (اٹک) ڈائریکٹر آپریشنز ایئر ہیڈ کوارٹرز، وائس چیف آف ایئر اسٹاف پلاننگ اور ایف 16 جنگی طیاروں کے پروجیکٹ ڈائریکٹر کے عہدے شامل تھے۔ پی اے ایف میں اعلیٰ کارکردگی کی بناء پر انہیں 2000ء میں بطور چیف آف ایئر اسٹاف مقرر کیا گیا۔ 2003ء میں وہ اس وقت بدترین فضائی حادثے کا شکار ہوئے جب ان کا فوکر طیارہ اسلام آباد سے کوہاٹ ایئر فورس بیس کے سالانہ معائنے کے لیے روانہ ہوا۔ کوہاٹ سے 80 کلو میٹر دور بجانب مغرب گمبٹ کے 2000 فٹ بلند پہاڑی سلسلے میں حادثے کا شکار ہوا جس کے نتیجے میں 16 اعلیٰ افسر شہید ہو گئے۔ ان میں ان کی اہلیہ بھی شامل تھیں۔ پی اے ایف میں ان کی کارکردگی بے مثال رہی اور انہیں اعلیٰ خدمات کے اعتراف کے طور پر نشان امتیاز، ہلال امتیاز، ستارۂ امتیاز اور ستارۂ بسالت جیسے اعزازات سے نوازا۔

بنیادی مذاہب سے متعلقہ معلومات کے ذرائع

ماہر بشریات ایک معاصر بنیادی ثقافت کا جائزہ لیتا اور اس کے مذہبی عقائد اور وظائف کا مطالعہ کرتا ہے۔ پھر اس مطالعے سے وہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ بہت سے یا تمام بنیادی اور قبل از تاریخ مذاہب شاید ایک جیسے رجحانات اور مذہبی وظائف کے حامل ہیں۔ لہٰذا پادری کاڈرنگٹن نے انیسویں صدی میں ملینیشا والوں کا مطالعہ کیا اور بتایا کہ وہ فطرت میں ایک غیر مرئی قوت ”مانا“ کا ادراک رکھتے ہیں۔ اسے اور دوسروں کو ماننا پڑا کہ ”مانا“ جیسی ہی کسی قوت سے آگاہی انسان کا حقیقی مذہبی محرک رہی ہوگی۔

مرسلہ: نرگس آفاق، کراچی

''وہ مہلت مجھے تو نہیں ملی تھی۔ مجھے بس تھوڑا عرصہ اور دے دو۔ میں پائی پائی چکا دوں گا۔'' مدقوق چہرے اور کمزور جسامت کے حامل اسلم نے کہا۔

''تمہارا باپ بھی یہی کہتا قبر میں پہنچ گیا اور اب تم نے بھی وہی رٹ پکڑ لی ہے۔'' ایک تنومند شخص نے اسے تھپڑ رسید کیا۔ وہ درحقیقت ایک خاص منصوبہ کے تحت وہاں بھیجے گئے تھے۔

اسلم کی سماعت میں لرزہ خیز چیخ و پکار کی آوازیں آئیں تو وہ دیوانوں کی مانند ان سب سے بھڑ گیا۔ اسی پل دو افراد گھر کی اندرونی سمت سے اس کی بڑی بہن کو کاندھے پر لادے نکلے اور پھنکار کر بولے۔ ''تمہارے باپ کا لیا گیا قرض اب یہ سود سمیت ادا کرے گی۔''

اسلم ان کے پیچھے لپکا تو ایک پتھر سے ٹھوکر کھا کر وہیں ڈھے گیا۔ زخمی سر سے خارج ہونے والا لہو کسی تالاب کی مانند اس کے پاس بہتا رہا۔

جبر، استبداد اور ناانصافی کی اس اندھیر نگری میں ملنگی کا ذہن 'باغیانہ خیالات' کی آماجگاہ بنتا رہا۔ چرن سنگھ کے گھر میں ہوش سنبھالنے اور پرورش پانے کے باعث اس کا فطری میلان سکھ برادری کی طرف نسبتاً زیادہ تھا۔ اپنے باغی خیالات کی عملی تسکین کا پہلا موقع بھی اسے بہت جلد مل گیا۔ باہمی رضامندی کے تحت ہرنام سنگھ اور ملنگی نے 'ببر اکالی تحریک' میں شمولیت اختیار کر لی۔

'ببر اکالی' کا پس منظر اور ان دونوں کی شمولیت کے عوامل جاننے کے لیے ملنگی کی داستان کو ایک وقتی ٹھہراؤ دیتے ہوئے ماضی کے چند اوراق پلٹتے ہیں۔

☆☆☆

بیسویں صدی کی تیسری دہائی سکھ عوام کے لیے بہت اہمیت کی حامل تھی۔ اس قوم کے افراد نے ہندوستان میں مسلم حکومت کی ناک میں دم کیے رکھا تھا اور اب برطانوی حکومت کے لیے دردِسر بننے کے لیے تیار تھے۔

اس تحریک کا آغاز سکھ مذہب کے مقدس مقامات کی انتظامیہ میں تبدیلیوں کی غرض سے ہوا۔ منتظمین نے ذاتی مفادات کو ترجیح دیتے ہوئے دولت گھر کی باندی بنا لی تھی اور مالی منفعت کے باعث اصل خالصہ تعلیمات میں ردوبدل سے بھی گریز نہ کرتے۔ سالہا سال سے جاری اس روش نے نئے منتظمین کو بھی فرنگی راج کے زیرِاثر عیش پسند اور سہل بنا دیا اور گردواروں کے ساتھ خوب کھلواڑ ہونے لگا۔

تحریک کے شرکاء نے ابتداء میں پُرامن اور جائز طریقۂ کار اختیار کرنے کا حلف اٹھایا۔ وہ اپنے مذہبی مقامات میں غیر مذہبی افراد کا تسلط برداشت کرنے سے قاصر تھے۔ اس لیے اپنے طے کردہ لائحہ عمل کے مطابق اقدامات میں مگن رہے۔

ان کی یہ 'بغاوت' حکومتی انتظامیہ کو ایک آنکھ نہ بھائی اور 'متحمل مزاج' غیر متشدد مطالبات کو خونی قالب میں ڈھال دیا گیا۔ 'ترن تارن' اور 'ننکانہ صاحب' میں سینکڑوں افراد کا قتل تاریخ کے اوراق میں آج بھی ملتا ہے۔ اس صورتحال کے بعد تحریک کے ممبران نے بھی اپنی روادارانہ پالیسی ترک کر دی اور ایک طویل خونی جدوجہد کا آغاز ہو گیا۔

ملنگی کی اس سرگزشت میں 'ببر اکالی' کا کردار صرف اسی حد تک تھا کہ وہ اس کے ابتدائی اراکین میں ہرنام سنگھ کے ساتھ شامل ہوا۔ ان کا بنیادی ہدف برطانوی افسران اور ان کے مقامی پٹھو و جاسوس ہوتے۔ ہتھیاروں کے استعمال کے چند تکنیکی نکات سیکھتے ہوئے ان دونوں بھائیوں کو قطعی علم نہ تھا کہ 'اکالیوں' سے ان کا ناتہ قلیل المدت ثابت ہو گا اور بظاہر پُرسکون زندگی کی کایا یکدم پلٹ جائے گی۔

☆☆☆

''کیا بات ہے بے بے؟ آج پھر بہت گم صم بیٹھی ہے؟'' ملنگی اپنے ہتھیاروں کی صفائی کرتے ہوئے مستفسر ہوا۔

''ایک پھانس دل میں بڑی مدت سے گڑی ہے بیٹا! جانے کب نجات ملے گی مجھے اس سے؟'' وہ آزردہ تھی۔

''مجھے بتا بے بے! میں اپنے لہو کا آخری قطرہ تک بہا دوں گا۔'' وہ جوش سے بولا۔

''زمین کا وہ بے جان ٹکڑا میرے لیے بہت اہمیت کا حامل ہے ملنگی! ذیلدار نے میری بے بسی کا فائدہ اٹھا کر اسے ہتھیا لیا تھا۔ تیرے باپ کے خون پسینا نے اسے زرخیز بنایا۔ دن رات محنت کرتا تھا بخشی۔''

''کاش تو نے مجھے پہلے بتایا ہوتا بے بے! میں کسی بھی طرح اپنا حق چھین لاتا اس سے۔'' ملنگی طیش میں آ گیا۔

''اب بھی کچھ نہیں بگڑا! ہم اپنا حق وصول کر سکتے ہیں۔'' ہرنام سنگھ بھی وہیں موجود تھا۔

''جو بھی کرنا مگر احتیاط کا دامن ہاتھ سے مت چھوڑنا مجھے زمین کا قرض واپس لینے کی خواہش ضرور ہے لیکن تم دونوں کی جان زیادہ عزیز ہے۔اب تو سنا ہے اس کا بیٹا اس ڈگر میں باپ سے بھی دو قدم آگے ہے۔انگریز سرکار کی پشت پناہی نے مزید شیر کر رکھا ہے انہیں۔''

''چنتا کیوں کرتی ہے بے بے؟ ہم نمٹ لیں گے جاگیردار اور اس کے بیٹے سے۔'' ہرنام نے اسے تسلی دی۔

''ہمارا تو شکار ہی انگریز اور ذیلدار جیسے پٹھو ہیں۔اس کی طرف بہت سے حساب واجب ہیں۔'' ملنگی نے کہا۔

باہمی افہام و تفہیم کے بعد ہرنام سنگھ اور ملنگی کچھ روز بعد مکمل تیاری کیے چہرے ڈھاٹوں میں لپیٹ کر ذیلدار کی حویلی میں جا دھمکے۔بیرونی دیوار کود کر اس کا کمرا تلاش کرنے میں انہیں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ایک منقش دروازے سے بے ترتیب لباس اور حلیہ میں ان کے گاؤں کی ہی ایک مظلوم عورت نکلتی دکھائی دی۔اس کی حالت دیکھ کر ان دونوں کی آنکھیں لہو چھلکانے لگیں اور وہ بے آواز قدموں سے اسی دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔ذیلدار ایک جہازی سائز بستر پر اپنا بھاری بھرکم وجود لیے جام لنڈھا رہا تھا۔

ملنگی نے آگے بڑھ کر اپنی بندوق کا کندا بلوریں گلاس پر رسید کیا۔سرخی مائل مشروب نے بستر کے ساتھ فرش پر بچھا قیمتی غالیچہ رنگین کر دیا۔

''کون ہو تم لوگ؟ اس حرکت کا انجام جانتے ہو؟'' ذیلدار دھاڑا۔

''ہم موت کے فرشتے ہیں حرام خور! تیرے حساب کتاب کا وقت آن پہنچا ہے۔'' ملنگی نے اس کی توند پر بندوق کی نال جما دی۔

''کک...... کیا چاہتے ہو؟'' ان کے تیور اسے سہانے لگے۔

''زمین جائیداد کے سب کاغذ نکال کر لاؤ۔'' ہرنام اطمینان سے بولا۔

ہزاروں افراد کو موت بانٹنے والا وہ فرعون وقتی ان کا بے دام غلام بنا ہوا تھا۔اس نے حکم کی فوری تعمیل کر دی۔ملنگی نے باقی ماندہ شراب کاغذات پر انڈیلی اور انہیں نذر آتش کر دیا۔یہ ایک بھیانک انتقام تھا۔

ذیلدار کے زمینی ریکارڈ کی سوختگی نے اسے چوٹ کھایا ہوا ناگ بنا دیا۔اس کے ہرکارے 'اصل مجرم' کی نشاندہی کر چکے تھے۔خلاف طبع وہ دشمن پر کوئی اوچھا وار نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے انتہائی صبر و سکون سے بہترین موقع کی تلاش کا منتظر رہا۔

اپنا دیرینہ خواب پورا ہوتے ہی اب ملنگی کی والدہ بیٹے کے سر پر سہرا سجانے کے ارمان جگا بیٹھی۔بیٹے نے بھی ماں کی خواہش پر سر تسلیم خم کر دیا اور کچھ ہی ہفتوں میں ملنگی کے مسلم باپ اور پس منظر سے واقف ایک مسلم خاندان کی بیٹی سے اس کی شادی طے ہو گئی۔

غیر رسمی منگنی کے بعد زندگی کو نیا رخ مل گیا تھا۔خوشی و سرشاری کی کیفیت میں روز و شب خوشیوں کے ہنڈولے میں بیتنے لگے اور اسی ہنڈولے کے قریب، بہت قریب ایک عفریت انہیں اپنے خونی شکنجوں میں دبوچنے کے لیے جست بھرنے کو تیار تھی۔

☆☆☆

ذیلدار چند معزز مسلم اور سکھ افراد کے ساتھ حویلی کی بیٹھک میں نشست جمائے بیٹھا تھا۔

''اس گاؤں کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے۔یہاں کے سب لوگ میری رعایا ہیں۔اگر ان کے ساتھ کوئی اونچ نیچ ہوئی تو روز قیامت میں جوابدہ ہوں گا۔'' وہ اپنی مکار آنکھوں اور چہرے پر بہت سنجیدہ و مہذب تاثرات سجائے بولا۔

''سبحان اللہ! بہت عمدہ خیال ہیں جناب آپ کے۔'' چند ملی جلی آوازیں ابھریں۔

''میں چرن سنگھ کے خانوادے میں سالوں سے پنپنے والی بے حیائی سے بہت عاجز ہوں۔خائف ہوں کہ ہم بھی کسی عذاب کی لپیٹ میں نہ آ جائیں۔''

''کھل کر کہو ذیلدار! کیا چل رہا ہے من میں؟'' موہن سنگھ نے اپنی سفید ریش پر ہاتھ پھیرتے کہا۔

''چاچا موہن! تم اس علاقے کے سب سے عمر رسیدہ فرد ہو۔دو نسلیں تمہارے سامنے پل کر جوان ہوئی ہیں۔چرن سنگھ نے ایک مسلمان بیوہ سے شادی کی...... کس قانون کے تحت؟ مسلم عورت کسی غیر مسلم سے شادی کی مجاز نہیں ہوتی پھر وہ اس کے گھر میں اپنے پہلے شوہر کا بیٹا بھی لے آئی۔وہ سکھ خاندان میں رہتا' کھاتا پیتا رہا لیکن اس کے طور طریقے' حلیہ' نظریات کبھی نہیں بدلے...... ملنگی کی ماں نے سکھ شوہر کے تین بچے جنے اور اب اس نے بیٹے کی

شادی ایک مسلمان عورت سے طے کر دی ہے۔ میں پوچھتا ہوں یہ کیا پاکھنڈ مچا رکھا ہے انھوں نے؟ مذہب ایک کھیل تماشا بن کر رہ گیا ہے؟ ملنگی کے بچے کون ہوں گے موہن سنگھ؟ سکھ یا مسلم؟ رحیم بخش! تم بتاؤ؟ کیا اس عورت کی چرن سنگھ سے شادی اور اولاد جائز قرار دی جا سکتی ہے؟ یہ مخلوط نسلیں کیوں پیدا کر رہے ہیں؟ کوئی ایک مذہب مکمل اپنا لیں۔'' وہ ان کی نبض مکمل طور پر اپنے قبضے میں لے چکا تھا۔

''بہت گھمبیر سمیا ہے ذیلدار یہ! ہمارے دماغ بند ہونے لگے ہیں۔'' موہن نے گہری سانس لی۔

''تو پھر مجھے ہی کچھ سوچنا پڑے گا۔'' وہ اپنی مونچھوں کو تاؤ دینے لگا۔

''ہم تمہارے ہر فیصلہ میں ساتھ دیں گے۔ بے فکر رہو۔'' رحیم بخش نے بھی یقین دہانی کروائی۔

ذیلدار نے اپنی نشست کے پیچھے ساکت کھڑے ایک خصوصی ملازم کو آنکھوں سے اشارہ کیا اور وہ سر جھکائے بیٹھک سے باہر نکل گیا۔ اگلے چند منٹ بعد گاؤں کا ماچھی (روٹیاں لگانے والا) ان کے سامنے موجود تھا۔

''نورے! گاؤں کے ان معززین نے ایک فیصلہ کیا ہے۔ آیندہ چرن سنگھ کے لیے تم کوئی روٹی نہیں بناؤ گے۔ ورنہ اس علاقہ سے تمہارا بوریا بستر گول کر دیا جائے گا۔''

''جو حکم سرکار! میری کیا مجال کہ نافرمانی کر سکوں۔'' اس نے ہاتھ جوڑے۔

''اس فیصلے کا اطلاق آج، ابھی اور اسی وقت سے ہو گا۔'' وہ انگلی اٹھائے متنبہ کرتے ہوئے بولا۔ ''میرے ملازم تمہارے آس پاس رہیں گے۔''

اس زمانے کے معاشرتی اصول اور رواج کے مطابق ماچھی کا کسی بھی فرد واحد یا خاندان کے لیے روٹیاں بنانے سے انکار انتہائی حد تک ذلت و رسوائی کی علامت گردانا جاتا تھا۔ ملنگی اور اس کے اہل و عیال کی متوقع ہرزہ سرائی کا تصور کرتے وہ بہت آسودگی سے اپنی مونچھوں کو بل دیتا رہا۔

اور عین اسی پل......

چرن سنگھ اپنے کھیت میں ملنگی اور ہرنام سنگھ، فصلی معاملات پر گفتگو کھانے کے منتظر تھے۔ والدہ کے اعصاب پر بڑھاپے کی یلغار کے بعد اب یہ فریضہ جیراں نے سنبھال رکھا تھا۔ وہ خشکہ اور گندھا ہوا آٹا لیے تندور پر روٹیاں لگوانے پہنچ گئی۔

اس روز وہاں ہجوم کی وجہ سے وہ بے تابی سے اپنی باری کا انتظار کرنے لگی لیکن ماچھی نے اس کے بعد آنے والے افراد کی روٹیاں لگاتے ہوئے اسے نظر انداز کیے رکھا۔ جیراں کے ساتھ سب سے چھوٹا بھائی بھی موجود تھا جو اس صورت حال پر بالآخر پھٹ پڑا۔

''ہم کب سے بیٹھے ہیں یہاں؟ تمہارے مزاج ہی نہیں مل رہے۔''

''اپنا رستہ ناپو یہاں سے۔ میں آیندہ تم لوگوں کے لیے کوئی روٹی نہیں بناؤں گا۔''

''یہ فیصلہ کس بنیاد پر کر لیا تم نے؟ ہمارا کام تو تمہیں کرنا ہی پڑے گا۔'' جیراں نے تنتناتے ہوئے اپنا آٹے کا تسلہ اس کے سامنے رکھ دیا۔

ذیلدار کے بھیجے ہوئے ملازم ایسے ہی کسی موقع کی تاک میں وہاں موجود تھے۔ انھوں نے تسلے کو ٹھوکر مار کر باہر پھینکا اور جیراں کی لمبی چوٹی اپنے ہاتھ میں لپیٹے اسے جھٹکے دینے لگا۔ کراہتی ہوئی بہن کی یہ ذلت بھائی سے برداشت نہ ہو سکی۔ وہ بھاگم بھاگ کھیتوں میں پہنچا اور بڑے بھائیوں کو سارے واقعے سے آگاہ کر دیا۔

ملنگی اور ہرنام سنگھ غیظ و غضب سے تندور پر جا پہنچے اور ذیلدار کے آدمیوں سے گتھم گتھا ہو گئے۔ چند ہی لمحوں میں وہ گاؤں کی گلیوں میں ان دونوں بھائیوں کے ہاتھوں بری طرح پٹنے لگے۔ اپنے ملازم کی خبر پر ذیلدار نے تازہ دم آدمیوں کی کمک روانہ کر دی۔ اس 'فری اسٹائل' جھگڑے میں بانس سے بنے ڈنڈوں (ڈانگ) اور اینٹوں کا استعمال بھی خوب ہوا۔ ایک اچٹتی ہوئی اینٹ ملنگی کے چھوٹے بھائی کے سر پر جا لگی اور وہ موقع پر ہی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

چرن سنگھ کے خاندان پر غم کا ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ جوانی کی سرحد پر کھڑے بیٹے کا لاشا ان سب کے لیے بہت بھاری تھا۔ غم و اندوہ کی اس کیفیت میں وہ فی الوقت ذیلدار اور اس کے گماشتوں کو فراموش کر چکے تھے۔ ذہن کے کسی گوشے میں انتقام کا خیال بہر حال اپنی شدت سے موجود تھا۔ اپنے لہو اگلتے وجود کے زخموں کے علاج کے لیے انھیں گاؤں کے باہر واقع ایک اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔

ان دونوں بھائیوں کے سنبھلنے سے قبل ذیلدار نے اپنے اگلے ناٹک کے لیے اسٹیج تیار کر لیا۔ دوسرے ہی روز مقامی پولیس اہلکار ان باپ بیٹوں کی گرفتاری کے لیے!

آدھمکے۔ان کی چیخ پکار اور انصاف کی دہائیوں کے باوجود وہ اسپتال میں قانون کے رکھوالوں کے نرغے میں موجود تھے۔ذیلدار اور اس کے آدمیوں پر قتل عمد کے لیے حملہ کی رپورٹ درج ہو چکی تھی اور غالب امکان یہی تھا کہ یہاں سے وہ تھانہ منتقل کر دیئے جائیں گے۔

ان کا بھرا پرا گھر اب کسی ویران کھنڈر کا منظر پیش کرتا تھا۔جیراں اور بوڑھی ماں کے پاس آہ و بکا کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا۔وہ دہائی دیتیں بھی تو کہاں؟ علم و شعور سے نابلد انگریزی قانون کی ابجد سے بھی واقف نہ تھیں۔اور ان کے مبینہ مجرموں کے لیے گورا صاحب کی نرم دلی و پشت پناہی بھی کسی سے ڈھکی چھپی نہ تھی۔

چرن سنگھ اور اس کے اہل و عیال بھیانک زوال کی زد میں تھے۔

☆☆☆

رات کا سحر ہر سو طاری تھا۔

دن بھر کے تھکے ہارے مشقت کی بھٹی میں تپتے محنت کش افراد نیند کی سہانی وادیوں میں مدہوشی کا سفر طے کر رہے تھے۔دو ہیولے ملنگی کے گھر کی بیرونی دیوار پھلانگ کر صحن میں کود پڑے اور خاموشی سے مرکزی دروازہ کھول دیا۔ان کے سامنے ایک اور ہیولہ موجود تھا۔

جیراں کی حساس سماعت نے ہلکی سی آہٹ محسوس کی تو وہ فوری چوکنا ہو گئی۔دائیں جانب غم سے نڈھال ماں کی آنکھ لگ گئی تھی۔وہ ہانپتے کانپتے اٹھی اور صحن کی طرف دبے قدموں بڑھنے لگی۔اسی پل ایک کھردری مردانہ ہتھیلی اس کے ہونٹوں پر پیوست ہو گئی۔اسے پشت سے جکڑے کسی تنومند فرد نے بے دردی سے گھسیٹ کر ملنگی اور ہرنام سنگھ کے بستر پر پھینک دیا۔

جیراں کے سامنے ذیلدار کا بیٹا اپنے ازلی کروفر و نخوت سے کھڑا تھا۔اس کے مذموم ارادے بھانپ کر وہ بری طرح مچلتی بستر سے نیچے اتر آئی لیکن اگلے ہی پل ملازمین نے اس کی مشکیں کس دیں۔ذیلدار نے اپنے باپ کی ہزیمت کا قرض مکمل سود سمیت اس کے نازک وجود سے وصول کیا اور اپنے گماشتوں کو اس کا گلا گھونٹ دینے کے احکامات جاری کرتا رات کے اندھیرے میں واپس لوٹ گیا۔

اگلی صبح بہت لرزہ خیز تھی۔

بیٹی کی بے حرمتی اور قتل نے بوڑھی ماں کا دماغی توازن یکدم بگاڑ دیا۔کرب و اذیت کے عالم میں وہ اپنا سر دیوار میں پٹختی رہی اور بالآخر ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گئی۔اسی شام اسپتال میں جبری نظر بندی کے شکار چرن سنگھ کو جیراں کی موت کے ساتھ بیوی کی بینائی ضائع ہونے کی خبر اس کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئی۔

مرحوم دوست کی بیوہ اور یتیم بیٹے کی کفالت اپنے ذمہ لینے والے چرن کی زندگی نے موت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔پے در پے ملنے والے ان صدموں نے ہرنام سنگھ اور ملنگی کو اس نقطہ پر پہنچا دیا جب انسان اپنا نفع و نقصان فراموش کر دیتا ہے۔ان دونوں ہی کی کیفیت اس مغلوب بلی کی سی تھی جو اپنی بقاء کے لیے شیر کی آنکھیں نوچ لینے کے لیے بھی تیار ہو جاتی ہے۔

اگلے روز تھانے منتقلی کے دوران وہ زبردست کشمکش کے بعد وہ پولیس کی گرفت سے فرار ہو گئے۔ملنگی کی تقدیر بہت سے تھپیڑوں کے بعد اسے اس مقام پر لے آئی جہاں مزید مسافت کے بعد اس کا نام فرنگی راج کی تمام ترعلتوں اور ان کے مقامی سہولت کاروں کے لیے ایک ڈراؤنا خواب ثابت ہوتا تھا۔

☆☆☆

وہ دو روز سے ایک ویرانے میں روپوش تھے۔

پولیس کی گرفت سے آزاد ہونے کے بعد مستقبل تا حال مبہم تھا۔ان کی تلاش کے لیے پولیس انتہائی سرگرم تھی اس لیے فی الوقت وہ کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتے تھے۔

”اب یہاں سے کب کوچ کرنا ہے؟ مجھ سے یہ بے عملی مزید برداشت نہیں ہو سکتی۔“ جنگلی پھلوں سے شکم پری کرتے ہرنام نے ملنگی سے پوچھا۔

”آج رات آخری پہر نکل چلیں گے۔“ ملنگی اطمینان سے بولا۔

”کہاں؟“

”اکالیوں کے پاس۔“

”ان کی جنگی حکمت عملی مجھے پسند نہیں ملنگی! میں اپنے مجرموں کو اب مزید آزاد نہیں چھوڑ سکتا۔“

”ان سے صرف اسلحہ وغیرہ لیں گے۔اور پھر انگریز راج اور بنیے' ساہوکاروں' ذیلداروں کی صورت میں دیئے گئے زخموں سے براہ راست جنگ ہو گی۔اب انگریزی نظام نہیں یا ہم نہیں۔“ ملنگی نے جوش سے کہا۔

اس رات آسمان پر آخری تاریخوں کا چاند ابر آلود

مطلع میں محو استراحت تھا۔ تاریکی میں چھپتے چھپاتے وہ ببر اکالی تحریک کے ایک خفیہ ٹھکانے پر پہنچ گئے۔ چند روز وہاں قیام کے بعد کچھ ہتھیار اکٹھے کیے اور ایک نئی مسافت پر روانہ ہو گئے۔ مقصد اور منزل اب واضح تھے۔ اس کا پہلا شکار ان کی زندگی تباہی کے دہانے پر دھکیلنے والا ذیلدار ثابت ہوا۔

حویلی پر حملہ اور موت کا کھیل گاؤں کے رہائشیوں سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔ وہ ایک دوسرے سے نظریں چراتے حویلی کے باہر ہجوم بنائے کھڑے تھے۔ ملنگی اور ہرنام اپنے مجرم کو کیفر کردار تک پہنچا کر باہر آئے تو کئی مانوس چہروں نے ان کے گھوڑوں کی باگیں تھام لیں۔

''ہمیں تیرے والدین اور بہن بھائی کی موت کا بہت افسوس ہے پتر!'' موہن نے کہا۔

''افسوس کرنے سے وہ واپس تو نہیں آ جائیں گے چاچا! ہماری گرہستی بکھر گئی ہے۔'' ملنگی تلخی سے بولا۔

''ہم بھی ذیلدار کے بہکاوے میں آ گئے تھے۔ ہمیں کیا علم تھا کہ وہ انتقام کی آگ اس قدر بھڑکا دے گا کہ نوبت یہاں تک پہنچ جائے گی۔ ہمیں معاف کر دینا۔''

''اس دھرتی پر اب کسی ظالم کو سانس نہیں لینے دوں گا میں۔ ملنگی جب تک زندہ ہے انگریز حکومت اور اس کے پٹھوؤں کے لیے زمین تنگ کرتا رہے گا۔ اب انگریز نہیں یا ملنگی نہیں۔'' اس نے سفاکی سے کہا اور ہرنام سنگھ کو اشارہ کرتے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

☆☆☆

برصغیر پاک و ہند کی تاریخ کا یہ وہ موڑ تھا جب باشعور اور تعلیم یافتہ طبقہ برطانوی سامراج کے خلاف اپنی قانونی جنگ کا آغاز کر چکا تھا لیکن دوسری جانب ملنگی و ہرنام سنگھ جیسے افراد بھی تھے جو اس لائحہ عمل اور شعور سے نابلد تھے۔ جبر و استحصال کی چنگاری نے آزادی کی شمع پیدا کی تو اپنی بساط' نا سمجھی اور عقل و دانش کے مطابق 'بغاوت' کی وہ راہ اپنائی جسے مہذب دنیا میں 'ڈاکا زنی' اور 'لوٹ مار' کا نام دیا جاتا ہے۔

اس نے اپنے قول کے مطابق انگریزی قانون کے خلاف محاذ بنا لیا۔ اس کے اہداف جاگیردار' بنیے' 'سود خور' مجسٹریٹ' سرکاری پولیس افسران اور مقامی برطانوی نمائندے بنتے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کا گروہ وسیع تر ہونے لگا۔ قرب و جوار کے کئی باغی جوانوں نے اس کے ساتھ مل کر وسطی پنجاب کے علاقوں ماجھا' لاہور' قصور اور شیخوپورہ کے زمیندار طبقہ میں تباہی مچا دی۔

اس کے گروہ میں شمولیت کی کچھ مخصوص شرائط تھیں۔ نفرت و انتقام کا نشانہ محض با اختیار جابر طبقہ بنا کرتا۔ ان سے حاصل کردہ مال و متاع میں وہ صرف اپنی انتہائی ضرورت کا سامان پاس رکھنے کے مجاز تھے اور ضرورت سے زائد تمام تر چیزیں علاقے کے غرباء اور محکوم افراد کے حوالے کر دی جاتیں۔ لوٹ مار اور ڈاکا زنی کی ان مہمات میں کسی بھی ساتھی کو مخالف طبقہ کی خواتین سے ناروا سلوک یا ان کی عزت و آبرو سے کھیلنے کی ممانعت تھی۔

ملنگی کی دہشت اور شہرت میں راتوں رات اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ اپنے شکار کردہ فرد کے لیے کسی بھی ڈراؤنے خواب سے کم ثابت نہیں ہوتا تھا۔ سود خور طبقہ تو اس کی آمد سے پناہ مانگا کرتا۔ وہ ان کی دولت و اسباب لوٹنے کے بعد ایک ایسا وار کرتا جو انہیں زندگی بھر کے لیے گہری چوٹ لگا دیتا۔ ان کی تجوریوں میں موجود سودی ریکارڈ کے کاغذات نذر آتش کر کے اپنے شکار کی بے بسی اور تڑپ کا نظارہ ملنگی اور ہرنام سنگھ کو بہت مرغوب تھا۔

سود کی لعنت سے اس چھٹکارے اور مالی تعاون کے بعد وہ مقامی افراد میں مقبولیت کی بلندیوں تک پہنچ گیا۔

وہ اندھیرے کا شکاری تھا۔ رات کی تاریکیوں میں اپنی خفیہ پناہ گاہ سے برآمد ہوتا اور کسی تیر کی طرح سنسناتا ہوا اپنے مطلوبہ ہدف کی گردن دبوچ لیتا۔ آنے والے چند سالوں میں وہ پنجاب میں مقامی ہیرو کا درجہ اختیار کر گیا۔ چوپال' پنچایت' میلے ٹھیلوں میں اس کی تعریف میں بولیاں (ایک مخصوص شاعرانہ کلام) پڑھی جاتیں۔ ملنگی نامی وہ چھلاوا انگریز حکومت کے لیے وبال جان بن گیا تھا۔ اس کی ذات سے منسوب قصوں کے بعد وسطی پنجاب اور ماجھا میں ایک اور زبان زد عام بات ان کے لیے ناقابل برداشت تھی۔

راتیں راج ملنگی دا
دن نوں راج فرنگی دا

(دن میں انگریز حکومت کرتا ہے اور راتوں میں حکومت و غلبہ صرف ملنگی کا ہے۔)

☆☆☆

سرکاری کاغذات میں ملنگی اب ایک سند یافتہ ڈاکو

قرار پا چکا تھا۔ نظام لوہار ہی کی طرح اس کی زندہ یا مردہ گرفتاری پر نقد کے علاوہ کئی مربع زمین کا انعام مقامی افراد کے لیے ایک بہت بڑی ترغیب تھی لیکن سوال یہ تھا کہ وسطی پنجاب کے لوگ اس کی مخبری کیونکر کرتے؟

وہ ان کے لیے رحمدل تھا' نجات دہندہ تھا' خودداری و وقار سے جینے کی مثال بھی تھا۔ ایسے شخص کی گرفتاری کے لیے مخبری چہ معنی دارد۔

ملنگی نے گذرے سالوں میں اپنے عوام کے لیے جو بھی اقدامات کیے ان کا احاطہ سردست اس سرگذشت کی طوالت بن جائے گا۔ تاہم اس کی زندگی اور کردار کے خفیہ پہلو آشکار کرتی اس داستان میں ایک واقعہ کا بیان تو لازم ہے۔

ضلع قصور کے ایک نواحی گاؤں میں 'جمعہ ٹیلا' نامی سود خور شخص فرعون وقت تھا۔ علاقے کے لوگوں کا خون چوستے ہوئے اس نے اپنی حویلی اور اصطبل میں شاہانہ طور طریقے رائج کر رکھے تھے۔ جاگیر کے ملازمین آئے روز جرم بے گناہی کی سزا بھگتتے۔ ملنگی ہمیشہ ایسے ہی افراد کی تاک میں رہا کرتا تھا۔

اس جاگیردار نے اپنے ایک ملازم کو قرض واپس نہ لوٹانے کی پاداش میں سربازار انسانیت سوز پٹائی کے بعد رسوائی کا طوق پہنا دیا۔ اب اتفاق کہیے یا جمعہ ٹیلا کی شامت اعمال' اس واقعہ کی بازگشت ملنگی تک جا پہنچی۔ تاریکی کا وہ شکاری اگلی رات اس کی حویلی میں موجود تھا۔

منظر ایک بار پھر وسیع و عریض شاہانہ خوابگاہ کا تھا اور کردار بھی ماضی ہی کی طرح بندوق کی زد میں رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔ ملنگی نے اپنے رائج کردہ قانون کے مطابق سود کے ریکارڈ سوختہ کر دیئے اور اصطبل میں موجود تمام تر جانور آزاد کرنے کے بعد مقامی افراد کے حوالے کر دیئے۔ جمعہ ایک ہی پل میں عرش سے فرش پر آ گیا۔

ملنگی کے خوف نے جاگیرداروں کے تمام کس بل نکال دیئے۔ اب کسی بھی جاگیردار میں ہمت نہ تھی کہ وہ اپنے ملازمین سے تنخواہ کے بغیر کام لے سکے۔ وہ 'باغی' بیسویں صدی کا 'روبن ہڈ' بن چکا تھا۔ وسطی پنجاب اس کی سلطنت تھی اور رات کی تاریکی اس کا دربار۔ برسوں پہلے دونوں بھائیوں کے باہمی عہد نے انگریز انتظامیہ کی بنیادیں کمزور کرنی شروع کر دیں۔ انگریز نواز افراد کے خلاف قرار واقعی کارروائی کے بعد وہ دن کے اجالے میں قصور کے نزدیکی جنگل 'چھانگا مانگا' میں روپوشی اختیار کر لیتا۔ (اسی جنگل میں نظام لوہار بھی پناہ گزین ہوا کرتا تھا)۔

تاریخ ایک بار پھر خود کو دہرانے لگی۔

☆☆☆

انگریز انتظامیہ ملنگی کے ہاتھوں زچ ہو چکی تھی۔ سرکردہ افراد کی ہلاکت اور برطانوی قانون کی دھجیاں اڑانے کے باعث انہیں ملنگی کسی بھی صورت درکار تھا۔ زن' زر اور زمین کے بھی لالچ تا حال ناکام تھے لیکن اب قدرت کی جانب سے وقت کی اس بساط پر 'باغی' کا مہرہ اپنی مدت مکمل کر چکا تھا۔ قسمت کے نادیدہ قلم نے ایک خونی ناٹک کا اسٹیج تیار کیا اور کچھ کردار تقدیر کے گرداب میں الجھ کر اپنی زندگی کا آخری ایکٹ ادا کرنے چلے آئے۔

ملنگی اور ہرنام سنگھ 'چونیاں' میں موجود تھے۔ تاریخی حیثیت کا حامل یہ علاقہ لاہور سے 90 کلومیٹر کی مسافت پر تھا۔ اپنے ایک شکار سے فراغت کے بعد دن کے ملگجے اندھیرے میں ان کی ملاقات ایک دیرینہ شناسا سے ہو گئی۔ وہ شخص بہت محبت سے ان سے بغلگیر ہوا۔

''مجھے بھول ہی گئے تم لوگ تو۔ کیا یار دوستوں کے ساتھ یوں بھی کیا جاتا ہے؟'' اس نے شکوہ کیا۔

''ایسی بات نہیں فتح محمد! ہماری زندگی ایک بگولا بن چکی ہے۔ آج یہاں تو کل وہاں۔ پنجاب کی اس دھرتی سے فرنگی ظلم مٹانے کے سوا اور کوئی مقصد نہیں۔'' ملنگی نے سنجیدگی سے کہا۔

فتح محمد سے آشنائی کو ایک زمانہ بیت چکا تھا۔ بھلے وقتوں میں ملنگی نے اسے کچھ قرض فراہم کیا تھا جس کی بنیاد پر اس کے حالات میں بہتری کی صورت پیدا ہونے لگی اور اب وہ عرصہ دراز سے اپنے اہل و عیال کے ساتھ چونیاں میں رہائش پذیر تھا۔

''مجھے علم ہے دوست! اور مجھے فخر بھی ہے کہ راتوں میں راج کرنے والا ملنگی میرا تعلق دار ہے...... اس لیے میں ابھی تم لوگوں کو یہاں سے جانے نہیں دوں گا۔ کچھ وقت میرے گھر گذار لو۔'' اس کے ملتجی انداز پر ملنگی نے مزید سفر کا ارادہ مؤخر کر دیا اور فتح محمد کی ہمراہی میں اس کے گھر پہنچ گئے۔

باتوں' قہقہوں اور یادوں کی برات میں وقت بیتنے کا اندازہ ہی نہ ہوا۔ شام سے قبل وہ انہیں آرام کرنے کی تلقین کرتا کھانے کا بندوبست کرنے اٹھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد

اس نے دروازے کی درز سے جھانکا اور انہیں کسلمندی سے اونگھتے دیکھ کر مطمئن انداز میں بیوی کے پاس باورچی خانہ میں پہنچ گیا۔

''اسے جلدی سے کھانے میں ملا دے۔ مزید تاخیر اب مناسب نہیں۔'' اس نے سرگوشی میں بولتے اپنی مٹھی میں دبی ایک چیز اسے تھمائی۔

''کیا ہے یہ؟ کہیں مروا ہی نہ دینا ہمیں۔'' بیوی بہت خوفزدہ تھی۔

''بھنگ کے پتے ہیں۔ کھانے میں ملا کر پکا دے۔ کھاتے ہی دونوں انٹاغفیل ہو جائیں گے۔''

تھوڑی ہی دیر بعد نشہ آور کھانا ملنگی کے سامنے موجود تھا۔ فتح محمد نے گرانیٔ شکم کا بہانہ کرتے ہوئے خود تو کچھ نہ کھایا لیکن اپنے ان دیرینہ دوستوں کو خلوص بھرے اصرار سے خوب کھلاتا رہا۔ نتیجہ حسبِ توقع تھا۔ ماجھا کی دہشت بے ہوشی نما نیند میں اپنے ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکی تھی۔

فتح محمد فوری طور پر تھانہ روانہ ہوا اور پولیس کی ایک بھاری نفری نے اس کے مکان کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ جی ہاں! آپ ٹھیک سمجھے۔ وہ رات ان دونوں بھائیوں کی زندگی کا چراغ گل کر گئی۔ کچھ روایات کے مطابق پولیس ان دونوں کا سامنا کرنے سے سخت خائف تھی۔ اس لیے انھوں نے چھت میں شگاف کرنے کے بعد ان پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ جبکہ ایک روایت کے مطابق پولیس کی آمد کے بعد ان کا نشہ ہرن ہو گیا اور اپنے ہتھیار تھامے وہ مقابلہ پر اتر آئے۔ قانون کا گھیرا توڑنے کی کوشش میں انھیں لہو لہان کر دیا گیا۔

طریقہ کار خواہ جو بھی رہا ہو، برطانوی سیاسی، سماجی اور معاشی اداروں اور ان کے گماشتوں کو مدتوں ہراس میں مبتلا رکھنے والا ملنگی اپنی آخری سانسیں پوری کر چکا تھا۔

فتح محمد کی اس مخبری پر اسے 175 ایکڑ زمین الاٹ کی گئی۔ اس کی ہلاکت میں عملی حصہ لینے والے پولیس افسران کی بھی خوب چاندی ہوئی۔ انگریزی نظام کے خاتمہ کے دعویدار اس باغی کی موت کے بعد تمام تر نظام از سرِ نو ترتیب دیا گیا۔

وسطی پنجاب اور ماجھا میں ایک بار پھر استحصال کا بازار گرم ہو گیا۔

☆☆☆

وہ نابینا عورت اپنے چہرے پر دنیا جہان کا کرب سموئے ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھی تھی۔ درخت کا سایہ اسے بے طرح جھلسا رہا تھا۔ اپنے بھرے پرے گھر کی تباہی کے بعد ایک نئی خبر نے اس کا سکون غارت کر دیا۔

وہ ملنگی کی حرماں نصیب ماں تھی جس کے لختِ جگر کی موت کی اطلاع جنگل میں آگ کی طرح پنجاب میں پھیل چکی تھی۔ اس حادثے کو کئی ہفتے بیت چکے تھے لیکن اذیت کسی طور بھی کم ہونے میں نہ آتی۔ درخت کے تنے سے پشت لگائے وہ تصور کے جہان میں اپنے خاندان کے ساتھ بیتے لحات میں غریق تھی کہ گھوڑوں کی مخصوص ٹاپوں کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

''ست سری اکال ماں جی!'' ایک کھردری لیکن مؤدب آواز اس کی سماعت میں پڑی۔

''پتر! کون ہو تم؟'' اس نے آواز کے ماخذ کی جانب اپنی ویران نظریں جما دیں۔

''ایک مسافر سمجھ لیجیے ماں جی! ملنگی جیسا ایک مسافر۔''

''تم ملنگی کو جانتے ہو؟'' وہ بے اختیار بولی۔

''اسے کون نہیں جانتا۔ مجھے اس کی بے وقت اور المناک موت کا بہت افسوس ہے۔ میں یہاں اس کے قتل کے ذمہ داروں کی تلاش میں آیا تھا۔ جانے مجھے کیوں لگتا ہے کہ اگر اس مخبر سے انتقام نہ لیا گیا تو ملنگی کی آتما کو بھی شانتی نہ ملے گی۔ آج میں اس کے تمام گلے دور کرنے آیا ہوں۔''

''لیکن تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟'' وہ الجھ گئی۔

''میں بھی ایک باغی ہوں ماں جی! انگریز حکومت سے باغی...... اور یہ ساری دھرتی ہی میرا ٹھکانہ ہے۔'' نووارد نے مضبوط لہجے میں کہا۔

اگلے کچھ گھنٹوں میں وہ ملنگی کے اس خیر خواہ اور اس کے ساتھیوں سے متعارف ہو گئی۔ وہ حقیقتاً ملنگی کے قبیلے کا باسی تھا۔ پنجاب حکومت سے متصادم ''جگت سنگھ عرف جگا'' نامی وہ شخص اس دور کا ایسا 'باغی' تھا جو فرنگی اہلکاروں کو باقاعدہ مطلع کر کے اپنے شکار پر روانہ ہوتا۔

ملنگی اور ہرنام سنگھ کی موت کا انتقام لینے کے لیے آئے 'جگا' کے ساتھ ایک ان چاہا مہمان بھی چلا آیا تھا جس کی موجودگی سے بے خبر وہاں موجود بھی افراد سے خوش گپیوں میں مگن تھا۔ ملنگی کی والدہ کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ اس کا بیٹا ایک بار پھر لوٹ آیا ہے۔ اس کی محبت اور اصرار پر

'جگا' نے اپنی بغاوت کے سفر کی پرتیں اس پر آشکار کردیں۔

☆☆☆

سردار مکھن سنگھ ورک اور بھاگاں اپنی نوعیت کا ایک منفرد جوڑا تھا۔

دولت و خوشحالی میں یکتا اور بدقسمتی میں بھی اپنی مثال آپ۔ ان کی شادی کو سات سال بیت چکے تھے لیکن اولاد کی آزمائش ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتی۔ گذشتہ سالوں میں بھاگاں کی گود چھ بار ہری ہوئی اور ہر دفعہ موت نہایت اطمینان سے اس کے بچوں کو اپنے بے رحم شکنجے میں دبوچ کر چلتی بنی۔ کوکھ اجڑنے کا دکھ اس کی روح کا آزار بننے لگا۔ مکھن سنگھ کی محبت اور خلوص کے باوجود وہ اپنے جذبات پر قابو پانے میں ناکام رہتی۔

''مجھ جیسی ابھاگن بھی کوئی ہوگی بھلا؟ جانے کون سے پاپ کیے تھے جن کی سزا اس طرح بھگت رہی ہوں۔''

''ہر رات کے بعد سویرا ہوتا ہے بھاگاں! کیوں نراش ہوتی ہے؟'' مکھن سنگھ دلاسہ دیتا۔

''میرا نام بھاگاں بھی جانے کیا سوچ کر رکھ دیا ماں باپ نے؟ ایک بھدا مذاق بن کے رہ گیا ہے یہ میرے لیے۔'' وہ رنجیدہ لہجے میں بولی۔ (بھاگاں پنجابی زبان میں خوش بخت عورت کو کہا جاتا ہے۔)

''لیکن مجھے پورا وشواس ہے کہ تیرے بھاگ ضرور جاگیں گے اور ہمیں صحت مند، طویل زندگی والی اولاد بھی ضرور ملے گی جو ہمارا نام امر کردے گی۔'' مکھن نے اس کا ہاتھ تھپتھپایا۔

سردار مکھن سنگھ اور بھاگاں ضلع لاہور کے گاؤں 'برج رن سنگھ' کے رہائشی تھے۔ اس گاؤں میں اکثریت مسلمانوں کی تھی جو 'تیلی' ذات سے تعلق رکھتے تھے۔ سترہ اٹھارہ خاندان 'کھرل جاٹ اور سدھو' ذات کے تھے۔ بیسویں صدی کا آفتاب اپنی کرنیں بکھیرتا تماشائے رنگ و بو دیکھتا رہتا۔ اس نئی صدی کے آغاز پر بھی برصغیر کا خطہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑا تھا۔

مکھن سنگھ کئی مربع زمین کا مالک تھا۔ زندگی میں کمی تھی تو بس اپنے وجود سے نمو پانے والی انمول ترین نعمت کی۔ اولاد کی پیدائش کے بعد موت اس کے لیے بھی کم اذیت ناک نہ تھی لیکن وہ اپنی مردانگی کا بھرم قائم رکھنے کے لیے اپنا کرب دل میں چھپالیتا اور ہر بار بیوی کی ڈھارس بندھانے لگتا۔ اس کا گمان جلد ہی یقین میں بدل گیا۔ کچھ ماہ بعد بھاگاں ایک بار پھر امید سے تھی۔ خوشی، خوف اور واہموں کی ملی جلی کیفیت میں وہ روز و شب اس بچے کی زندگی کی دعائیں کرتے۔

اپنی نسل کی افزائش کسی بھی انسان کی جبلی خواہش ہوتی ہے۔ جس کی تکمیل کے لیے وہ بعید العقل امور سرانجام دینے میں بھی مضائقہ محسوس نہیں کرتا۔ ساتویں بچے کی ولادت سے قبل مکھن سنگھ اپنے کسی قریبی دوست کے مشورے پر 'سوڈھی وال' نامی گاؤں میں قیام پذیر سادھو 'اندر سنگھ' کے پاس جا پہنچا۔

اندر سنگھ کی شہرت آس پاس علاقوں میں مسلمہ تھی۔ اس کی پیش گوئیاں اور تجویز کردہ علاج بھی شفا بخش تسلیم کیے جاتے۔ اضطراب و اذیت سے بے حال مکھن سنگھ نے اپنی بپتا من و عن اسے بیان کردی۔

''بھگوان کی لیلا نرالی! تیرے کٹھن دن اب ختم ہوتے دکھائی دیتے ہیں بالک!'' اندر سنگھ نے اپنی سرخ آنکھیں اس پر جمادیں۔ ''تیری قسمت میں سنتان کا سکھ موجود ہے پرنتو تجھے تھوڑا کشٹ اٹھانا پڑے گا۔''

''میں ہر کشٹ اٹھانے کو تیار ہوں مہاراج! آپ بس اپائے بتائیے۔'' وہ جلدی سے بولا۔

''اگلی پورن ماشی ایک بکرا لے کر میرے پاس آنا۔ میں اس پر کچھ جاپ کروں گا اور جب تیری سنتان اس دنیا میں آجائے تو اس کا ہاتھ اسے لگوانا۔''

''ایسا ہی ہوگا مہاراج!''

''مکھن سنگھ! میری بات یاد رکھنا..... اپنی سنتان کو کبھی بھی 'ج' سے نام مت دینا۔ ورنہ بھوش (مستقبل) میں اسے سنبھال نہ پاؤ گے۔''

''آگیا کا پالن ہوگا مہاراج!'' وہ عقیدت سے اس کے پاؤں چھوتے لوٹ آیا۔

اندر سنگھ کی ہدایت کے مطابق وہ ایک صحت مند بکرا لیے اس کے پاس پہنچ گیا۔ مخصوص جاپ اور اشلوک پڑھنے کے بعد اس نے روانگی کا عندیہ دے دیا۔

کچھ ماہ بعد بھاگاں نے ایک صحت مند بیٹے کو جنم دیا۔ مکھن سنگھ نے سادھو کے حکم کے موجب نومولود بیٹے کا ہاتھ اس بکرے پر کئی بار پھیرا۔ اب خدا کی کرنی بھی ایسی ہوئی کہ وہ بے زبان جانور موت کا شکار ہوگیا۔ مکھن اور بھاگاں کو تو گویا ہفت اقلیم کی دولت مل گئی۔ خوشی سے پھولے نہ سماتے انھوں نے خاندان بھر کی خصوصی ضیافت کا اہتمام

مس گوہر نے اپنے عروج کے دور میں چندو لال شاہ سے شادی کی جو مشہور فلم ساز اور رنجیت اسٹوڈیو کے مالک تھے۔

پری چہرہ نسیم بڑی مقبول اداکارہ تھیں۔ سہراب مودی کی فلم پکار سے انہیں پری چہرہ کا خطاب ملا۔ میٹھا زہر، وحشی، طلاق، خان بہادر اور پکار ان کی ابتدائی فلمیں تھیں۔ انہوں نے مشہور فلمساز میاں احسان سے شادی کی۔ میاں احسان نے اپنی بیوی کی شہرت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اجالا، بیگم، ملاقات، چاندنی رات وغیرہ بنائیں۔

نسیم بانو نامور گلوکارہ شمشاد بیگم کی بیٹی تھیں جو 2 جولائی 1922ء کو دہلی میں پیدا ہوئی تھیں۔ ان کی دیگر فلموں میں چل چل رے نوجوان، انوکھی ادا، شیش محل، شبستان اور سند باد جہازی بھی قابلِ ذکر ہیں۔ دلیپ کمار کی بیگم سائرہ بانو نسیم بانو کی بیٹی ہیں۔

نور جہاں جنہوں نے ملکہ ترنم نور جہاں کی حیثیت سے عالمگیر شہرت حاصل کی۔ 23 ستمبر 1922ء کو پنجاب کے شہر قصور میں پیدا ہوئیں۔ 6 سال کی عمر سے فلموں میں کام کرنا شروع کر دیا۔ ان کی پہلی فلم ''پنڈ دی کڑی'' تھی۔ جوانی میں قدم رکھا تو پنچولی پکچرز کی فلم ''خاندان'' میں پہلی بار ہیروئن کا کردار ادا کیا۔ لاہور کی فلموں سے شہرت حاصل کرنے کے بعد بمبئی چلی گئیں اور کامیاب ہدایت کار شوکت حسین رضوی سے شادی کر لی۔ بمبئی کے دوران قیام فلم نوکر، دہائی، دوست، زینت، انمول گھڑی اور جگنو میں کام کیا۔ تقسیم ملک کے بعد اپنے شوہر سید شوکت حسین رضوی کے ساتھ لاہور آ گئیں۔ یہاں انہوں نے چنوے، دوپٹہ، گلنار، انارکلی، انتظار، کوئل اور غالب میں کامیاب اداکاری کی۔ ابتدا ہی سے اداکاری کے ساتھ گلوکاری بھی کرتی رہی تھیں۔ جب فلموں میں کام کرنا ترک کر دیا تو صرف گلوکاری کرتی رہیں۔ ان کی زندگی میں ایک وقت وہ بھی آیا جب انہوں نے سید شوکت حسین رضوی سے طلاق لے لی اور بعد میں اعجاز درانی سے شادی کر لی۔ طویل علالت کے باعث

کیا جس میں سر کردہ بزرگ افراد کے صلاح مشورے سے بیٹے کا نام رکھا جاتا تھا۔

خاندان کے سبھی ارکان مکھن سنگھ کو مدتوں بعد ملنے والی اس خوشی سے بہت پُرجوش تھے۔ اس کے چھوٹے بھائی 'روپ سنگھ سدھو' کے پاؤں ہی زمین پر نہ ٹک رہے تھے۔ ننھے بھتیجے کو گود میں اٹھائے وہ انوکھی مسرتوں سے نہال ہو رہا تھا۔

''بھائیا جی! اس کا نام اگر میں رکھوں تو کوئی اعتراض تو نہیں؟''

''نہیں روپے! اعتراض کیسا بھلا؟ تیرے بھتیجے پر تیرا بھی اتنا ہی ادھیکار ہے۔'' مکھن نے فراخدلی سے کہا۔

''اس کا نام 'جگت سنگھ' ہوگا بھائیا جی! میرے کہے کا بھرم مت توڑنا اب۔''

''لیکن روپے! سادھو جی نے منع کیا تھا کہ اس کا نام 'ج' سے نہیں رکھنا۔'' وہ پریشان ہو گیا۔

''یہ سب بے کار باتیں ہیں۔ آپ بھی کن وہموں میں پڑ گئے ہیں؟''

روپ سنگھ نے بالآخر اسے دلائل سے قائل کر کے ہی دم لیا۔ جگت سنگھ گھر بھر کی آنکھوں کا تارا تھا۔ اگلے دو سال میں بھاگاں نے دو بیٹیوں کو جنم دیا۔ خوشی و سرشاری کے ساتھ جگت سنگھ کی اہمیت مزید دوچند ہو گئی۔

☆☆☆

سردار مکھن سنگھ کی زندگی اب کسی بھی محرومی کا شکار نہیں تھی۔ دنیا کی ہر نعمت کا سکھ اس نے اپنے جیون میں پا لیا تھا۔ جگت سنگھ سے اس کی محبت فزوں تر ہونے لگی۔ کبھی کبھی اسے محسوس ہوتا کہ دیومالائی کہانیوں کی طرح جگت وہ طوطا ہے جس میں اس کی اپنی جان مقید ہے۔

بیٹے کی ناز برداری میں مکھن اور بھاگاں نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اس کی زبان سے نکلی ہر بات 'خواہش' کی فوری تکمیل کی جاتی۔ جگت سنگھ کو خود بھی اپنی اس اہمیت کا احساس تھا اس لیے مزاج میں تبدیلیاں تو ناگزیر تھیں۔ اکھڑ مزاجی، حاکمانہ انداز تخاطب اور من موجی فطرت اس کا خاصا بن گئی۔ زندگی اس کی بے دام کنیز تھی۔

ہوش سنبھالا تو پردہ غیب سے رونما ہونے والی ایک تبدیلی نے اس کی بنیادیں ہلا دیں۔ سردار مکھن سنگھ اپنی اولاد کی بابت دل میں ڈھیروں ارمان لیے داعی اجل کو لبیک کہہ گیا۔ باپ سے محرومی ایک دائمی کسک کی طرح وجود

کراچی میں ان کا انتقال ہو گیا۔
سورن لتا، جنہوں نے بمبئی اور لاہور کی فلموں میں کام کرکے بڑی شہرت حاصل کی۔ سکھ گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ 20 ستمبر 1924ء کو راولپنڈی میں پیدا ہوئیں۔ 1942ء میں فلمی دنیا میں قدم رکھا۔ بمبئی میں ان کی فلمیں جو بنیں ان میں تصویر، اشارہ، پرتگیا، لیلیٰ مجنوں، رتن اور وامق عذرا بہت مقبول ہوئیں۔ بمبئی کے دوران قیام ہی انہیں فلمساز ہدایت کار اور اداکار نذیر اتنے بھائے کہ ان کو جیون ساتھی بنا لیا۔ شادی سے پہلے نذیر صاحب کی خواہش پر مسلمان ہو گئیں اور اپنا نام سعیدہ بانو رکھا۔

پاکستان بننے کے بعد نذیر صاحب کے ساتھ لاہور آ گئیں۔ یہاں انہوں نے کوئی دو درجن فلموں میں کام کیا۔ پاکستان میں ان کی مشہور فلمیں سچائی، پھیرے، لارے، انوکھی داستان، خاتون، ہیر، شہری بابو اور صابرہ قابل ذکر ہیں۔ آخری عمر میں کچھ فلموں میں کیریکٹر رول میں بھی کام کیا۔ مسلمان ہونے کے بعد بھی وہ اپنے پرانے نام سورن لتا سے ہی پکاری جاتی رہیں۔ دونوں ایک دوسرے کو بے حد چاہتے تھے۔ موت نے ہی انہیں ایک دوسرے سے جدا کیا۔

جے شری جو ماہر رقص اداکارہ تھیں۔ کلاسیکل موسیقی پر ان کے رقص قابل دید ہوتے تھے۔ گوا کی خوب صورت سرزمین میں جنم لینے والی اس اداکارہ کی پہلی فلم چندر راؤ تھی جو مراٹھی زبان میں بنائی گئی تھی۔ فلم ''شکنتلا'' کی زبردست کامیابی نے جے شری کو ایک کامیاب ایکٹریس بنا دیا۔ اس کے بعد انہوں نے ڈاکٹر کوٹنس کی امر کہانی اور جہیز کو اپنی شاندار اداکاری سے کامیابی عطا کی ان کی آخری فلم مہندی تھی۔

جے شری نے اپنے عالم عروج میں انڈیا کے منفرد ہدایت کار اور فلمساز وی شانتا رام سے شادی کی

کی دیواروں سے لپٹ گئی۔ بھاگاں اور روپ سنگھ نے اس کی پرورش کا بیڑہ اٹھایا اور مکھن ہی کی مانند اسے مان ومحبت سے پروان چڑھاتے گئے۔

عمر کے پڑاؤ پار کرتے اس کی فطرت ومزاج کی پرتیں نمایاں ہونے لگیں۔ ہٹ دھرم اور ضدی تو وہ تھا ہی دوستیاں گانٹھنے اور نبھانے میں بھی اسے کمال ملکہ تھا۔ اس کی حاکمانہ طبیعت کے باوجود سب سنگی بیلی اسے بہت عزیز رکھتے۔

ایک روز اپنے روزمرہ کے کھیل میں وہ مشغول تھے کہ انہیں بھوک ستانے لگی۔ کسلمندی سے سب نہر کے کنارے اینڈ رہے تھے۔

''اس بھوک کا کیا علاج کیا جائے جگت؟'' ایک ساتھی نے پوچھا۔

''ہاتھ پاؤں کو حرکت دیتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی رستہ تو نکل ہی آئے گا۔''

''کرم چند کے باغ میں چل کر پھل توڑ لاتے ہیں۔'' دوسرے ساتھی نے تجویز دی۔

''بے کار خیال ہے! یہ تو ہم بہت دفعہ کر چکے۔ آج کچھ انوکھا کرتے ہیں۔'' جگت کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔ ''چلو میرے ساتھ!''

وہ سب خاموشی سے اس کے پیچھے چل دیئے۔ تھوڑے ہی فاصلے پر ان کی آبائی زمینیں موجود تھیں جہاں اس وقت کماد کی فصل مکمل جوبن پر تھی۔ وہ انہیں لیے وہاں داخل ہوا اور ڈھیروں گنے توڑ کر اطمینان سے لوٹ آیا۔

شام ڈھلے اس کے کارنامے کی خبر اس سے قبل ہی گھر پہنچ چکی تھی۔ روپ سنگھ کا طیش آسمان سے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے بھتیجے کو آڑے ہاتھوں لیا۔

''میں نے اگر کچھ گنے توڑ کر استعمال کر لیے تو اتنا چیخ کیوں رہے ہو؟''

''وہ فصل برباد کر دی تو نے اور اب بھی پوچھتے ہو چیخ کیوں رہا ہوں؟'' روپ سنگھ چلایا۔

''اس زمین میں میرے باپ کا بھی حصہ تھا اور اس کا سب کچھ اب میرا ہے۔ میں اپنی ملکیت کے ساتھ جو چاہے کر سکتا ہوں۔''

روپ کو بہت تذلیل محسوس ہوئی۔ اس کے ہاتھوں میں پروان چڑھنے والا وہ بالشت بھر چھوکرا منہ کو آنے لگا تھا برداشت تو اب ممکن ہی نہ تھی۔

"تیرے دماغ میں ٹھکانے لگاتا ہوں۔ کسی بھرم میں مت رہنا!" وہ اسے گھسیٹتا ہوا ایک کمرے میں لے گیا اور دروازہ مقفل کر دیا۔

جگت سنگھ کئی پہر وہاں بھوکا پیاسا قید رہا۔ سوئے اتفاق بھاگاں بھی کسی کام کے تحت اپنے والدین کے گھر موجود تھی اس لیے کوئی بھی اس کی مدد کو نہ آسکا۔ روپ سنگھ اگر یہ سوچتا تھا کہ وہ رعب داب سے بھتیجے پر غالب رہے گا تو یہ خام خیالی اسی روز ہوا ہو گئی۔ جگت نے اس سزا کا انتقام لینے میں بالکل تاخیر نہ کی۔

اگلی صبح اس نے روپ کے کنویں پر موجود پانی کھینچنے والے برتن توڑ دیئے اور اس کے اصطبل سے کئی جانور آزاد کر دیئے۔ اپنے اس 'کارِ خیر' کے بعد وہ فرار ہونے کی بجائے وہیں بچھی ایک چارپائی پر اطمینان سے نیم دراز ہو گیا۔

"جگت کو سزا دینے کی سزا مدتوں یاد رکھو گے روپے!" اس نے سرشاری سے خودکلامی کی۔

اپنے اس نقصان اور اہانت پر روپ سنگھ کی حالت اور غصہ قابلِ دید تھا۔ وہ تنتناتا ہوا بھاگاں کے پاس گیا اور اسے دھمکانے لگا۔ "اپنے بیٹے کو لگام دے بھرجائی! اس کی سرکشی برداشت کرنا میرے لیے ممکن نہیں اب۔"

"میرا بیٹا تیرا بھی کچھ لگتا ہے۔"

"میں کب انکار کر رہا ہوں؟ مگر اس کا مزاج ٹھکانے لگانا ضروری ہے اور یہ کام تمہیں کرنا ہے۔"

"یہ مزاج تمہارا ہی دیا ہوا تحفہ ہے۔ اس لیے بھگتنا تو پڑے گا۔" بھاگاں نے بے نیازی سے کہا۔

"سٹھیا تو نہیں گئی ہو بھرجائی!" وہ بیزاری سے بولا۔

"یاد کرو وہ ویلا (وقت) جب لکھن تجھے منع کرتا رہا کہ اس کا نام 'جگت' مت رکھ مگر تو نے رشتے کا فائدہ اٹھایا اور اپنی منوا کے چھوڑی۔ اب سادھو جی کی پیش گوئی سچ ثابت ہو رہی ہے تو بلبلا کیوں رہے ہو؟"

روپ خشمگیں نظروں سے دیکھتا لوٹ گیا۔ اس وقت تو بات آئی گئی ہو گئی لیکن جگت سنگھ کی سرکشی بڑھتی ہی چلی گئی۔ پنجاب کے سبھی دریاؤں کی طغیانی اور منہ زوری اس میں سمائی تھی۔ وہ کسی کی سننے کی بجائے اپنی راہیں خود متعین کرتا۔ خوشحالی اور آسودگی نے تن آسانی کی طرف مائل نہیں کیا تھا۔ اس کا رجحان پہلوانی کی طرف بڑھنے لگا۔

بھاگاں کے لیے اس کم عمری میں اس کا مشقت بھرا یہ شوق خاصا دردِ سر تھا۔

"جگت پتر! ابھی تیری عمر ہی کیا ہے۔ تیرہویں سن میں لگا ہے اور اتنے جوکھم میں پڑ گیا ہے۔" وہ اس کے بال سنوارتے ہوئے بولی۔

"مجھے بچہ سمجھنا چھوڑ دے بے بے! میں مرد ہوں...... اور مرد اکھاڑوں کے کھلاڑی ہوتے ہیں۔ اپنے مخالف کو دھول چٹانے میں جو مزہ ہے اس کا کوئی مول ہی نہیں۔" وہ چھاتی چوڑی کیے کہنے لگا۔

اسی شوق کے پیشِ نظر اس نے کشتیاں لڑنی شروع کر دیں۔ اس کا چیتے کی مانند پھرتیلا جسم، پٹھوں میں موجود قوت اور لہو میں لپکتے شرارے مخالف کو اس کے سامنے ٹھہرنے ہی نہ دیتے تھے۔ ہاں! ایک دوست ایسا ضرور تھا جسے زیر کرنے میں اسے دانتوں پسینا آجاتا۔ 'سوہن تیلی' اس کے لیے بہت کڑا مقابل ثابت ہوتا۔ وہ دونوں بچپن کے دوست تھے اور اکھاڑے کی اس جنگ نے اس دوستی کو کئی گنا گہرا کر دیا۔

وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا اور اسی مزاج و مشاغل کے ساتھ جگت سنگھ نوجوانی کی سرحد میں آن پہنچا۔

وہ پنجاب کا گبرو نوجوان تھا۔

متوسط قامت، مضبوط کاٹھی، گندمی رنگت اور آزاد منش طبیعت نے اسے اپنے علاقے میں بہت مقبول بنا دیا۔ محض چودہ، پندرہ سال کی عمر میں اس کی اٹھان کسی بھرپور جوان مرد سے کم نہ تھی۔ گاؤں کی لڑکیاں اسے حاصل کرنے کے خواب سجائے آہیں بھرتیں تو نوجوانوں اور بچوں کو اس کے مشاغل و شخصیت بہت بھاتے۔ وہ دانستہ طور پر لباس، انداز و اطوار میں اس کی نقالی فخر سمجھتے۔

بھاگاں اب بڑھاپے کی یاس زدہ وادی کی مکین تھی۔ لکھن سنگھ کے بچھڑ جانے کے بعد زندگی مشکل ہی سہی لیکن بیت گئی تھی اور اب مادرانہ جذبات سے مغلوب اس نے اکلوتے بیٹے کے سر پر سہرا سجانے کا فیصلہ کر لیا۔

جگت سنگھ سے شادی کا قرعہ فال نزدیکی گاؤں 'کل ونڈی' کی ایک مٹیار 'اندر کور' کے نام نکلا۔ اس شادی سے جگت خود بھی بہت خوش تھا۔ کامنی وجود اس کی خوشنودی کے لیے بے چوں چرا تمام احکام تسلیم کرتا تو اسے ایک بے عنوان سرشاری شرابور کیے رکھتی۔

شادی کے بعد بھی جگت سنگھ کے مشاغل میں رتی بھر فرق نہ آیا۔ معاشی آسودگی کے باعث اسے روزگار کی بھی کوئی فکر نہ ہوتی۔ دس مربع (250 ایکڑ) زمین پر ملازمین

ایمانداری سے اپنا کام کرتے۔ آمدن سے ان کا حصہ نکالنے کے بعد بھی ان کے یہاں ریل پیل میں کوئی کمی نہ آتی۔

وہ ہر لحاظ سے اپنی زندگی میں مطمئن تھا۔ مگر یکے بعد دیگرے چند واقعات نے ایک نیا تلاطم پیدا کر دیا۔

☆☆☆

شادی کے بعد جگت سنگھ کے لیے تل ونڈی میں اپنے سسرالی رشتہ داروں سے میل ملاپ ناگزیر تھا۔ اس گاؤں میں 'نکائیوں' کے لڑکے بہت اودھم مچائے رکھتے۔ اس خاندان کا تعلق 'مہاراجا رنجیت سنگھ' سے بھی تھا جس کے باعث وہ ہمیشہ کھل کھیلتے۔

'برج رن سنگھ' اور 'تل ونڈی' کے درمیان ایک پل موجود تھا جسے عرف عام میں کچا پل کہا جاتا۔ نکائیوں کے سبھی لڑکے اس علاقے کے بے تاج بادشاہ تھے۔ ان کی اجازت کے بغیر کوئی بھی وہ رستہ عبور نہ کر سکتا تھا۔

شادی کے بعد اندر کور کے والدین اسے کچھ روز کے لیے اپنے ساتھ لے گئے اور رواج کے مطابق جگت سنگھ اسے واپس لانے کے لیے بڑے کروفر سے روانہ ہو گیا۔ کچے پل سے گزرتے ہوئے وہ یکدم اس کے سامنے آ گئے۔ مخصوص علاقائی لباس میں ملبوس وہ چھ بھائی آفت کے پرکالے تھے۔

''کدھر کی تیاریاں ہیں شریمان! ذرا اپنا پریچے (تعارف) تو کروائیے ہمیں!''

''کمال ہے! اپنے جیجا جی (بہنوئی) سے واقف نہیں تم لوگ۔'' وہ طنزیہ مسکراہٹ اچھالتے ہوئے بولا جو مخالفین کو سلگا گئی۔

''اس پل سے گزرنے کے لیے ہماری آگیا لازم ہوتی ہے۔''

''مجھے اپنے رستے خود بنانے آتے ہیں بھولے بادشاہ! اس لیے مجھ سے الجھنے کا خیال اپنے دل سے نکال دو تو بہتر ہے۔'' اس کی بے خوفی انہیں مزید طیش دلا رہی تھی۔

''دیکھ لیتے ہیں کتنے پانی میں ہو تم! آج یہاں سے سلامت واپس نہیں لوٹو گے۔''

''شوق سے دیکھو۔ بلکہ اپنے مزید درجن بھر تعلق داروں کو بھی بلوا لو۔ کیونکہ تم لوگوں کو تو میں ایک چٹکی میں مسل دوں گا۔''

اس کی ہرزہ سرائی ان کے ضبط کا پیمانہ لبریز کر گئی۔ سب سے بڑے بھائی نے ہاتھ میں پکڑی ڈانگ (بانس سے بنا ہوا قدرے طویل ڈنڈا) سے گھوڑے کی ٹانگ پر شدید ضرب لگائی۔ گھوڑا اپنے سوار سمیت زمین بوس ہو گیا۔

جگت کے زمین پر گرتے ہی ان سب بھائیوں نے اسے اپنے نرغے میں گھیر لیا۔ اس نے پل بھر میں ساری صورت حال کا جائزہ لیا اور بجلی کی سی تیزی سے اپنی کرپان نکال لی۔ جگت کی پھرتی اور چابکدستی کے سامنے وہ نصف درجن افراد محض چند منٹ ہی اس کے سامنے ٹھہر پائے۔ بے جگری سے اپنا دفاع کرتے اس نے تن تنہا 'تل ونڈی' کی دہشت سمجھے جانے والے ان بھائیوں کو خاک چٹا دی۔

جگت سنگھ کی شہرت دور دور پھیلنے لگی۔ اس کے وہ مخالفین اپنی ہزیمت کے بعد بہت رسوائی کا شکار ہوئے اور راتوں رات لاہور میں روپوش ہو گئے۔

اس واقعہ کی دھول ابھی بیٹھی ہی نہ تھی کہ اس کی ذات سے ایک اور قصہ منسوب ہو گیا جس نے اس کی شہرت میں مزید اضافہ کر دیا۔

اسے اپنی جایداد کے ملکیتی کاغذات درکار تھے۔ چار و ناچار پٹواری سے رجوع کرنا پڑا۔ اس زمانے میں پٹواری حضرات ناک پر مکھی بیٹھنے نہ دیتے تھے۔ سائل کو اپنی مطلب براری کے لیے جانے کتنی جوتیاں گھسانی پڑتیں۔ جگت سنگھ کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا گیا۔ اس نے متعلقہ ریکارڈ کی چھان بین کرنے سے انکار کر دیا۔ جگت نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اس پٹواری کے دفتر میں کسی صحرائی بگولے کی مانند تمام تر کاغذات کا نقشہ ہی بدل دیا۔ اس پر اطمینان نہ ہوا تو اسے چار چوٹ لگائی۔

آس پاس کے سبھی علاقوں میں اس کی بہادری، بے خوفی اور اپنے حقوق کے لیے انگریز انتظامیہ کے سرکردہ ناخداؤں سے بھڑ جانے کی اس صلاحیت کو حسد و رشک کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

اگلے چند سالوں میں روپ سنگھ اور بھاگاں اسے داغ مفارقت دے گئے تو قدرت نے ایک بیٹی کی رحمت سے بھی نوازا۔ 'گلاب کور' نامی اس بچی سے جگت سنگھ جبلی طور پر بہت محبت کرتا تھا۔

بہنوں کی شادیاں احسن طریقے سے کر دی گئیں۔ اس کی سرکش سرگرمیوں میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا چلا گیا اور اسی کشمکش میں اس نے اپنی زندگی کی تمیس بہاریں دیکھ لیں۔

☆☆☆

حیات کے اس کٹھن اور لمحہ بہ لمحہ رنگ بدلتے مدار میں کبھی کوئی پل ایسا بھی در آتا ہے جو سالہا سال سے قائم شناخت پس پشت ڈالے زندگی کے اس اسٹیج پر ایک نیا کردار سونپ دیتی ہے۔ اور یہی کردار ایک انمٹ شناخت بن کر گردو پیش پر نا قابلِ تغیر نقوش چھوڑ دیتا ہے۔

جگت سنگھ کی زندگی میں بھی وہ پل چپکے سے چلا آیا۔ اس کی شہرت ہی اس کی سب سے بڑی دشمن ثابت ہوئی۔

یہ وہی وقت تھا جب برطانوی راج میں مقامی نوجوانوں کو دباؤ میں رکھنے کے لیے غیر منصفانہ اور متعصب احکامات صادر کرنے میں مگن تھا۔ ماضی میں نظام لوہار ملنگی اور ان جیسے ہزارہا نوجوانوں سے زچ ہونے کے بعد اب وہ بغاوت کو نقطۂ آغاز پر ہی کچلنے کے درپے تھے۔ آزاد منش اور دلیر افراد پر گہری نظر رکھی جاتی۔ مقامی انتظامیہ کو ان کی سرگرمیوں میں رتی بھر تشکیک پر فوری کارروائی کرنے کا حکم تھا۔

جگت سنگھ کے گاؤں کا ذیلدار بھی انھی افراد میں شامل تھا جو گورا صاحب کے نمک حلال تھے۔ برطانوی نظام ہی در حقیقت نوجوانوں میں باغیانہ سرکشی پیدا کرنے کا ذمہ دار تھا۔

ذیلدار اس کی شہرت سے حسد و جلن رکھتا تھا۔ وہ ان افراد میں سے تھا جو سانپ کو سر اٹھانے سے قبل ہی کچل دینے کے قائل تھا۔ اس لیے باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت جگت کو ایک جھوٹے مقدمہ میں پھنسا کر چار سال کے لیے جیل بھیج دیا گیا۔

اس مقدمہ کی تفصیلات کا ذکر تاریخی حوالوں میں کہیں بھی موجود نہیں ہے۔ تاہم مستقبل میں پیش آنے والے چند واقعات کی بناء پر قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہ چوری چکاری یا قانون شکنی کا معاملہ تھا۔ (اگر اس وقت غیر جانبداری سے مذکورہ مقدمہ کی تحقیق ہوتی تو چوری بعید از منطق ثابت ہوتی کیونکہ جگت سنگھ کی معاشی خوشحالی مسلمہ تھی)۔

جیل میں گذارے گئے چار سال اس کے سرکش ذہن میں باغیانہ خیالات کی آبیاری کرتے رہے۔ بیرونی دنیا میں ہونے والے واقعات کی چیدہ خبریں سوہن تیلی کے توسط مل جایا کرتیں۔ جرم بے گناہی کی سزا نے اس کے وجود میں آتش فشاں دہکا رکھے تھے لیکن خلافِ طبع وہ تحمل سے رہائی کا انتظار کرتا رہا۔

☆☆☆

قید سے چھٹکارے کے بعد جب وہ اپنے خاندان میں واپس لوٹا تو ایک بدلا ہوا انسان تھا۔

لاشعوری خیالات کے تحت وہ انگریزی نظام کے ستائے افراد کی مالی و اخلاقی مدد میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتا اور یہ کوشش اس کے گلے کا پھندا ثابت ہوئی۔ اس کی سابقہ شہرت کے پیشِ نظر ان سرگرمیوں نے ذیلدار کو مزید بوکھلا دیا۔ وہ جانتا تھا کہ جگت سنگھ اسے کبھی بھی معاف نہ کرے گا۔ کچھ سوچ بچار کے بعد اس نے ایک اور منصوبہ ترتیب دے دیا اور شومئی قسمت اسے ایک فوری موقع بھی میسر آ گیا۔

انھی دنوں ایک قریبی گاؤں بھائی پھیرو میں ایک با اثر شخصیت کے گھر میں چوری کی واردات پیش آ گئی۔ ذیلدار نے اپنے ہم خیال انسپکٹر اصغر علی کے ساتھ جگت سنگھ کو ملوث کرنے کا فیصلہ کر کے ایک اہلکار کو اس کے پاس روانہ کر دیا۔

اس روز وہ اپنے چند رشتہ داروں اور قریبی ساتھیوں کے ساتھ فصلی مسائل کے کچھ معاملات پر گفتگو میں مشغول تھا۔ اہلکار کی آمد نے اس کی پیشانی کے بلوں میں اضافہ کر دیا۔

''میری یاد کیسے آ گئی سنتری بادشاہ!'' وہ الفاظ چباتے ہوئے بولا۔

''بڑے صاحب نے تمہیں کل بلایا ہے تھانہ میں!''

''کیوں بھئی؟ انہیں کیا افتاد آن پڑی؟'' سوہن تیلی کے تیور بدلے۔

''یہ تو اپنے اس سورما دوست سے پوچھو..... بھائی پھیرو میں مال لوٹ کر کہاں بندر بانٹ کی ہے؟''

''اب کیا پھر کوئی نیا منصوبہ گھڑ لیا ہے ذیلدار اور اصغر نے؟'' جگت تلخی سے بولا۔

''چور ہمیشہ یونہی شور مچاتا ہے۔ خاموشی سے تھانے میں حاضری دے دینا کل..... ورنہ یہیں سے گھسیٹ کر لے جائیں گے تجھے۔''

اس اہانت پر جگت سنگھ اس اہلکار کی گردن دبوچنے کے لیے ایک جھٹکے سے اٹھا لیکن اس کے ساتھیوں نے موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے اسے اپنے نرغے میں لے لیا۔

اہلکار کی روانگی کے کچھ ہی دیر بعد وہ محفل مختلف

آوازوں اور تجاویز کا اکھاڑہ بن گئی۔

"ہم جانتے ہیں کہ تو نردوش (بے قصور) ہے اس لیے اصغر علی سے ملنے میں کوئی حرج نہیں۔" ایک رشتہ دار دولا سنگھ نے اسے تحمل سے کہا۔

"نردوش تو میں پچھلی مرتبہ بھی تھا چاچا! تو پھر کس جرم میں میری زندگی کے چار سال ضائع کر دیے گئے؟" وہ پھٹ پڑا۔

"ہم کسی بااثر شخصیت کو اطلاع دے کر تجھے خود ساتھ لے جائیں گے۔ اس بار کسی کو انیائے کا موقع ہی نہیں دیں گے۔" کیہار سنگھ نرمی سے بولا۔

"رہنے دو یار! رہنے دو! فرنگیوں نے ہر جگہ اپنے پنجے گاڑ رکھے ہیں۔ یہاں طاقت صرف اسی کے پاس ہے جو ان کا نمک حلال ہے۔ میرا ساتھ دے کر وہ اپنے آقاؤں کو نراش (خفا) کیوں کریں گے؟ جو ان کا سنگی نہیں' اس کے پاس کوئی اختیار نہیں۔" اس نے حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا۔

"تو کیا کرنا چاہتے ہو تم؟ کیا ان سے ٹکر لو گے؟" سوہن تیلی اس کا رمز شناس تھا۔

"اگر ایسی نوبت آئی تو یہ بھی کر گزروں گا سوہن! مگر اب انگریزوں اور ان کی جی حضوری کرنے والوں کا کوئی بھی ناٹک میں پھل (کامیاب) نہیں ہونے دوں گا۔" اس کے لہجے میں گزرے ہوئے کٹھن وقت کی تپش تھی۔

یہ بحث بہت دیر چلتی رہی اور بالآخر اس کے خیر خواہ اسے قائل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔

اگلے روز وہ بظاہر خاموشی سے ان کے ساتھ روانہ ہو گیا لیکن اس کے دل میں ایک طوفان کروٹ لے رہا تھا۔ اصغر علی کی تشدد پسند فطرت اور سازشی روابط بھی اس کے گرد بنے جانے والے جال کا واضح عندیہ دینے لگے۔ اس نے رستے میں اپنے گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں۔

"اب کیا ہوا؟ کہیں ارادہ پھر تو نہیں بدل لیا؟" نہال سنگھ نامی ایک عزیز نے استفسار کیا۔

"میرا اصغر علی سے نہ ملنا ہی بہتر ہے۔ ورنہ اگر اس نے کوئی بھی ہیر پھیر کی تو وہاں خون خرابہ ہو جائے گا۔" وہ کسی فیصلہ پر پہنچ چکا تھا۔

اس کے عقب میں خاموشی سے آنے والے پولیس اہلکار بھی کشمکش میں مبتلا ہوگئے۔ انہیں بہر صورت جگت سنگھ کو تھانہ میں پیش کرنے کا حکم تھا۔ جگت سنگھ اپنے اس تعاقب سے باخبر ہوگیا تھا۔ اس نے اہلکاروں کو کامیابی سے جل دیا اور ننکن پور گاؤں کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس علاقہ میں اس کی مڈبھیڑ آتما سنگھ سے ہوگئی۔ جگت نے اس کی رائفل چھین کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔

وہ لمحہ اس کی زندگی یکسر تبدیل کر گیا اور سردار لچھمن سنگھ کا اکلوتا سپوت قانون کے کاغذات میں 'جگا' کی شناخت حاصل کر کے اندھیری راہوں کا مسافر بن گیا۔ اپنے ملک میں رائج قوانین اور نظام معاشرت نے اسے بھی 'باغی' بنا دیا۔

☆☆☆

آتما سنگھ کو قتل کرنے کے بعد وہ کچھ عرصہ کے لیے روپوش ہوگیا۔ یہ دورانیہ اس کی آیندہ زندگی کے لائحہ عمل کی تشکیل کے لیے بہت اہم تھا۔ حکومتی نظام اور برطانوی قانون کے علمبردار پولیس اہلکاروں سے اسے نفرت ہو چلی

تھی۔ بیرونی دنیا کی سرگرمیوں سے ناتا جڑنا اب دشوار تھا۔ قانون کی نظر میں وہ ایک مفرور قاتل تھا۔ ذیلدار، اصغر علی اور جانے کتنے فرنگی گماشتے اس کے خون کے پیاسے بن چکے تھے۔ بقاء کی اب صرف ایک ہی صورت تھی...... اور جگت سنگھ نے اسی راستے پر چلنے کا فیصلہ کرلیا۔

یہ وہی دور تھا جب ملنگی اور ہرنام سنگھ جیسے اور بھی کئی جوان اپنی آتش انتقام کی تسکین کے لیے ہتھیار اٹھائے پنجاب کی سرزمین اپنے گھوڑوں کے سموں تلے روندتے اور فرعونیت زدہ بااختیار لوگوں کا مال ومتاع لوٹ کر اسے مستحق لوگوں کے سپرد کر دیتے۔ جگا نے بھی خود کو اسی آتش میں جھونک دیا۔

اس نے اپنی پہلی مہم سے ہی اپنے عزائم آشکار کردیئے۔ جھنڈا سنگھ نربل اور ٹھاکر سنگھ منڈیالی نامی دو ساتھیوں کے ہمراہ اس نے لاہور اور قصور کی سرحد پر واقع ایک گاؤں میں سنار کا مال ومتاع لوٹ لیا۔

جھنڈا اور ٹھاکر اس مہم کی کامیابی پر بہت پُر جوش تھے۔ گھنے جنگل میں روپوشی کے دوران وہ شراب سے دل بہلاتے حاصل کردہ مال کے حصے بخرے کرنا چاہتے تھے۔ جگا نے ایک مناسب حصہ الگ کرنے کے بعد باقی ماندہ مال اس علاقے کے غریب طبقہ کو دینے کا فیصلہ کرلیا۔

''کچھ زیادہ ہے یہ مال جگے! اپنے لیے اور نکال لیتے اس میں سے۔'' ٹھاکر نے دبے لفظوں میں اعتراض کیا۔

''نہیں! جو حصہ طے ہو چکا ہے اس میں ایک انچ بھی تبدیلی نہیں آئے گی۔ طاقت کے نشے میں چور ان لوگوں کی جمع پونجی سے غلاموں کی طرح حقیر کیچوؤں جیسی زندگی گذارنے والوں کو تقویت ملے گی۔ پھر کوئی امیر رہے گا نہ غریب...... طاقت کا توازن ہر طرف برابر ہوگا۔'' اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔

اس کے بعد جگا نے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ ذیلدار، بنیے اور ساہوکار اس کے نام سے ہی پناہ مانگتے تھے۔ وہ لومڑی کی طرح عیار، چیتے کی طرح پھرتیلا اور بھیڑیئے جیسا سفاک تھا۔ اپنے اہداف کے لیے کسی بھی قسم کی نرمی نہ برتتا۔ اور ہر مہم سے فراغت پاتے ہی وہ بے بسی اور ظلم کے شکنجے میں جکڑے عوام کے لیے مجسم رحم دلی بن جاتا۔ سود اور دیگر قرضہ جات کے قانونی کاغذات نذر آتش کرنا اس کا بھی پسندیدہ مشغلہ بن چکا تھا۔

ان افراد کی تباہی کے علاوہ اسے پولیس اہلکاروں کا شکار کھیلنا بہت مرغوب تھا۔ اس کی سفاکی و وحشت ایک مثال بننے لگی۔ قتل، سرگرمیوں اور قانون شکنی کے باوجود عوام میں اس کی مقبولیت مسلمہ تھی۔

قافلے چلتے گئے' کارواں بڑھتے گئے۔ اس کے گروہ میں بنتا سنگھ' باوا' سوہن تیلی' بھولو اور لالو نائی کی آمد نے اس باغی جتھے میں ایک نئی روح پھونک دی۔

جگا کی قائدانہ صلاحیتوں کے وہ بھی معترف تھے۔ اس کے تفویض کردہ امور وہ برضا ورغبت سرانجام دیتے۔ اس گروہ میں 'لالو نائی' کا کردار بہت اہم تھا۔ وہ ان کے لیے کھانے پکانے کا بندوبست کرتا تو رات کے وقت رائفل بدست ان کا پہریدار بھی ہوتا۔ لوٹ مار کا یہ سلسلہ اب صرف دو ہی صورتوں میں رک سکتا تھا۔ جگا کی گرفتاری یا موت......

☆☆☆

پولیس اسٹیشن کا ماحول بہت تناؤ زدہ تھا۔

افسران بالا نچلی سطح کے اہلکاروں کی پے در پے سفاکانہ اموات سے شدید خائف تھے۔ ماضی ہی کی طرح ایک بار پھر سازشی جوڑ توڑ شروع ہوگیا۔ ڈی۔ ایس۔ پی کو اس معاملہ میں بہرحال ایک اہم برتری حاصل تھی۔ ٹھاکر سنگھ نامی ریڈر جگا کا رشتے میں بھتیجا تھا۔ اسے اپنے دفتر میں طلب کرنے کے بعد اس نے محتاط الفاظ میں تمہید باندھی۔ ''ٹھاکر سنگھ! قانون کو تمہاری ضرورت آن پڑی ہے۔ میں تمہیں آؤٹ آف وے ایک کام سونپنا چاہتا ہوں۔''

''جو حکم مائی باپ! میں تیار ہوں۔'' ٹھاکر سنگھ اس اعزاز پر پھولے نہ سما رہا تھا۔

''جگا ڈاکو کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟'' وہ گہری نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

''آپ سے کیا چھپانا سرکار! وہ رشتے میں میرا چاچا لگتا ہے اور میں تو اسے تب سے ہی جانتا ہوں جب وہ صرف جگت سنگھ تھا۔''

''اور اب وہی جگت سنگھ جگا ڈاکو بن کر علاقے کے معززین کو لوٹنے لگا ہے۔ سید پور اور لائل پور اس کی ڈکیتیاں حکومتی انتظامیہ کے لیے بہت بڑا طمانچہ ہیں۔ پولیس اہلکار آئے دن اس کی سفاکی کا نشانہ بنتے ہیں۔'' ڈی۔ ایس۔ پی نے بے چینی سے ہاتھ مسلے۔

''چھوٹا منہ بڑی بات ہے جناب! لیکن اسے جگا

ڈاکو بنانے میں اسی پولیس ہی کا تو کردار ہے۔ ذیلدار کی بے جا دشمنی اور انسپکٹر اصغر علی سے گٹھ جوڑ نے اسے مجسم انتقام بنا دیا ہے۔ سرکش اور ضدی تو وہ پہلے بھی کم نہ تھا..... اب بالکل ہی جوالا مکھی بن چکا ہے۔''

''لیکن اصغر علی تو آج بھی زندہ ہے۔ اس کی بجائے وہ دیگر لوگوں کو موت کے جام پلا رہا ہے۔''

''جہاں تک میں اسے جانتا ہوں سرکار! وہ دانستہ اسے ڈھیل دے رہا ہے۔ ایذا رسانی اس کی فطرت میں شامل ہے۔ وہ اصغر کو موت سے قبل ہزار ہا اموات دے گا۔'' ٹھاکر سنگھ نے صاف گوئی سے کہا۔

''وہ ایک دلیر انسان ہے۔ اگر وہ ہمیں اپنی انھی صفات سے فائدہ پہنچائے تو اسے دولت سے مالا مال کر دیا جائے گا اور مجھے اسی سلسلہ میں تمہاری مدد درکار ہے۔'' اس نے چارا پھینکا۔ ''اس سے ایک ملاقات کرو اور میری یہ پیشکش من و عن بیان کر دو۔ میں تمام جرائم کی معافی دلوا کر جگا کو اس کے شایان شان مقام دلواؤں گا۔ اور اس کامیابی کے طفیل تمہارے لیے بھی مراعات کا خزانہ کھول دوں گا۔''

ٹھاکر سنگھ اس کے دام میں آ گیا۔ اس نے چند روز بعد جگا سے ملاقات کی اور سرکاری پیشکش اس کے سامنے رکھ دی۔

''تو کہیں چریا تو نہیں گئے ٹھاکر! سرکاری نوکری نے تیری خالصہ غیرت ختم کر دی ہے کیا؟ اپنے یہ پانچوں ککے اتار دے اور ان انگریزوں کی غلامی کا پٹہ پہن لے۔'' وہ غرایا۔

''ایسی بات نہیں ہے چاچا! اس کی بات پر ایک بار غور تو کر۔ تیرا ہی بھلا ہے۔'' وہ منمنایا۔

''انگریز اور ان کے حواری میرا بھلا کب سے چاہنے لگے؟ جس روز ان کا داؤ چلا یہ میرے جسم کا ہر ریشہ الگ کر کے میری بوٹیاں چیل کوؤں کو کھلا دیں گے..... مجھے دودھ پیتا بچہ نہ سمجھ۔ جانتا ہوں میں کہ تجھے بھی کوئی نہ کوئی ہڈی ڈالی ہوگی اس ڈی۔ ایس۔ پی نے۔ اب میرا بھی ایک سندیسہ لے جا اس کے پاس..... میں اس سے دوبدو مقابلہ کرنا چاہتا ہوں جو جیتا وہی سکندر ہوگا..... اس نے تجھے جتنی دولت دینے کا چارا ڈالا ہے اس سے دگنی مجھ سے لے لینا۔'' جگا کی آنکھوں سے جھلکتی سفاکی نے ٹھاکر کے جسم میں پھریری دوڑا دی۔

وہ خاموشی سے لوٹ آیا۔ ان دو طرفہ ملاقاتوں پر اسے اپنی نازک صورت حال کا پہلی دفعہ شدت سے احساس ہوا۔ وہ ہاتھیوں کی اس لڑائی میں مینڈک کی طرح پسنا نہیں چاہتا تھا اس لیے ڈی۔ ایس۔ پی سے اگلی ملاقات میں مایوسی اور بے بسی سے بولا۔ ''میں کوشش کے باوجود اس سے نہیں مل سکا۔ اس کے گھر والوں کو بھی اس بارے میں کچھ علم نہیں۔''

اس کی گھاگ نظریں ٹھاکر سنگھ میں تبدیلی بھانپ گئیں۔ اسے اپنے دفتر سے بھیجنے کے بعد وہ سنجیدگی سے اگلے منصوبے پر عمل پیرا ہونے کے لیے تیار ہو گیا۔

پولیس کے خصوصی ایلچی گاؤں در گاؤں بھیج دیئے گئے جو ایک جانب عوام کو جگا ڈاکو کی گرفتاری کا معاون بننے کے لیے ترغیب دیتے تو دوسری جانب اس کے قریبی رشتہ داروں اور ساتھیوں کو ہراساں کرنے لگے۔ مقصد صرف اس کی زندہ یا مردہ گرفتاری تھا۔

اپنے احباب کی یہ تذلیل جگا کے لیے ناقابل برداشت تھی اس نے بھی اپنے گروہی ساتھیوں سے صلاح مشورہ کیا اور ایک تحریری پیغام پتھر میں لپیٹ کر مقامی پولیس اسٹیشن میں پھینک دیا۔

''جگت سنگھ عرف جگا تمہیں قول دیتا ہے کہ آئندہ اپنی ہر مہم کی پیشگی اطلاع فراہم کروں گا اگر بازوؤں میں دم ہو تو مجھے گرفتار کرنے کا شوق پورا کر لینا۔ اپنی طاقت کی بے بس اور کمزور لوگوں پر آزمائش ترک کر دو۔ براہ راست مجھ سے مقابلہ کرو اور ہاں! جب مجھے گرفتار کرنے آؤ تو کفن اور تابوت ضرور تیار رکھنا۔ میں اس مقابلہ میں بیراج کو خالی ہاتھ لوٹا کر زیادتی نہیں کروں گا اور جب بھی جہاں بھی جیسی بھی حالت میں پلسیے (پولیس کے لیے استعمال ہونے والا ایک پنجابی لفظ) میرے سامنے آئے میں انہیں اسی پل موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔''

اس کا پیغام حکومتی ایوانوں اور پولیس فورس میں ایک ہنگامہ برپا کر گیا۔ قانون کے رکھوالے بری طرح خوف و ہراس میں مبتلا تھے۔ جگا کی دہشت کا یہ عالم تھا کہ اہلکاران رات کے وقت تھانے میں حوالات کے مقفل دروازوں کے عقب میں سوتے۔ اور اصغر علی کی ہیبت تو کبھی سے جدا تھی۔ اس نے اپنے خصوصی اختیارات استعمال کرتے ہوئے تھانہ میں دو داخلی دروازے بنوائے اور اپنے ذاتی محافظوں کی تعداد میں بھی اضافہ کر دیا۔

جگا افسانوی کردار بن چکا تھا۔

وہ دشمنوں کے لیے فولاد اور اپنے قریبی ساتھیوں کے لیے موم تھا۔ ان کے ذاتی مسائل حل کرنے کے لیے اپنی سر توڑ کوشش کرتا۔ سوہن تیلی کے علاوہ اگر کسی نے اسے اپنی پُرخلوص دوستی، بے جگری سے متاثر کیا تھا تو وہ بنتا سنگھ تھا۔

بنتا سے اس کے تعلقات بہت گہرے تھے۔ وہ اس کی جنبشِ چشم سے مزاج کا ہر رنگ بھانپ لیا کرتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ جاڑوں کی ٹھٹھری شاموں میں اس کی اداسی و چڑچڑاہٹ جگا سے پوشیدہ نہ رہ سکی اور وہ اسے گھیرے باقی ساتھیوں سے الگ درختوں کے ایک جھنڈ میں لے گیا۔

''دکھ بنتے! مجھ سے سچ چھپانے کی کوشش مت کرنا۔ تیری آنکھیں کم از کم مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتیں۔''

''میں بہت پریشان ہوں جگا! بلکہ یوں سمجھ لے میری غیرت پر ایک گہرا گھاؤ ہے جو مجھے پل پل بچھو کے ڈنک لگاتا ہے۔''

''ذمہ دار کا نام بتاؤ بس مجھے۔'' رائفل پر اس کی گرفت سخت ہوگئی۔

''میری چاچی نے اپنے گاؤں کے بیراگی سے تعلقات بنا لیے ہیں۔ علاقہ میں رسوائیوں کے اشتہار لگ گئے ہیں۔ بہت سمجھایا ہے انہیں لیکن جانے کیسی پٹی بندھی ہے آنکھوں پہ قائل ہو کے ہی نہیں دیتی! وہ بیراگی بھی حکومتی ٹو سمجھا جاتا ہے۔''

''چل اٹھ! مجھے لے چل اس کے پاس۔ دیکھتا ہوں کیسے نہیں مانتی؟'' اس کی آنکھوں میں لہو اترا۔

بنتا سنگھ نے اس کی فرمائش پوری کردی۔ وہ خاتون گھر کے آنگن میں آگ کا الاؤ جلائے بے نیازی سے بیٹھی تھی۔ بنتا کے ساتھ ایک اجنبی کو دیکھ کر اس کی پیشانی شکن آلود ہوگئی۔

''یہ کس کو ساتھ اٹھا لائے ہو؟ اب پھر سے اپنا بھاشن (درس) مت شروع کر دینا۔''

''دیکھیں شریمتی جی! میں گھما پھرا کر بات نہیں کروں گا۔ آپ ہماری بزرگ ہیں۔ ایسی بے حمیت حرکات آپ کو زیب نہیں دیتیں۔'' جگا صاف گوئی سے بولا۔

''تم...... تم کون ہوتے ہو میرے گھر میں کھڑے ہو کر مجھے یہ پاٹ پڑھانے والے۔'' وہ آگ بگولا ہوگئی۔

''بس کردو چاچی! ایک تو چوری اوپر سے سینہ زوری۔ اس بیراگی سے بیاہ کرلے یا پھر اسے چھوڑ دے۔'' بنتا سنگھ بھی بے قابو ہوگیا۔

''کل کے چھوکرے اب مجھے یہ سمجھائیں گے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ نکل جاؤ میرے گھر سے ابھی۔ میں اسے نہیں چھوڑوں گی۔ ڈنکے کی چوٹ پر ملوں گی۔'' وہ ہٹ دھری سے کہتی کھڑی ہوئی اور اگلے ہی پل تیورا کر وہیں ڈھیر ہوگئی۔ جگا کی رائفل نے بارود اگل کر اس کا بے باک وجود موت کے منہ میں دھکیل دیا۔

بنتا سنگھ کے دل و دماغ پر اب بھی غیظ و غضب سوار تھا۔ وہ جگا کو ساتھ لیے بیراگی کے گھر پہنچ گیا اور للکارتے ہوئے گھر سے باہر آنے کے لیے پکارنے لگا۔ بیراگی ان کی آمد سے بہت ہراساں تھا۔ یقینی موت کے خوف سے وہ گھر کے اندرونی کمرے میں قفل لگائے بیٹھ گیا۔ اسے اپنے بل سے نکالنے کے لیے انھوں نے چھت میں موجود ایک سوراخ سے آتش گیر مادہ کمرے میں پھینک دیا۔ چوبی دروازے نارنجی شعلوں کی زد میں آگئے۔ آن کی آن میں گھر بھر کے مکین بیراگی کے کرموں کی اس سزا کی لپیٹ میں آگئے۔ دس بے گناہ افراد کی موت نے جگا کے وجود میں اداسی بھردی۔

اس حادثے نے اس کی سوچ میں کئی ایک تبدیلیاں پیدا کردیں اور وہ سنجیدگی سے بلوغت کی دہلیز پر کھڑی اپنی بیٹی کے مستقبل کی بابت سوچنے لگا۔ چند روز بعد وہ بھیس بدلے رات کی تاریکی میں اندر کور سے ملنے پہنچ گیا۔

''میں گبو کی شادی کرنا چاہتا ہوں اندر! کیہار سنگھ کے بھتیجے اوتار سنگھ سے رشتہ طے کر آیا ہوں۔ کیہار کا پریوار اسے کبھی بھی باپ کے نام سے رسوا نہیں کرے گا۔''

''اتنی جلدی کیوں جی؟ ابھی وہ بہت کم عمر ہے۔'' وہ بوکھلا گئی۔

''ڈکیت کی زندگی بہت مختصر ہوتی ہے پگلی! میرے دشمن بہت کم ظرف ہیں۔ بہن بیٹیوں کی عزت کا انہیں کوئی پاس نہیں۔ میں اپنی نظروں سے اسے محفوظ ہاتھوں میں سونپنا چاہتا ہوں۔''

''آپ شریک ہوں گے کیا گبو کی شادی میں؟''

''میری پرچھائیں بھی یہاں پڑی تو قانون کے رکھوالے خون کی ہولی کھیلنا شروع کردیں گے۔ میں جہیز کا سامان اور گہنے بھیج دوں گا۔ تم بس بیٹی کی رخصتی کی تیاری کرو۔'' وہ اسے تسلی دیتا ہوا وہاں سے لوٹ آیا۔

گلاب کور کی شادی سادگی اور بخیر و عافیت انجام پا گئی۔ جگا نے اپنے وعدے کے مطابق اسے تمام تر ساز و سامان بھجوا دیا مگر شرکت کی آرزو کے باوجود ضبط کیے جنگل میں

میں اپنے مخصوص ٹھکانے میں روپوش رہا۔

کسی کو بھی مشکل میں مبتلا دیکھ کر وہ اسے اخلاقی، مالی تعاون فراہم کرنے سے گریز نہ کرتا۔ خواتین کی عزت و احترام کے کئی واقعات بھی آج بھی پنجاب کے لوک گیتوں میں محفوظ ہیں۔ اس نے متعدد بے بس قیدی عورتوں کو برطانوی چنگل سے رہائی دلوائی جن میں ایک خاتون نے اسے اپنا منہ بولا بھائی بنا کر ان کے خفیہ ٹھکانے پر دسترخوان لگانے اور برتن مانجھنے کی ذمہ داری بخوشی نبھائی رہی۔

اسی ضمن میں ایک اور واقعہ بھی بہت مشہور ہے۔ ایک ساہوکار کی تجوری لوٹنے کے بعد وہ ڈھیروں سونا لیے واپس لوٹ رہا تھا کہ تنت سردی میں پھٹے پرانے چیتھڑے لپیٹے ایک عورت کو برہنہ پا گاجریں فروخت کرتے دیکھ کر اپنے گھوڑے کی لگام کھینچ لی۔ کچھ دیر گفتگو کے بعد اسے عورت کی عسرت زدہ زندگی اور بےکسی کا اندازہ ہوا تو فوری طور پر اپنے پاس موجود طلائی زیورات اس کے سپرد کیے اور بے نیازی سے اپنی راہ لی۔

☆☆☆

وقت کی ریت بند مٹھی سے پھسلتی رہی۔ جگا کے مزاج میں بھی دھوپ چھاؤں کا وہی عالم رہا۔ امیر با اختیار اور مقتدر طبقہ کو لوٹنے کے بعد وہ غریبوں کے آنگن میں خوشیوں کی فصل بہار لے آتا۔ انہی دنوں اسے قریبی گاؤں میں ملنگی اور ہرنام سنگھ کی موت کی خبر ملی۔ فتح محمد کی انگریز نوازی نے اسے آگ بگولا کر دیا۔ ملنگی کے خاندان پر ٹوٹنے والی قیامت اور ان کے کارناموں سے وہ بے خبر نہیں تھا۔ وہ ان دونوں بھائیوں کی جدوجہد اور جذبات کا دلی معترف تھا۔

ساتھیوں سے صلاح مشورے کے بعد وہ انہیں ہمراہ لیے ملنگی کی والدہ سے ملاقات اور تعزیت کے لیے روانہ ہوا تو اس بات سے بالکل لاعلم تھا کہ ایک ان چاہا مہمان بھی ان کا ہمراہی بن گیا ہے۔

☆☆☆

وہ بوڑھی نابینا عورت چہرے پر بے انتہا کرب سموئے درخت کی چھاؤں میں بیٹھی تھی۔ اس کی حالت زار دیکھ کر جگا کے دل میں دکھ نے نشتر زنی کر دی۔ وہ اپنی تمام تر اکھڑ مزاجی بھول گیا اور اس کے قریب پہنچ کر مودبانہ انداز میں گفتگو کرنے لگا۔

وہاں گزرنے والے چند گھنٹوں میں اس خاتون کے لبوں پر مسکراہٹ چھب دکھلانے لگی اور اس کی آواز میں پہلی مرتبہ زندگی کی رمق محسوس ہوئی۔

”مجھے تیرے وجود میں اپنے ملنگی کی خوشبو پہنچتی نظر آ رہی ہے پترا!“

”مجھے اپنا بیٹا ہی سمجھو بے بے! میں دلی طور پر ملنگی کی موت کا انتقام لینا چاہتا ہوں اور جانے مجھے بھی کیوں ایسا لگتا ہے کہ اس کے قاتل کو نرک میں پہنچا دیا تو میرے ان دونوں بھائیوں کے سبھی گلے شکوے دور ہو جائیں گے۔“ اس نے ایک عزم سے کہا۔

”کتنی دیر قیام کا ارادہ ہے یہاں؟“ سوہن تیلی نے بھی مسکرا کر پوچھا۔

”آج میں دوپہر کا بھوجن اپنی ماتا جی کے ساتھ ہی کروں گا۔ اس کانے (یک چشمی) لالو تائی کو کھانا بنانے کا کہہ دو۔“ لالو کی ایک آنکھ میں قدرتی معذوری اکثر یونہی ساتھیوں میں چھیڑ چھاڑ کا سبب بنی رہتی تھی۔

تھوڑی ہی دیر بعد میلے چیکٹے کپڑوں اور بوسیدہ پگڑیوں میں ملبوس چند افراد کھانے کے لیے تمام لوازمات لالو تائی کو تھما گئے۔ باتوں میں مگن جگا اور سوہن ان کی آنکھوں کے مبہم اشارے بھانپ نہ سکے۔ لالو نے برق رفتاری سے کھانا چولہے پر پکنے کے لیے دھر دیا اور سامان میں موجود دختر انگور لیے ان کے پاس چلا آیا۔

”کھانا بننے میں کچھ وقت لگ جائے گا استاد جی! حلق تر کرنے کے بارے کیا خیال ہے؟“ وہ چہرے پر مسکینی طاری کیے بولا۔

”نیک خیال ہے۔ ماتا جی اندر کمرے میں ذرا دیر آرام کے لیے گئی ہیں۔ ان کی موجودگی میں ہمارا یوں پینا پلانا مناسب نہیں لگتا۔“ بنتا سنگھ نے تائید کی۔

”یہیں لے آ سب سامان۔ آج تو میرے بھی دل کی ترنگ نرالی ہے۔“ جگا نے سرشاری سے کہا۔

لالو کے انداز میں مزید پھرتی در آئی۔ وہ لپک کر باورچی خانہ میں پہلے سے تیار ایک ٹرے اٹھا کر لایا تو سوہن تیلی کہیں روانگی کے لیے پر تول رہا تھا۔

”کدھر کی تیاری ہے سوہن؟“ وہ ٹھٹک گیا۔

”اپنے ایک عزیز سے ملنے جا رہا ہوں۔ آج جانے کیوں اپنوں کی یاد بہت ستا رہی ہے۔ تم لوگ کھانے پر میرا انتظار نہ کرنا۔“ وہ افسردہ تھا۔

اس کی روانگی سے قبل ہی جگا اور دیگر ساتھی مے نوشی میں مشغول ہو گئے تھے۔ شراب کا ذائقہ بھی معمول سے

بہت تلخ تھا اور ایک ہی جام نے انہیں سرور میں مبتلا کر دیا۔ سوہن الوداعی معانقہ کے بعد رخصت ہو گیا۔

جگا اور اس کے سب ساتھی چند لمحوں میں اتنا غافل ہو گئے۔ درخت کے گھنے سائے میں چار پائی پر نیم دراز وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکے تھے۔ لالو نائی کے چہرے کی مسکینیت اب ایک شاطرانہ اور متنفر چمک میں ڈھل گئی۔ اس نے چپکے سے بیرونی دروازہ کھولا اور سبزی ترکاری لانے والے پانچ افراد فوری اندر چلے آئے۔

یہ پانچوں لالو کے بھائی تھے اور ان کے مابین جگا سنگھ اور اس کے ساتھیوں کو ٹھکانے لگانے کی منصوبہ بندی بہت عرصہ قبل ہی طے پا چکی تھی۔ وہ جانے کب سے ایسے ہی کسی موقع کا منتظر تھا۔ جگا کی برتری' دھونس' ساتھیوں کا اس کے جسمانی عیب پر ہر وقت ہنسی مذاق و چھیڑ چھاڑ دھیرے دھیرے اس کے دل میں نفرت و بغض کے تناور شجر کی آبیاری کرنے لگیں۔ انگریز حکومت کی جانب سے انعام و کرام کی ترغیبات بھی خوب من للچا تیں۔ اس نے اپنے بھائیوں سے مل کر پولیس کی مدد کرنے کی ٹھان لی تھی۔ مقامی تھانہ میں اس کا ایک بھائی لالو کی معیت میں بالا ہی بالا تمام معاملات بھی طے کر چکا تھا۔

لالو نے اپنے بھائیوں سے ہتھیار لیے اور چار پائی کے قریب جاتے ہی جگا سمیت سبھی پر فائر کھول دیے۔ اپنی اس کامیابی پر وہ خوشی و جوش سے بے حال ہونے لگا۔ پنجاب پولیس اور انگریزی راج کو خوف و ہراس میں مبتلا رکھنے والا جگا ڈاکو اپنے ہی خون میں لت پت جسم و روح کے رشتے سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے ایک بھائی کو تھانہ بھیج دیا اور سرشاری سے صحن میں ٹہلنے لگا۔

''یہاں گولیاں کس نے چلائی تھیں لالو! سب خیریت ہے ناں!'' سوہن تیلی کی تشویشناک صدا پر وہ یکدم بدک گیا۔

''تم ۔ تم واپس کیسے آ گئے؟''

''میں ابھی رستہ میں ہی تھا۔ بارود کے دھماکے سن کر پلٹ آیا ہوں..... یہاں اتنی خاموشی۔'' اسی پل خونچکاں لاشوں کی جھلک نے اس کے الفاظ کا گلا گھونٹ دیا۔ لمحے کے ہزارویں حصہ میں وہ لالو کا رچایا ہوا خونی ناٹک سمجھ گیا اور مغلظات کے آہنگ میں اس پر پل پڑا۔

لالو کے پاس موجود ہتھیار کے باعث یہ جنگ سوہن تیلی کی موت پر منتج ہوئی۔ پولیس اہلکار اپنے مجرموں کی لاشیں وصولنے اور سہولت کار کی پیٹھ ٹھونکنے چلے آئے۔ برطانوی سرکار کی جانب سے اسے دو مربع زمین کے ساتھ ایک اصیل گھوڑی عطا کی گئی۔

فرنگی راج کا ایک اور باغی اپنی ہی آستین میں پروردہ سانپ کے زہر کا شکار ہو گیا۔ پنجاب میں انگریزی قانون اور قانون کے رکھوالے اب بخیر و عافیت اور آزاد تھے۔

قلیل المدت میں دہشت کی علامت جگت سنگھ کی داستان کسی افسانوی کردار ہی کی مانند اپنے اختتام کو پہنچ گئی۔

☆☆☆

نظام لوہار' ملنگی اور ہرنام کے بعد جگت سنگھ بھی اپنوں کی بے وفائی کی بھینٹ چڑھ گیا۔ جگا کی عوامی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اس کی زندگی' کارنامے اور موت مکمل طور پر پنجابی شاعری کے قالب میں ڈھالی گئی ہے۔

اس داستان کے بقیہ کرداروں کا انجام بھی پنجاب کی دھرتی نے دیکھ لیا۔ لالو نائی کو کچھ ہی دن بعد حکومت نے ایک مقدمہ میں الجھا کر جیل بھیج دیا۔ اسے عطا کردہ زمین اور دیگر انعامات بھی واپس لے لیے گئے۔ لالو نے اپنے اس کارنامہ کی بدولت خاصی شہرت پائی تھی۔ پنجاب کے عوام جگا کی موت پر یقین کرنے کے لیے تیار ہی نہ ہوتے تھے اور اب ان کے دل میں اس موت کے اصل ذمہ دار کے خلاف غم و غصہ بے حد بڑھ گیا تھا۔

جیل میں موجود کچھ قیدیوں تک لالو کی یہ شہرت پہنچ گئی۔ انھوں نے دیگر ساتھیوں کی رضا مندی سے وہاں باہمی لڑائی کی صورت میں بلوے کا ماحول تخلیق کیا اور لالو کو ہلاک کر دیا۔ اس موت میں فطری رنگ بھرنے کے لیے اپنے ہی چند ساتھیوں کو زخمی کرنے میں بھی انھوں نے کوئی عار نہ سمجھا۔

جگت سنگھ کا خاندان اس کی موت کے بعد ایک طویل عرصہ تک جیا۔ اندر کور اور اوتار سنگھ کی وفات بالترتیب 1983 اور 2005 میں ہوئی جبکہ گلاب کور کی زندگی یا موت کے متعلق تاریخ خاموش ہے۔

اس کے قتل کے کئی سال بعد فرنگی راج بالآخر اپنے اختتام سے بغلگیر ہو گیا لیکن ستم ظریفی تو یہ ہے کہ برصغیر کی دونوں آزاد ریاستیں تا حال اسی نظام کی باقیات تلے دبی آج بھی ان گنت باغیوں سے برسرپیکار ہیں۔ ہاں' فرق صرف اتنا ہے کہ اب وہ اپنوں سے ہی نالاں ہیں۔

ستاروں کی دنیا

ابراهیم جمالی

آسمان پر چمکتے انگنت ستارے جو ہماری گلیکسی کا حصہ ہیں ان کے فوائد اور پہچان بہت ضروری ہے۔ ایسے ہی چند ستاروں کا تذکرہ، ایک مختصر سی معلوماتی تحریر۔
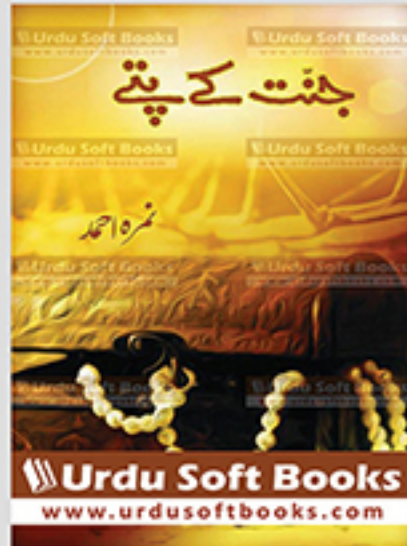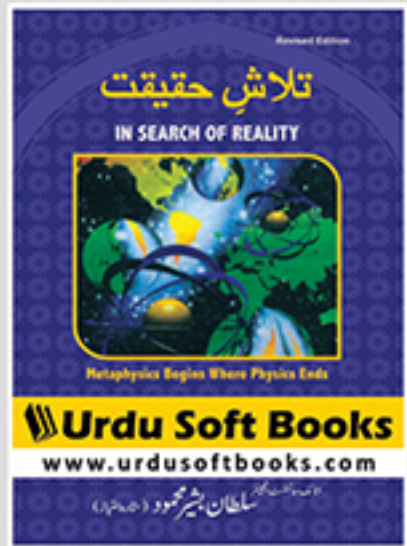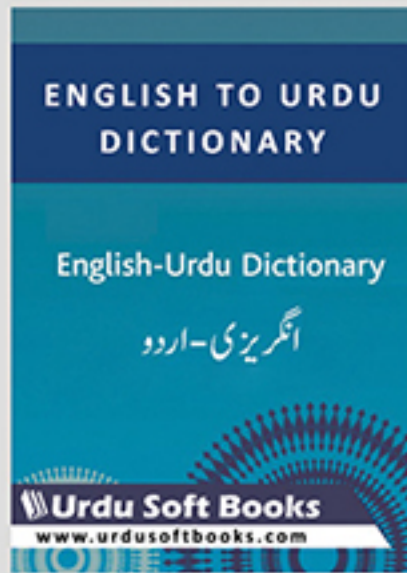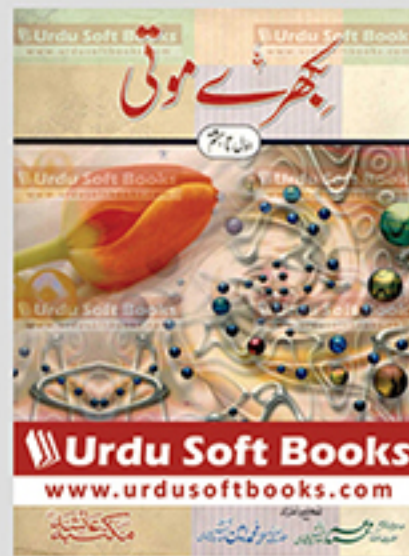
ستاروں اور سیاروں کا ذکر خاص

آسمان پر لاکھوں ستارے موجود ہیں۔ ہمیں دوربین کے بغیر بھی ہزاروں نظر آتے ہیں۔ چاند کی ہلکی روشنی میں بھی سینکڑوں نظر آتے ہیں۔ یہ تمام ستارے آسمان پر مختلف لیول پر ہیں۔ کچھ قریب اور کچھ بہت زیادہ فاصلے پر موجود ہیں۔ آسمان پر ہمیں کہیں کہیں بدلی کی طرح سفیدی سی نظر آتی ہے۔ دراصل وہ بدلی کا ٹکڑا نہیں بلکہ ہزاروں لاکھوں ستاروں کا جھرمٹ ہے لیکن بہت دور ہونے کے سبب تمام مل کر بدلی کی سفیدی کی طرح نظر آتے ہیں۔ اس کی بڑی مثال ہماری
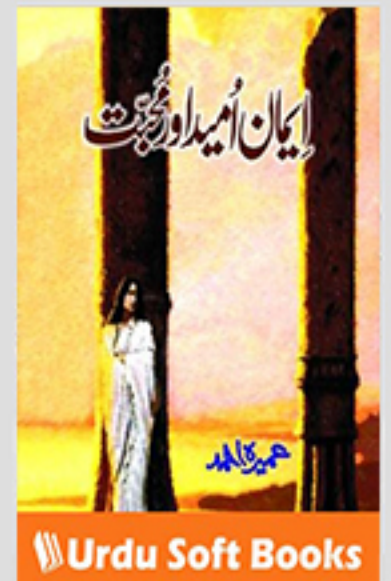
کہکشاں ہے اور ہمارا سورج گویا اس کا ایک فیملی ممبر ہے۔ جس کے گرد وہ گردش کرتا رہتا ہے۔ جن راتوں میں چاند آسمان پر موجود نہیں ہوتا تو ستاروں کی کچھ روشنی زمین پر پڑتی رہتی ہے لیکن کسی صحرا اور بیابان میں سفر کرنے والے کے لیے اور ہم جہازیوں کے لیے جو سمندر میں جہاز چلاتے ہیں جہاں دور دور تک کوئی نشانی یا سنگِ میل نصب نہیں ہوتا جس سے رہنمائی حاصل ہو سکے کہ ہم سمندر کے کس حصے میں موجود ہیں یا ہم نے کتنا سفر طے کرلیا ہے ایسے میں ستارے ہمارے لیے اہم اور بڑے مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

دنیا کے مختلف علاقوں میں مختلف ستارے نظر آتے ہیں۔ بعض ستارے دنیا کے شمالی نصف کرہ میں نظر آتے ہیں اور جنوبی نصف کرہ میں بھی لیکن کئی ستارے ایسے بھی ہیں جو ایک کرہ میں صاف اور واضح نظر آتے ہیں اور دوسری طرف دھندلے دکھائی دیتے ہیں۔ خاص طور پر افق پر موجود ستارے۔ بعض ستارے تھوڑی دیر کے لیے نظر آنے کے بعد غائب ہو جاتے ہیں اور کچھ ستارے رات کے خاصے حصے تک نظر آتے رہتے ہیں۔ زیادہ تر تمام ستارے سال کے مختلف حصوں میں نظر آتے ہیں اور زمین کے گول گھومنے کے سبب وہ ہمارے لیے غروب ہو جاتے ہیں لیکن شمالی قطبی ستارہ (Polaris) ایسا ہے جو پورا سال رات بھر گویا ایک جگہ ٹھہرا ہوا ہے۔ یہ ستارہ شمال کی سمت میں نظر آتا ہے۔ رات کے وقت کوئی مسافر صحرا میں بھٹک جائے یا کوئی نیند سے بیدار ہو کر سفر شروع کردے تو وہ شمالی قطبی ستارے کو دیکھ کر شمال کی سمت کا تعین کر سکتا ہے اس کے بعد دیگر سمتوں کا تعین آسان ہو جاتا ہے۔

سمندر میں جہاز کو اگر شمال کی سمت میں چلانا ہے تو اس ستارے کو سامنے رکھ کر ناک کی سیدھ میں سفر کرنا چاہیے اگر کسی اور سمت میں جانا ہے تو اتنی ڈگری دائیں یا بائیں میں چلنا چاہیے۔ اس ستارے کو قطبی ستارہ (Pole star) اور شمالی ستارہ (North star) بھی کہا جاتا ہے۔ اب عربستان میں بھی سڑکیں اور راستے تیار کیے جا چکے ہیں اور لوگ کاروں میں سفر کرتے ہیں۔ جو لوگ اونٹوں پر یا پیدل سفر کرتے ہیں۔ ان کی رہنمائی کے لیے بھی جگہ جگہ کئی نشانیاں موجود ہیں۔ آج کل مکہ سے مدینہ تو کیا، دمام اور الخبر سے یمن کے شہروں عدن اور صنعا تک ستاروں کی رہنمائی اور مدد حاصل کیے بغیر سفر کیا جاسکتا ہے۔ جب کہ صدیوں سے یہ عرب راستہ تلاش کرنے کے لیے عموماً دو ستاروں کا سہارا لیتے تھے۔ ایک یہی قطبی ستارہ جسے عرب الجدی یعنی بکرا کہتے ہیں اور دوسرا کینوپس (Canopus) ستارہ ہے جسے وہ سہیل کہتے ہیں۔ یہ دونوں ستارے ہماری شمالی نصف گول کی دھرتی سے روزانہ نظر آتے ہیں۔

قطبی ستارے کے مقابلے میں سہیل (Conopus) ستارہ کچھ کم درجہ رکھتا ہے۔ کیونکہ یہ بعد میں افق کے عقب میں غائب ہو جاتا ہے۔ کولمبس جہاز چلانے کے دوران قطبی ستارے پر زیادہ انحصار نہیں کرتا تھا۔ کیوں کہ اس وقت تک قطب نما (Compass) ایجاد ہو چکا تھا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس نے سمت کے درست تعین کے لیے قطبی ستارے کو بالکل نظر انداز نہیں کیا تھا۔ کیوں کہ قطب نما کی سوئی کسی وقت بھی اٹک سکتی ہے یا ارد گرد زیادہ Magnetic Field ہونے کے سبب کمپاس کی سوئی میں نقص بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ سمندر کے برمودا ٹرائی اینگل کی حدود میں یہی مسئلہ پیدا ہونے کے سبب بھی جہازوں کو حادثات پیش آتے رہتے ہیں۔ وہ درست سمت سے بھٹک جاتے ہیں۔

بہرحال نیوی گیشن کے لیے سب سے زیادہ استعمال ہونے والا یہی قطبی ستارہ Polestar ہے جسے عرب الجدی کہتے ہیں۔ چند ملکوں میں اسے نارتھ اسٹار قطب تارہ Lodestar بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ایک مقررہ جگہ پر موجود رہتا ہے۔ اس لیے یہ دیگر ستاروں سے منفرد ہے اور اس کے ذریعے سمت کا تعین کرنا خاصا آسان ہے۔ البتہ یہ ستارہ کچھ زیادہ روشن نہیں ہے۔ آسمان پر موجود زیادہ روشنی والے ستاروں میں اس کا 48واں نمبر ہے۔

میں قارئین سے ایک سوال پوچھنا چاہوں گا کہ کیا انہیں قطب تارے کی شناخت ہے؟ میرے خیال کے مطابق سندھ میں رہنے والا ہر شخص اس ستارے سے واقف ہے۔ جب میں چھوٹا تھا تو میری دادی نے بتایا تھا۔ مرحومہ ستاروں، جھمکوں اور ان کے ظاہر ہونے اور اوجھل ہونے سے بہت زیادہ واقف تھیں۔ وہ تعلیم یافتہ بالکل نہیں تھیں۔ وہ گھڑیال کو دیکھ کر بھی وقت نہیں جان سکتی تھیں۔ لیکن رات کے وقت چاند تاروں کی پوزیشن سے اور دن میں سورج کے سائے کو دیکھ کر وقت بتا سکتی تھیں کہ فلاں نماز کا وقت ہونے والا ہے یا رات کے کتنے پہر گزر چکے ہیں۔

جب تک کوئی ستارے دکھا کر اس کے بارے میں نہ بتائے تب تک محض میرا یہ مضمون پڑھ کر ستاروں کو شناخت کرنا آسان کام نہیں ہے۔ بہرحال وہ طالب علم جو جغرافیہ اور علم،

فلکیات کا اسٹوڈنٹ ہو اور اسے عرض البلد (Latitute) یا ستاروں کے جھرمٹ (Constellation) کے بارے میں بتایا جائے تو وہ سمجھ سکتا ہے۔

علم فلکیات کی تعلیم حاصل کرنے کے دوران یہ سبجیکٹ پڑھانے والے پروفیسر صاحب رات کے وقت کھلے آسمان کے نیچے سر کھپاتے رہتے تھے کہ فلاں ستارے کا نام فلاں ہے اور فلاں نام والا ستارہ فلاں ہے۔

علم فلکیات کے حساب سے یاد رہے کہ ہم سائنس سبجیکٹ علم فلکیات کی بات کر رہے ہیں نہ کہ علم نجوم (Astrology) کی۔ جسے ہمارے مذہب میں حرام سمجھا جاتا ہے۔ بہرحال ہم بتا رہے تھے کہ علم فلکیات کے حساب سے پورے آسمان کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جس میں چند اہم اور روشن ستاروں کے جھرمٹ کی شکلیں ہیں۔

صدیوں سے مختلف قومیں اپنے حساب سے ستاروں کے جھمگٹوں کو مختلف ناموں سے یاد کرتی چلی آ رہی ہیں۔ ان شکلوں میں سے تقریباً 80 کو ہم اہمیت دیتے ہیں۔ دراصل یہ تمام شکلیں خیالی ہیں سوائے چند ایک کے۔

جس طرح ہمارے ہاں ایک ایسی ہی شکل کا نام ٹیڈو یعنی تکون ہے۔ اس میں تین ستارے ایک دوسرے کے قریب نظر آتے ہیں۔ یعنی ہم زمین والوں کو ایسا معلوم ہوتا ہے جب کہ وہ ایک دوسرے سے کروڑوں میل کے فاصلے پر ہیں اور ہم سے تو اربوں، کھربوں میل کی دوری پر ہیں۔ بہرحال ستاروں کی اس جھرمٹ کو ظاہری طور پر نظر آنے کے مطابق یہ نام ٹیڈو یعنی تکون دیا گیا ہے۔ ہمارے ہاں تقریباً ہر شخص اس جھرمٹ سے واقف ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی نے بھی سُر رانی میں ان ستاروں کے جھرمٹ کا ذکر کیا ہے۔

لیکن بعض ستاروں کے جھرمٹ ایسے بھی ہیں جن کے نام ہرن، عقاب اور انگریزی میں Conis Minor (چھوٹا کتا)، Conis Major (بڑا کتا)، Virgo, Orion (ورجن) Cygnus (کونج) ہے لیکن وہ چھ سات ستارے جو کونج یا کتے کی شکل بناتے ہیں دراصل ان میں سے کونج کی چونچ اور دم بھی نہیں جچتی۔ سات ستاروں کے ایک جھرمٹ کا نام Ursa Major ہے۔ اسے یورپ کی اطراف میں Big Dipper کہتے ہیں۔ انگریز اسے Plough (ہل) بھی کہتے ہیں۔ کچھ لوگ اسے Small Pot یعنی ہینڈل والی دیگچی بھی کہتے ہیں۔ عرب دنیا میں ستاروں کے اس جھرمٹ کو دب اکبر یعنی بڑا ریچھ کہتے ہیں۔

یونانی بھی اسے ریچھ کہتے ہیں لیکن اپنی یونانی زبان۔ یاد رہے کہ اس یونانی لفظ Arktos سے ہماری زمین کے شمالی حصے کا نام Arctic پڑا۔ وہاں جب ابتدائی دور کے لوگ پہنچے تھے تو ہر طرف صرف سفید برف اور اس پر چلنے والے سفید ریچھ تھے۔ یہ منظر دیکھ کر سویڈن، ناروے، کینیڈا کے بالائی حصے کا نام ہی آرکٹک یعنی سفید ریچھوں کا دیس رکھا گیا تھا۔

مجھے یاد آ رہا ہے کہ اسکول کے زمانے میں جب ہم چھٹی یا ساتویں کلاس میں تھے۔ شاید جغرافیہ کے پیریڈ میں ہمیں سورج، چاند اور موسم کے ساتھ اس قطب تارے کے بارے میں بھی بتایا گیا تھا کہ وہ دب اکبر یعنی بڑے ریچھ والے ستاروں کی جھرمٹ کے قریب ہے۔ ان سات ستاروں کی جھرمٹ کے اگلے دو ستاروں کے درمیان لکیر کو آگے لے جانے سے ان دو ستاروں کے درمیان جو فاصلہ ہوگا۔ اس سے پانچ گنا فاصلے پر جو ستارہ ہے وہی قطب تارہ ہے۔

سات ستاروں کی اس جھرمٹ کو رات کے وقت میں نے بڑے غور سے دیکھا کہ شاید کسی ریچھ کا خاکہ بن جائے لیکن اسے دیکھ کر تصور میں بھی ریچھ نہ آیا۔ تب میں نے اپنی دادی سے دریافت کیا تھا۔

”ریچھ نہیں بلکہ چارپائی کہا جاتا ہے۔“ انہوں نے جواب دیا تھا۔ واقعی ان سات ستاروں میں سے چار ستارے کسی حد تک چارپائی کا منظر ضرور پیش کرتے ہیں لیکن بعد میں جب ہم نے چٹاگانگ نیول اکیڈمی سے علم فلکیات کی تعلیم حاصل کی تو معلوم ہوا کہ محض ستاروں کی شناخت کے لیے انہیں اس قسم کے خیالی شکلوں کے نام دیئے گئے ہیں۔ آج میں غور کرتا ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ستاروں کے اس جھرمٹ کی شکل دیگچی اور ہل سے کچھ کچھ مشابہت رکھتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ آمدِ اسلام سے پہلے تک سندھی بھی ماہر ناخدا (نیوگیٹر) تھے۔ پروفیسر جاوید بھٹی کے کہنے کے مطابق ہندو سمندر سے دور رہتے ہیں لیکن سندھی ہندو اور دوسرے نمبر پر کچھ گجراتی ہندو تھے جو سمندر میں سفر کرتے تھے۔ یہ لوگ آج بھی پوری دنیا میں نظر آتے ہیں۔

بہرحال اگر وہ اچھے اور ماہر نیوی گیٹر تھے تو ضرور ستاروں اور ان کے ناموں سے واقف ہوں گے۔ ان ہی کی مدد سے وہ سمندر میں سفر کے دوران سمت کا تعین کرتے ہوں گے۔ اس مضمون کو شروع کرنے سے پہلے میں نے کافی دانشوروں مثلاً تاج جل بیوس، تاج بلوچ اور جت سنگھانی جیسے لوگوں سے ستاروں کے ناموں کے بارے میں معلوم کرنا چاہا

تھا لیکن اس سلسلے میں کوئی بھی میری مدد نہیں کر سکا تھا۔ وہ خود بھی لاعلم تھے۔ گاؤں گاؤں میں بجلی آنے کے سبب لوگوں کے ذہن سے پرانے نام اور باتیں نکل چکی ہیں۔

قطب تارہ، ستاروں کے کسی جھرمٹ کا حصہ نہیں بلکہ بالکل تنہا ہے۔ اس کے قریب ترین ستاروں کا جھرمٹ دب اکبر ہے جسے انگریزی میں Big Dipper (ڈیگچی) ہل اور Ursa Major کہتے ہیں۔ اس جھرمٹ کے چار ستارے ڈیگچی یا چارپائی کا منظر پیش کرتے ہیں۔ اس جھرمٹ میں شامل پہلا ستارہ Alioth کہلاتا ہے جو باقی سات ستاروں میں سب سے زیادہ واضح ہے۔ حتیٰ کہ قطب تارہ سے بھی زیادہ صاف نظر آتا ہے۔

علی اوتھ ستارہ جسے عرب الجون کہتے ہیں۔ یہ ہماری زمین سے 81 نوری سال کے فاصلے پر ہے اور ہمارے سورج سے 108 گنا زیادہ روشن ہے۔ یعنی اس پر سورج سے 108 گنا زیادہ آگ روشن ہے۔ سورج تو ہم سے صرف ساڑھے آٹھ منٹ کے فاصلے پر ہے اگر یہ الجون یعنی Alioth ستارہ ہمارے اتنے ہی قریب ہوتا جتنا سورج ہے تو ہماری زمین پر انسان تو کیا پتھر اور لوہا بھی اس کی تپش سے گل جاتا۔ یہ ستارہ، سورج سے چار گنا بڑا ہے اور وزن میں تین گنا زیادہ ہے۔ بہرحال اس دب اکبر یعنی Ursa Major کے سات ستاروں کی جھرمٹ میں Alioth ستارہ سب سے زیادہ روشن ہے۔ ویسے تو پورے آسمان پر Alioth ستارہ اپنی چمک کے لحاظ سے 31 ویں نمبر پر ہے۔ جہاز رانی کی دنیا میں نیوی گیشن کے لیے جو 57 ستارے زیادہ سے زیادہ استعمال میں آتے ہیں یہ ان میں سے ایک ہے۔

بحیرۂ عرب، جنوبی چینی سمندر، بحرِ احمر اور بحیرۂ ہند کے شمالی حصوں میں جہاز اور کشتیاں چلاتے والے اس ستارے کی بھی Sight لے کر سمندر میں اپنی کشتی کی پوزیشن اور طے کیے ہوئے فاصلے کا اندازہ کرتے ہیں۔ حالانکہ آج کل سیلائٹ نیوگیٹر جیسے الیکٹرونک آلات سمندر میں موجود جہاز کی پوزیشن اس قدر آسانی سے بتا سکتے ہیں جیسے Accu-chek جیسے آلات انسانی خون میں موجود شوگر لیول بتا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ Magnatic کمپاس تو برسوں سے موجود ہے جو فوراً شمال کی سمت کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس کے باوجود ہم اپنے یقین کی خاطر ستاروں کو دیکھ کر فاصلے اور مقام کا تعین کرتے ہیں کہ ہم سمندر کے کس حصے پر ہیں یا ہم دنیا کے کس عرض البلد اور طول البلد میں موجود ہیں۔

زیکا وائرس

زیکا وائرس کا پہلا حملہ دماغی خلیات پر ہوتا ہے۔ یہ وائرس ایک دن میں ہزاروں کی تعداد میں خلیے ناکارہ بنا ڈالتا ہے جس کے باعث انسانی جسم کا وہ حصہ جو ان خلیوں سے منسلک ہوتا ہے بتدریج ناکارہ ہو جاتا ہے مچھروں کی وجہ سے پھیلنے والا زیکا وائرس جو 1947ء میں افریقا میں دریافت ہوا تھا اب یورپ اور امریکا تک پہنچ چکا ہے۔ اس وائرس کا حملہ بالغ افراد کے لیے عموماً اس قدر خطرناک نہیں ہوتا انہیں زیادہ سے زیادہ چند دن بخار رہتا ہے چہرہ اور آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں اور جوڑوں میں درد بھر آتا ہے زیکا وائرس سے اصل خطرہ حاملہ خواتین کو ہوتا ہے کیونکہ یہ وائرس رحم میں موجود بچے کے دماغ تک پہنچ جاتا ہے جس سے دماغ کے خلیے متاثر ہونا شروع ہو جاتے

کشتیوں کو چلانے والے کئی ناخدا ایسے بھی ہیں جو محض ستاروں کے آسرے پر کہیں سے کہیں جا پہنچتے ہیں۔

ماری پور کے ایک ہوٹل میں مجھے ایک شخص ملا تھا۔ میرے دریافت کرنے پر اس نے بتایا تھا۔

''میں لانچ چلاتا ہوں۔''

''آپ کہاں جاتے ہیں؟'' میں نے پوچھا تھا۔

''میں آج کل اپنی لانچ کو مگدیشو لے جاتا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

مگدیشو، افریقی ملک صومالیہ کی بندرگاہ ہے اور ایک لانچ کا اس قدر طویل سفر کرنا بڑی بات ہے۔ ممبئی، کولمبو یا ایران کی کسی بندرگاہ تک جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ کیونکہ ان بندرگاہوں تک پہنچنے کے لیے Coasting کرنی پڑتی ہے۔ یعنی کنارے کنارے سفر کیا جاتا ہے۔ موسم کی خرابی۔ سمندری لہروں کا خوف ہو تو کنارہ زیادہ فاصلے پر نہیں لیکن مگدیشو پہنچنے کے لیے عربی سمندر سے گزر کر ہندی سمندر کے کچھ حصے میں سفر کرنے کے بعد جا کر منزل آتی ہے۔ اس سفر میں ہمارے بڑے جہاز کو بھی کم از کم چھ سات دن لگ جاتے ہیں۔ جہاز میں اضافی ایندھن، خوراک اور پانی کا وافر انتظام ہوتا ہے۔ ایک لانچ کو کم از کم بارہ تیرہ دن لگتے ہیں۔ لانچ چلانے والے کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ وہ سیدھی اور متوازن لہروں پر سفر کرے تاکہ ایندھن زیادہ صرف نہ ہو۔ جلد منزل پر

پہنچا جائے۔ دوسری صورت میں پانی اور خوراک کا مسئلہ بھی پیدا ہو سکتا ہے۔

''سفر کے دوران سمت کا تعین کرنے کے لیے آپ کی لانچ پر کس قسم کے آلات موجود ہیں؟'' میں نے اس سے پوچھا تھا۔

''کچھ بھی نہیں۔'' اس نے کندھے اچکا کر جواب دیا۔ ''بس اللہ کا آسرا ہوتا ہے۔''

''آپ بھی کمال کرتے ہیں۔'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''پھر آپ سمت کا تعین کیسے کرتے ہیں؟''

''جس طرح ہمارے بڑے کرتے آئے ہیں۔''

''مثلاً......؟''

''جناب، یہ راس الغول، واقی (الواقع النسر) الطائر، ذنب اور نگھبان ستارے ہیں ناں۔'' اس نے ستاروں کے نام گنوائے۔ نگھبان میرے لیے نیا نام تھا۔

''یہ نگھبان کون سا ستارہ ہے؟''

''جناب! ستارہ العیوق، جسے ایرانی اور ہم مکرانی، فارسی زبان میں نگھبان اور بزبان کہتے ہیں۔ اس نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ Capella ستارے کی بات کر رہا تھا۔ یہ آسمان پر چمکنے والے ستاروں میں گیارھویں نمبر پر ہے۔''

''ہم مختلف ستاروں کو فالو کرتے ہوئے مگدیشو جا پہنچتے ہیں۔'' اس نے بتایا۔ اس کی کہی ہوئی بات کی تصدیق کے لیے میں اگلے دن اس کے ہمراہ گھاس بندر گیا تھا۔ وہاں اس کی لانچ سے سامان اتارا جا رہا تھا۔ لطف کی بات یہ کہ اس قسم کی لانچیں بھی یہیں کراچی میں تیار کی جاتی ہیں۔ میں اکثر جہاز کے کیڈٹوں کو آرکیٹیکچر پڑھانے کے دوران انہیں ماری پور کے قریب واقع گاؤں یوسف آباد لے جاتا تھا جہاں کاریگر نقشے کے بغیر لانچیں تیار کرتے ہیں۔ بعد میں ان میں نئے اور سیکنڈ ہینڈ انجن فٹ کیے جاتے ہیں۔ ان کشتیوں میں خاصا سامان ڈھونے کی گنجائش ہوتی ہے۔ انجن کے بغیر لکڑی کی اس کشتی کی قیمت تقریباً دو کروڑ روپے ہوتی ہے۔

گزشتہ سطروں میں بیان کیا گیا ستارہ بزبان (چرواہا) اسے عربی میں العیوق (بکری) اور انگریزی میں Capella کہا جاتا ہے۔ یہ قطب تارے کے قریب ہے اور یہ ایک نہیں بلکہ دو ستاروں کا ایک جوڑا ہے۔ دوربین کے بغیر دیکھنے سے یہ ہمیشہ ایک ہی معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ دونوں

وسعت کا اندازہ اس ایک مثال سے کیا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں ستارے جو ننگی آنکھ سے دیکھنے سے ایک معلوم ہوتے ہیں اور طاقت ور دوربین سے دیکھتے محسوس ہوتا ہے کہ یہ دو ہیں۔ ان دونوں کے درمیان صرف ایک سو ملین کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔

اس بات سے اندازہ کیجیے کہ دوسرے ستاروں کے درمیان کتنا فاصلہ ہوگا! اور یہ کائنات کس قدر وسعت رکھتی ہے۔

لانچ کے ناخدا نے چند دوسرے ستاروں کے نام بھی گنوائے تھے۔ مثلاً راس الغول اسے انگریز یورپی اور یونانی بھی اسی نام سے جانتے ہیں لیکن تھوڑے فرق کے ساتھ Algol کہتے ہیں۔ یہ ستارہ Perseus نامی ستاروں کے جھرمٹ میں شامل ہے۔ انگریز اسے شیطانی ستارہ (Demonstar) اور Blinking Demon کہتے ہیں۔ لبنان، اسرائیل اور شام کی اطراف کے لوگ اپنی لوک کہانیوں میں اسے روش شیطان یعنی شیطان کا سر کہتے ہیں۔

الغول ستارہ (Algol) ہماری زمین سے 93 نوری سال کے فاصلے پر ہے۔ علم نجوم کے ماہر اس ستارے کو بدبختی کی علامت قرار دیتے ہیں۔

آسمان پر تین چمکتے ہوئے ستاروں کی تکون نظر آتی ہے۔ اس تکونی کو نیوی گیشن کے لحاظ سے خاصی اہمیت دی جاتی ہے۔ اس تکون کو Summer Triangle کہا جاتا ہے۔ اس تکون کے تین ستارے الطائر (Altair)، ذنب (Deneb) اور ویگا ہیں جن کا ذکر درج بالا مکرانی ناخدا نے کیا تھا۔ میں ایک بات کی وضاحت کرتا چلوں کہ یہ تین ستارے الطائر، ذنب اور ویگا گو کہ ایک تکون بناتے ہیں اور یہ تینوں صاف اور واضح نظر آتے ہیں کیونکہ یہ بہت زیادہ روشن ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک ستارہ علیحدہ شکل یعنی مختلف مجموعے اور جھرمٹ سے تعلق رکھتا ہے۔ مثلاً ویگا جو عربی لفظ واقع کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ یہ Lyra نامی جھرمٹ کا سب سے زیادہ چمکنے والا ستارہ ہے۔ یاد رہے کہ یہ اپنے جھرمٹ کا سب سے زیادہ Bright ستارہ ہے۔ پورے آسمان پر زیادہ روشن ستاروں میں اس کا پانچواں نمبر ہے لیکن ہم جیسے لوگ، جو خط استوا سے زیادہ بلندی پر رہتے ہیں ان کو یہ ستارے نظر نہیں آتے جب کہ دنیا کے جنوبی نصف گول میں رہنے والے انہیں آسانی سے دیکھ سکتے ہیں جو چند ستارے ہمیں نظر آتے ہیں وہ بھی جنوب کی سمت افق کے قریب دکھائی دیتے ہیں۔ وہ خواہ بہت زیادہ روشن ہوں لیکن ہمیں دھندلے

میں رہنے والوں کے لیے Arcturus کے بعد سب سے واضح ستارہ ویگا ہے۔

ویگا کو دنیا کا اہم ستارہ سمجھا جاتا ہے۔ سائنسدانوں اور فلکیات کے ماہرین نے سورج کے بعد سب سے زیادہ اس ستارے پر تحقیق کی ہے۔ ویگا ستارہ ہماری زمین سے 25 نوری سال کے فاصلے پر ہے۔ عرب صدیوں سے صحراؤں اور سمندر میں سفر کرنے کے دوران سمت کا تعین کرنے کے لیے اس ستارے سے مدد حاصل کرتے رہے ہیں۔ عربوں نے اسے واقع یعنی گرنے والا نام دیا تھا جو آج ویگا ہو چکا ہے۔ دراصل عربی میں اس کا مکمل نام الواقع النسر یعنی گرتا ہوا عقاب ہے۔ بعض لوگ اس کا ترجمہ جھپٹتا ہوا باز بیان کرتے ہیں۔

یہ ستارہ سورج سے ڈیڑھ گنا زیادہ وزنی ہے اور روشنی کے لحاظ سے سورج سے 24 گنا زیادہ ہے۔ ویگا ستارہ اپنے محور کے گرد انتہائی تیز رفتاری سے گردش کرتا ہے۔ اس کی رفتار، یہ تقریباً 274 کلومیٹر فی سیکنڈ ہے۔ اپنی اس تیز رفتار کے سبب وہ اپنے خط استوا والے مقام سے باہر نکل آیا ہے۔ جس طرح سورج کے گرد زمین، مریخ اور زہرہ جیسے کئی سیارے گردش کرتے رہتے ہیں اسی طرح ویگا کے گرد مشتری جتنا کم از کم ایک سیارہ ضرور گردش کرتا ہے۔

ویگا پہلا ستارہ ہے جس کے نام پر 1971ء میں شیورلیٹ کمپنی والوں نے اپنی کار تیار کی تھی۔ اسی طرح لاک ہیڈ ہوائی جہاز کمپنی کے جہاز کا نام بھی ویگا ہے۔

ہم یہاں ایک اور ستارے کا بھی ذکر کریں گے جس کا نام انگریزی میں بھی وہی ہے جو اصل میں عربوں نے رکھا تھا۔ وہ ہے Altair۔ اس کا اصل عربی نام الطائر یعنی پرندہ ہے۔ الطائر ستارہ زیادہ روشن ستاروں میں تیرہویں نمبر پر ہے۔ تین ستاروں کی تکون Summer Triangle کا یہ جنوبی ستارہ ہے۔ اس کے علاوہ دو ستارے ویگا اور ذنب (Deneb) ہیں۔

الطائر ستارہ جس ستاروں کے جھرمٹ یا شکل (Constellation) سے تعلق رکھتا ہے اس کا نام Aquila ہے۔ عقیلا کے لیے بھی کہا جاتا ہے کہ یہ عربی لفظ ہے اور اس کا مطلب عقاب ہے۔ بہر حال اس جھرمٹ کا نام عقیلا (عقاب) بھی ستاروں کی شکل سے مطابقت نہیں رکھتا۔ ستاروں کے جھرمٹ عقیلا میں صرف تین ستارے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ چمکنے والا ستارہ الطائر ہے۔ اس کے قریب بھی ہلکے روشن ستارے ہیں اور تینوں ستارے ایک قطار میں ہیں اگر آپ کو ستاروں کا یہ جھرمٹ نظر آ جائے تو اس سے تھوڑا آگے Cygnus (کونج) نامی ستاروں کا ایک جھرمٹ ہے جس کا سب سے زیادہ روشن ستارہ ذنب (Deneb) ہے اور ستاروں کے اس جھرمٹ کے دائیں جانب Lyra ہے جسے انگریزی میں Harp بھی کہا جاتا ہے اس جھرمٹ کا سب سے زیادہ روشن ستارہ ویگا ہے۔

الطائر ستارہ ہماری زمین سے 17 نوری سال کے فاصلے پر ہے۔ یہ سورج سے دس گنا زیادہ روشن ہے جب کہ ویگا ستارہ اس سے بھی زیادہ روشن ہے۔ ویگا اور الطائر ستاروں پر ہائیڈروجن اور ہیلیم گیس جلتی رہتی ہے۔ یہی گیسیں سورج پر بھی جلتی رہتی ہیں۔ الطائر ستارہ بھی خاصی تیز رفتار سے گردش کرتا ہے۔ اس کے گردش کی رفتار 210 کلومیٹر فی سیکنڈ ہے گو کہ یہ رفتار ویگا سے قدرے کم ہے (ویگا 274 کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے لٹو کی طرح گھومتا رہتا ہے) لیکن ہماری زمین اور سورج کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ ہماری زمین نصف کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے گول گھومتی (Rotate کرتی) ہے۔ سورج دو کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے گول گھومتا ہے۔ ہماری زمین گو کہ صرف نصف کلومیٹر کی رفتار سے گھومتی رہتی ہے۔ یعنی 1600 کلومیٹر فی گھنٹا کے حساب سے! بہر حال یہ بھی بہت زیادہ رفتار ہے۔ اس کی رفتار ہمارے جمبو جیٹ جہاز کی اسپیڈ سے دگنی ہے۔ اب زمین کی Rotation کی رفتار کو ذہن میں رکھ کر الطائر اور ویگا ستاروں کی رفتار کا اندازہ کیجیے کہ وہ کس قدر تیز رفتاری سے Spin کرتے ہیں۔

الطائر ستارہ جسامت کے لحاظ سے سورج سے دگنا ہوگا لیکن اس کی گول گھومنے کی رفتار زیادہ ہونے کے سبب یہ دس گھنٹوں میں اپنی گردش مکمل کرتا ہے جب کہ سورج کو تقریباً ایک مہینا لگ جاتا ہے۔ طاقتور دور بین Interferometer کے ذریعے دیکھا جائے تو الطائر ستارہ بھی ویگا کی طرح تیز رفتاری سے گردش کرنے کے سبب Distorted نظر آتا ہے۔ یعنی بال کی طرح گول نظر نہیں آتا۔ زیادہ تیز رفتاری سے گردش کرنے والے اکثر ستارے ٹوٹ جاتے ہیں لیکن ایسا اس وقت ہوتا ہے جب کسی ستارے کی گردش کی رفتار 450 کلومیٹر فی سیکنڈ سے بڑھ جائے۔

آخر میں ہم ایک اور ستارے Deneb کا ذکر کریں گے۔ یہ سمر ٹرائی اینگل (تکون) کا ستارہ ہے اور اس کا تعلق Cygnus نامی ستاروں کے جھرمٹ سے ہے۔ ستاروں

ڈ کے اس جھرمٹ کو انگریزی میں Cygnus اور Swan یعنی ہنس، بطخ اور راج ہنس بھی کہتے ہیں۔ ستاروں کا یہ جھرمٹ خاصا مشہور ہے۔ یعنی گزشتہ زمانے سے یونانیوں، رومیوں، چینیوں اور عربوں کے ہاں اس جھرمٹ کے حوالے سے کئی کہانیاں اور روایات موجود ہیں۔ یہ نو ستاروں کا جھرمٹ ہے اور ان میں سب سے زیادہ چمکنے والا ستارہ ذنب ہے۔ یہ خیالی پرندے راج ہنس کی دم والا ستارہ ہے۔ ویسے پورے آسمان پر یہ انیسویں نمبر پر چمکنے والا ستارہ ہے۔ یہ ستارہ زمین سے تقریباً 3000 نوری سال کے فاصلے پر ہے۔ زمین سے روشن نظر آنے والے ستاروں میں سے یہ ستارہ (ذنب) سب سے دور ہے۔ ظاہر ہے الطائر بھی تقریباً 17 نوری سال کے فاصلے پر ہے۔ الجدی ستارہ (قطب تارہ) بھی صرف 431 نوری سال کے فاصلے پر ہے۔ علی اوتھ (Alioth) ستارہ، جو عربی لفظ علیات یعنی دنبے کی دم سے نکلا ہے اور اس ستارے کو عرب الجون بھی کہتے ہیں۔ یہ 81 نوری سال کے فاصلے پر ہے۔ الغول (Algol) 93 نوری سال کے فاصلے پر ہے۔ لہٰذا ان ستاروں کے مقابلے میں یہ ذنب ستارہ بہت زیادہ فاصلے پر موجود ہے۔

ہمیں چاند بھی بہت دور معلوم ہوتا ہے جب کہ یہ دوسروں کے مقابلے میں محض ایک سیکنڈ کے فاصلے پر ہے اور سورج صرف ساڑھے آٹھ منٹ کی دوری پر ہے۔ ان کے مقابلے میں دوسرے ستارے کس قدر فاصلے پر موجود ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جائے کہ یہ تمام ستارے جس کائنات میں سمائے ہوئے ہیں وہ کس قدر وسیع ہوگی۔ کیا کوئی انسان اس کا تخمینہ لگا سکتا ہے؟ اسی لیے ہمارے ایک پروفیسر جو سویڈن کی ورلڈ میری ٹائم یونیورسٹی میں ہمیں پڑھاتے تھے اور علم فلکیات سے واقف تھے وہ ایک ایرانی شاگرد سے کہتے تھے۔

''میں مسلمان نہیں ہوں لیکن مجھے یہ یقین ہے کہ اللہ ضرور ہے۔ جس نے اتنی وسیع کائنات نہ صرف تخلیق کی بلکہ بڑی حکمت اور قدرت کے ساتھ اسے قائم رکھا ہے اور اسے چلا رہا ہے۔''

اس ستارے کا انگریزی نام Deneb عربی نام ذنب یعنی دم سے لیا گیا ہے۔ بعض عرب اس ستارے کو ذنب الدجاجۃ یعنی مرغی کی دم بھی کہتے ہیں۔ یہ ستارہ سائز میں بھی بہت بڑا ہے۔ بہت زیادہ فاصلے پر ہونے کے سبب ہمیں چھوٹا نظر آتا ہے جب کہ یہ سائز میں سورج سے تقریباً 300 گنا بڑا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ہمارے سورج کی جگہ پر اس ستارے Deneb کو رکھا جائے تو اس کا بیرونی حصہ زمین کے Orbit تک پہنچ جائے گا۔ یعنی ہماری زمین جس Orbit پر گردش کرتی ہے اس دائرے جتنا یہ ستارہ ہے اور یہ وزن میں سورج سے 25 گنا زیادہ ہے۔

اس ستارے کے حوالے سے بھی کئی خیالی کہانیاں مشہور ہیں۔ چین میں Qixi کی محبت کی کہانی مشہور ہے۔ جس میں الطائر اور ویگا ستارے عاشق اور معشوق، نیولانگ اور زی نیو کے نام سے تھے۔ ان دونوں (عاشق اور معشوق) کو ملانے کے لیے ذنب ستارے نے ملکی وے (Milky way) کہکشاں کے اوپر پل بنایا تھا۔

ہمارے ہاں بھی خاص طور پر ہندو مت میں اس قسم کی ستاروں سے متعلق کئی کہانیاں مشہور ہیں۔ میں نے ایک جگہ اپنی اَن پڑھ دادی کے متعلق لکھا ہے کہ انہیں ستاروں کے کئی جھرمٹوں کے سندھی نام معلوم تھے۔ میں ساتویں کلاس تک اپنے گاؤں ہالا میں رہا تھا۔ ان ایام میں بجلی نہیں تھی۔ سب لوگ صحن میں سوتے تھے۔ نہ ہی ٹی وی، ٹیپ ریکارڈر اور ریڈیو کا وجود تھا۔ رات کو سونے سے قبل آسمان پر موجود ستاروں کا مشاہدہ کرنا پسندیدہ شغل تھا۔ دو ستاروں کی طرف اشارہ کر کے دادی بتاتی تھیں کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے محبوب ہیں یہ رات بھر چلتے رہتے ہیں۔ جس دن ان کا ملاپ ہوگا اس دن قیامت ہوگی۔

ایک مرتبہ ہانگ کانگ سے نیویارک جاتے ہوئے جنوبی چینی سمندر، بحیرہ ہند، کیپ آف گڈ ہوپ، اٹلانٹک سمندر اور کیریبین سمندر میں سفر کرنے کے دوران میں شمالی نصف کرہ اور جنوبی نصف کرہ کے ستاروں کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ دو دو ستاروں کے کئی جوڑے تھے۔ میں نے سوچا تھا کہ اس مرتبہ پاکستان پہنچ کر دادی سے پوچھوں گا کہ یہ ستارے کون سے ہیں؟ لیکن ہمارے جہاز کے کراچی پہنچتے ہی ہمیں یہ خبر ملی کہ ہماری دادی جس نے ہماری پرورش ماں کی طرح کی تھی وہ حج کرنے گئیں اور وہیں ان کا انتقال ہوگیا۔

آج بجلی، ٹی وی اور کمپیوٹر کے دور میں مجھے کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا جو ستاروں کے متعلق پرانے زمانے کے سندھی، اردو یا پنجابی نام اور روایات بتا سکے۔ نہ ہی اس زمانے کے کسی شخص کو یہ خیال آیا ہے کہ پہیلیوں، کہاوتوں، کہانیوں کے ساتھ ساتھ چاند ستاروں کے متعلق مقامی قصے قلمبند کیے جائیں۔ اس قسم کی چیزیں یونانی چینی اور جاپانی ادب میں وافر ہیں۔

مئی کی شخصیات

صائمہ اقبال

شمسی کلینڈر کے پانچویں مہینے سے جڑی ان اہم شخصیات کا مختصر مختصر تذکرہ جنہوں نے کارہائے نمایاں انجام دے کر اپنی اہمیت کا احساس دلایا، جنہیں ہم بھول نہیں سکتے۔ ان کا ذکر برابر کرتے رہنا چاہیے تاکہ معلومات حاصل کرنے کے شائقین اپنی پیاس بجھا سکیں۔

ایک ایسی تحریر جسے سب سے زیادہ پسند کیا جا رہا ہے

اپریل بھی عجیب مہینا ثابت ہوا۔

عام طور پر پاکستان میں اپریل گرمیاں لاتا ہے اور لوڈشیڈنگ شروع ہوجاتی ہے۔ برف کی مانگ بڑھ جاتی ہے۔ اس بار بھی گرمیاں آئیں۔ "ہیٹ ویو" کا خدشہ ظاہر کیا گیا۔ لوگوں نے کمر کس لی۔ سندھ میں تو درجہ حرارت بڑھنے لگا مگر اچانک موسم تبدیل ہوا۔ لاہور میں بارشیں شروع ہوگئیں۔ شمالی علاقہ جات میں یکدم برف پڑنے لگی۔ بلوچستان میں جانے کیسے سردی لوٹ آئی۔ کراچی جہاں موسم اچھا خاصا گرم ہوگیا تھا، وہاں گردآلود ہوائیں چلنے لگیں۔ ان عجیب وغریب تبدیلیوں کی وجہ سے امراض میں بھی اضافہ ہوا۔ اپریل نے سیاسی ماحول بھی خوب گرمایا۔ بیانات میں شدت آگئی۔ سیاست دانوں کے لہجے کرخت ہوگئے۔ دہشت گردی کے بھی افسوس ناک واقعات ہوئے۔ بالخصوص مردم شماری ٹیم پر حملہ۔ ادھر سرگودھا کے جعلی پیر کی جانب سے بیس افراد کے قتل کی ہولناک واردات ہوئی جس نے پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیا۔ کھیلوں کے میدانوں میں بھی خاصی گہما گہمی رہی۔ اپریل کے بعد مئی آجاتا ہے۔

[illegible]

کرہ میں اس ماہ گرمی کا موسم ہوتا ہے۔ عام خیال ہے کہ اس کا نام قدیم یونانی دیوی مایا (Maia) پر رکھا گیا ہے، جو یونان اور روم میں زمین اور زرخیزی کی دیوی سمجھی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ اسے پہاڑوں کی دیوی بھی کہا جاتا تھا۔

اس ماہ سے تعلق رکھنے والی شخصیات میں خاصا تنوع ہے۔ ایک طرف فنکار، دوسری طرف کھلاڑی۔

معروف شاعر ضمیر جعفری کا تعلق بھی اسی ماہ سے تھا، جن کے اشعار زبان زد خاص و عام ہوئے، جنہیں حکومت پاکستان نے تمغۂ قائداعظم اور تمغہ برائے حسن کارکردگی جیسے اعلیٰ ترین اعزازات سے نوازا۔ جن کی راہ میں قارئین نے آنکھیں بچھائیں۔ کتابیں بیسٹ سیلر ثابت ہوئیں۔ مزاحیہ شاعری کو انہوں نے اوج بخشا۔ انہوں نے ہی کہا تھا:

حضرت اقبال کا شاہین تو ہم سے اڑ چکا
اب کوئی اپنا مقامی جانور پیدا کرو

وہ یکم جنوری 1916 کو جہلم سے ملحقہ چک عبدالخالق میں پیدا ہوئے تھے۔ اسلامیہ کالج سے گریجویشن کیا۔ صحافت میں نام کمایا۔ تواتر سے کالم لکھے۔ قیام پاکستان کے بعد پاکستانی فوج میں خدمات انجام دیں۔ 1952 میں میجر کے

عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ سیاست میں بھی حصہ لیا۔ ان کا 16 مئی 1999 کو 83 سال کی عمر میں انتقال ہوا۔

نامور پاپ سنگر اور پاکستان کی مقبول اینیمیٹڈ سیریز ''برقعہ اوینجر'' (Burka Avenger) کے پروڈیوسر ہارون بھی 11 مئی 1976 کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ 90 کی دہائی میں وہ ''آواز'' بینڈ کے ساتھ پاکستانی پاپ میوزک میں داخل ہوئے۔ مقبول چہروں کی موجودگی میں اپنی شناخت بنائی۔ بعد میں یہ گروپ ٹوٹ گیا۔ انہوں نے اپنا سولو کیریر شروع کیا۔ ادھر بھی کامیابی ہوئی، مگر اصل کارنامہ لاکھوں شائقین کو گرویدہ بنا لینے والے ''برقعہ اوینجر'' پروڈیوس کرنا ہی ٹھہرا، جس نے ریکارڈ کامیابی حاصل کی۔

چلیں، اب اس ماہ کی دیگر معروف شخصیات پر نظر ڈال لیتے ہیں۔

☆ مصباح الحق

اگر آپ میں صلاحیت ہو، لگن ہو، خلوص ہو تو دشمن کتنا ہی زور لگا لے، آپ کی کتنی ہی مخالفت کی جائے، لاکھ سازشیں کی جائیں، آپ خود کو منوا لیتے ہیں۔ مصباح الحق کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی رہا۔ پاکستان کرکٹ میں شاید ہی کسی کھلاڑی پر اس نوع کی تنقید ہوئی ہو، جو اس دراز قد قائد پر ہوئی، شاید ہی کسی کو اتنی مغلظات بکی گئی ہوں، جو اس دھیمے مزاج کے بلے باز کو بکی گئیں، شاید ہی کسی پر عہدہ چھوڑنے کے لیے اتنا دباؤ ڈالا گیا ہو، جو پاکستانی تاریخ کے کامیاب ترین کپتان پر ڈالا گیا۔ یہاں تک کہ ملک کو بیچنے والوں کو بھی اس طرح آڑے ہاتھوں نہیں لیا جو درگت مصباح الحق کی بنائی گئی، مگر اس کی عظمت کو سلام... وہ سر جھکائے، خاموشی سے اپنے کام میں مگن رہا۔ تنقید کرنے والے تنقید کرتے رہے، سازشی مصروف عمل رہے۔ اس کے خلاف مضامین لکھے گئے، میڈیا پر مذاق اڑایا گیا، رکیک حملے کیے گئے، مگر وہ چلتا رہا، اپنے زور بازو پر اسے بھروسا تھا، قدرت کی مدد کا یقین تھا اور پھر وہ وقت آیا، جب پوری قوم نے یک زبان ہو کر کہا: شکریہ مصباح الحق۔ ہمیں تم پر فخر ہے۔

کہتے ہیں، جو شخص عظمت کا بیج لے کر پیدا ہوتا ہے وہ ابتدا ہی میں خود کو شناخت کروا لیتا ہے۔ شاید یہ نظریہ درست ہو۔ پاکستان کرکٹ پر نظر ڈالیں تو جاوید میاں داد، وسیم اکرم، وقار یونس نے کیریر کے آغاز ہی میں خود کو منوا لیا تھا، عہد حاضر میں شاہد خان آفریدی اور شعیب اختر نے دھماکے دار انٹری ماری تھی۔ صاف دکھائی دیتا تھا کہ وہ لمبی ریس کے گھوڑے ہیں مگر مصباح الحق کا معاملہ دیگر ہے۔ وہ کیریر کے آغاز میں خود کو شناخت کروانے میں ناکام رہا۔ اسے نیشنل ٹیم تک پہنچنے میں بہت وقت لگا۔ عام طور سے جب کرکٹرز ریٹائرمنٹ کے قریب ہوتے ہیں، تب وہ اسکواڈ کا حصہ بنا۔ عام خیال تھا کہ اس کا کیریر تین چار سال میں ختم ہو جائے گا پھر ایک ہولناک واقعہ بھی ہوا۔ پہلے ٹی ٹوئنٹی ورلڈ کپ میں ہندوستان سے ہونے والے ٹکراؤ میں وہ اعصاب کی جنگ ہار گیا تھا اور ایک بچگانہ شارٹ کھیل کر جیت ہندوستان کی جھولی میں ڈال دی۔ وہ ایک شارٹ پاکستان کو ورلڈ چیمپین اور مصباح کو سپر اسٹار بنا سکتا تھا مگر اسی شارٹ نے اسے زوال کی سمت دھکیل دیا اور لوگ اس کھلاڑی کو برا خواب سمجھ کر بھولنے کی کوشش کرنے لگے۔

مگر مصباح نے محنت جاری رکھی۔ دوبارہ ٹیم کا حصہ بن گیا۔ اور جب اسپاٹ فکسنگ کے واقعے میں پاکستان کے تین کھلاڑی ملوث پائے گئے، سلمان بٹ کو کپتانی سے ہاتھ دھونا پڑا، پاکستان کرکٹ بحرانوں کا شکار ہو گئی، تب اس ڈوبتی ناؤ کو مصباح الحق نے سنبھالا۔ آج سے قبل شاید ہی کسی کپتان نے اتنے کٹھن حالات میں کپتانی سنبھالی ہو۔ کپتانی کے دیگر امیدواروں کی موجودگی بھی اس کے مسائل میں اضافہ کا سبب بنی۔ تنقید کرنے والے بھی کئی تھے مگر وہ سر جھکائے اپنے کام میں مگن رہا۔ ٹیسٹ میں پاکستانی ٹیم کی کارکردگی میں مسلسل بہتری آئی۔ آخر ایک روز ٹک ٹک کہلانے والے مصباح نے پاکستان کو دنیا کی نمبر ون ٹیسٹ ٹیم بنا دیا۔ اسی زمانے میں آئی سی سی نے اسے خصوصی ایوارڈ سے نوازا۔ ایک تجزیہ کار نے اسے عہد حاضر کا سب سے قابل احترام کرکٹر قرار دیا۔ ایک انگریزی ویب سائٹ نے جب دنیائے کرکٹ کے عظیم کپتانوں کی فہرست بنائی تو اسے بھی فہرست میں جگہ دے دی۔ واقعی.... اگر آپ میں صلاحیت ہو، لگن ہو، خلوص ہو تو دشمن کتنا ہی زور لگا لے، آپ کی کتنی ہی مخالفت ہو، چاہے لاکھ سازشیں کی جائیں، آپ خود منوا لیتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ

کھلاڑی اپنے کیریر کی اختتامی لکیر تک پہنچتے پہنچتے ایک سنہری داستان میں ڈھل گیا ہے۔ کامیابیوں کی ایسی داستان رقم کی کہ دنیا انگشت بدنداں رہ گئی۔

مصباح کی شہرت کا ایک اہم حوالہ یہ بھی ہے کہ اس نے بطور قائد غیروں کی سرزمین پر عظیم جنگیں لڑیں۔ جی ہاں، جس زمانے میں مصباح کپتان بنا، پاکستان میں انٹرنیشنل کرکٹ کے امکانات معدوم ہو چکے تھے۔ سری لنکن ٹیم پر حملے کے بعد تمام ٹیموں نے پاکستان آنے سے انکار کر دیا تھا۔ اب مصباح کو ہر جنگ اجنبی محاذوں پر لڑنی تھی۔ اسے ہوم گراؤنڈ کا وہ ایڈوینٹیج حاصل نہیں تھا، جس نے بھارت کو شیر اور آسٹریلیا کو اپنی سرزمین پر ناقابل شکست بنا دیا تھا۔ اس کے باوجود مصباح نے کامیابی کے حیران کن ریکارڈ قائم کیے اور مخالفین کے منہ بند کر دیے۔

مصباح الحق 28 مئی 1974 کو میانوالی کے ایک مڈل کلاس گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے خاندان میں تعلیم کو خصوصی اہمیت دی جاتی تھی، یہی سبب ہے کہ انہوں نے کرکٹ کے ساتھ ساتھ تعلیمی سلسلہ بھی جاری رکھا۔ لاہور کی یونیورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی سے ایم بی اے کیا۔ یہ تعلیم کیریر میں بہت کام آئی۔ اسی نے انہیں مہذب، سمجھ دار اور بردبار بنایا۔

اب ان کے کیریر پر نظر ڈال لیں: 8 مارچ 2001 کو مصباح نے نیوزی لینڈ کے خلاف ٹیسٹ ڈیبیو کیا۔ ون ڈے کیریر کا آغاز اگلے برس نیوزی لینڈ ہی کے خلاف کیا۔ کیریر کی ابتدا میں وہ ان اینڈ آؤٹ ہوتے رہے۔ دراصل اس وقت انضمام الحق، یوسف اور یونس جیسے کھلاڑی ٹیم میں موجود تھے، جن کے ہوتے ہوئے ٹیم میں جگہ بنانا کچھ مشکل تھا۔ پھر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انضمام انہیں پسند نہیں کرتے تھے۔ ٹی ٹوئنٹی ورلڈ کپ میں بھارت کے ہاتھوں شکست ان کے کیریر کا بڑا دھچکا تھی۔ اسی طرح کا واقعہ ایک بار ون ڈے کرکٹ کے ورلڈ کپ میں بھی پیش آیا، جب آفریدی پاکستانی ٹیم کی قیادت کر رہے تھے۔ سیمی فائنل میں پاکستان کو ہندوستان سے شکست ہوئی۔ اس میچ میں سب سے زیادہ اسکور کرنے والے مصباح پھر زیر عتاب آئے۔ میچ بنانے والے کھلاڑی کو برا بھلا کہتے ہوئے لوگ ان بلے بازوں کو یکسر بھول گئے، جنھوں نے غیر ضروری شارٹس کھیل کر میچ بگاڑا تھا۔

دراصل ان کی کہانی کا یہ عجیب پہلو رہا کہ غیروں نے

[illegible]

اعزازات دیے، پاکستانیوں نے پھبتیاں کسیں، مگر عزت اور ذلت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ 2010 میں جب پاکستان نے انگلینڈ کا متنازعہ دورہ کیا، کپتان سمیت تین کھلاڑی زیر عتاب آئے، تب قیادت کی ذمے داری ٹھنڈے مزاج کے حامل مصباح کو سونپی گئی۔ کپتانی کے ساتھ بطور بلے باز بھی ان کی کارکردگی شان دار رہی۔ انہوں نے ٹیسٹ کی تیز ترین نصف سنچری اور سنچری بنائی، سال میں سب سے زیادہ رنز اسکور کرنے والے بلے باز بنے۔ پاکستان کو ایشیا کپ کا فاتح بنوایا۔ ہندوستان کو ہندوستان میں شکست دی۔ جنوبی افریقا کو اس کی زمین پر ون ڈے سیریز ہرانے والے پہلے ایشیائی قائد ٹھہرے۔ بطور کپتان تین ہزار رنز بنائے۔ سری لنکا کے خلاف ایک تاریخ ساز فتح اپنے نام کی۔ انگلینڈ اور آسٹریلیا جیسی ٹیم کو وائٹ واش کیا۔ گذشتہ ورلڈ کپ کے بعد مصباح نے ون ڈے سے ریٹائرمنٹ لے لی۔ یاد رہے، اس وقت وہ اپنی ٹیم کی جانب سے ٹاپ اسکورر تھے۔ آخری ٹورنامنٹ میں چار نصف سنچریاں بنائیں۔ ٹیسٹ میں مصباح الحق نے 8 بار سو کا ہندسہ عبور کیا، اور حیران کن طور پر ہر بار فتح نے پاکستان کے قدم چومے۔

انہیں شریف النفس اور غیر متنازعہ کھلاڑی کی حیثیت سے شناخت کیا جاتا ہے۔ انہوں نے کبھی غصے میں اپنے مزاج کی درگت نہیں بنائی۔ کبھی ڈوپ ٹیسٹ مثبت نہیں نکلا۔ کبھی صحافیوں سے جھگڑا نہیں ہوا۔ گو وہ ون ڈے میں کوئی سنچری نہیں بنا سکے مگر 42 کارآمد نصف سنچریاں ضرور بنائیں۔ ان کی اوسط 43.40 تھی، جو انتہائی متاثر کن ہے۔ یہ بیٹنگ اوسط پونٹنگ، لارا، انضمام، سارو گنگولی اور بے ج وردھنے جیسے کپتانوں سے زیادہ تھی۔ اس معاملے میں وہ میاں داد سے بھی آگے دکھائی دیتے ہیں۔ بیشتر بہترین اننگز میں وہ ناٹ آؤٹ رہا۔

ایک مبصر کے مطابق لوگ مصباح پر سست بلے بازی کا الزام عائد کرتے ہوئے لوگ بھول جاتے کہ کرکٹ "ٹیم گیم" ہے۔ یہ دیگر بیٹسمینوں کی بے گنوائی وکٹوں کا دباؤ ہوتا تھا، جس سے نبرد آزما ..... ہونے کے لیے انہیں اپنا انداز تبدیل کرنا پڑتا تھا۔ یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ اگر مصباح نے اتنی فتوحات پاکستان کے بجائے جنوبی افریقا، آسٹریلیا یا انگلینڈ کو دلائی ہوتیں تو انہیں کاندھے پر بٹھایا جاتا، مگر ہمارے ہاں ہیروز کی قدر نہیں کی جاتی۔ مصباح الحق اب ٹیسٹ کرکٹ سے بھی ریٹائر ہو چکے ہیں۔ اس عظیم کھلاڑی کا

شاندار کیریر اختتام کو پہنچا۔ مستقبل میں انہیں پاکستانی تاریخ کے کامیاب ترین کپتان کے طور پر یاد کیا جائے گا، جس نے پاکستانی ٹیسٹ ٹیم کو دنیا کی نمبر ون ٹیم بنا دیا تھا۔

علی ظفر

کچھ برس قبل ہماری فلم انڈسٹری سپر اسٹارز سے یکسر محروم تھی۔ ایک طرف ہالی وڈ اور بالی وڈ کے فلمی ستارے تھے جو فیشن آئی کون تھے جنھیں دنیا جانتی تھی، نئی نسل جن کی تقلید کرتی تھی... دوسری طرف ہماری فلم انڈسٹری کے ستارے تھے جو اپنے عصر سے کٹے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ رہی سہی کسر زوال پذیر انڈسٹری نے پوری کر دی، جس کے بعد فلم اسٹارز کو مجبوراً ٹی وی کی سمت آنا پڑا۔ البتہ ماضی کے برعکس آج حالات خاصے بہتر ہیں۔ ہمارے پاس ایسے اداکار ہیں جن کا بین الاقوامی طور پر چرچا ہوتا ہے، جو ایشیا کے پُرکشش ترین مردوں کی فہرست میں نہ صرف جگہ پاتے ہیں بلکہ کبھی کبھی رِتک روشن اور شاہ رخ خان کو بھی پچھاڑ دیتے ہیں۔ جن کے فیس بک اور ٹوئٹر پر اچھے خاصے فالورز ہیں۔ اس ضمن میں ہمارے سامنے فواد خان اور ماہرہ خان کی مثالیں ہیں، جنھیں پاکستانی انڈسٹری کا رخ روشن کہا جا سکتا ہے مگر جس فنکار نے زمین تیار کی، بین الاقوامی مارکیٹ میں پاکستان کی نمائندگی کی، اپنی صلاحیتوں کو لوہا منوایا، ہندوستانی پروڈیوسروں کو پڑوس میں جھانکنے کی تحریک دی... وہ تو علی ظفر ہی تھا۔

جی ہاں، علی ظفر ہی پاکستان انڈسٹری کا حقیقی چہرہ ہیں۔ ایک سپر اسٹار۔ ایک مکمل پیکیج۔ وجیہہ، اسٹائلش۔ اداکار بھی خوب۔ پھر زبردست گلوکار۔ انھیں یہ خبر بھی ہے کہ خود کو کس طرح پیش کرنا ہے۔ کیسے اٹھنا بیٹھنا ہے۔ لوگوں سے کس طرح ملنا ہے۔ کیسے گفتگو کرنی ہے۔ شہرت انھیں تھال میں رکھ کر پیش نہیں کی گئی، اس کے لیے انھوں نے کڑی محنت کی ہے۔ جدوجہد کی کہانی طویل ہے۔ کبھی وہ ایک ہوٹل میں مصوری کیا کرتے تھے۔ ٹی وی کی سمت آنے کے بعد بھی کڑی محنت کی۔ چھوٹے موٹے رول کیے۔ مختلف برانڈز کے اشتہارات میں دکھائی دیے۔ گلوکار بننے سے قبل دیگر گلوکاروں کی میوزک ویڈیو میں بطور ماڈل نظر آئے۔ یہ ابرار کے گانے پرتو کا ذکر ہے۔ گلوکاری کی سمت آنے کے بعد ڈھیرے ڈھیرے آگے بڑھے۔ جب شہرت مل گئی اور وہ ایک آئی کون بن گئے، تب بھی ایک حلقے کی جانب سے انہیں غیر ضروری تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ یہ وہ طبقہ ہے جو پاکستانی انڈسٹری کی تجدید میں تو کوئی خاص کردار ادا نہیں کر سکا، البتہ ہندوستانی فلموں کی ریلیز کے خلاف بیانات داغ کر اپنی موجودگی کی خبر دیتا رہتا ہے۔ اس طبقے کی جانب سے بھارت میں کام کرنے والے اداکاروں کو بھی وقتاً فوقتاً آڑے ہاتھوں لیا جاتا ہے۔ علی ظفر بھی زیر عتاب آئے۔ ایک ایوارڈ شو میں اداکار شان نے اسٹیج پر کھڑے ہو کر ہندوستان جانے والے فنکاروں کو تنقید کا نشانہ بنایا، تو اشارہ وہاں موجود علی ظفر ہی کی سمت تھا۔ بعد میں جب علی ظفر اسٹیج پر آئے، تو تہذیب کے دائرے میں رہتے ہوئے اس کا جواب دیا۔ شان خاموش رہنے کی بجائے جب دوبارہ اسٹیج پر آئے، تو پھر اپنا موقف پیش کرنا ضروری جانا۔

بعد میں بھی وہ اس ضمن میں اپنا موقف پیش کرتے رہے، مگر علی نے بردباری کا ثبوت دیتے ہوئے خاموشی اختیار کیے رکھی۔ ان کی ذہانت اور اعتدال پسندی نے اس وقت بھی اہم کردار ادا کیا، جب مرحوم جنید جمشید خواتین کی بابت ایک متنازعہ بیان کی وجہ سے زیر عتاب تھے۔ تب ٹوئٹر پر علی ظفر نے ان کے ساتھ ایک سلجھا ہوا مکالمہ کیا، جس سے منظر پر چھائی دھند چھٹ گئی، جنید جمشید کا موقف بھی واضح ہو گیا اور معاملے کی شدت خاصی کم ہو گئی۔ بعد میں یہ مکالمہ ملکی اور بین الاقوامی میڈیا کی زینت بنا۔

ہم انہیں ایک ہمہ جہت فنکار کہہ سکتے ہیں، جس نے خود کو ہندوستان کی سرزمین پر منوایا۔ یاد رہے کہ علی سے قبل جو اداکار ہندوستان گئے یا تو انہوں نے مختصر کردار کیے یا پھر ایسے رول، جو ان کے شایانِ شان نہیں تھے۔ یہ علی ظفر ہی تھے، جو پہلی بار ایک ہندوستانی فلم میں لیڈ رول میں نظر آئے۔ وہ ہندوستان کے مشہور ایوارڈ فلم فیئر کے لیے بھی نامزد ہوئے۔

اب ان کی حالاتِ زندگی پر نظر ڈال لی جائے۔ علی ظفر 18 مئی 1980 کو لاہور میں ایک مڈل کلاس گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والدین تدریس کے پیشے سے وابستہ تھے۔ وہ پی اے اے پبلک اسکول اور گورنمنٹ کالج لاہور میں زیر تعلیم رہے۔ نیشنل کالج آف آرٹس نے ان کی شخصیت پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

ایک مہینا دو لیجنڈز

پاکستانی فلم نگری کے دو لیجنڈ اداکاروں کا تعلق ماہ اپریل سے ہے۔ ایک نے کامیڈی میں خود کو منوایا، ایک نے منفی کرداروں کو لازوال بنایا۔ ایک کو دنیا رنگیلا کے نام سے جانتی ہے، دوسرے کو مصطفیٰ قریشی کے نام سے۔

رنگیلا فقط فنکار نہیں تھے، وہ تو ایک عہد تھے۔ مزاح کے بے تاج بادشاہ تھے۔ محفل کو زعفران زار بنانے کے فن میں یکتا تھے۔ ان کے بغیر پاکستانی فلم انڈسٹری کی تاریخ ادھوری ہے۔ ایک عام آرٹسٹ سے نمایاں کامیڈین بننا اور پھر ہیرو کے طور پر خود کو منوانا ان کی بڑی کامیابی تھی۔ انہوں نے یہ سفر اپنی صلاحیتوں کے بل پر طے کیا۔ اپنے دور کی تمام ہیروئنوں کے مقابل مرکزی کردار ادا کیے۔ 9 نگار ایوارڈ اپنے نام کیے۔ گلوکاری اور ہدایت کاری کے شعبے میں بھی خود کو منوایا۔

ان کا اصل نام محمد سعید خان تھا۔ وہ یکم جنوری 1937 کو افغانستان میں پیدا ہوئے۔ اوائل میں وہ پہلوان بننا چاہتے تھے۔ باڈی بلڈنگ میں دلچسپی تھی، مگر پیٹ کی پکار کے سامنے شوق بے وقعت ہو جاتا ہے۔ کچھ برس فلموں کے بورڈ پینٹ کیے۔ پھر تھیٹر کا رخ کیا۔ وہاں خود کو دریافت کرنے کا موقع ملا۔ فلمی کیریر کا آغاز ایم جے رانا کی 1958 میں ریلیز ہونے والی فلم "جٹی" سے کیا، جس میں وہ ایک مختصر کردار میں نظر آئے۔ ادھر جگہ بنانے کے لیے انہیں سخت محنت کرنی پڑی۔ منور ظریف اور آصف جاہ جیسے باکمال فنکاروں کے سامنے خود کو منوانا آسان نہیں تھا۔ فلم "گہرا داغ" ان کے کیریر میں اہم موڑ ثابت ہوئی۔ فلم "ہتھ جوڑی" میں ان کی اور منور ظریف کی جوڑی بہت پسند کی گئی۔ دونوں فنکار پھر "جی دار" میں نظر آئے، جو پلاٹینیم جوبلی کرنے والی پہلی فلم تھی۔

67ء میں ریلیز ہونے والی "یار مار" میں ان کا ایک ڈائیلاگ "اس دنیا نے غرق ہو جانا ہے لشکری" بہت مقبول ہوا۔ فلم "دیا اور طوفان"، "ہیر رانجھا" اور "ماں پتر" کا بھی بڑا چرچا ہوا۔ ان کے پروڈکشن ہاؤس نے تیزی سے کامیابی کے مراحل طے

مصوری کی جانب بھی ان کا رجحان تھا۔ وہ پورٹریٹ بنایا کرتے تھے۔ یہ شعبہ دور سے تو بڑا جاذب نظر لگتا ہے، مگر یہاں جگہ بنانا خاصا دشوار ہے۔ وہ بطور آرٹسٹ ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں یہ کام کیا کرتے۔ وہیں ٹی وی کے لیے پیشکش ہوئی۔ مگر یہ پیشکش فوری کامیابی نہیں لائی۔ پہلے پہل وہ ثانوی کرداروں میں نظر آئے۔ ماڈلنگ کرتے رہے۔ ہاں جب ان کا البم "حقہ پانی" ریلیز ہوا، تب حالات میں کچھ بہتری آئی۔ ان کے گانے "چھنو" کو بہت پسند کیا گیا۔ اس البم کے دیگر گانے بھی مقبول ہوئے۔ بالخصوص ویڈیوز کا بڑا چرچا ہوا۔ اس کی پانچ ملین کاپیاں فروخت ہوئیں۔ اس کے گانے ایک عرصے تک چارٹ میں نمبر ون رہے۔ انہوں نے بہترین البم کے لیے لکس اسٹائل ایوارڈ حاصل کیا۔

ہندوستان میں بھی اس کی خبر پہنچی۔ کچھ ویڈیوز ادھر چلیں تو انہیں وہاں ہونے والے پروگراموں میں مدعو کیا جانے لگے۔ اس بڑی انڈسٹری میں خود کو پیش کرتے ہوئے انہیں یقینی طور پر کچھ دقت پیش آئی ہوگی، مگر انہوں نے اعتماد کے ساتھ یہ مرحلہ طے کیا۔ اُن کی پُرکشش شخصیت نے بھی کچھ سہولت پیدا کی۔ 2006 میں ان کی البم "مستی" کا بھی بہت چرچا ہوا۔ اس کی ویڈیوز انٹرنیشنل مارکیٹ میں ریلیز ہوئیں۔ "سجنیا" اور "دیکھا" کی ویڈیوز چارٹس میں ٹاپ پر رہیں۔ "دیکھا" اس وقت کی مہنگی ترین میوزک ویڈیو تھی، جس میں وہ ریما، میرا اور آمنہ حق سے رومانس کرتے نظر آئے۔ یہ گیت 2010 میں ریلیز ہونے والی ہالی وڈ فلم Wall Street: Money Never Sleeps میں بھی برتا گیا۔ وہ نصرت فتح علی خان، عاطف اسلم اور اسٹرنگز کے بعد چوتھے پاکستانی گلوکار ہیں، جسے یہ اعزاز حاصل ہوا۔

2010 میں وہ ہندوستانی فلم "تیرے بن لادن" میں جلوہ گر ہوئے۔ وہ ایک یادگار لمحہ تھا۔ یہ پہلا موقع تھا، جب کوئی پاکستان اداکار بالی وڈ میں لیڈ رول کر رہا تھا۔ گو فلم اپنے نام اور موضوع کے باعث پاکستان میں

کیے۔ فلم "انسان اور گدھا" تو ایک شاہکار تھی۔

جب ہواؤں کا رخ بدلا، ننھا اور علی اعجاز کا دور آیا، تو ہم نے انہیں ثانوی کرداروں میں بھی دیکھا۔ جگر اور گردے کے عارضوں کے باعث وہ انڈسٹری سے دور ہو گئے۔ 24 مئی 2005 کو لاکھوں انسانوں میں خوشیاں بانٹنے والے اس فنکار کا انتقال ہوا۔

اب بات ہو جائے مصطفیٰ قریشی کی۔ جن فنکاروں نے ولن کے کردار سے حقیقی معنوں میں انصاف کیا، مصطفیٰ قریشی ان میں سرفہرست ہیں۔ سلطان راہی کے ساتھ انہوں نے سیکڑوں سپرہٹ فلمیں کیں۔ دونوں کی جوڑی بہت مشہور تھی۔ ایک ہیرو ہوتا، دوسرا ولن۔ ایک طویل عرصے تک انہوں نے انڈسٹری پر راج کیا۔ سلطان راہی کے انتقال کے بعد ہی یہ جوڑی ٹوٹی۔ یہ دلچسپ امر ہے کہ ان کی مادری زبان سندھی تھی، مگر شہرت اُنھیں پنجابی فلموں سے ملی۔ کہتے ہیں، انہوں نے پنجابی فلموں میں کام کرنے کے لیے یہ زبان باقاعدہ سیکھی اور پھر اتنی پختگی سے بولنے لگے کہ یوں لگتا تھا، پنجابی ہی ان کی مادری زبان ہے۔

مصطفیٰ قریشی 11 مئی 1937 کو حیدرآباد، سندھ میں پیدا ہوئے۔ کیریر کا آغاز محمد علی اور وحید مراد کے ساتھ اردو فلموں سے کیا تھا۔ 1967 میں ریلیز ہونے والی "لاکھوں میں ایک" ان کی پہلی فلم تھی۔ "عندلیب" پہلی نمایاں فلم ٹھہری، جو 1969 میں ریلیز ہوئی۔ جب پنجابی فلم کی پیشکش ہوئی، تو وہ تذبذب کا شکار ہو گئے کہ وہ اس زبان پر گرفت نہیں رکھتے تھے، پھر اس انڈسٹری کا مزاج الگ تھا، لیکن جب اس سمت گئے، تو اس انڈسٹری نے سندھ کے اس بیٹے کو گلے لگا لیا۔ پہلی پنجابی فلم ہدایت کار الطاف حسین کی "خون وے پیاسے" تھی۔ پنجابی میں ان کی ڈائیلاگ ڈلیوری کو بڑی پزیرائی ملی۔ 1979 میں ریلیز ہونے والی "مولا جٹ" انہیں آسمان پر لے گئی۔ اس کا ڈائیلاگ "نواں آیا ایں سوہنیا" لوگوں کے ذہنوں پر نقش ہو گیا۔ انہوں نے سلطان راہی کے ساتھ کئی یادگار فلمیں کیں۔ انڈسٹری کو ایک کے بعد ایک بلاک بسٹر دی۔ اُن کی بیگم روبینہ قریشی بھی شوبز انڈسٹری سے وابستہ ہیں اور گلوکارہ کے طور پر بھی اپنی شناخت رکھتی ہیں۔

وہ پاکستان میں بھارتی فلموں کی ریلیز کے خلاف ہیں۔ اور پذیرائی کے معاملے میں حکومت پاکستان سے کچھ شاکی نظر آتے ہیں۔

ریلیز نہیں ہو سکی مگر اس کا خاصا چرچا ہوا اور ان کی اداکاری اور گائیکی کی رسائی میں اضافہ ہوا۔ کچھ عرصے بعد وہ "لو کا دی اینڈ" میں نظر آئے۔ گو کردار چھوٹا تھا، مگر اس نے گہرا اثر چھوڑا۔ اب بڑے بینرز ان کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔ "میرے برادر کی دلہن" میں انہوں نے ایک اہم کردار ادا کیا۔ اس فلم میں عمران خان اور کترینا کیف ان کے مدمقابل تھے۔ دونوں ہی علی کی اداکاری اور اسٹائل کے سامنے ماند پڑ گئے۔ 2012 میں ان کی فلم "لندن، پیرس، نیویارک" ریلیز ہوئی۔ 2013 میں وہ ماضی کی کلاسیک "چشم بددور" میں نظر آئے۔ یہ فلم بلاک بسٹر ثابت ہوئی۔ اسی برس انہیں ایشیا کا پرکشش ترین مرد قرار دیا گیا۔ اس دوڑ میں انہوں نے سلمان، شاہ رخ اور رتیک کو پچھاڑ دیا تھا۔ اِسی شہرت کے ساتھ انہوں نے 2012 میں اپنا البم "جھوم" ریلیز کیا، جس نے توقع کے عین مطابق بے حد کامیابی حاصل کی۔

آج علی ظفر اپنے کیریر کے عروج پر نظر آتے ہیں۔ مداح شدت سے ان کی پہلی پاکستانی فلم کے منتظر ہیں۔ ناقدین کو یقین ہے کہ پاکستانی انڈسٹری میں قدم رکھتے ہی علی سنیما بینوں کے لیے ایک مقامی اسٹار اور بین الاقوامی اسٹار کا فرق واضح کر دیں گے۔ فلمی پنڈتوں کے مطابق ان کا مستقبل روشن ہے۔ اگر حالات بہتر ہو گئے، تو عین ممکن ہے کہ وہ پھر ہندوستانی فلموں میں دکھائی دیں۔ بے شک، ان کے لیے ستاروں کے آگے اور بھی جہاں ہیں۔

فاطمہ بھٹو

ہر تجزیہ کار متفق ہے کہ پاکستانی سیاست کو آج نئے چہروں کی ضرورت ہے، نئی نسل کو سامنے آنا ہوگا، تو جوانوں کو قیادت سنبھالنی ہوگی، مگر بدقسمتی سے جب بھی ایسا ہوا، موروثی سیاست کو فروغ دیا گیا جو صاحب اقتدار تھا، اس نے اپنے بیٹے بیٹیوں کو نوازا۔ جاگیردار کے بعد اس کی اولاد جاگیردار بنی، پیر کی گدی اس کی نسل ہی نے سنبھالی۔ یعنی نئے

مئی اور دو سیاست دان

پاکستانی تاریخ کے دو سینئر سیاست دانوں کی زندگی ماہ مئی سے جڑی ہے۔ دونوں میں ایک دلچسپ مماثلت یہ ہے کہ اپنی تمام تر قربانیوں اور قد کے باوجود ان کا کوئی رشتہ دار تھا (ایک کے معاملے میں بھائی، دوسرے میں بیٹا) جس نے ان سے زیادہ شہرت، مقبولیت اور طاقت حاصل کی۔

پہلا نام ہے خان عبدالجبار خان کا، جو خدائی خدمت گار تحریک کے بانی خان عبدالغفار خان المعروف باچا خان کے بھائی تھے۔ آج باچا خان کے تذکرے کے بنا پشتون سیاست کا تذکرہ ادھورا ہے۔ ان کے بیٹے ولی خان، بہو بیگم نسیم ولی اور پوتے اسفندر یار ولی نے سیاست میں نام کمایا، دوسری طرف عبدالجبار کا معاملہ ذرا مختلف رہا۔ ان کی اولادیں نمایاں نہ ہو سکیں۔

وہ 1882 میں چارسدہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد بہرام خان زمین دار تھے۔ پشاور سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ پہلے بمبئی پھر لندن کا رخ کیا، جہاں سے طب کی تعلیم حاصل کی۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران فوج میں خدمات انجام دیں۔ بعد میں انڈین میڈیکل سروس کا حصہ بن گئے۔ وزیرستان میں مقامی آبادی کے خلاف آپریشن شروع ہوا، تو انہوں نے

احتجاجاً استعفیٰ دے دیا۔ وہ ترقی پسند نظریات کے حامل تھے، کانگریس کی جانب رجحان تھا۔ ان کے بھائی عبدالغفار خان سیاست میں متحرک ہو چکے تھے۔ آزادی ہند کی تحریک شروع ہونے کو تھی۔ 1930 میں وہ عملی سیاست میں آئے۔ قانون ساز اسمبلی میں شمال مغربی سرحدی علاقے کے نمائندے رہے۔ 1937 میں صوبائی الیکشن میں انہوں نے کامیابی حاصل کی اور کانگریس کی حکومت بنائی۔

قیام پاکستان کے وقت وہ چیف منسٹر تھے، مگر جلد حکومت اور ان کے درمیان اختلافات بڑھنے لگے۔ نظر بندی کا زمانہ شروع ہوا۔ وہ پابند سلاسل بھی رہے۔ رہائی کے بعد ان کے انداز سیاست میں کچھ تبدیلی نظر آئی۔ راستہ اپنے بھائی سے الگ ہو گیا۔ 1954 میں محمد علی بوگرہ کی کیبنٹ میں وہ وزیر رہے۔ 1955 میں مغربی پاکستان کے پہلے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے حلف اٹھایا۔ حکمران جماعت مسلم لیگ سے اختلافات کی وجہ سے وہ اس سے الگ ہو گئے اور ری پبلکن پارٹی کی بنیاد رکھی۔ 9 مئی 1958 کو ایک شخص نے لاہور میں انہیں قتل کر دیا۔ اس وقت وہ اپنے بیٹے کے گھر کے باغ میں بیٹھے ایک فوجی افسر کا انتظار کر رہے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا تعلق خاکسار تحریک سے تھا اور اس کا حکم علامہ مشرقی نے دیا تھا۔

چہروں کے نام پر ہمیشہ ہمارے ہاں دھوکا ہوا۔ جب نئی نسل نے سامنے آنے کی کوشش کی بھی، تو سماجی اور سیاسی جماعتیں اس کی راہ میں رکاوٹ بن گئے۔

فاطمہ بھٹو اس کی سب سے بڑی مثال ہیں۔ بلا کی ذہین، بین الاقوامی شہرت یافتہ، مطالعے کی شائق۔ سیاست سے متعلق وژن رکھتی ہیں مگر سیاست سے دور ہیں۔ فی الحال ان کا سیاست میں آنے کا ارادہ بھی نہیں۔ فاطمہ بھٹو ذوالفقار علی بھٹو کی پوتی ہیں۔ کہتے ہیں، بھٹو ایک پارس پتھر تھا جو اس سے جڑا خود بھی داستان بن گیا۔ اس خاندان کے ہر فرد کو عالمی شہرت ملی مگر یہ شہرت بد اثرات کی حامل تھی کہ جو نمایاں ہوا، اسے اپنی جان قربان کرنی پڑی۔ پہلے بھٹو کو پھانسی ہوئی، پھر ان کے ایک بیٹے شاہنواز کو زہر دے دیا گیا، دوسرا بیٹا مرتضیٰ اپنی بہن ہی کے دور حکومت میں قتل ہوا، اور پھر بہن (بے نظیر بھٹو) کو بھی 2007 میں قتل کر دیا گیا، جس کے بعد سندھ میں ہولناک فسادات ہوئے، املاک جلائی گئیں، گاڑیاں نذر آتش ہوئیں، لوٹ مار ہوئی، لوگ قتل ہوئے۔

خیر، یہ ایک الگ اور طویل موضوع ہے۔ فی الحال ہماری توجہ کا محور فاطمہ بھٹو ہیں،

ڈاکٹر خان صاحب کو چارسدہ میں دفنایا گیا۔ باچا خان سے آٹھ برس بڑے عبدالجبار خان کو احتراماً ڈاکٹر خان صاحب کہہ کر پکارا جاتا تھا۔

دوسرا نام ہے سندھ کے سینئر سیاست دان حاکم علی زرداری کا ہے، جو سابق صدر اور پاکستان پیپلز پارٹی کے شریک چیئرمین آصف علی زرداری کے والد ہیں۔ ان کا خاندان کئی نسلوں سے سیاست میں ہے۔ وہ 1930 میں سندھ کے ضلع نوابشاہ میں پیدا ہوئے۔ گزر بسر کا ذریعہ زمین داری تھا۔ تقسیم کے بعد کراچی میں تعمیراتی شعبے میں سرمایہ کاری کی۔ شہر کا مشہور بمبینو سنیما تعمیر کروایا۔ 60 کے عشرے میں ضلع کونسل نوابشاہ کے انتخابات سے اپنے سفر کا باقاعدہ آغاز کیا۔ پیپلز پارٹی کے بانی ارکان میں شامل تھے۔ 1970 کے عام انتخابات میں وہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے، مگر ذوالفقار علی بھٹو کے دور حکومت میں پارٹی سے اختلاف کی وجہ سے راہیں جدا کر لیں۔ اس فیصلے کی انہیں بھاری قیمت چکانی پڑی۔ بعد میں وہ عوامی نیشنل پارٹی کی سمت چلے گئے۔ مارشل لا کے زمانوں میں ان کا خاندان بھی زیر عتاب آیا۔ 1985 کے غیر جماعتی انتخابات میں انہیں شکست ہوئی۔ فوجی عدالت نے ان پر پابندی لگادی، زمینیں ضبط کرلی گئیں۔ محترمہ کے سیاست میں آنے کے بعد وہ دوبارہ پی پی میں متحرک ہوگئے۔ ان کے بیٹے آصف علی زرداری کی محترمہ بینظیر بھٹو سے شادی ہوگئی۔ اس رشتے نے ان کے لیے توقع کے عین مطابق مشکلات پیدا کیں۔ قومی بینکوں سے حاکم علی زرداری کے تعمیراتی منصوبوں کے لیے منظور شدہ قرضے روک دیے گئے۔ اسٹیبلشمنٹ اور بیوروکریسی ان کے پیچھے پڑ گئی۔

88ء کے عام انتخابات میں وہ قومی اسمبلی کے رکن بنے۔ قومی اسمبلی کی پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کے سربراہ مقرر ہوئے۔

1990 کے انتخابات میں بھی حاکم زرداری نے پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن میں حصہ لیا، لیکن اس بار ناکام رہے۔ پی پی پر لگنے والے کرپشن کے الزامات ان سمیت سب ہی کو لے ڈوبے۔ 1993 کے انتخابات میں وہ تیسری بار رکن قومی اسمبلی منتخب ہوئے، لیکن اب ان کی صحت گر رہی تھی۔ دھیرے دھیرے وہ عملی سیاست سے دور ہوگئے۔

1997 میں ایک وفاقی سیکریٹری کے قتل کا مقدمہ اُن کے بیٹے کے خلاف درج ہوا۔ طویل عرصے چلنے والے اس مقدمے میں بالآخر انہیں بری کردیا گیا۔ زندگی کے آخری برسوں میں انہیں نیب کے باعث مقدمات کا سامنا رہا۔ انہوں نے دو شادیاں کیں۔ آصف علی زرداری کے علاوہ ان کی بیٹیوں فریال تالپور اور عذرا پیچوہو نے بھی سیاست میں حصہ لیا۔ ان کا اسلام آباد میں 24 مئی 2011 کو انتقال ہوا۔

جو اسی مرتضیٰ بھٹو کی بیٹی ہیں، جسے 70 کلفٹن کے پاس قتل کیا گیا تھا۔ وہ ہمیشہ اس کی ذمے دار اپنی پھوپی بے نظیر بھٹو کو ٹھہراتی ہیں، مگر اس کیس پر کام کرنے والے تفتیش کاروں کا خیال ہے کہ اس میں مقتدر حلقے شامل تھے، جو مرتضیٰ بھٹو سے عسکری تنظیم الذوالفقار کی تشکیل اور اس کی دہشت گرد کارروائیوں کا بدلہ لینا چاہتے تھے۔ واضح رہے کہ 80 کی دہائی میں کراچی سے پشاور جانے والا ایک جہاز اغوا ہوا تھا جسے افغانستان اتارا گیا تھا، اس کی ذمے داری الذوالفقار نے قبول کی تھی اور اس میں سوار ایک فوجی افسر کو قتل کردیا گیا تھا۔ شاید اسی کی پاداش میں مرتضیٰ کو راستے سے ہٹا دیا گیا... سبب جو بھی رہا ہو، یہ کیس اب بھی ایک معما ہے اور فاطمہ بھٹو کی جانب سے ہر برسی پر خاندان کے دیگر افراد کی سمت اشارہ کیا جاتا ہے۔

بھٹو کی موجودہ نسل میں گو آج بلاول، بختاور اور آصفہ کا چرچا ہوتا ہے، مگر یہ فاطمہ بھٹو ہی ہیں جس کی کتب دنیا بھر میں پڑھی گئیں اور جس کی ذہانت کو تسلیم کیا گیا۔

فاطمہ بھٹو 29 مئی 1982 کو افغان دارالحکومت کابل میں اُس وقت پیدا ہوئیں، جب ان کے والد میر مرتضیٰ بھٹو جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ یعنی جلاوطنی کے زمانوں میں فاطمہ پروان چڑھیں۔ ان کی والدہ فوزیہ فصیح الدین بھٹو افغان وزارت خارجہ کے ایک اہلکار کی بیٹی تھیں۔ غنویٰ بھٹو، جو اس وقت پاکستان پیپلز پارٹی (شہید بھٹو) کی چیئر پرسن ہیں، ان کی سوتیلی ماں ہیں۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم دمشق، شام میں حاصل کی۔ 1993 میں

اداکارہ نینا جو پُراسرار نینا کے نام سے مشہور ہوئیں۔ ان کا اصل نام شاہدہ تھا اور وہ ریاست دتیہ کے دیوان کی بیٹی تھیں۔ انہوں نے محسن عبداللہ نامی ایک دولت مند شخص سے شادی کی اور پھر اپنے شوہر کی رضامندی سے شالیمار پکچرز پونا کی فلم ایک رات کے ذریعے فلمی اداکارہ بن گئیں۔ ان کی مشہور فلموں میں من کی جیت، پریم سنگت، پرتھوی راج، سنجوگتا اور میرا بائی قابلِ ذکر ہیں۔ شالیمار پکچرز کی فلموں میں کام کرنے کے دوران اس فلم ساز ادارے کے مالک ڈبلو زیڈ احمد انہیں کچھ اتنے اچھے لگے کہ محسن عبداللہ سے علیحدگی اختیار کرکے ڈبلو زیڈ احمد کو شریکِ حیات بنالیا۔ نینا کو پُراسرار نینا شاید اس لیے کہا جاتا تھا کہ ان کی طبیعت کی پراسراریت کا کسی کو کچھ علم نہیں ہوتا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد وہ احمد صاحب کے ساتھ پاکستان آگئیں۔ لاہور میں چند ایک فلموں میں کام کیا۔ پھر وہیں ان کا انتقال ہوگیا۔

شمیم جن کا اصلی نام شمیم لودھی تھا۔ 1926ء میں لاہور میں پیدا ہوئی تھیں۔ ابتداء میں شوقیہ طور پر اداکاری کی پھر ان کے شوق اور دلچسپی نے انہیں باضابطہ اداکارہ بنادیا۔ وہ اس پائے کی ہیروئن بن گئیں کہ ان کے مقابل پرتھوی راج، موتی لال، ایشور لال اور کشور ساہو کو ہیرو کاسٹ کیا جاتا تھا۔ باغی، ایماندار، کنیا دان، ڈھنڈورا، ارمان، آدمی، فریاد، بانسری، کالی داس اور سیت وردان ان کی مشہور فلمیں تھیں۔

ان کی چھوٹی بہن نسیم نے بھی کچھ فلموں میں کام کیا مگر انہیں خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی۔

پاکستان بننے کے بعد شمیم لاہور آگئیں اور اس دور کے نامور فلم ساز وہدایت کار انور کمال پاشا سے شادی کرلی اور باقی زندگی ہاؤس وائف کے طور پر گزاری۔

وہ غنویٰ بھٹو اور چھوٹے بھائی ذوالفقار بھٹو جونیئر کے ساتھ پاکستان آگئیں۔ انہوں نے کراچی سے اولیول کیا۔ اسی عرصے میں باپ کی موت کا سانحہ برداشت کرنا پڑا۔ اس واقعے کے بعد فاطمہ بیرونِ ملک چلی گئیں۔ 2004 میں کولمبیا یونیورسٹی، نیویارک سے امتیازی نمبروں کے ساتھ گریجویشن کیا۔ 2005 میں انہوں نے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقین اسٹڈیز سے ماسٹرز کیا۔ ان کے لوٹنے کے بعد چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ وہ جلد سیاست میں قدم رکھیں گی اور بھٹو خاندان کے دو یونٹوں کو ایک کر دیں گیں، مگر انہوں نے قلم کار بننے کو ترجیح دی۔ کبھی شعر کہے، کبھی نثر لکھی۔ پاکستان، امریکا اور برطانیہ کے اخبارات میں شائع ہونے والے ان کے کالموں کا بڑا چرچا ہوا۔ ان کی پختگی نے لوگوں کو حیران کردیا۔

1997 میں جب وہ پندرہ برس کی تھیں، ان کا پہلا شعری مجموعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے شائع ہوا۔ عنوان تھا: Whispers of the Deserts۔

2006 میں دوسری کتاب آئی، جس کا موضوع 8 اکتوبر 2005 کو آزاد کشمیر اور صوبہ سرحد میں آنے والا ہولناک زلزلہ تھا۔ تیسری کتاب Songs of Blood and Sword تھی۔ یہ متنازع بھی رہی اور مقبول بھی۔ اس میں انہوں نے اپنی پھوپی، جو اب شہید ہوچکی تھیں، کڑی تنقید کا نشانہ بنایا۔ دنیا بھر کے اخبارات نے اس پر تبصرے لکھے۔ ان کے اندازِ بیان کو سراہا گیا، مگر ان کی تنقید، رویہ اور محترمہ کی قربانیوں کو نظرانداز کرنا ایک بڑے طبقے کو ناگوار گزرا۔ انہوں نے انگریزی میں ایک ناول بھی لکھا ہے۔ سیاست میں تو اب تک نہیں آئیں، مگر سماجی خدمات کے میدان میں سرگرم رہیں۔ جیل میں قید خواتین کے لیے خاصا کام کیا۔

ایک زمانے میں پی پی کی اعلیٰ قیادت کی جانب سے یہ بیان دیا گیا تھا کہ مستقبل میں بلاول اور فاطمہ مل کر پارٹی کو آگے لے جاسکتے ہیں۔ اس کے بعد یہ افواہیں گردش کرنے لگی تھیں کہ دونوں پارٹیوں میں مفاہمت ہوگئی ہے اور اب کوئی بیچ کی راہ نکل آئے گی مگر غنویٰ بھٹو اور فاطمہ بھٹو کی جانب سے اس کی سختی سے تردید کردی گئی۔ ابھی دونوں پارٹیاں الگ الگ سمتوں میں کھڑی ہیں۔ مرتضیٰ بھٹو کے صاحب زادے مرتضیٰ جونیئر کو بھی پی پی کا وارث ٹھہرایا جاتا ہے۔ ممکن ہے، مستقبل میں انہیں سیاست میں لانچ کیا جائے۔

عمر اکمل

ایسا تو نہیں کہ تین بھائیوں کا ایک ہی زمانے میں پاکستان کرکٹ کا حصہ بننا انوکھا واقعہ ہو۔ اوائل ہی میں ہمیں محمد برادرز کی عظیم مثال ملتی ہے۔ حنیف محمد، مشتاق محمد، صادق محمد نے پاکستان کی نمائندگی کی اور خوب داد بٹوری، البتہ اکمل برادرز کا معاملہ ذرا مختلف ہے۔ اوّل الذکر نے جہاں کارکردگی سے خود کو منوایا، وہیں آخر الذکر کو تنازعات نے گھیرے رکھا۔ ایک کے بعد دوسرا، دوسرے کے بعد تیسرا تنازعہ۔

یہ وکٹ کیپر بیٹس مین کامران اکمل تھے، جو سب سے پہلے پاکستانی ٹیم کا حصہ بنے اور انتہائی مضبوط ہو گئے۔ وہ ٹیم، جس کی کپتانی سلمان بٹ کر رہے تھے اور جو اسپاٹ فکسنگ اسکینڈل میں ملوث پائی گئی تھی، کامران اس کا ایک اہم حصے تھے جو کرشماتی طور پر اس اسکینڈل سے بچ نکلے۔ بعد میں ان کے چھوٹے بھائی عمر اکمل ٹیم کا حصہ بنے، گو ان پر فکسنگ کے الزامات نہیں لگے مگر ان کی لاابالی طبیعت نے متعدد تنازعات کو جنم دیا۔ کبھی وہ ٹریفک وارڈن سے الجھ پڑتے، کبھی جھوٹ موٹ ان فٹ ہو جاتے، کبھی کسی پارٹی میں ڈانس کرتے نظر آتے، کبھی عجیب وغریب سیلفیاں اپ لوڈ کرتے۔

عمر کی صلاحیت پر کسی کو شبہ نہیں۔ انہوں نے خود کو منوایا ہے۔ کئی بار پاکستان کو میچز جتوائے، مگر یہ بھی سچ ہے کہ ان کی غیر سنجیدگی کی وجہ سے پاکستان کئی میچز میں ناکام بھی ہوا، پھر ان کی بچکانہ حرکتوں کے باعث پاکستان کی سبکی بھی ہوئی۔ (عدنان اکمل اس تکون کو مکمل کرتے ہیں۔ وہ کامران اکمل سے چھوٹے ہیں، وکٹ کیپر بیٹس مین ہیں اور پاکستان کی نمائندگی کر چکے ہیں)

عمر اکمل 26 مئی 1990 کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کے لیے راستہ ہموار تھا۔ دونوں بڑے بھائی فرسٹ کلاس کرکٹ کھیل رہے تھے۔ کامران نے بھی سبک روی سے سفر طے کیا۔ تیزی سے رن بنانے کی ان کی قابلیت نے انہیں 2008 کا انڈر 19 ورلڈ کپ کھیلنے والی ٹیم کا حصہ بنا دیا۔ وہاں کارکردگی متاثر کن رہی۔ اب وہ فرسٹ کلاس کرکٹ میں جلوہ گر ہوئے۔ اپنے چوتھے فرسٹ کلاس میچ میں انہوں نے 248 رنز کی تباہ کن اننگز کھیلی۔ 2009 میں پاکستان اے ٹیم نے آسٹریلیا کا دورہ کیا۔ وہاں اس نوجوان کو

اپنی قابلیت کا رنگ جمانے کا موقع ملا۔ اب انہیں نیشنل ٹیم سے بلاوہ آ گیا۔

انہوں نے 23 نومبر 2009 کو نیوزی لینڈ کے خلاف اپنے ٹیسٹ کیریئر کا آغاز کیا۔ پہلے ہی ٹیسٹ میچ میں 129 رنز کی تیز رفتار اننگز کھیل کر سب کو چونکا دیا۔ یہ بے حد اہم اننگز تھی۔ کچھ حلقے جو یہ کہہ رہے تھے کہ انہیں موقع دینے میں جلدی بازی کی گئی، چپ ہو گئے۔ سری لنکا کے خلاف ون ڈے ڈیبیو کیا، وہاں بھی سنچری اسکور کی۔ یوں لگنے لگا کہ پاکستان کو ایک حقیقی مڈل آرڈر بلے باز مل گیا ہے۔ وہ ٹیم کا مستقل حصہ بن گئے مگر دھیرے دھیرے ان کی شخصیت کے منفی پہلو سامنے آنے لگے۔ جب فیصلہ کیا گیا کہ کامران کو بٹھا کر عمر سے وکٹ کیپنگ کروائی جائے تو حالات بگڑنے لگے۔ کچھ میچز میں تو انہوں نے دستانے سنبھالے پھر ایک روز انہوں نے کہہ دیا کہ وہ ان فٹ ہیں۔ بعد میں پتا چلا، انہوں نے کامران کے لیے راہ ہموار کی تھی۔ آنے والے دنوں میں انہوں نے ڈسپلن کی مزید خلاف ورزیاں کیں۔ سیکیورٹی اہل کاروں سے جھڑپ کی وجہ سے وہ ناپسندیدہ ٹھہرے۔ یہ خبر بھی آئی کہ انہوں نے تھیٹر شو کے دوران انتظامیہ سے جھگڑا کیا ہے۔ الغرض یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ ایک طویل عرصے تک ٹیم کا حصہ رہنے والے اکمل برادرز کو بالآخر باہر کا راستہ دکھا دیا گیا۔ گو یہ تو نہیں کہا جا سکتا ہے کہ عمر کا کیریئر ختم ہو گیا، مگر یہ ضرور ہے کہ مستقبل میں انہیں مشکلات کا سامنا رہے گا۔

اب ذرا ان کے ریکارڈز پر نظر ڈال لی جائے۔

عمر 16 ٹیسٹ میچز میں 35.82 کی اوسط سے 1,003 رنز بنا چکے ہیں، جن میں ایک سنچری اور چھ نصف سنچریاں شامل ہیں۔ 114 ون ڈے میچز میں انہوں نے 34.67 کی اوسط سے 2,987 رنز بنائے، جن میں دو سنچریاں اور 20 نصف سنچریاں شامل ہیں۔ انہیں ٹی 20 اسپیشلسٹ کہا جاتا ہے، مگر وہ 63 میچز میں 26.86 کی اوسط سے فقط 1,343 رنز ہی اسکور کر سکے۔ اب وہ اس فارمیٹ سے بھی باہر ہو چکے ہیں۔

شمشال سے ٹورنٹو

ندیم اقبال

شاعر نے غلط نہیں کہا ہے کہ چاند میری زمیں پھول میرا وطن۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ میرا وطن چاند سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔ اس کی وادی، اس کے دریا، شہر و کوہسار سب کے سب بے نظیر و بے مثال ہیں۔ لیکن ان فضاؤں سے جو نکل کر کسی اور شاخ پر آشیانہ سجانے کی خواہش کرتا ہے اسے کیسی کیسی پریشانیاں گھیرتی ہیں اس کا ذکر۔ جو یورپ و امریکا میں بسنا چاہتے ہیں وہ اس تحریر کو ضرور پڑھیں۔

ایک جداگانہ انداز کی دلچسپ سفر کہانی کا تیرہواں حصہ

آفیسر کاغذ کا وہ ٹکڑا جس پر سرجی نے اپنی سالی کا ایڈریس اور فون نمبر لکھ رکھا تھا لے کر اندر چلا گیا۔ سرجی اب اپنی جگہ کھڑے اس دروازے کو دیکھ رہے تھے جسے کھول کر وہ آفیسر اندر گیا تھا۔ اب ان کے چہرے پر پریشانی تھی۔ ہم بھی پریشان ہو اٹھے تھے۔ شہباز زیرِ لب بڑبڑایا تھا۔ ''اس نے سیاپا ڈال دیا ناں۔'' اس کی بڑبڑاہٹ مجھے مزید پریشان کر رہی تھی۔ آفیسر اگر سرجی کے کاغذات لوٹا دیتا انہیں امریکا میں داخل ہونے سے روک دیتا تو شاید ہم بھی شک کے د

گھیرے میں آجاتے۔ پاکستانی تھانے میں بیٹھا ایس ایچ او اور امیگریشن کاؤنٹر پر بیٹھا آفیسر خود کو خدا سمجھتا ہے۔ یک جنبش قلم کچھ بھی کرسکتا ہے۔ اسی بات نے ہمارے دل کی دھڑکنوں کو سوا کردیا تھا۔ میں سمجھ نہیں پارہا تھا کہ اب کیا کیا جائے۔ سرجی اگر لفاظی نہ دکھاتے اس کے سوالوں کا جواب گھما پھرا کر نہ دیتے تو شاید اب تک ہم امیگریشن کے کاؤنٹر سے آگے بڑھ چکے ہوتے۔

"میرا کہا مانیں اور سرجی کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔" شہباز بولا۔

"بس تھوڑا سا انتظار کرلو۔ پھر کوئی راستہ تلاش کرتے ہیں۔" میں نے تسلی دینے کے انداز میں کہا۔ "مجھے یقین ہے وہ آفیسر کاغذ پر لکھے فون نمبر کو چیک کرنے گیا ہوگا۔"

ابھی میرا جملہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ آفیسر لوٹ آیا۔ اتنی دیر سے اس نے اپنے چہرے پر خشونت طاری کر رکھی تھی مگر اب اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اس نے کاؤنٹر پر پہنچ کر وہ کاغذ سرجی کو تھمایا اور ان کے سفری کاغذات پر مہر لگادی پھر اس نے کہا۔ "ہم نے آپ کی سالی سے معلوم کرلیا ہے۔ آپ جاسکتے ہیں۔"

سرجی اندر سے برآمد ہوئے تو میں طیش میں تھا کہ وہ کس طرح سے امیگریشن آفیسر کو الٹے سیدھے جوابات دے رہے تھے۔ میں سرجی کے سامنے کھڑے ہوکر ان سے یہ پوچھا۔ "آپ کو کیا معلوم نہ تھا کہ یہ امریکا کا بارڈر ہے اور آپ جواب کس طرح سے دے رہے تھے؟"

وہ سر جھکائے کھڑے رہے۔ مجھے اور زیادہ غصہ آرہا تھا اور اسی حالت میں بولا۔ "آپ تو ایسے خوف زدہ کھڑے تھے جیسے کوئی مجرم ہوں اور آپ کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنی چاہیے تھی۔"

اسی طرح سر جھکائے کہنے لگے۔ "آپ لوگ بھی کھسک گئے تھے اور میں اکیلا چنا کیسے بھاڑ پھونکتا؟"

شہباز ساتھ کھڑا تھا یہ سن کر بوکھلا گیا اور سرجی سے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔ "کیا بیگ میں چنے بھی آپ نے رکھے ہوئے تھے؟"

سرجی خفا ہوکر بولے۔ "ایک بے بس آدمی کو ظالموں کے حوالے کرکے آپ بھی تنہا چھوڑ گئے اور پھر ناجائز میں چنوں کی اسمگلنگ کا الزام بھی لگارہے ہیں۔"

اب شہباز نے سوالیہ نگاہوں سے میری جانب دیکھا اور میں نے اس کی جانب۔ اتنے میں مسافر بس میں بیٹھ چکے تھے اور ہم بھی سر ڈولتے ہوئے بس کی جانب بڑھ گئے۔

ہم امیگریشن سے نکلے تو بس نے بفلو کے ٹرمینل پر اسٹاپ کیا۔ موسم بہت اچھا تھا اور ہر ایک یہی کہہ رہا تھا کہ فروری میں بہار آگئی ہے۔ جیکٹ پہنے ہم بڑے آرام سے باہر کھڑے تھے۔ بفلو، امریکا اور کینیڈا کا سرحدی شہر ہے اور وہ اس وقت بلند قامت عمارتوں کی روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ یہیں ہمیں امریکا اور کینیڈا میں فرق محسوس ہوا۔ کینیڈا یہاں پر ہمیں بہت چھوٹا اور تنگ محسوس ہوا۔ یہاں بڑی بڑی گاڑیاں، وسیع ہائی ویز اور سڑکیں اور روشنیوں کی جگمگاہٹ ہمیں حیران کررہی تھی۔ صاف محسوس ہورہا تھا کہ یہ بہت زیادہ مالدار ملک ہے لیکن اس ملک کے نظام میں بہت سی خرابیاں بھی ہیں، جن کا ذکر آگے آئے گا۔

یہاں کا بس ٹرمینل ٹورنٹو سے بڑا تھا۔ آمدورفت اور چہل پہل بھی زیادہ تھی۔ مسافروں سے لاؤنج بھرا تھا۔ سامنے کافی شاپ تھی جہاں ایک لائن لگی تھی۔ سرجی لائن میں کھڑے انتظار کررہے تھے۔ کافی شاپ کے ساتھ وینڈنگ مشین تھی، جہاں سے ہم ڈالرز ڈال کر جوس، کافی، پانی اور مختلف اقسام کے چپس اور بسکٹ خرید سکتے تھے۔ دوسری جانب ایک بڑا کاؤنٹر تھا جس کے پیچھے بیٹھا عملہ ہر ایک سے مسکرا کر مل رہا تھا۔ آپ انٹرنیٹ سے بھی اپنی سیٹ بک کروا سکتے ہیں۔ ایک مشین کھڑی تھی، جسے یہاں کاؤسک Kiosks کہا جاتا ہے۔ انٹرنیٹ پر جو ٹکٹ نمبر آپ کو مہیا کیا جاتا ہے، آپ وہ نمبر دبائیں۔ اپنے کوائف کی تصدیق کریں تو ٹکٹ باہر آجاتا ہے۔ آپ نئی بکنگ بھی اسی مشین سے کرسکتے ہیں اور آپ کو کاؤنٹر پر جانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

کاؤنٹر کے ساتھ انکوائری کا علیحدہ ڈیسک آپ کی خدمت کے لیے ہر وقت کھلا رہتا ہے۔ ساتھ ہی پولیس کا کاؤنٹر بھی تھا۔ کرسیوں پر کچھ مسافر اونگھ رہے تھے اور کچھ خاموش بیٹھے سوچوں میں گم تھے۔ سیٹوں کی ہر لائن کے بیچ بجلی کے سوئچ تھے اور کچھ مسافر اپنے فون چارج کررہے تھے۔

ہمیں پینتالیس منٹ تک یہاں رکنا تھا۔ ہم آرام دہ کرسیوں پر لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ مجھے یہ فکر تھی کہ بس کہیں نکل نہ جائے۔ میں بار بار شیشوں سے بس کی جانب جھانک کر دیکھ لیتا تھا۔ ایک دوبار پاکستان میں میرے ساتھ ایسا ہو چکا تھا کہ

میں کھانا کھاتے یا چائے پیتے رہ گیا تھا اور اسی دوران بس مجھے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ یہی خدشہ ہر وقت میں اپنے ساتھ لیے پھرتا تھا۔ مجھے اس وقت تک یہ معلوم نہ تھا کہ یہاں اگر ایک بس رہ جائے تو اسی ٹکٹ پر آپ اگلی بس آرام سے لے سکتے ہیں اور آپ کو کاؤنٹر پر جانے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ راستے میں جہاں جی چاہا اتر گئے اور جب اگلی بس آئی تو اس میں جا بیٹھے۔ یہی بات ٹرین کے سفر کی بھی ہوتی ہے لیکن میں اس دن بار بار اپنے ساتھیوں سے کہتا۔ ''ہمیں باہر بس کے ساتھ ہی کھڑے رہنا چاہیے۔''

میں نے بار بار اپنی بات دہرائی تو سرجی خواب خرگوش سے جاگ گئے۔ شہباز کی جانب منہ کر کے مجھے سنانے لگے۔

''آدھی رات جمائی آئے، شام سے پہلے منہ پھیلائے۔''

میں نے سن لیا۔ مجھے ابھی تک انگریشن پر ان کی حرکتوں کا غصہ تھا۔ میں بولا۔ ''سونا ہے تو بس میں جا کر سو لیتا۔ جمائیاں آرہی ہیں تو کیا یہیں سوجانے کا ارادہ ہے؟''

پھر اندازہ ہوا کہ وہ تو کوئی مثل بیان کر رہے ہیں۔ بار بار پوچھا کہ اس کا مطلب کیا ہے مگر ٹس سے مس نہ ہوئے۔ آخر شہباز کو کان میں اس کا مطلب بتایا۔ ''جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے۔''

اسی دوران نیویارک جانے والی بس کی روانگی کا اعلان ہوا اور ہم خراماں خراماں چلتے ہوئے اپنی اپنی سیٹوں پر جا بیٹھے۔ تبھی بس کے ڈرائیور کا اعلان گونجا وہ کہہ رہا تھا کہ نیو یارک تک چار سو آٹھ میل کا فاصلہ ہے جسے ہم سات گھنٹوں میں طے کر لیں گے۔

رات کے بارہ بج رہے تھے کہ ہم بفلو کی روشنیوں سے نکل کر ہائی وے 90 کے اندھیرے میں داخل ہوئے۔

بس اپنی یکساں رفتار سے چلی جارہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ڈرائیور نے بس کو کروز پر ڈال دیا ہے۔ سرجی اور شہباز کے پیچھے والی سیٹ پر جو نوجوان جوڑا بیٹھا تھا، وہ اپنی حرکتوں میں تیزی لاتے جارہے تھے۔ میرے لیے یہ نیا تماشا تھا۔ پھر لڑکے نے ایک چادر سرجی اور اپنی سیٹ کے بیچ کس دی۔ ایک ہلچل پردے کے پیچھے مچ رہی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ دو جانور گتھم گتھا ہوں۔ اب عجیب سی آوازیں آنا شروع ہوئیں تو سرجی اٹھ کر میرے سامنے آکھڑے ہوئے۔ پنجوں کے بل چادر کے پیچھے جھانکنے کی کوشش کرنے لگے۔ میں نے سختی سے انہیں منع کیا تو کہنے لگے۔ ''واللہ قسم سے ان بدچلن لوگوں نے میرا سکون غارت کر رکھا ہے۔ کوئی شرم و حیا ہی نہیں ہے۔ پرائے لوگوں کے سامنے ایسی بے ہودہ حرکتیں کر رہے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''مفتی کی بات آپ کو بتائی تھی ناں کہ ان کو اپنا کام کرنے دیں اور ہم اپنا کام کریں۔''

سرجی اب باقاعدہ سے پھنکار کر بولے۔ ''وہ تو اپنا کام کر رہے ہیں مگر ہماری جان سلب ہو رہی ہے۔''

میں نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ ''صبر کا نہیں تو پانی کا گھونٹ پئیں اور سکون سے سو جائیں۔''

سرجی کی متواتر گفتگو سے میرے ساتھ بیٹھی سیاہ فام لڑکی پہلو بدل رہی تھی۔ سرجی ایک بار پھر چادر کے پیچھے جھانک کر اپنی سیٹ پر جا بیٹھے۔ شہباز بے پروا سویا خراٹے لے رہا تھا۔

سرجی پانی کا گھونٹ بھر کر سو گئے۔ رات چار بجے بس ایک جگہ رکی جہاں کافی شاپ اور ایک اسٹور تھا، میں باہر نکل آیا۔ مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ میں نے اسٹور میں جا کر ٹھنڈے کولر سے پانی کی بوتل ایک ڈالر میں خریدی وہاں ساتھ میں بیر کاٹن پیک بھی ایک ڈالر کا تھا۔ چاروں جانب اندھیرا اور مہیب خاموشی تھی۔ ہم کچھ دیر بعد روانہ ہوئے، وہی سفر ہمیں درپیش تھا۔ پچھلی سیٹ پر سسکاریاں دم توڑ چکی تھیں اور اب گونجتے خراٹے غالب آگئے تھے۔

معلوم نہیں میں کب نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ آنکھ اس وقت کھلی جب اسپیکر پر ڈرائیور نے یہ اعلان کیا۔ ''ہم کچھ دیر میں منہٹن میں داخل ہونے والے ہیں۔''

منہٹن کے بارے میں سب سے پہلے میں نے طارق سے سنا تھا جب اس نے پاکستان آکر مجھے بتایا تھا کہ نئے سال کے شروع ہونے پر منہٹن میں لاکھوں لوگ اکٹھے ہوتے ہیں اور زیادہ آتش بازی ہوتی ہے۔ پھر بتایا تھا۔ ''یہ جو سب اونچی اونچی عمارتیں تم تصویروں میں دیکھتے ہو، وہ سب منہٹن میں واقع ہیں۔ میں نے اپنے تصور میں بہت سی چیزوں کی طرح ایک خاکہ سا بنایا ہوا تھا۔

جب ڈرائیور کا اعلان کانوں میں پڑا تو میں اچانک اٹھ بیٹھا اور تیزی سے ارد گرد دیکھنے لگا۔ بس ایک دریا پر سے گزر رہی تھی۔ سامنے نیو یارک سٹی کے ڈاؤن ٹاؤن منہٹن کی آسمان سے باتیں کرتی عمارتیں صاف نظر نہیں آرہی تھیں کیونکہ ان کے اوپر اور ارد گرد دھند کے بادل تھے۔ بادلوں سے نیچے ان عمارتوں کے نچلے حصے ایک نئے منظر کی تخلیق کر رہے تھے۔ اتنی

زیادہ اسکائی اسکریپر عمارتوں کا دور سے نظر آتا جھمگھٹا مجھے دم بخود کیے ہوئے تھا۔ میں محو حیرت میں ڈوبا ہوا اس دنیا کا ایک عجب نظارہ دیکھ رہا تھا۔ ہماری بس سبک خرامی سے ان عمارتوں کے ہجوم کی طرف رواں تھی۔ کچھ ہی دیر بعد میں اس منظر میں رچ بس گیا تو پھر دونوں کی خبر لی۔ وہ اپنے منہ کھولے ابھی تک بے ہوش ہو کر پڑے تھے۔ میں نے ایک کو ہلا کر جگایا تو اس نے دوسرے کو۔ پھر ہماری بس کچھ دیر بعد رینگتی ہوئی ان دیو ہیکل بلڈنگز کے نیچے بے حیثیت ہو کر موڑ کاٹنے لگی۔ ہر بندہ اور ہر موٹر کار جیسے کسی خوف کے مارے بھاگا جا رہا تھا۔ موٹر کاروں کا ایک ہجوم تھا جو ایک دوسرے کے پیچھے گویا اڑی جا رہی تھیں۔ برف نہ تھی مگر لوگوں نے اپنے آپ کو ڈھانپا ہوا تھا۔ اونچی عمارتوں کے نیچے لوگ دوڑتے پھر رہے تھے۔ گرے ہونڈ کا ٹرمینل یہاں بہت بڑا تھا۔ ہماری بس دور تک چلتی گئی اور آخر ہمیں ایک اسٹینڈ پر جا اتارا۔

ہم تینوں اپنے سامان کے ساتھ کھڑے ایک دوسرے کو اپنے فون نمبر دے رہے تھے۔ پروگرام یہ بنا کہ تیسرے دن ہم ایک دوسرے کو فون کر کے گھومنے پھرنے کا ایک پلان بنائیں گے۔ سرجی کو جرسی سٹی جانا تھا اور ان کا راستہ لمبا تھا۔ شہباز کو کوئی اور ٹرین لینی تھی اور میری منزل دونوں سے مختلف سمت میں تھی۔ ہم نے اپنے اپنے سامان اٹھائے اور اپنے اپنے راستوں کی جانب بڑھے۔ جانے سے پہلے کچی نیند سے جاگے سرخ آنکھوں کے ساتھ سرجی میرے کان کے قریب آ کر بولے۔ ”یہ ریڈ ایریا کیا ہوتا ہے اور کہاں ہوتا ہے؟“

میں رات بھر کے سفر کے بعد خالی دماغ الجھا کھڑا تھا۔ میں خاموش رہا اور اردگرد دیکھنے لگا۔ پھر یہ کہتے پائے گئے۔ ”سنا ہے ریڈ ایریا میں جانے والے لوگ آنکھوں کے اندھے اور گانٹھ کے پورے ہوتے ہیں۔“

میں غصے میں ان کی جانب دیکھنے لگا۔ مجھے ان کی بات کا مطلب سمجھ میں آ گیا تھا۔ وہ مجھے اپنے تئیں یہ بتا رہے تھے کہ ان علاقوں میں جانے والے لوگ مالدار ہونے کے ساتھ بے وقوف بھی ہوتے ہیں۔

میں ان کے بے وقت کے اس بے تکے سوال پر جھنجلا کر بولا۔ ”کیا کل کے کھائے پائے سر میں چڑھے ہیں؟“

منت کرتے لہجے میں بولے۔ ”بس ایک بار دور سے ہی نگر دیکھنا چاہتا ہوں۔ کہیں میری یہ خواہش جی کے جی میں نہ رہ جائے؟“

اس سے پہلے کہ مجھے اور زیادہ غصہ آتا، وہ کچھ بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے۔

میں بس ڈرائیور سے stream Valley جانے کے لیے ضروری معلومات لے چکا تھا۔ اس نے قریبی سب وے کا بتایا کہ وہاں سے 34th اسٹریٹ سے اسٹریم ویلی .... کے لیے ٹرین ملے گی۔ میں پوچھتا بچاتا ڈھونڈتا پھرتا سب وے پہنچا اور ٹرین پر 34th اسٹریٹ کے اسٹیشن کے لیے بیٹھ گیا۔ میری سیٹ کے سامنے ادھیڑ عمر دو سیاہ فام آ بیٹھے۔ خاصے دراز قد تھے۔ موٹی اور میلی لمبی جیکٹوں میں ملبوس بیٹھے وہ مجھے دیکھنے لگے اور میں انہیں۔ میں نے ان سے Stream Valley جانے والی ٹرین کے بارے میں معلومات مانگیں تو ان میں سے ایک بولا۔ ”ہم بھی وہیں جا رہے ہیں۔“ اور پھر مجھے دائیں ہاتھ کا انگوٹھا دکھا کر بولا۔ ”نو پروبلم۔“

میں نے سکون کا سانس لیا کہ چلو دو مقامی مجھے اپنے پیچھے لگا کر ٹرین اسٹیشن تک پہنچا دیں گے۔ وجہ یہ تھی کہ 34th اسٹریٹ کی سب وے سے نکل کر باہر کسی اور اسٹیشن سے Stream Valley کی ٹرین ملنی تھی۔ دوسرا اسٹیشن کہیں دور تھا اور مجھے ڈھونڈنے میں دشواری ہوتی۔ اب دو فرشتہ صفت انسان میرے سامنے تھے اور مجھے تو بس ان کا پیچھا ہی کرنا تھا۔

ہم 34Th اسٹریٹ پر چند منٹ بعد اترے اور جب سب وے اسٹیشن سے باہر آئے تو میں وہیں ڈاؤن ٹاؤن کی بلند عمارتوں کے سائے میں تھا..... وہی شور و غوغا اور دھکم پیل تھی جو گرے ہاؤنڈ ٹرمینل سے 8th اوینو آتے ہوئے ملی تھی۔ اردگرد وہی اونچی اونچی آسمان سے باتیں کرتیں سر اٹھائے کھڑی عمارتیں تھیں۔ کوئی عمارت مجھے پچاس منزل سے کم کی نہیں لگتی تھی۔ یہ سب دفاتر تھے یا رہائشی اپارٹمنٹ۔ منہٹن نیویارک کا سب سے مہنگا ترین علاقہ کہلاتا ہے۔ دوسرے علاقوں میں اگر کوئی گھر یا عمارت ایک سے دو سو ڈالر فی مربع فٹ کی ہے تو یہاں ڈیڑھ سے تین ہزار ڈالر فی مربع فٹ اس کی قیمت ہے۔ منہٹن میں کئی بار آیا اور اس کے بعد بار بار آیا۔ اس کو میں نے کھنگال ڈالا تھا۔ صرف منہٹن کو بیان کرنے کے لیے مجھے پوری کتاب درکار ہوگی۔ میں بعد میں اپنے پڑھنے والوں کو اختصار سے یہاں لے آؤں گا۔ ابھی تو میں ان دو سیاہ فاموں کا پیچھا کر رہا تھا جو اپنے بھاری وجودوں پر اپنے بھاری بیگ اٹھائے اجنبیوں کی طرح ادھر ادھر پریشانی سے دیکھتے کچھ

ڈھونڈ رہے تھے۔
ایک گھنٹے میں ان کے پیچھے پیچھے خجل ہوتا رہا اور پھر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ بھی میری طرح کوئی اجنبی ہیں۔ میں پہلے تو بڑے سکون سے ان کے پیچھے پیچھے بھاگنے کی کوشش کرتا رہا۔ مجھے پہلے تو کوئی فکر نہ تھی کیونکہ ان کے پیچھے لگ کر میں ٹرین اسٹیشن پہنچ سکتا تھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ وہ دونوں ایک چوراہے پر کھڑے ہیں۔ ایک دائیں جانب کو اپنا بازو پھیلاتا اور دوسرا اسے بائیں جانب کو گھسیٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر ان کا آپس میں ایک مختصر قسم کا جھگڑا ہوا اور پھر وہ دائیں جانب مڑ کر غائب ہو گئے۔ میں بھی اپنا بیگ اٹھائے ان دراز قدموں سے اپنی رفتار بمشکل ملا پایا۔ پھر انہوں نے دائیں جانب ایک اونچی، بڑی اور کھلی عمارت کے آگے کھڑے ہو کر اسے دیکھا۔ آپس میں کچھ مشورہ کیا۔ پھر ایک اور جھگڑا ان کے درمیان ہوا اور پھر وہ سامان سمیت اس عمارت کے گول گھومنے والے دروازوں میں داخل ہو گئے۔ میں یہی سمجھ کر ان کے پیچھے اسی عمارت میں گھس گیا کہ کئی سب وے کے اسٹیشن بڑے مالوں میں سے بھی نکلتے ہیں۔ مگر یہ تو کوئی ہوٹل کی لابی تھی۔ وہ دونوں سر جھکائے، لابی میں رکھے صوفوں کے پیچھے سے ایک گول چکر کاٹ کر انہی گول گھومنے والے دروازوں سے باہر لڑتے جھگڑتے نکل آئے۔ میں بھی انہی کے عین نقش قدم گھومتا ہوا باہر آ گیا اور کھڑے ہو کر ان کی جانب دیکھا جو اب آپس میں کچھ زیادہ ہی فساد کر رہے تھے۔

انہیں میری پروا نہ تھی کہ کوئی دم چھلا ان کے لگا ہوا ہے۔ وہ کچھ دیر غور و غوص کرتے رہے۔ پھر اپنی بے تحاشا جیبوں میں سے کسی ایک جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک پرفیوم نکالا اور حیرت ناک طور پر اس کا ڈھکن کھول کر دو دو گھونٹ چڑھا لیے اور ڈھکن کس کر بند کر کے ان کو اپنے لباسوں میں کہیں غائب کر دیا۔ مجھے تو بعد میں معلوم ہوا کہ یہ شراب کی بوتلیں تھیں۔ ان کو دو گھونٹ کا خمار چڑھا تو ایک جانب بھاگتے چلے گئے۔ میں بھی ان کے پیچھے جیسے کسی رسے سے بندھا گھسیٹتا چلا گیا۔ اب وہ کہیں بھی جاتے، میں ان کے ساتھ ایک طرح سے چپکا ہوا تھا۔ کئی موڑوں پر وہ کسی سے ٹکرائے تو میں بھی ٹکرایا۔ کئی بار کسی گاڑی کے تلے کچلنے سے ذرا سا رہ جاتے تو میں بھی انہی کی طرح نئی زندگی پاتا۔ پھر مجھے معلوم نہ ہوتا کہ گاڑی کا ہارن مجھ پر بجا ہے یا ان پر۔ مین ہٹن نیویارک کا واحد علاقہ ہے جہاں گاڑیوں کے ہارن بجتے ہیں۔ ہارنوں کی جلترنگ سن کر مدتوں بعد محسوس ہو رہا تھا کہ اپنے ملک میں کہیں گھوم رہا ہوں۔

ایک گھنٹے میں تو میں پسینے پسینے ہو گیا۔ ٹھنڈ تھی مگر کاٹ دار نہ تھی۔ موسم نیویارک سے ٹورنٹو تک ایک جیسا چلا آ رہا تھا۔ فروری کے آخری دن تھے۔ مارچ آتا ہے تو آسمان کے ڈھیلے پڑتے تیوروں سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اب موسم بدلے گا۔ یہ آسمان مجھے پہلی بار ڈھیلا پڑتا نظر آ رہا تھا۔

آخرکار ان دونوں کو زمین کے اندر جاتی کچھ سیڑھیاں نظر آئیں اور وہ اس میں اترتے چلے گئے۔ یہ ہمارا ٹرین اسٹیشن تھا۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے تھا۔ انہوں نے ایک مشین میں سکے ڈال کر ٹکٹ لیے اور میں نے بھی وہیں سے دس ڈالر کا نوٹ ڈال کر اپنا ٹکٹ نکالا۔ اسٹریم ویلی .... جانے والی ٹرین آئی تو میں ان کے پیچھے اسی بوگی میں سوار ہو کر ان کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گیا اور ان دونوں کو دیکھتا رہا۔

انہوں نے کافی دیر بعد میری جانب دیکھا اور مجھے محسوس ہوا کہ وہ اب میری جانب دیکھ کر مسکرا رہے ہیں۔ میں بھی مسکرانے لگا تو وہ دونوں خوش ہوئے اور اپنی جیبوں سے ''پرفیوم'' کی بوتلیں نکالیں اور غٹا غٹ پینے لگے۔ میں پہلے یہ سمجھتا رہا کہ سب شام کے بعد پیتے ہیں مگر صبح سویرے پینا مجھے الجھا رہا تھا۔ میرے پوچھنے پر ایک نے بتایا کہ کچھ دیر میں Stream Valley کا اسٹیشن آنے والا ہے۔ اب مجھے ان کا اعتبار نہ رہا تھا۔ میں نے ان سے کچھ پوچھا تو انہیں میرا سوال سمجھ میں نہ آیا۔ پھر انہوں نے کچھ کہا تو جواب میرے پلے نہ پڑا اور پھر ہم تینوں خاموش ہو گئے۔ دراصل کالوں کی انگریزی کسی نو وارد کو بمشکل سمجھ میں آتی ہے۔ انہیں سمجھنے کے لیے ان کے درمیان رہنا پڑتا ہے۔ ایک تو ان کے ہر دوسرے فقرے میں ایک گالی ضرور ہوتی ہے جو امریکا میں رہتے ہیں وہ اس گالی کو خوب سمجھتے ہیں۔

اسی دوران ٹرین زمین کی سطح پر آ کر ایک گونج کے ساتھ بھاگی چلی جا رہی تھی۔ میں نے اپنی نظریں کھڑکی سے باہر پیچھے کو بھاگتے نیویارک پر لگائی ہوئی تھیں۔

ٹرین خستہ حالت میں تھی۔ ٹورنٹو کی ٹرینیں نئی نکور اور صاف ستھری تھیں۔ یہاں تو حالت ان کی بہت بری تھی۔ چلتے ہوئے کھڑکھڑاتی زیادہ تھیں۔ یہ نیویارک تھا۔ یہاں سب کچھ اتنا زیادہ ہے کہ ان سے بمشکل سنبھالا جاتا ہے۔ نیویارک بہت کھلا کھلا اور پھیلا ہوا لگ رہا تھا۔ فاصلے زیادہ محسوس ہو رہے تھے۔ آسمان پر بادل تھے اور میں بیٹھا اسٹریم ویلی

...... کو سوچ رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ جب بھی تمنا بھابی کا پاکستان میں فون آتا یا خط آتے تو میں ہر وقت یہی کہتا۔ ''کیا میں کسی طرح امریکا آسکتا ہوں؟'' وہ مجھے وہاں کی تصویریں بھیجتیں۔ باتیں بتاتیں مگر یہ نہ کہہ پاتی کہ کس طرح میں امریکا آسکتا ہوں۔ جیسے آج کل مجھے جب کوئی یہ کہتا ہے کہ میں کس طرح امریکا آسکتا ہوں تو میرے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا ہے۔

آدھ گھنٹے بعد Sream Valley کا اسٹیشن آیا اور میں اپنا سامان لیے پلیٹ فارم پر کھڑا تھا۔ یخ ہوا چل رہی تھی مگر تنگ نہیں کررہی تھی۔

اپنے اردگرد سے تنہا ایک منزلہ اینٹوں کی عمارت اور ساتھ بنا ایک شیڈ اور شیڈ کے نیچے رکھے بینچ جن میں سے کچھ باہر خالی پڑے تھے۔ ان کو دیکھ رہا تھا۔ چند لوگ اترے اور دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہوگئے۔ ویک اینڈ تھا اور کوئی رش نہ تھا۔ دیوار سے لگے فون پر میں نے طارق کو کال کی۔ طارق کا یہ جواب سن کر میں نے فون رکھ دیا۔ ''تم گیٹ کے قریب پہنچو۔ تمنا ابھی آرہی ہے۔''

تین رویہ پٹڑیاں تھیں اور ٹرینیں تیزی سے گزر جاتیں، رکتی کوئی نہیں۔ لگ رہا تھا کہ وہ اتنا معروف اسٹاپ نہ تھا جہاں ہر ٹرین رکتی ہو۔ میں فون کرکے سگریٹ سلگائے باہر کھڑا تھا کہ ایک بڑی گاڑی میرے قریب آرکی۔ دیکھا تو تمنا بھابی تھیں۔ رسمی باتیں ہوئیں۔ سامان گاڑی کی پچھلی سیٹ پر رکھا۔ آگے فرنٹ سیٹ پر بیٹھا تو کچھ دیر غور سے دیکھتے ہوئے بولیں۔ ''بدرنگ تو پہلے بھی تھے مگر اب کچھ زیادہ ہوگئے ہو۔'' پھر اپنا مخصوص قہقہہ لگایا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

تمنا بھابی طارق سے شادی کے بعد میرے چچا کے گھر آئیں تو مجھ سے ان کی دوستی ہوگئی۔ ہر روز کیمرے میں فلم ڈلواتا۔ ان کی دلہن والی تصویریں بناتا اور شام کو پرنٹ کروالاتا تھا۔ خرچ ڈھائی سو ہوتا اور میں ان سے پانچ سو بٹور لیتا۔ میں اس گمان میں تھا کہ انہیں کچھ معلوم نہیں ہوتا مگر جب امریکا جانے لگیں تو بولیں۔ 'بدرنگ! تم کیا سمجھتے تھے کہ میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ بس دوست، بھائی سمجھ کر میں بھی خوش ہوجایا کرتی تھی۔''

فون کرنا ان دنوں بہت مہنگا سودا تھا مگر وہ باقاعدگی سے خط لکھتیں اور میں بھی اسی وقت جواب دے دیتا تھا۔ اب ان کا ایک آٹھ سالہ بیٹا شہروز تھا اور ایک سال سے ذرا کم کا ارشیان۔ وقت گزرا اور پھر میری شادی ہوئی۔ بچے ہوگئے تو خط لکھنے کی فرصت نہ انہیں ملی اور نہ مجھے۔ مگر فون پر رابطہ رہا۔ پھر میں کینیڈا آیا تو ہر روز باقاعدگی سے فون کرتیں۔ حوصلہ دیتیں۔ کچھ نصیحتیں کرتیں۔

آج جب وہ گاڑی میں بٹھا کر اپنے گھر لارہی تھیں تو میں اپنے پچھلے تمام لمحوں کو یکجا کرکے یہی سوچ رہا تھا۔

اردگرد اجڑے اور ویران درخت تھے۔ مکانات پرانے تھے۔ برف نہ تھی مگر یخ بستگی کا احساس تھا۔

طارق کا گھر بہت خوبصورت تھا۔ سفید رنگ سے پینٹ کیا گیا لکڑی سے بنا گھر ایک پُرسکون ماحول میں خاموش سا تھا کیونکہ چاروں جانب مکمل خاموشی تھی۔ اسی طرح کے گھر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کھڑے تھے۔ آگے ایک بڑا حصہ لان کا تھا۔ گیراج کے سامنے گاڑی رکی۔ میں اندر جانے لگا تو تمنا بھابی نے مجھے روک لیا۔ میں وہیں تھم گیا اور سوچا کیا ماجرا ہوسکتا ہے؟ اس نے آگے بڑھ کر سائیڈ کا دروازہ کھولا۔ پہلے الارم سسٹم کو ڈی الارم کیا اور پھر مجھے اندر آنے کا اشارہ دیا۔ اس طرح میں گھر میں داخل ہوسکا۔ میں نے سوچا کہ یہ امریکا ہے اور وہ بھی نیویارک، جہاں جرائم کی شرح زیادہ تھی۔

ایک ڈیوڑھی سے گزر کر میں ایک بڑے لاؤنج میں داخل ہوا۔ بائیں سمت دو کمرے تھے۔ ذرا آگے دائیں جانب کچن کاؤنٹر تھا اور اس کے پیچھے کچن۔ کاؤنٹر کے آگے تین اسٹول رکھے تھے۔ کچن کے بعد ایک بڑا اور کھلا ٹی وی لاؤنج تھا جس میں ساٹھ انچ کا ایک بڑا ٹی وی رکھا تھا۔ بائیں ہاتھ پر دوسرے کمرے کے ساتھ ڈور وال باہر کھلتی تھی اور ڈور وال کے پیچھے لکڑی کا ڈیک بنا ہوا تھا اور اس کے پیچھے ایک بہت بڑا لان تھا، جہاں متعدد درخت بہار کے انتظار میں کھڑے تھے۔

میں گھر کو دیکھ رہا تھا کہ طارق واش روم سے باہر نکلا اور مجھے گلے لگالیا۔ سفر کا پوچھا اور کچھ باتیں ہوئیں تو پھر کہنے لگا۔ ''میں ابھی اپنی فارمیسی جارہا ہوں۔ آج ہفتہ ہے اس لیے تین بجے تک واپس آجاؤں گا۔'' شہروز بھی اٹھ آیا۔ ایسے ملا جیسے مدتوں بعد کسی انسان کی شکل دیکھ رہا ہے۔ آتے ہی گھل مل گیا۔ طارق کہنے لگا۔ ''اسے زیادہ اپنے ساتھ فری مت کرنا ورنہ بہت تنگ کرے گا۔''

میں نے کہا۔ ''یار اپنا بھتیجا ہے، تنگ کرے گا تو کوئی بات نہیں۔''

طارق ہنس کر کہنے لگا۔ ''ٹھیک ہے۔ اب خود ہی بھگتنا۔'' بعد کے دنوں میں مجھے احساس ہوا کہ طارق کا مشورہ مناسب تھا۔

پُرتکلف ناشتا تھا جس میں چنے پائے، حلوا اور پراٹھے تھے۔ ناشتا ہم نے کاؤنٹر کے آگے رکھے اسٹولوں پر بیٹھ کر کیا۔ طارق چلا گیا۔ پوری رات کے سفر نے مجھے ادھ موا کیا ہوا تھا۔ شدید تھکاوٹ تھی۔ نیند سے برا حال تھا۔ تمنا بھابی نے کہا کہ تم بیسمنٹ میں سوجاؤ کیونکہ بچے گھر پر ہیں اور شور بہت ہوگا۔ کچن کے ساتھ کچھ خفیہ سیڑھیاں نیچے اتر رہی تھیں۔

تمنا بھابی مجھے نیچے لے آئیں جہاں گھپ اندھیرا تھا۔ بلب جلا تو دیکھا کہ ایک لاؤنج کے خاتمے پر دو کمرے ہیں۔ ایک کمرے کو اسٹور بنایا ہوا تھا۔ دوسرے کمرے میں ایک آرام دہ ڈبل بیڈ رکھا تھا اور کمرے کے کونے میں ایک دروازہ تھا جہاں سے کسی مشین کے دھیمے دھیمے چلنے کی آواز آرہی تھی اور یہی میرا کمرا تھا۔ لاؤنج میں بھی سامان رکھا ہوا تھا۔ بائیں جانب ایک اندھیرے کونے میں ایک بار کاؤنٹر تھا جس کے ساتھ واش روم تھا۔

تمنا بھابی چلی گئیں تو میں اپنا بیگ پکڑے اس نیم روشن کمرے میں کھڑا تھا۔ سونے کے لیے لیٹا اور نیند میں ڈوبنے لگا۔ ساتھ والے دروازے سے آتی مشین کی آواز کبھی بند ہوجاتی اور پھر کچھ دیر بعد خود بخود چلنا شروع ہوجاتی۔ میں پھر اس کے بند ہونے کا انتظار کرتا اور بند ہونے پر سونے کی سعی کرنے لگتا۔ جیسے کچھ آنکھ لگتی تو وہ مشین جاگ جاتی۔ ایک تو مشین کی گڑگڑاہٹ سونے نہ دیتی تھی بلکہ اس اندھیرے کمرے میں خوف بھرتی تھی۔ میں واقعی ایک طرح سے خوف زدہ ہوچکا تھا۔ ایک تو تہہ خانہ اور پھر اندھیرا کمرا اور پھر یہ سوتا جاگتا شور شرابا۔ پھر یہ ہوا کہ چھت سے دھم دھم کی آوازیں وقفے وقفے سے آنا شروع ہوگئیں۔ مشین بند ہوتی تو دھم دھم کی آوازیں آنا شروع ہوجاتیں۔ آوازیں تھمتیں تو مشین رونے لگتی۔ میری نیند تو اڑ چکی تھی۔ میں اس تہہ خانے کو اپنی قبر سمجھ بیٹھا تھا اور کسی انجانے خوف سے دل دہل رہا تھا۔ یہاں سے بھاگتا تو بزدلی کا طعنہ سننا پڑتا۔ اگر پڑا رہتا تو جان کے لالے تھے۔ میں سخت بے چینی کا شکار ہوچکا تھا۔ دو تین گھنٹے میں نے کرب میں گزارے اور پھر اوپر لاؤنج میں چلا آیا۔

تمنا بھابی کہنے لگی۔ ”اتنی جلدی کیوں اٹھ آئے؟ کچھ دیر اور سوتے رہتے۔“

میں نے بہانہ یہ کیا کہ اگر اب سوتا رہتا تو پھر رات میں نیند نہ آتی۔ رات کو اس تہہ خانے میں سونے کا سوچ کر ہی میں خود چکرا گیا۔ یا اللہ کیا رات کو بھی مجھے اس خوفناک تہہ خانے میں سونا ہوگا؟

میں نے باتوں باتوں میں اس مشینی آواز کا پوچھا تو وہ بولیں۔ ”یہ گھر 1930ء میں بنا تھا۔ اس وقت گھر کو ڈیزل سے حرارت پہنچائی جاتی تھی۔ اس بوائلر کو چلانے کے لیے ہفتے میں دو دن ایک کمپنی کی گاڑی آتی ہے اور ڈیزل ڈال جاتی ہے۔ جب گھر کا درجہ حرارت گرنے لگتا ہے تو یہ بوائلر چل پڑتا ہے۔ اس سے پہلے میں یہ پوچھتا کہ یہ دھم دھم کی آوازیں کہاں سے آتی ہیں کہ وہ خود بول پڑیں۔ ”شہروز کے کھیلنے سے آوازیں نیچے جاتی ہیں۔ لکڑی کی چھتیں ہیں۔ یہ کارپٹ پر ہر وقت اچھلتا کودتا رہتا ہے۔ اس کا شور بھی تمہیں آرہا ہوگا؟“

میں صوفے پر آرام سے بیٹھا یہ سب سن رہا تھا کہ شہروز نے دور سے ایک زقند بھری اور پورا کا پورا مجھ پر آگرا۔ میں صوفے پر گرا پڑا تھا۔ اسی اثنا میں وہ دوبارہ مجھ پر کود کر اب ٹی وی کے ساتھ کھڑا انس تنس کر لوٹ پوٹ ہورہا تھا اور تمنا بھابی کے شہروز پر چلانے سے اب چھت نہیں، پورا گھر لرز رہا تھا۔

میری اس مرمت پر ایک بار پھر تمنا بھابی نے مجھے چائے پلائی۔ اب میں محتاط ہو کر بیٹھا تھا کہ اگر شہروز کہیں سے مجھ پر آ ٹپکے تو میں تھوڑا بہت تو اپنا بچاؤ کر سکوں۔

چائے ختم کی ہی تھی کہ شہروز کسی کونے سے نکلا اور میرے پاس آکر بولا۔ ”انکل! باہر لان میں چلتے ہیں۔ میں نے بائیک چلانی ہے۔“

میں نے سوچا اب اس بچے کے شر سے بچنے کے لیے یہی بہتر ہے کہ اس سے دوستی کی جائے۔ میں نے جیکٹ پہنی۔ ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولا اور چپل پہنے باہر نکلنے لگا تو نوماہ کا ارشیان کارپٹ پر لڑھکتا ہوا کہیں سے آیا اور ٹانگوں سے چمٹ کر باہر جانے کی ضد کرنے لگا۔ تمنا بھابی نے کھینچ کر اسے مجھ سے علیحدہ کیا اور میں شہروز کے ہمراہ بیک یارڈ میں آگیا۔

ایک بہت کھلا لان تھا اور اس سے پیچھے اسی طرح کے اور اسی رنگ کے دیگر مکانات تھے۔ ہر جانب سناٹا ہوتا اگر شہروز اس منظر میں نہ ہوتا۔ وہ کہیں سے اپنی بائیک نکال لایا اور لان میں لگے درختوں کے اردگرد تیزی سے بائیک چلانے لگا۔ جس تیزی سے وہ بائیک چلا رہا تھا، اس سے زیادہ تیزی سے بولے بھی جارہا تھا جس کی مجھے کم از کم سمجھ نہ آرہی تھی۔ ایک بات جو میں سمجھ سکا وہ یہ تھی۔ ”انکل میرے ساتھ کھیلیں ناں۔“

اب میں اس دوڑتی سائیکل کے ساتھ کیسے کھیلتا؟ پھر سوچا اب اس سے دوستی کی ابتداء کسی نہ کسی طریقے سے تو کرنی

ہوگی۔ اسی لیے میں اس کی سائیکل کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگا اور پانچ منٹ میں پسینا میرے چہرے پر پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ گرمی لگی تو اپنی جیکٹ اتاری اور پھر بھاگنے لگا۔ میں تھک کر رکتا تو وہ مجھے سائیکل سے ٹکر مارنے کی کوشش کرتا۔ درختوں سے لپٹ کر چلنے والی ٹھنڈی ہوا میرے چہرے کو یخ رکھتی تھی جیسے میں نانگا پربت کے سامنے بیال کیمپ میں لیٹا وہاں سے آنے والی سرد ہواؤں کے بوسے اپنے چہرے پر لیتا تھا۔

اتنے میں طارق فارمیسی سے آگیا اور میری اس بھاگم دوڑ سے خلاصی ہوئی۔

اب ہم ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے اور اپنے شہر ڈیرہ کی باتیں کرنے لگے۔ نیویارک میں بیٹھے ہمیں اپنے شہر کی گلیاں اور بازار یاد آرہے تھے۔ ہمارے فارمیسی کے بہت سے کلاس فیلو نیویارک میں تھے۔ وہ بتا رہا تھا کہ کل امتیاز اسلم کے گھر رات کا کھانا ہے۔ وہاں وقار اور شہزاد بھی ہوں گے۔ وقار وہی تھا جسے 1992ء میں اپنے ساتھ امریکا لے جانے پر بڑی مشکل سے تیار کیا تھا۔ اس کا ویزا تو لگ گیا تھا اور میرا مسترد ہوگیا تھا۔

شام ہوئی تو طارق نے کہا۔ ”چلو! تمہیں مینہٹن دکھلاتے ہیں۔“

میں جلدی سے تہہ خانے میں اترا اور تیار ہو کر اوپر آیا تو شہروز میرے انتظار میں تھا۔ کہنے لگا۔ ”انکل جلدی کریں۔ میں آپ کے ساتھ بیٹھوں گا۔“

میں نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا۔ ”کیوں نہیں بیٹا۔“

مگر اب تمنا کے چلانے سے گھر کے ساتھ طارق بھی لرز اٹھا۔ وہ شہروز کو بتا رہی تھیں کہ انکل اگلی سیٹ پر بیٹھیں گے۔ شکر ہے کہ یہاں ایک سیٹ پر ایک ہی بندہ بیٹھ سکتا ہے، بھلے وہ آٹھ سال کا بچہ ہی کیوں نہ ہو۔

رات اتر آئی تھی اور ہم سب پیتھ فائنڈر جیپ میں ڈاؤن ٹاؤن مینہٹن جا رہے تھے۔ یہیں پر مجھے امریکا اور کینیڈا میں فرق کا پتا چلا۔ امریکا ایک کھلا وسیع ملک ہے۔ ہائی ویز کا جال بنا ہوا ہے۔ انسان چکرا جائے کہ میرا راستہ کہاں سے نکلتا ہے؟ کئی ایک ہائی ویز آپس میں گم ہو کر پھر سے علیحدہ ہو کر نکل رہی تھیں اور گاڑیاں اپنی رفتار سے بھاگتی پھر رہی تھیں۔ ہزاروں گاڑیاں بغیر کسی رکاوٹ کے اپنی روشنیاں پھیلائے ہمارے آگے پیچھے دوڑ رہی تھیں۔ جو شان و شوکت امریکا میں نظر آتی ہے وہ دنیا کے کسی اور ملک میں نہیں دکھتی۔ ہم نے کئی ایک بڑی بڑی ٹنل کراس کیں جو روشنیوں سے جگمگا رہی تھیں۔ میں آنکھیں پھاڑے ان روشنیوں کے سونامی کو دیکھتا اور حیرت زدہ ہو رہا تھا۔ یا اللہ یہ کون سی روشن دنیا ہے جو نظروں سے اوجھل رہ گئی تھی۔ میں گاڑی میں روتے ارشیان کی آوازوں سے بے نیاز بیٹھا اس عجب دنیا میں کھویا ہوا تھا۔ ہر پہلا تجربہ ہمیشہ یاد رہتا ہے اور یہ میرا پہلا دن تھا جب میں جگمگاتے عجائب خانے کو دیکھ رہا تھا۔

اب مینہٹن ڈاؤن ٹاؤن کی بلند ترین عمارتیں اپنی بے انتہا روشنیوں کے تکبر میں سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ ایک ناقابلِ یقین منظر میرے سامنے افق سے ابھر کر پھیلتا چلا گیا۔ میں دنگ تھا کہ جو میں آج دیکھ رہا ہوں کیا وہ ایک خواب ہے یا حقیقت۔ مینہٹن سے آتی گاڑیاں ایک طوفان کی مانند جیسے کسی جنگل سے نکل کر بھاگی چلی آتی ہوں اور بہت سی گاڑیاں کچھ دیکھنے کی آس میں اس روشنیوں کے شہر کی جانب جاتی نظر آرہی تھیں۔ طارق کیا بول رہا تھا، مجھے کچھ سمجھ میں نہ آرہا تھا اور نہ مجھے محسوس ہوا کہ وہ متواتر بول رہا ہے۔ وہ بہت بگڑا تھا جب دوسرے دن میں نے اس سے پوچھا۔ ”مجھے سب دوبارہ بتاؤ جو کل گاڑی میں سنا رہے تھے۔“

ہم ڈاؤن ٹاؤن میں داخل ہوئے تو دور کا نظارہ ختم ہوا اور ہم روشنیوں کے بیچ میں آگئے۔ اب چاروں جانب جگمگاتی عمارتیں کھڑی تھیں۔ طارق نے گاڑی کو سائیڈ پر روکا اور بولا۔ ”یہ جو دو عمارتیں ہیں۔ یہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر ہے۔“

میں نے کھڑکی سے سر نکال کر اوپر دیکھا مگر اس کی بلندی میری نظر کی دسترس سے باہر تھی۔ (اگلے سال یہ دونوں عمارتیں نہ رہیں اور نہ وہ دنیا جو اس دن تھی) ہم آگے آئے تو طارق نے کہا۔ ”سامنے امپائر اسٹیٹ بلڈنگ ہے۔“

اس کی تصویریں میں پہلے دیکھ چکا تھا اور آج وہ میری نظر کے سامنے تھی۔ کچھ دور آئے تو سامنے ٹائم اسکوائر تھا۔ ایک ہجوم اکٹھا تھا۔ چمکتے دمکتے چہرے، سینکڑوں فٹ تک پھیلے روشن بل بورڈز اور نیچے سڑک پر خوشیوں سے بے قابو ہوتے لوگ۔ میں جب پہلی بار لندن گیا تو میرا ایک کزن مجھے روشنیاں اور رونق دکھانے ٹریفلگر اسکوائر خصوصی طور پر لے گیا۔ مجھے دیکھ کر بولا تھا۔ ”لگتا ہے تمہیں زیادہ پسند نہیں آیا۔“

میں نے دل میں کہا تھا کہ جس نے ٹائم اسکوائر دیکھا ہو، اسے تو یہ بجھا بجھا دکھائی دے گا۔ بہرحال ہم اس کے بعد مینہٹن کے مختلف مقامات کو گاڑی میں بیٹھ کر بہت دیر تک

دیکھتے رہے۔ اسٹریٹ پر رونق میلہ بہت زیادہ تھا۔ انتہائی شاندار اور بلند عمارتیں روشنیوں سے نہائی خاموش کھڑی تھیں اور ایک ہنگامہ ان کے پہلو میں برپا تھا۔ عالیشان ہوٹل اور دفتری عمارتیں ایک چہل پہل کے ماحول میں اپنی جانب دیکھنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ میری اتنی زیادہ دلچسپی کو دیکھ کر طارق اور تمنا بھابی بہت خوش ہو رہے تھے۔

ہم مینھٹن سے واپس نکلے تو میں مڑ مڑ کر اسے دیکھتا رہا۔ اب مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ طارق نے ایک افغانی ریسٹورنٹ کے سامنے سڑک پر گاڑی پارک کی اور ہم ایک بھرے ہال میں داخل ہوئے۔ اردگرد خوش حال چہرے شادمان بیٹھے کھلکھلا رہے تھے۔ درمیانہ سائز کا ہال تھا۔ پندرہ بیس میزیں اور اردگرد شور شرابہ تھا۔ ہم بھی کودتے شہروز اور روتے ارشیان کے ساتھ داخل ہوئے۔ سامنے دیوار کے آگے ایک کاؤنٹر تھا اور ساتھ ایک دروازہ، جہاں سے بیرے خالی پلیٹیں لیے داخل ہوتے اور بھری ہوئی واپس لاتے۔ ہم ایک میز کے گرد بیٹھ گئے۔ تمنا بھابی نے مجھے کہا۔ "مینو دیکھو، تم نے کیا منگوانا ہے۔"

میں نے مینو پکڑا ہی تھا کہ شہروز نے میرے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔ تبھی طارق بولا۔ "مینو کو چھوڑو، پلیٹر منگواتے ہیں۔"

میں صرف پلیٹ کو جانتا تھا اور مجھے ان دنوں پلیٹر کا معلوم نہ تھا کہ یہ کسی ڈش کا نام ہے یا ڈش میں رکھے کئی کھانوں کا نام ہے؟ میں نے خاموشی میں ہی عافیت سمجھی اور کن انکھیوں سے شہروز کو دیکھنے لگا کہ کہیں مجھ پر اپنا وار نہ کر جائے مگر وہ پلیٹر آرڈر کرنے کے باوجود مینو کی ایک ایک ڈش کو پڑھتا جا رہا تھا۔

پلیٹر آیا تو مجھے معلوم ہوا کہ سارے افغانی کھانے اس میں ایک ترتیب سے سجے ہیں۔ چانپیں، کباب، پلاؤ، تکے، سلاد کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔ شہروز نے بسم اللہ کر کے پہلے اپنے دونوں ہاتھوں سے پلیٹر کی ترتیب کو بے ترتیب کیا۔ تمنا بھابی نے چبری نظروں سے اسے دیکھا اور وہ ردعمل میں ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوا۔ کھانا بہت لذیذ تھا۔ بہت کچھ کھایا اور اتنا ہی ڈبوں میں بند کر کے گھر واپس لائے۔ تمنا بھابی نے کہا۔ "قہوہ گھر پر پئیں گے۔"

شہروز اس اعلان پر بہت خوش ہوا اور تالیاں بجانے لگا۔ ہم گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو چکے تھے اور اس کی تالیاں ابھی تک بج رہی تھیں۔ اب ماشاء اللہ شہروز ایک اسمارٹ نوجوان بن چکا ہے۔ میں تو ان دنوں کی بات کر رہا ہوں جب وہ آٹھ سال کا بچہ تھا۔

ہم گھر آئے اور ٹی وی لاؤنج کے آرام دہ صوفوں پر بیٹھے گرم افغانی قہوے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ طارق نے ٹی وی آن کیا اور کہا کہ اب تو اردو چینل بھی آنا شروع ہو گئے ہیں۔ میرے لیے یہ انوکھی بات تھی کہ امریکا میں بیٹھ کر کوئی اردو چینل ٹی وی پر دیکھ رہا ہوں۔ میں محو حیرت بیٹھا تھا اور یہی میری بھول تھی کہ میں شہروز سے ایک لمحے کے لیے ہی غافل ہوا تھا۔ میرا منہ حیرت اور خوف کے مارے زیادہ زور سے کھل گیا جب میں نے فضاء میں اڑتے شہروز کو دیکھا جس کا رخ میری جانب تھا۔ دراصل اس نے کہیں سے تاک کر مجھ پر چھلانگ لگائی تھی اور وہ ان لمحوں میں فضاء میں محو پرواز تھا اور اڑتا ہوا میری جانب آ رہا تھا۔ میں اپنے بچاؤ کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ وہ مجھ سے ایک ڈرون کی مانند ٹکرایا اور پھر میرے پرخچے اڑ گئے۔ شکر ہے کہ اس وقت چائے کا کپ میز پر رکھا تھا۔ اب اس پر ہنسی کا شدید دورہ پڑ چکا تھا اور طارق اسے ڈانٹتے ہوئے زور زور سے "شہروز، شہروز" کہہ رہا تھا۔

میں نے طارق سے کہا۔ "یار یہ تو نے بچہ جنا ہے یا کہ جن؟"

وہ تاسف بھرے لہجے میں کہنے لگا۔ "یہاں کے بچے توجہ چاہتے ہیں۔ ہمیں تو پاکستان میں گھر اور محلے میں کھیلنے کو بہت سے بچے مل جاتے تھے مگر یہاں یہ پورا دن بوکھلایا ہوا پھرتا رہتا ہے کہ کوئی ملے جس کے ساتھ میں کھیل سکوں۔ ماں باپ کے چہروں سے تو یہ اب اکتا چکا ہے مگر جب کوئی نیا چہرہ دیکھتا ہے تو اس سے کھیلنے کی کوشش کرتا ہے۔"

میں نے بڑی متانت سے یہاں کے بچوں کا یہ مسئلہ سنا اور پھر سنجیدگی سے اپنے آپ کو اس کے کھیل سے بچانے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔

کھیلنے والا پورے دن کی اچھل کود سے شاید تھکا ہوا تھا، اسی لیے سونے چلا گیا تو میں بھی ریلیکس ہو گیا۔ طارق سے باتیں شروع ہوئیں۔ وہ مجھے اپنے امریکا آنے کے بعد کے قصے سنا رہا تھا۔ ان میں مشکلیں بھی تھیں اور حیرتیں بھی شامل تھیں۔ دکھ کم تھے کیونکہ وہ اپنے آپ کو راضی رکھنا جانتا تھا۔ وہ اپنی محنتوں کی باتیں سنا رہا تھا اور بار بار تولیے سے اپنی ناک صاف کر رہا تھا۔ میں نے پوچھا تو بولا کہ پچھلے پندرہ سال سے الرجی ہے۔ وہ بتا رہا تھا کہ برف صاف کی ہیں، اسٹوروں کے باہر گاہکوں کے لیے دروازہ کھولنے کی جاب بھی کی ہے اور

کالنگ کارڈز بھی بیچے ہیں۔

میں نے پوچھا۔ ''وہ جو پہلی بار پاکستان آئے تھے تو کس بے دردی سے پیسے اڑا رہے تھے؟''

کہنے لگا۔ ''یہاں خوش ہونے کو کیا تھا میرے لیے؟ وہاں پیسے اڑاتا تو سب خوش ہوتے اور پھر میں بھی انہیں دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''جب تم نے پہلی بار پاکستان ماں کو پیسے بھیجے تھے تو خالہ بہت خوش ہوئی تھیں۔''

جواب دیا۔ ''وہی پیسے بھیجے تھے جو اپنے ساتھ لایا تھا۔ میرے پاس تو ان دنوں کوئی جاب بھی نہ تھی۔''

وہ بولتا رہا اور میں سنتا رہا۔ وہ بتا رہا تھا۔ ''میں آیا تو کسی جاننے والے کے فلیٹ میں رکا تھا۔ کالوں کا علاقہ تھا۔ باہر با آسانی جا بھی نہیں سکتا تھا۔ پورا دن کمرے میں پڑا رہتا تھا۔ شکر ہے وہاں وی سی آر تھا اور چند فلمیں بھی رکھی تھیں۔'' سالا صاحب'' فلم تو میں نے پچاس بار دیکھ لی ہوگی۔ واپس بھی نہیں جاسکتا تھا کیونکہ ٹکٹ کے پیسے بھی نہیں تھے۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔

میں سمجھا کہ رو رہا ہے مگر اس نے تولیہ اٹھایا اور پھر سے ناک صاف کی اور گالی دے کر کہنے لگا۔ ''یہ الرجی بھی تو جان نہیں چھوڑ رہی۔'' پھر تولیہ اپنے اوپر لپٹے کمبل پر رکھا اور مجھ سے پوچھا۔ ''میں کیا کہہ رہا تھا؟''

میں نے کہا۔ ''تم بتا رہے تھے کہ پہلی بار تم نے سالن کیسے بنایا تھا۔'' وہ دراصل بھول چکا تھا کہ وہ مجھے کیا بتا رہا تھا اور اسی لیے اس نے بعد میں مجھے کھانا بنانے کی بہت ساری ترکیبیں یاد کرا دیں۔

رات کا ایک بج چکا تھا اور ہم کمبلوں میں لپٹے، آرام دہ کاؤچز پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ گزشتہ رات سفر کی تھکاوٹ تھی اور دن میں نیند بھی پوری نہ ہوئی تھی۔ طارق نے کہا کہ وہ ابھی کچھ دیر اور بیٹھے گا اور مجھے اس اندھیرے تہہ خانے میں اتار دیا۔

جیسے ہی تہہ خانے میں اترا تو کسی خوف نے مجھے جکڑ لیا۔ گھپ اندھیرا اور اسی اندھیرے میں غراتی مشین پورے تہہ خانے میں ڈر اور خوف پھیلا رہی تھی۔ میں نے بہت سی دعائیں اور قرآنی آیتیں پڑھیں۔ زور و شور سے چاروں جانب پھونکیں۔ آرام دہ بستر پر رضائی اوڑھے لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھ پر ایک اور بھید یہ کھل رہا تھا کہ میں اتنا بزدل ہوں کہ اندھیرے سے گھبرا رہا ہوں۔ ایسا تو میں کبھی نہ تھا اگر مشین چپ رہتی تو شاید مجھے سکون مل جاتا مگر وہ تو مسلسل اپنے ہونے کی یاد دہانی کروا رہی تھی۔ میں پوری رات کروٹیں بدلتا رہا اور ہر بار چونک کر اٹھ جاتا۔ ساری رات اٹھتے بیٹھتے گزری۔ سونا دو بھر ہوگیا تھا۔ ٹائم دیکھا تو صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ اپنا کمبل لیے اوپر آیا اور ٹی وی لاؤنج میں پڑے ایک صوفے پر سو گیا۔

میں گہری نیند میں تھا کہ محسوس ہوا کہ کوئی میرا کمبل کھینچ رہا ہے۔ میں نے کمبل کو اپنے رات والے خوف کی وجہ سے اور زیادہ جکڑ لیا اور پھر کسی نے اسے دوبارہ کھینچا۔ پہلے تو ڈر کے مارے پڑا رہا۔ میں بھول گیا تھا کہ اس وقت میں لاؤنج میں صوفے پر لیٹا تھا۔ پھر میرے پاؤں میں گدگدی سی ہوئی تو میں اور زیادہ دہل گیا۔ یہ کھینچا تانی بڑھتی جا رہی تھی اور میں کمبل میں لیٹا تھر تھرا رہا تھا۔ آخر کار ہمت کر کے میں نے ڈرتے ڈرتے کمبل سے ذرا سی آنکھ نکال کر باہر دیکھا تو شہروز تھا۔ وہ حیران کھڑا تھا کہ آج لاؤنج میں صوفے پر کون سویا ہے۔ میں نے کھینچ کر لات ماری تو وہ چھلاوا صاف بچ نکلا۔ میرے چہرے کو دیکھا۔ پھر پہچانا اور ہا ہو کرتا ایک بڑی چھلانگ لگا کر مجھ پر آبیٹھا۔ دن نکل چکا تھا۔ تمنا بھابی کچن میں آہستگی سے کام کر رہی تھیں کہ میں بے آرام نہ ہو جاؤں مگر ان کا لاڈلا بیٹا اب مجھ سے کسی جن کی طرح چمٹ کر میرا کمبل کھینچ رہا تھا۔ تمنا بھابی اسے ڈانٹتے ہوئے اس کی جانب آئیں اور زبردستی اسے اٹھا کر لے گئیں مگر وہ جاتے جاتے میرا کمبل بھی اپنے ساتھ کھینچ کر لے گیا۔ مجھے اندازہ نہ تھا کہ نیویارک میں یہ جن مجھ سے چمٹ جائے گا۔

میں با دل نخواستہ اٹھا۔ نیچے جا کر شیو کی۔ گرم کھولتے پانیوں سے غسل کیا اور پھر تازہ دم ہو کر کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا۔

سوچا کہ سرجی اور شہباز کو فون کر کے خیریت معلوم کر لوں۔ سرجی شاید کل سے گھر سے باہر نہیں نکلے تھے اس لیے چھوٹتے ہی پوچھا۔ ''کل کا کیا پوگرام (پروگرام) ہے؟''

میں نے پوچھا۔ ''پہلے یہ بتاؤ کل کا دن کیسے گزرا؟ سائی صاحبہ اور فیض صاحب نے کچھ آؤ بھگت کی؟''

کہنے لگے۔ ''وہ تو ماشاءاللہ بہت اچھے ہیں۔ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔''

میں نے کہا۔ ''سرجی جو آپ اتنی زیادہ تعریفیں کر رہے ہیں، مجھے تو کوئی گڑبڑ لگتی ہے۔''

میری بات سن کر کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے اور پھر

آہستگی سے فون پر بولے۔ ''جا کی بنندی دا کی منڈی۔'' میں تو یہ مثل سن کر چکرا گیا۔ مطلب پوچھا تو صرف یہ بولے۔ ''جہاں کا کھائیں گے، انہی کے تو گن گائیں گے۔'' میں خاموش ہو گیا۔ انہوں نے دوبارہ سے اپنا سوال دہرایا۔ ''بتاؤ کل کا پروگرام کیا ہے؟''

طارق نے کہا تھا کہ کل پیر کو وہ مجھے اپنی فارمیسی لے جائے گا اور سامنے ہی ٹرین اسٹیشن ہے اور اسی سے میں ڈاؤن ٹاؤن پہنچ سکتا ہوں۔ میں نے سرجی کو کہا۔ ''منگل کا پروگرام بناتے ہیں۔'' کیونکہ کل میں طارق کے ساتھ فارمیسی میں وقت گزارنا چاہتا تھا۔ یہ نہیں کہ مجھے اس کے اندر بیٹھے رہنا تھا۔ طارق جب بھی پاکستان آتا تو یہی کہتا رہتا کہ میری فارمیسی کے پیچھے بہت خوبصورت بیچ ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس کی فارمیسی کسی اور دنیا میں ہوگی جس کے ساتھ بیچ اور سمندر ہے۔ اٹلانٹک اوشین (بحر اوقیانوس) کے ساتھ بنی اس بیچ کو دیکھنے کا مجھے اشتیاق تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ان سردیوں میں یہ بیچ خالی پڑی ہوگی مگر میرے لیے اسے تنہائی میں دیکھنے کا اس سے اچھا موقع کوئی نہ تھا۔ میں نے آج تک کسی سمندر یا بحر کو اپنی آنکھوں سے سامنے نہیں دیکھا تھا۔ سمندر کی لہروں کے قریب اکیلے بیٹھ کر انہیں سننے کا ایک اپنا لطف ہے۔ سرجی کو میں نے پرسوں منگل کے دن بیٹری پارک پہنچنے کا کہہ دیا اور انہوں نے جی جی کر کے فون بند کر دیا۔ شہباز کو بھی فون کر کے اسی پروگرام پر راضی کر لیا۔

طارق اٹھا تو متواتر چھینک رہا تھا اور تولیہ بھی ساتھ اٹھا رکھا تھا۔ پوچھا تو کہنے لگا۔ ''یار بہت بری الرجی ہے۔''

ناشتا سامنے رکھا گیا تو ایسا لگا کہ میں گوالمنڈی میں بیٹھا ناشتا کرنے آیا ہوں۔ میں نے تازہ پوریاں دیکھیں تو تمنا بھابی سے پوچھا۔ ''کیا آج خود بنائی ہیں؟''

جواب آیا۔ ''نہیں! ایک پاکستانی عورت یہاں قریب ہی کیٹرنگ کا کام کرتی ہے۔ کل اسے پوریوں اور حلوے کے ساتھ چنوں کا آرڈر دے دیا تھا اور ابھی میں وہیں سے لائی ہوں۔''

میں نے پوچھا۔ یہاں تو لوگوں کے پاس بہت پیسا ہوتا ہے پھر وہ یہ دس پندرہ ڈالر کا آرڈر کیوں لیتی ہیں؟''

تمنا بھابی بتانے لگیں۔ ''پاکستان میں لوگ کسی گرین کارڈ ہولڈر کو پرنس چارمنگ سمجھ کر اپنی حسین اور پڑھی لکھی لڑکیوں کے رشتے دے دیتے ہیں۔ یہاں آ کر لڑکی کے سامنے بھید کھلتا ہے کہ میں تو کسی فائیو اسٹار جیل میں قید ہو چکی ہوں۔ پہلا سال روتے اور ڈپریشن میں گزرتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ ماحول کی عادی ہوتی چلی جاتی ہیں اور پھر خاوند کا ہاتھ بٹانے کے لیے کسی اسٹور پر جاب شروع کر دیتی ہے۔ اگر کوئی بچہ پیدا ہو جائے تو گھر بیٹھے کسی کے لیے ویک اینڈ پر کچھ کیٹرنگ کر کے سو ڈیڑھ سو ڈالر ایک دن میں بنا لیتی ہیں۔ جب پاکستان جاتی ہیں تو اتنی زیادہ آؤ بھگت پر اصل صورت حال اپنے ماں باپ سے بھی چھپا لیتی ہیں۔ ایک بات میں نے اور بھی نوٹ کی کہ اکثر کے خاوند واجبی شکل و صورت کے تھے مگر بیویاں بہت خوب صورت مگر اداس تھیں۔ معلوم یہ ہوا کہ لڑکے کے ماں باپ اپنے گرین کارڈ پرنس چارمنگ کے لیے شہر کی حسین اور امیر لڑکی کو ہی پسند کرتے ہیں اور لڑکی کے ماں باپ بھی اپنے اٹھنے بیٹھنے والوں میں یہی کہتے پائے جاتے ہیں۔ ''ماشاءاللہ بیٹی امریکا میں ہوتی ہے۔'' میں ادھر کسی کی دل آزاری نہیں کرنا چاہتا۔ صرف یہی کہنا چاہوں گا کہ لڑکی والے کم از کم لڑکے کی تعلیم اور جاب کا بھی کچھ پتا کر لیا کریں۔

بات کبھی کبھار الٹی پڑ جاتی ہے۔ بیچ میں مجھے ایک دوست کی کہانی یاد آ گئی۔ وہ امریکا کی ایک بڑی ریاست میں فارماسسٹ تھا۔ اکیلا تھا اور اچھا خاصا کماتا بھی تھا۔ اس کی منگنی پاکستان میں ایک پڑھی لکھی اور اچھے گھرانے کی لڑکی سے ہوگئی۔ اتفاق سے میں لڑکی اور اس کے والدین کو بھی اچھی طرح جانتا ہوں۔ میرا دوست بہت خوش تھا۔ پانچ وقت کا نمازی اور وہ بھی پندرہ منٹ کی ڈرائیو کر کے مسجد میں باجماعت نماز پڑھتا تھا۔ نکاح ہو چکا تھا اور اب وہ نیا مکان خرید کر اپنی دلہن کا انتظار کر رہا تھا۔ ایک دو بار اس نے اپنی منکوحہ سے کہا کہ سر پر حجاب لینا چاہیے اور نماز پابندی سے پڑھنا اور اسی طرح کے مذہبی مشورے دیے۔ ایک دن فون کیا تو رو رہا تھا۔ پوچھا تو بتایا کہ لڑکی نے تنسیخ نکاح کا مقدمہ کر دیا ہے کہ میں اسے نماز پڑھنے کا کہتا ہوں۔ میں خود حیران رہ گیا کہ اتنا اچھے کردار کا لڑکا اور تعلیم یافتہ کس طرح ٹھکرایا جا سکتا ہے۔ خیر لڑکی انکاری ہو گئی اور اس نے لڑکی کی فرمائش پر طلاق بھیج دی۔ وہ اب ٹوٹ چکا تھا۔ مجھ سے کہا کہ مجھے پاکستان میں کوئی رشتہ ڈھونڈ کر دو۔ اتنے میں خود مسجد میں اپنی شادی کا ایک اشتہار بھی لگوا دیا۔ ایک ہفتے میں انڈین مسلمان لڑکی ملی اور والدین نے جھٹ پٹ نکاح کر کے بیٹی اس کے حوالے کر دی۔ لڑکی سیاحتی ویزے پر امریکا آئی ہوئی تھی۔ انہیں گرین کارڈ فارماسسٹ لڑکا مل گیا تھا جس کا اپنا گھر بھی تھا۔

میں ایک بار اسی کے شہر گھومنے گیا تو اس نے ہمیں گھر پر کھانے کی دعوت دی۔ اس کی حالت دیکھی تو میں شدید صدمے سے دوچار ہوا۔ وہ گھر کا نوکر بنا ہوا تھا۔ بیوی بیٹھی دور سے اس پر حکم چلا رہی تھی کہ اب کھانے کے برتن دھو دو، اب چائے بنا کر لے آؤ، بیٹا رو رہا ہے اس کا فیڈر بنا دو۔ وہ اپنے دو چھوٹے بچوں کے ساتھ علیحدہ کمرے میں سوتا تھا کیونکہ بیوی رات کو بچوں کے رونے سے بے آرام ہوتی تھی۔ دراصل میرے دوست کو ایک رشتہ ختم ہونے پر یہ وہم ہو گیا تھا کہ اب اس کی شادی نہیں ہو سکے گی اور اب وہ جاب کے علاوہ گھر کا کچن سنبھالے سب کو یہ یقین دلا رہا تھا کہ اس میں تو کوئی خامی نہ تھی بلکہ طلاق مانگنے والی نے اس کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ اب اس کی دوسری بیوی نے اس کے احساس کمتری کو بھانپ لیا تھا اور اس کا بھرپور فائدہ اٹھا رہی ہے۔ واقعی شادی ایک جوا ہے جس میں کبھی کوئی ہارتا ہے اور کسی کی جیت ہوتی ہے۔

میں اور طارق یہاں کے بچوں اور گھریلو زندگی کے موضوع پر بات کرتے رہے تھے۔ تین بجے ہم تیار ہو کر اپنے کلاس فیلو امتیاز اسلم کے گھر روانہ ہوئے۔ طارق نے بتایا کہ اس نے نیا گھر خریدا ہے اور آج اپنے دوستوں کو پارٹی دے رہا ہے۔ طارق نے اسے میرے آنے کا بتایا تو اس نے آج کا ہی دن مقرر کر لیا۔

جس سال میں یونیورسٹی میں لیکچرر بھرتی ہوا تو دوسرے سال میں کلاس کا اسٹڈی ٹرپ لے کر کراچی آیا تھا۔ امتیاز ان دنوں جناح پوسٹ گریجویٹ اسپتال میں فارماسسٹ کی جاب کر رہا تھا۔ وہ ڈاکٹرز ہاسٹل میں رہتا تھا اور میں اسی کے ہاں ٹھہرا تھا۔ وہ ہر دن ڈاکیے سے اپنی ڈاک کا پوچھتا اور نہ ملنے پر نماز پڑھنے بیٹھ جایا کرتا تھا۔ میرے پوچھنے پر بتایا کہ اس کے چچا نیو یارک میں رہتے ہیں اور امتیاز کی شادی وہاں کسی پاکستانی لڑکی سے کروائی ہے۔ اب امتیاز کو اپنے اسپانسر کے کاغذات کا انتظار تھا۔ میں اسے رشک بھری نظروں سے دیکھتا کہ وہ کچھ مہینوں میں امریکا چلا جائے گا اور پھر وہ واقعی چلا گیا۔ اب دس سال بعد اس سے ملنے جا رہا تھا۔

اس کا گھر نیو یارک کے ایک علاقے مڈل ٹاؤن میں تھا۔ ہمیں دو گھنٹے لگ گئے۔ مڈل ٹاؤن کا علاقہ کسی پہاڑی پر بنا ہوا تھا۔ سڑکیں اوپر نیچے جا رہی تھیں۔ انتہائی پُرسکون اور شور شرابے سے پاک و صاف۔ مجھے مڈل ٹاؤن بہت پسند آیا۔ میں خاموشی اور خوشی سے اس کی تنگ سڑکوں کے پیچ و خم دیکھتا رہا۔ سرد اور تنہا کھڑے بے پتوں کے لاتعداد درخت اس منظر میں بہت بھلے محسوس ہو رہے تھے۔ طارق کے علاقے میں برف نہیں تھی مگر یہاں زمین برفانی سفید چادر سے ڈھکی تھی۔ یہاں ٹھنڈ بھی کچھ زیادہ لگ رہی تھی۔ گاڑی ایک اونچائی پر بنے گھر کے نیچے رکی اور طارق نے اوپر لکڑی سے بنے کسی پرانے مگر خوب صورت گھر کو دیکھ کر کہا۔ ”لگتا تو یہی ہے۔“ اور پھر کسی نے ایک زوردار چھینک ماری۔ ناک صاف کرنے کے لیے باتھ روم کا بڑا تولیہ ہمیشہ ساتھ رکھتا تھا۔ پھر اسی تولیے سے ناک کو رگڑ کر صاف کیا اور ڈرائیونگ سیٹ سے نیچے اتر آیا۔ ساتھ میں تولیہ اٹھانا نہیں بھولا تھا۔

ہم لکڑی کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئے تو امتیاز بڑے تپاک سے ملا۔ گھر کوئی عجائب گھر کی مانند تھا۔ پرانا، صاف ستھرا اور مکمل طور پر سارا لکڑی سے بنا ہوا تھا۔ فرش، دیواریں اور چھت سب قدیم اسٹائل کی تھیں۔ مجھے اس کا گھر اور محل وقوع بہت پسند آیا۔ سیمنٹ اور سریے سے بنے گھروں سے بہت بہتر تھا۔ یہاں تو ویسے بھی سیمنٹ سے گھر نہیں بنائے جاتے مگر اس گھر پر لکڑی کا استعمال بہت تھا۔

ہم ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ ایک بڑا ٹی وی رکھا تھا۔ کھڑکیوں کے باہر درخت جھک جھک کر اندر جھانک رہے تھے۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میں مری کے سیسل ہوٹل میں آ گیا ہوں، حالانکہ میں اس میں کبھی نہیں گیا اور صرف فلموں میں دیکھا تھا جن کی شوٹنگ وہاں ہوئی تھی۔

اتنے میں وقار اور شہزاد بھی آ گئے۔ سب ایک دوسرے سے بڑی گرم جوشی سے ملے۔ یونیورسٹی کی باتیں شروع ہوئیں تو ختم ہونے کا نام نہ لے رہی تھیں۔ رات گزرتی گئی۔ کھانا کھایا گیا اور پھر سے باتیں شروع ہو گئیں۔ وہ سب اچھی جاب کرتے تھے اور میں ابھی نیا رنگروٹ بھرتی ہوا تھا۔ مجھے بہت ساری نصیحتیں کی گئیں۔ میں اپنے پلے باندھتا گیا مگر میری نظریں کھڑکیوں سے باہر درختوں پر تھیں جو مجھے کسی جنگل یا ویرانے کا تاثر دے کر مجھے مدہوش کر رہے تھے۔

ہم گھر واپس پہنچے تو رات بہت بیت چکی تھی۔ سب جلدی سونے چلے گئے کیوں کہ کل سے کام کا پہلا دن شروع ہو رہا تھا جو سب کو بوجھل لگتا ہے۔ میں بھی تہہ خانے سے کمبل اٹھا لایا اور صوفے پر گہری نیند میں ڈوبتا چلا گیا۔

...

صبح سویرے میری آنکھ اس شور سے کھل گئی جو شہروز اور اس کی ماں کے درمیان کسی بحث سے اٹھ رہا تھا۔ شہروز اسکول جا رہا تھا اور ماں اسے ناشتا کھلا رہی تھی۔ تمنا بھابی نے مجھے چائے دی اور ساتھ یہ بھی کہا۔ ”تم بھی تیار ہو جاؤ۔ ابھی

طارق نکلنے والا ہے۔"

مجھے اس کے ہمراہ اس کی فارمیسی جانا تھا جس کے پیچھے بحراوقیانوس کے پانیوں سے لگی راک وے بیچ تھی۔ مجھے سمندر کے سامنے بیٹھ کر اس کی موجوں کو دیکھنا تھا۔

ساگر کنارے سے موتی چنوں
سانس گنتی رہوں، ساز سنتی رہوں

میں فٹافٹ تیار ہوا۔ ناشتا تیار تھا اور ہم دونوں نے سیر ہو کر اپنے پیٹ بھرے اور چل پڑے۔ باہر ہوا سرد تھی۔ میں نے اپنے آپ کو لپیٹ رکھا تھا۔ طارق صبح نو سے شام چھ بجے تک فارمیسی کھولتا ہے۔ فارمیسی کا دروازہ صرف فارماسسٹ ہی کھول سکتا ہے جب فارمیسی بند کرنی ہو تو وہی پہلے سب کو باہر نکالتا ہے اور پھر دروازہ خود ہی بند کرتا ہے۔ فارماسسٹ نہ ہو تو پھر فارمیسی بھی بند رہتی ہے۔ راستے میں طارق مجھے یہ معلومات دے رہا تھا۔

طارق نے گاڑی ایک گھر کے سامنے روکی اور کہا جے (Jay) کو اٹھانا ہے۔ میں نے پوچھا کہ یہ جے کون ہے تو بولا میرا ملازم ہے اور کیش رجسٹر پر ہوتا ہے۔ معلوم ہوا کہ طارق روزانہ اسے گھر سے اٹھاتا ہے اور واپسی پر ڈراپ بھی خود کرتا ہے۔ وجہ معلوم کی تو ایک گالی دے کر کہنے لگا۔ "روزانہ کسی نہ کسی بہانے لیٹ ہو جاتا ہے۔ راستے میں اس کا گھر پڑتا ہے تو میں ہی اسے اٹھا لیتا ہوں۔"

گاڑی رکی اور جے اپنے چھوٹے سے گھر سے برآمد ہوا اور کچھ کہے بغیر پچھلی سیٹ پر آ بیٹھا۔ ہسپانوی نسل کا جے عمر میں تیس سال اور کرتوتوں میں بھی تیس سال کا تھا۔ طارق بتانے لگا کہ اس نے اب تیسری شادی کی ہے۔ دو کو بھگا چکا ہے اور آخری بیوی بہت خوبصورت ہے مگر پھر بھی ایک اور گرل فرینڈ رکھی ہوئی ہے۔

ہم فارمیسی پہنچے تو ایک عورت پہلے سے ہی باہر گاڑی میں بیٹھی انتظار کر رہی تھی۔ طارق نے بتایا کہ یہ فلیر ہے، یہودی ہے اور کام بہت اچھا کرتی ہے۔ عمر پچاس کے قریب ہوگی۔ لاغر چہرہ اور ڈھلتا جسم۔ چہرے پر چوٹ کا نشان تھا۔ طارق نے بتایا۔ "آئے دن شوہر سے پٹتی ہے اور یہ نشان بھی اس کے پٹنے کا ہے۔"

"میں نے کہا مگر یہاں تو لوگوں کے بہت زیادہ حقوق ہوتے ہیں تو یہ کیسے روزانہ شوہر سے مار کھا لیتی ہے؟"

کہنے لگا۔ "یہ سب کتابی باتیں ہیں جتنا گھریلو تشدد امریکا میں ہوتا ہے شاید ہی کسی اور ملک میں ہوتا ہوگا۔ پھر بتایا کہ فلیر بھی اپنے شوہر سے طلاق لے رہی ہے کیونکہ اسے ایک نیا بوائے فرینڈ مل گیا ہے۔"

میں یہ سب کچھ حیرت سے سن رہا تھا کیونکہ یہ میرے لیے نئی اور انوکھی باتیں تھیں۔

فارمیسی ایک قسم کے ویرانے میں تھی۔ آس پاس کوئی اور دکان نہ تھی۔ سناٹا چھایا ہوا تھا اور ہر جانب ہو کا عالم تھا۔ دور کچھ گھر اور دکانیں نظر آ رہی تھیں مگر فارمیسی کے اردگرد سائیں سائیں کرتی ہوائیں تھیں۔ طارق نے لوہے کے دروازے کھولے۔ اندر جا کر لوح قرآنی کے آگے کھڑا ہو کر کچھ دیر پڑھتا رہا اور پھر ادھر ہی کھڑے کھڑے چاروں جانب پھونکا اور پھر ایک زوردار چھینک ماری۔

فارمیسی کی عمارت شاید سو سالہ پرانی تھی۔ ایل شکل میں کاؤنٹر تھے۔ ان کے آگے چھوٹی چھوٹی عام ضروریات کی چیزیں رکھی تھیں۔ کیش رجسٹر پر جے بیٹھ گیا۔ فلیر کے علاوہ ایک اور ملازم بھی فارمیسی کے کام میں لگ گیا۔ پیچھے دیواروں کے ساتھ شیلفوں میں میڈیسن کے ڈبے رکھے تھے۔ کاؤنٹر کے پیچھے ایک بڑی لیدر کی کرسی تھی اور سامنے میز پر ایک کمپیوٹر تھا۔ طارق نے اللہ کا نام لیا اور کمپیوٹر پر اسٹاک مارکیٹ کے بھاؤ دیکھنے لگا۔

فارمیسی پوری عمارت کے آدھے حصے میں قائم تھی۔ پیچھے کوئی پرانا کاٹھ کباڑ پڑا تھا، جسے بیچ میں الماریاں رکھ کر چھپا دیا گیا تھا۔ میں طارق کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ان دنوں اسٹاک مارکیٹ کا کاروبار کمپیوٹر پر شروع ہو چکا تھا۔ طارق مختلف سستی کمپنیوں کے ریٹس دیکھتا۔ پھر اپنے اندازے اور تجربے سے ہزار شیئرز خرید لیتا۔ جیسے ہی اس شیئر کی قیمت میں تیس سینٹ بھی بڑھ جاتی تو یہ انہیں وہیں بیچ کر ڈیڑھ دو سو ڈالر بنا لیتا تھا۔ اس کا ایک سکھ دوست تھا۔ نام جس کا پال تھا۔ وہ طارق کی مہارت سے گرویدہ ہو چکا تھا۔ اس دن طارق نے اس کے ایک لاکھ ڈالر کے سرمائے سے شیئرز خریدے اور اسی دن چھ ہزار ڈالر بنا لیے۔ پال بہت خوش تھا۔ وہ فون پر واری نیاری جا رہا تھا۔ وہ کچھ دن بعد میرے ہوتے ہوئے طارق سے ملنے گھر آیا۔ کہہ رہا تھا کہ گھر کے لیے طارق کو نیا کمپیوٹر دینا چاہتا ہے اور اپنا ایک کاروبار بیچ کر سارا سرمایہ اس کے حوالے کرنا چاہتا ہے تاکہ وہ اس کے لیے اسٹاک مارکیٹ میں ڈے ٹریڈنگ کرے۔ مجھے بھی بڑی دلچسپی ہونے لگی اور طارق مجھے اس کاروبار کے داؤ پیچ سمجھانے لگا۔ میرے لیے تو یہ پیسے بنانے کا سب سے آسان راستہ تھا۔ ایک لاکھ ڈالر پر چھ ہزار

اور وہ بھی ایک دن میں۔ یہیں پر مجھ سے غلطی ہوئی اور آگے جا کر میں نے اپنی دو سال کی جمع پونجی اس میں ڈبو دی تھی۔ اس کے بعد میں نے اسٹاک مارکیٹ کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ میں جب کینیڈا آیا تو تب بھی طارق ہر وقت یہی بتاتا رہتا کہ آج پال کو کتنے پیسے بنا دیے اور پال اب اس کا مرید ہو چکا ہے۔ کچھ دن فون نہ آیا تو میں نے ہی فون کیا۔ باتوں باتوں میں پال کا پوچھا تو مریل سی آواز میں بولا کہ پال کا اپنا ایک لاکھ ڈالر کا سرمایہ اور جو کچھ کمایا تھا وہ سارا کا سارا ڈوب گیا ہے۔

فلیز تو کام میں لگی تھی۔ کبھی کبھار اپنے کسی دوست کو خوش ہو کر بتاتی کہ کل میری ڈاکٹر کے پاس اپائنٹمنٹ ہے۔ طارق مجھے بتا رہا تھا کہ شوگر کے علاوہ اسے ہر قسم کی بیماری ہے۔ سب سے خطرناک بیماری اسے جلد کی ہے۔ ہر وقت اپنے آپ کو کھرچتی رہتی ہے۔

مجھے سالوں امریکا اور کینیڈا میں رہنے کے بعد پتا چلا کہ یہاں تو ہر ایک اپنا اپنا بوجھ اٹھائے اکیلا گھوم رہا ہے۔ کسی اور کو پروا بھی نہیں کہ دوسرا کس عذاب میں مبتلا ہے کیونکہ ہر ایک کے اپنے بے تحاشا مسائل ہیں۔ پاکستان میں رہنے والے سمجھتے ہیں کہ یہاں ہر ایک خوش حال ہے۔ گھر ہے، گاڑیاں سب کے پاس ہیں مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ ان کے کندھوں پر ان کا اپنا منوں بھاری بوجھ بھی ہوتا ہے۔ جیتے بھی لاوارثوں کی طرح ہیں اور مرتے بھی ہیں لاوارثوں کی طرح۔ کئی ایک کو تو مرنے سے پہلے مصنوعی سانس پر زندہ رکھا جاتا ہے کہ لواحقین دفنانے کا ٹائم دیں تو ان کی نالیاں کھینچ لی جائیں یا پھر لاش سرد خانے میں رکھ دی جاتی ہے۔ یہاں ایسے سینٹر بھی ہیں جہاں ان مریضوں کو رکھا جاتا ہے جن کے بچنے کی امید نہیں ہوتی۔ سب مریض ایک جگہ پر اپنی موت کے انتظار میں پتھریلی نظروں سے ایک دوسرے کو تکتے رہتے ہیں۔ اس بات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کوئی بوڑھا مریض اپنے بچوں کے گھر میں مر سکے۔ اگر ہوتا ہو گا تو بہت ہی کم۔ اگر گھر پر ہارٹ اٹیک ہو جائے تو اور بات ہے۔

جے فارغ بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ میں اس سے باتیں کرنے لگا۔ وہ مجھے گائیڈ کرنے لگا کہ میں کس طرح یہاں سے ڈاؤن ٹاؤن بذریعہ ٹرین جا سکتا ہوں۔ کہنے لگا۔ ”کہو تو ابھی تمہارے لیے ٹرین کے نقشے لے آتا ہوں۔“ طارق نے اسے روک دیا اور دوسرے ملازم کو بھیج کر نقشے منگوا لیے۔ میں نے جے سے پوچھا تو بتانے لگا۔ ”یہ اب جائے گا تو چار گھنٹے بعد واپس آئے گا۔“

میں نے پوچھا۔ ”اتنی دیر کیوں لگاتا ہے۔“

طارق نے گالی دے کر کہا۔ ”اپنی گرل فرینڈ سے ملنے چلا جاتا ہے۔“ پھر چھینکنے کے بعد بولا۔ ”کئی بار پہلے بھی ایسا کر چکا ہے اور بہانہ کرتا ہے کہ ٹریفک پولیس نے روک لیا تھا۔“ خیر نقشے آئے تو جے نے مجھے ان پر نشانات لگا کر سب سمجھا دیا کہ میں کس طرح سے بیٹری پارک اور ڈاؤن ٹاؤن یہاں سے جا سکتا ہوں اور واپسی کا بھی پورا نقشہ بتا دیا۔

دوپہر ہوئی تو میں نے طارق سے کہا۔ ”میں ذرا باہر کا چکر لگا آتا ہوں۔“

اس نے مجھے تنبیہ کی۔ ”آگے جو آبادی ہے وہاں نہیں جانا۔“

میں حیران ہوا۔ ”کیوں؟“

وہ بولا۔ ”یہ کالوں کا علاقہ ہے۔ یہ تمہاری جیکٹ بھی اتار لیں گے۔“ پھر بتانے لگا کہ پہلے میں فارمیسی میں سگریٹ رکھا کرتا تھا کالوں نے تین بار سگریٹ چرانے کے لیے فارمیسی کو توڑا اور سگریٹ لے گئے۔ پھر میں نے سگریٹ رکھنا ہی چھوڑ دی۔ اس کے بعد کوئی چوری نہیں ہوئی۔“

میں نے پوچھا۔ ”کیا بیچ پر بھی نہیں جا سکتا؟“

وہ بولا۔ ”بیچ تو فارمیسی کے پیچھے دو بلاک دور ہے۔ وہاں جا سکتے ہو۔“

میں باہر نکل آیا۔ ہوا کی تیزی میں شدت کم ہو چکی تھی۔ سڑک کے پار ایک بلندی پر ٹرین اسٹیشن ویران سا لگ رہا تھا۔ ارد گرد بہت کم آمد و رفت تھی۔ سناٹا تھا اور یکا تکی تھی۔ فارمیسی کے پہلو سے ایک سڑک پیچھے بیچ کو جا رہی تھی اور تنہائی پر اس کا اختتام ہو رہا تھا۔ میں دھیرے دھیرے اسی سڑک پر چل پڑا۔ دس منٹ میں ہی اپنے آپ کو ایک لامتناہی ویرانے کے سامنے پایا۔ ایک پانیوں کا سلسلہ تھا جو تا حد نظر افق میں کہیں گم ہو رہا تھا۔ میلوں پھیلی بیچ کا ریتیلا حصہ ویران پڑا تھا اور میں اکیلا اس میں کھڑا متعجب ہو کر اسے دیکھ رہا تھا۔ یہاں ہواؤں کا شور تھا اور میں تھا۔ دور دور تک کوئی انسان نہ تھا اور نہ فضا میں اڑتے سمندری پرندے تھے۔ سمندر کا پانی پُرسکون تھا اور موجوں میں کوئی دم خم نہ تھا۔ ایسی تنہائی اور اداسی میں نے کسی سمندر کی نہ پہلے دیکھی تھی اور نہ بعد میں دیکھ پایا تھا۔ کسی تنہا بیچ پر جانے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ چند سال بعد فلوریڈا کی ایک مشہور بیچ پر گیا تھا۔ بہت لوگ تھے بلکہ بہت عریاں لڑکیاں تھیں مگر میں سچ بتا رہا ہوں کہ یہ میرا مزاج نہیں تھا۔ مجھے

فلوریڈا سے زیادہ لطف آج کے دن آرہا تھا کہ یہاں میں تھا اور میری تنہائی تھی۔

میں ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ سگریٹ سلگائی اور کش لینے لگا۔ تند ہوائیں مجھے اڑانے پر تلی تھیں اور میں بنا اڑے ہی اپنی پروازوں میں تھا۔ خیالوں کی آنکھوں سے بہت کچھ دیکھ رہا تھا۔

مجھے اندازہ تھا کہ گرمیوں میں اس ویران ساحل پر دور دور تک رنگین چھتریاں ہوتی ہوں گی اور انسانوں کا ہجوم نیکریں پہنے یا تو چھتریوں کے نیچے کالی عینکیں لگائے پڑا ہوگا یا پھر منچلے لہروں کے سنگ ڈوب ڈوب کر ابھر رہے ہوں گے مگر آج میں تنہا بیٹھا آہستگی سے ساحل کی جانب بڑھتی موجوں کو دیکھ رہا تھا۔ جو بڑے حوصلے سے ساحل تک آتیں اور مایوس ہو کر واپس لوٹ جاتیں۔ میں نے اپنی تمام یادوں کو ایک کتاب میں بند کر کے یکجا کیا اور پھر ہولے ہولے ان کے ورق پلٹنے لگا۔ جیسے جیسے کتاب کے باب ختم ہوتے گئے میرا چہرہ آنسوؤں سے بھیگتا گیا۔ انسان کی زندگی سے یادیں نکال دی جائیں تو پیچھے حال کی صرف بے رحمی ہی رہ جاتی ہے۔ مجھے تو اس شعر کی بھی سمجھ نہیں آئی

یاد ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

یہ کسی کو لبھانے کے لیے تو کہا جا سکتا ہے مگر حقیقت میں حال کی چادر کو یادوں میں بھگو کر اوڑھنے میں اس کے معنی زیادہ پُراثر دکھائی دیتے ہیں۔ میں وہاں تند ہواؤں سے لرز نہیں رہا تھا بلکہ پگھل رہا تھا۔ میں آج لکھتے ہوئے یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا کہ اس دن وہ سمندر صرف میرا تھا یا میں اس کا ہو گیا تھا۔ سمندری موجیں ایک خاص ردھم میں آتیں اور جب واپس جاتیں تو ایک مخصوص ساز کسی نغمے کی طرح کانوں میں رس گھولتا تھا۔ لہروں کی اپنی زبان ہوتی ہے۔ ان کی اپنی دھن ہوتی ہے۔ کبھی لے اٹھ جاتی ہے اور کبھی مدھم پڑ جاتی ہے۔ آپ سمندر کے سامنے بالکل تنہا ہوں اور کوئی بھی درمیان میں نہ ہو تو یہ لمحات آپ کو کہیں کا کہیں پہنچا دیتے ہیں۔ مجھے نیاگرا فال میں کسی گفٹ شاپ سے ایک سی ڈی ملی۔ جس پر ساؤنڈ تھراپی لکھا تھا۔ میں نے خرید کر سنا تو اس میں سمندری لہروں کا ساؤنڈ تھا۔ اس کو تنہائی میں لگا کر ذہنی تفکرات اس طرح سے دور ہوتے تھے جیسے تپتے بخار میں ماں کا نرم ہاتھ ماتھے پر پڑ گیا ہو۔ اب بھی جب میں اپنے لیونگ روم میں بیٹھا یہ سب لکھ رہا ہوں تو میرے چاروں جانب خاموشی ہے اور صرف سمندری لہروں کا شور ہے۔ ایپل ٹی وی پر یہ پروگرام آچکے ہیں کہ سمندروں پر لگے کیمرے آپ کو سمندری لہریں سنواتے ہیں اور بدلتے مناظر بھی دکھاتے ہیں۔

میں بحر اکاہل کی سمندری لہروں کو سن رہا تھا۔ پانیوں پر تاریکی کا راج تھا اور سفید جھاگ اس وقت نظر آتی جب لہریں کناروں سے ٹکراتیں۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ سمندر کنارے میرا تنہا کمرا ہے اور کھڑکی کے باہر سمندری موجیں مجھے دلاسے دے رہی ہیں۔ انسان اپنے مناظر خود بناتا ہے۔ یہ تو اس پر منحصر ہے کہ وہ کیسے اپنے دکھوں کو کچھ لمحوں کے لیے کہیں دور رکھ کر اپنے مناظر خود تخلیق کرے۔ آج کے گزرے چند گھنٹے میرے دل و دماغ میں ہمیشہ کے لیے پیوست ہو گئے جب میں راک وے بیچ پر تنہا ایک بنچ پر بیٹھا لہروں کی مدھم موسیقی سن رہا تھا۔

مجھے جے کے آنے کا پتا اس وقت چلا جب وہ میرے پیچھے کھڑا ٹھنڈی ہواؤں سے کپکپا رہا تھا بمشکل اس نے کہا۔

”باس تمہیں بلا رہا ہے۔“

چھ بجے فارمیسی بند کر کے گھر جا رہے تھے تو میں گاڑی میں نہیں بلکہ اس بنچ پر بیٹھا تھا جس کے سامنے ایک پُراسرار خاموشی میں ہولے سے آتی اور واپس نامراد ہو کر جاتیں سمندر کی نرم دل موجیں تھیں۔

واپسی پر ہم نے ایک پیزا لیا اور گھر جا کر سب نے وہی کھایا۔ سب کی اپنی پسند ہوتی ہے مگر مجھے پیزا ابھی پسند نہیں آیا ایک بار میں روم میں تھا جہاں حلال خوراک ڈھونڈنا جان جوکھوں کا کام تھا تو میں نے سبزیوں اور چیز پیزا منگوایا۔ کھا کر مجھے یقین ہوا کہ اٹالین پیزا اتنا مشہور کیوں ہوتا ہے۔ ان جیسا پیزا کوئی نہیں بنا سکتا۔

صبح اٹھایا گیا۔ جلدی سے تیار ہوا۔ آج مجھے مجسمہ آزادی دیکھنے ڈاؤن ٹاؤن میں بیٹری پارک جانا تھا۔ سرجی اور شہباز بھی وہیں پہنچ رہے تھے۔ کل رات انہیں فون کر کے میں نے ٹائم اور مقام طے کر لیا تھا۔ مجسمہ آزادی کے جزیرے تک جانے والی فیری کی ٹکٹس جہاں سے ملتی تھیں ہمیں بھی وہیں ملنا تھا۔

طارق کے ساتھ میں ناشتا کر کے نکلا۔ راستے میں ویسے ہی اس نے جے کو اس کے گھر سے اٹھایا۔ فارمیسی پہنچے تو فلیز ویسے ہی فارمیسی کے باہر اپنی گاڑی میں بیٹھی طارق کا انتظار کر رہی تھی۔ فارمیسی کھول کر طارق کل ہی کی طرح لوح قرآنی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ میں نے فارمیسی سے کچھ

چاکلیٹ، چپس اور پانی کی دو بوتلیں اپنے بیگ میں ڈالیں اور سڑک پار ٹرین اسٹیشن کو جانے کے لیے باہر آ گیا۔ فارمیسی سے نکلتے ہوئے طارق نے ہدایت دی کہ چھ بجے سے پہلے فارمیسی پہنچ جانا۔

ارد گرد ویرانی تھی مگر دور سر بلند اپارٹمنٹ بلڈنگز نظر آ رہی تھیں۔ ٹرین اسٹیشن زمین سے ایک اونچائی پر بنا ہوا تھا اور لوہے کے متعدد زینے اوپر جا رہے تھے۔ نیچے ٹکٹ گھر تھا۔ سات ڈالر میں مجھے ٹکٹ ملا اور میں زینے چڑھنے لگا۔ زینے اور اسٹیشن دونوں سنسان پڑے تھے۔ ایک دو سیاہ فام نظر آئے جو خود سے باتیں کر رہے تھے۔ طارق نے ہدایت کی تھی کہ کسی کالے سے فری نہ ہونا اور ان سے ایک فاصلہ رکھنا۔ پوچھنے پر بتایا کہ ان میں اکثر جرائم پیشہ ہوتے ہیں۔

ہر نئے آنے والے کے ذہن میں یہ تصور بٹھا دیا جاتا ہے کہ کالوں سے تو دور ہی رہنا! پھر وہ بندہ ہر وقت سیاہ فام باشندوں سے ایک فاصلے پر رہتا ہے اور وہ یہی بات بعد میں نئے آنے والوں کے گوش گزار کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح ہر ایک بغیر کسی سیاہ فام لوگوں سے ملے، اپنے دل میں ایک نفرت پال لیتا ہے۔ نفرت ہو تو اس کی حدت دور تک پہنچتی ہے اور اس طرح یہ سیاہ فام لوگ اندر میں کھولتے رہتے ہیں۔ کوئی ان سے نرمی سے بات نہیں کرتا۔ بات کرنی بھی پڑے تو یا خوف زدہ لہجے میں کرے گا یا پھر نفرت سے کرے گا۔ اکثر کالے نکمے پھرتے رہتے ہیں۔ نہ ان کے پاس کوئی تعلیم ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی جاب۔ یہ پورا دن پبلک مقامات پر، گیس اسٹیشنوں کے آس پاس اور یا پھر پارکوں میں بلا مقصد گھومتے رہتے ہیں۔ شروع میں تو میں بھی ان سے دور دور رہتا تھا۔ جہاں کوئی کالا آتا دیکھا تو راستہ بدل لیا۔ کسی نے بات کرنے کے لیے روکا تو بھاگ کھڑا ہوا۔ ہمارے اس رویے سے وہ زیادہ مرتے ہیں اور اپنے اندر ایک آگ لیے سلگتے رہتے ہیں اور یہی آگ اکثر باہر نکل کر سامنے والے کو بھسم کر دیتی ہے۔

ایک بار میں گاڑی پر کہیں جا رہا تھا کہ راستہ بھول گیا۔ بھٹکتا ہوا کہیں اور جا نکلا۔ وہ کالوں کا علاقہ تھا اور میں بے سمت ہو چکا تھا۔ ایک گیس اسٹیشن پر رکا کہ اندر سے کوئی معلومات لے سکوں۔ دیکھا کہ گیس اسٹیشن کے باہر بہت سے کالے نوجوان ٹولیوں کی صورت بیٹھے ہیں یا کچھ ٹہل رہے ہیں۔ میں ذرا سا گھبرایا مگر پھر اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ میں آرام سے اترا اور سکون سے ٹہلتا ہوا ایک گروپ کی جانب چلتا گیا۔ سب کے سب گروپ میں کھڑے میری جانب آنکھوں میں لپکتے شعلوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں نے جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی اور ان سے لائٹر مانگا۔ ایک نے حیرانگی سے مجھے لائٹر پکڑا دیا۔ اب ارد گرد سب کی نظریں مجھ پر گڑی تھیں۔ میں نے انہیں سگریٹ کی آفر کی اور تمام خاموش کھڑے مجھے دیکھتے رہے۔ میں نے سگریٹ سلگا کر لائٹر اسے شکریے کے ساتھ واپس کیا۔ گہرا کش لگا کر اندر کا خوف دھوئیں کی صورت باہر نکالا اور ان سے گپ شپ کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں ان کی آنکھوں میں ملائمت اتری اور پھر وہ جھاگ کی طرح نرم پڑتے گئے۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے سگریٹ ختم کی۔ ایک نے بڑے دوستانہ ماحول میں مجھے راستہ سمجھایا۔ پھر دوسرے نے آ کر وہی راستہ دوبارہ سے سمجھایا۔ میں نے سب کو گڈ بائے کہا۔ اچھے دن کی نوید سنائی اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ بعد میں اپنے دوستوں میں بیٹھا سب کو یہ بات بتا رہا تھا اور سب مجھے کوس رہے تھے کہ بخیریت بچ نکلے ورنہ جس مقام کا تم بتا رہے ہو وہاں سے تو ہم دن کو بھی نہیں گزرتے۔ اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ میری جاب اسی علاقے میں ہوئی۔ وہاں میں نے فارمیسی مینیجر کی حیثیت سے تین سال کام کیا۔ جتنا نرم اور حلیم ان کو پایا اتنا دوسروں کو نہیں پایا۔

مگر آج میں ٹرین اسٹیشن پر کھڑا ان دو کالوں سے ڈر رہا تھا جو خود سے نہ معلوم کیا باتیں کر رہے تھے۔ ٹرین آئی تو میں فٹافٹ اس پر سوار ہوا مگر اندر داخل ہو کر میں اور زیادہ خوف زدہ ہوا کیونکہ بیشتر کالے تھے اور میں ایک پردیسی مسافر جس کے ہاتھ میں ٹرین کا نقشہ تھا۔

میں خاموشی سے ایک کھڑکی کے ساتھ سیٹ پر جا بیٹھا۔ ٹرین شور مچاتی چلی اور میں دماغی طور پر بے فکر ہوتا گیا۔ کچھ دیر بعد ٹرین جمیکا بے پر سے گزر رہی تھی۔ لانگ آئی لینڈ سے ہم نیو یارک سٹی کی جانب جا رہے تھے۔ خلیج جمیکا کے اپنے چھوٹے چھوٹے جزیروں کی بدولت ایک شاندار منظر میں دیکھ رہا تھا۔ دائیں جانب ساحل کے پار جے ایف کے ایئر پورٹ تھا، جہاں کئی جہاز یا تو لینڈ کر رہے تھے یا اپنی پروازیں بھر کر فضا میں تیر رہے تھے۔ دوسری جانب خلیج کے جزیروں پر ہزاروں آبی پرندے فضا میں اڑ رہے تھے اور اس سے زائد ساحلوں کے پاس بیٹھے کچھ چیختے نظر آ رہے تھے۔ ایک جاذب نظر منظر میں دیکھ رہا تھا۔ سفید سی گل اور مرغابیاں ایک اطمینان کی حالت میں بادلوں بھرے آسمان پر پرواز کرتیں اور پھر فضا میں لمبے غوطے مار کر زمین پر ستانے کے لیے بیٹھ جاتیں۔ دور پرے ڈاؤن ٹاؤن کی بلند قامت عمارتیں انسانی ترقی کی شاہد تھیں۔

خلیج جیکا کے اوپر ہزاروں پرندوں کی اڑان یہ گواہی دیتی کہ اللہ ہی سب سے بڑا مصور ہے۔ میں یہی دیکھ رہا تھا کہ ٹرین ایک گونج کے ساتھ خلیج جیکا کو پیچھے چھوڑتی آگے بڑھ گئی تھی۔

ٹرین زمین کے اندر چلی گئی اور اب دوسرے مسافر ہر اسٹیشن پر اتر رہے تھے اور کئی ایک سوار ہو رہے تھے۔ مجھے 134th اسٹریٹ اور 8th اوینیو پر اترنا تھا۔ وہاں سے پیدل 7th اوینیو پر آ کر ایک اور ٹرین سے بیٹری پارک پہنچنا تھا۔

سرجی اور شہباز کو گیارہ بجے پہنچنا تھا یعنی میرے پاس ایک گھنٹا تھا۔ میں بلا مقصد سب وے کے اندر گھومتا رہا۔ ایک چہل پہل تھی۔ سب کو اپنی پڑی تھی۔ ہر کوئی جلدی میں تھا سوائے میرے اور ایک دو فقیروں کے۔ اکتایا تو سیڑھیاں چڑھ کر 8th اوینیو پر نکل آیا۔

ڈاؤن ٹاؤن کو میں اب دن میں دیکھ رہا تھا۔ بلند و بالا عمارتیں، مصروف سڑکیں، زیبرا کراسنگ عبور کرتے ہجوم اور ایک دھکم پیل مجھے بتا رہی تھی کہ میں منہٹن میں ہوں۔ سامنے امپائر اسٹیٹ بلڈنگ کی چوٹی بادلوں میں گھری کہیں گم تھی۔ گو وہ 5th اوینیو پر تھی مگر لگتا تھا کہ میرے سامنے کھڑی ہے۔ میرے لیے یہ ماننا ناممکن تھا کہ یہ عمارت 1931ء میں مکمل ہو چکی تھی۔ میرے حساب سے تو وہ زمانہ پتھروں کا دور تھا۔ ایک سو دو منزلہ یہ بلڈنگ چالیس سال تک دنیا کی سب سے اونچی عمارت رہی۔ چودہ سو فٹ سے بلند اس عمارت کا حسن بے مثال اور یکتا ہے۔ میں دیر تک سر اٹھائے اپنے ارد گرد کھڑی عمارتوں کو حیرت سے دیکھتا رہا۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ میرے علاوہ کوئی انہیں نہیں دیکھ رہا تو میں چپکے چپکے دیکھنے لگا۔ ٹھنڈ یہاں بہت تھی کیونکہ بلند عمارتوں کی وجہ سے روشنی زمین تک بمشکل پڑ رہی تھی۔ سب عمارتیں ایک دوسرے سے کندھا ملائے کھڑی تھیں۔ میں پھر چوک میں کھڑا اس کی رونق میں کھو گیا۔ پہلی بار یہ نظارہ کر رہا تھا۔ اسی لیے مجنونانہ حرکتیں کیے جا رہا تھا۔ ایک سیاح کو پکڑا اور اس کو اپنا کیمرا دیا اور پھر میری پہلی تصویر منہٹن میں اس نے بنائی۔

میں چلتا ہوا 7 th اوینیو پر آیا۔ دس منٹ کا سفر پینتالیس منٹ میں طے کیا۔ نظریں اپنے ارد گرد اس اجنبی دنیا پر تھیں جو مجھے حیران کر کے بھاگی چلی جا رہی تھی۔ لوگ دوسری طرح کے تھے۔ میں ان سے میل نہیں کھاتا تھا مگر میں کوئی اجنبیت بھی محسوس نہ کرتا تھا۔ سب پرائے تھے اور میں ان کے لیے کوئی نیا نہ تھا کیونکہ کوئی کسی کی طرف گھور کر یا متوجہ ہو کر نہیں دیکھتا تھا۔ یہ شہر اور اس میں میرے ہمراہ چلنے والے سب لوگ ایک دوسرے سے اجنبی تھے۔ مگر کوئی دوسرے کے لیے اپنے ماتھے پر نا آشنائی کی شکنیں نہ رکھتا تھا۔ وہاں کوئی ایک بھی دوسرے کا اپنا نہ تھا۔ ہر کوئی اپنی ذات میں مگن اور صرف اپنے وجود سے آشنا تھا۔ مگر یہ وہ جگہ تھی جہاں شام ڈھلنے کے بعد کسی کی بانہیں کسی دوسرے کی بانہوں میں آ جاتی ہیں یا پھر کسی کی کمر کے گرد لپٹ جاتی ہیں۔ کچھ اجنبی ایک دوسرے کے کچھ دیر کے لیے رفیق بن جاتے ہیں جیسے جنموں کا ساتھ ہو۔ یہ نیویارک کا مشہور زمانہ ڈاؤن ٹاؤن تھا۔ جہاں کی سر بفلک عمارتوں تلے میں جیکٹ پہنے اور اپنے کندھے پر سفری بیگ لٹکائے چلے جا رہا تھا۔ میں سڑک پر تھا اور سڑک کے نیچے زیر زمین ریلوے کا ایک جال بچھا تھا گویا نیچے ایک اور دنیا تیز رفتاری سے بھاگ رہی تھی۔

میں 7TH ایونیو پر پہنچا۔ فٹ پاتھ پر کچھ سیڑھیاں زمین کے اندر جا رہی تھیں۔ یہ سب وے تھا جہاں سے مجھے ساؤتھ فیری کی ٹرین پکڑنی تھی اور وہ مجھے بیٹری پارک کے آس پاس اتارتی۔ ایک پختہ عمر کا جوڑا بیٹھا مجسمہ آزادی کا پمفلٹ دیکھ رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ دونوں بھی ادھر ہی جا رہے ہیں۔ میں ان سے ذرا قریب ہونے لگا اور پوچھا۔ ”آپ بھی مجسمہ آزادی دیکھنے جا رہے ہیں؟“

ایک نے صرف اپنے ہونٹ بھینچ کر اپنا بھاری سر ہلایا۔ میں نے ذرا زیادہ مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں بھی وہیں جا رہا ہوں۔“

وہ دونوں خاموش رہے۔ لگتا تھا کہ وہ دونوں میری طرح ٹورسٹ ہیں اور نقشوں کی مدد سے میری طرح گھوم پھر رہے ہیں۔ میں نے دل میں یہ سوچا کہ ان کا پیچھا کر کے میں بھی بیٹری پارک پہنچ جاؤں گا، جہاں سے مجسمہ آزادی سامنے نظر آتا ہے اور وہیں سے لبرٹی آئی لینڈ کو فیری بھی چلتی ہے۔ ساؤتھ فیری کے اسٹیشن پر اترے تو میں ان کے ساتھ چپک گیا۔ وہ تیز تیز چل کر شاید مجھ سے پیچھا چھڑوا رہے تھے۔ کوئی دس منٹ بعد سامنے بیٹری پارک تھا اور وہ دونوں پارک میں کہیں گم ہو چکے تھے۔

میری پہلی نظر دریا ہڈسن کے بیچ مجسمہ آزادی پر پڑی اور میں وہیں ٹھہر گیا۔ جس کی تصویریں دیکھ دیکھ کر میں خیالی پلاؤ بنایا کرتا تھا، وہ اب میرے سامنے کچھ دوری پر کھڑا تھا۔ ایک ہاتھ فضاء میں بلند اور دوسرا ہاتھ سینے سے لگائے قانون کی کتاب تھامے ایستادہ تھا۔ دوری کے باعث صاف دکھائی نہ دیتا تھا مگر تصویریں دیکھ کر اس کے خدوخال مجھ پر واضح تھے۔

میرے پیچھے مین ہٹن کے بلند و بالا مینار کھڑے تھے اور سامنے دریا کے بیچوں بیچ مجسمہ آزادی تھا۔

بیٹری پارک مجھے بھلا لگا گو کہ درخت پتوں سے خالی تھے۔ گھاس اپنا رنگ کھو چکی تھی مگر پارک میں بنے پختہ راستے اور ان راستوں کے ساتھ رکھے بینچ اور درختوں کی پتوں سے خالی سوکھی ٹہنیاں یہاں پر بہت سے لوگوں کی موجودگی کے باوجود ایک تنہائی کا تاثر دے رہی تھیں۔ مجھے پہلے سرجی اور شہباز کو ڈھونڈنا تھا۔ ان کو ٹکٹ گھر میں آنے کا بولا تھا۔ کلنٹن کیسل کی پتھروں سے بنی پرانی گول عمارت کے اندر ٹکٹ گھر تھا۔ میں ایک چوڑے دروازے سے اندر گیا۔ سامنے بہت بڑا صحن تھا اور ایک گولائی میں چاروں جانب پرانے کمرے اور ان کے آگے برآمدے تھے۔ صحن کے بیچ میں ایک گول سا ہال نما کمرا تھا جس میں کھڑکیاں تھیں اور ان کے آگے ٹکٹ لینے والوں کی لائن لگی تھی۔ میں ٹکٹ بوتھ کے اردگرد ان دونوں کو تلاش کر رہا تھا۔ سوچا کہ شاید ابھی نہیں پہنچے ہوں گے کہ سرجی کی پیچھے سے منمناتی ہوئی مخصوص سی آواز آئی۔ ”ہم ہیں کہ دیر سے انتظار کر رہے ہیں اور خود اتنی سردی میں میموں پر نظریں رکھے ہیں اور ہمیں گھاس بھی نہیں ڈال رہے۔“

مڑ کر دیکھا تو سرجی اپنی پھندنے والی ٹوپی پہنے اور اپنے ہاتھ جیکٹ کی جیبوں میں ڈالے میری جانب چلے آ رہے ہیں۔ آتے ہی ہاتھ ملانے سے پہلے بولے۔ ”جڑ سے بیر اور پتوں سے یاری۔“

مطلب ان کا یہ تھا کہ اپنوں سے بے اعتنائی اور اجنبیوں سے آشنائی۔ پیچھے شہباز بھی جیکٹ، اونی ٹوپی اور مفلر گلے میں ڈالے چلا آ رہا تھا۔ ہم نے آپس میں ہاتھ ملایا اور پھر گلے ملے۔ شہباز نے کہا۔ ”سرجی نے تو شکوں کا سیاپا کھڑا کر رکھا ہے، معلوم ہی نہیں پڑتا کہ کوس رہے ہیں یا تعریف کر رہے ہیں۔“

شہباز یہ سب بتا رہا تھا اور سرجی کی نظریں ان لڑکیوں پر تھیں جنہوں نے جین کی تنگ پینٹیں پہن رکھی تھیں۔ میں نے پوچھا۔ ”سرجی کہاں کھو گئے؟ اور وہ کیا پتوں اور جڑوں کی بات کر رہے تھے؟“

ایک سرد آہ بھر کر بولے۔ ”ہم سب تو ہواؤں میں اڑتے خزاں کے زرد پتے ہیں جڑیں تو سامنے کھڑی ہیں۔“

سرجی گلے لگ کر ایسے ملے تھے کہ جیسے مدتوں بعد ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہوں۔ پھر شکوہ کرنے لگے۔ ”ہم بیس منٹ سے انتظار کر رہے ہیں اور آپ کا کچھ پتا بھی نہیں چل رہا تھا۔“

شہباز بولا۔ ”یہ ابھی آیا ہے اور سیدھا واش روم میں گھس گیا۔ اب یہ وہیں سے آ رہا ہے۔“

ان دنوں ہمارے پاس موبائل فون نہیں تھے۔ نہ ہمیں ان کی ضرورت تھی اور نہ ہی اس کے خرچے کے متحمل ہو سکتے تھے۔ اگر فون ہوتے تو ہم ہر لحظہ رابطے میں ہوتے اور جو کچھ میں دیکھتا آیا تھا، وہ نہ دیکھ سکتا۔ موبائل فون کے کتنے بھی فوائد ہوں مگر اس نے ہم سے اپنا آپ بھی چھین لیا ہے۔

سرجی بولے۔ ”اب آگے کیا پروگرام ہے؟“

میں نے تجویز دی۔ ”فیری کے ٹکٹ لے کر پہلے بیٹری پارک کا چکر لگاتے ہیں اور پھر لبرٹی آئی لینڈ چلیں گے۔“

سرجی نے تائید کی اور کہا۔ ”ماشاء اللہ پارک میں بھی بہت رونق لگی ہوگی۔ شہباز کو یہیں بٹھا کر پہلے ہم دونوں بھائی بیٹری پارک میں اپنی بیٹری چارج کروا آتے ہیں۔“

چار دن سے ان کی تکرار نہیں سنی تھی۔ سرجی نے پہل کر دی تھی۔ شہباز بولا۔ ”سرجی کی بیٹری ہمیشہ کے لیے ٹھنڈی پڑ گئی ہے۔ یہ تو پورے دن میں بھی چارج نہیں ہو سکتی۔“

سرجی نے التجا بھری نظروں سے میری جانب دیکھا اور میں ان کی التجا بھری نظروں کے جھانسے میں نہیں آیا۔

میں کھڑکی سے تین ٹکٹ لے آیا۔ لبرٹی آئی لینڈ کے ساتھ ساتھ ایلس آئی لینڈ کے بھی ٹکٹ خرید لیے۔

بیٹری پارک ڈیڑھ سو سال پہلے یہاں بنایا گیا تھا۔ نام پہلے کچھ اور تھا۔ سو سال سے اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔ انیسویں صدی میں یورپ سے جہاز تارکین وطن کو بھر بھر کر یہاں لاتے تھے۔ یہاں ان کو کلنٹن کیسل میں رکھا جاتا۔ یہاں ان کے کاغذات مکمل کیے جاتے اور پھر امریکا کو انہی تارکین وطن نے امریکا بنا دیا۔ لبرٹی آئی لینڈ سے ذرا ہٹ کر دریائے ہڈسن میں ایلس آئی لینڈ ہے۔ بعد میں بیٹری پارک کی بجائے جہاز بھر وہیں لنگر انداز ہونے لگے۔ وہیں امیگریشن کا آفس بنایا گیا۔ مختلف کمرے بنائے گئے جہاں آنے والے پناہ گزینوں کو رکھا جاتا تھا۔ تمام سہولتیں دی جاتیں۔ میرا وہاں جانے کا ارادہ بھی تھا کیونکہ اب اس کو میوزیم کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ ہر چیز کو ویسے رکھا گیا ہے جیسے سو سال پہلے تھی۔

کہیں پڑھا تھا کہ جب یورپ سے تھکے پناہ گزینوں کی نظر مجسمہ آزادی پر پڑتی تو اشارے کر کر کے خوشی سے چلانے لگتے کہ ان کی منزل آ گئی ہے۔ ان کے دکھ ختم ہونے والے ہیں۔ اب ان کے سر پر چھت ہوگی اور پیٹ بھر کھانا بھی

ملے گا۔

مڈل ایسٹ کے بہت سے مسلمان جو یورپ میں بستے تھے وہ بھی ان جہازوں میں بیٹھ کر یہاں آ پہنچے۔ مسلمانوں کے ناموں کا تلفظ یہ لوگ ٹھیک طریقے سے ادا نہیں کر سکتے تھے تو سب کا نام محمد رکھ دیا گیا اور ان کو "مو" کے نام سے پکارا جانے لگا۔ مجھے ایک شخص ملا جس کا دادا بھی "مو" تھا۔ اس نے مجھے اپنے دادا کی کہانی بتائی کہ کس طرح سے وہ جرمنی سے بحری جہاز پر بیٹھ کر یہاں آیا تھا۔ مڈل ایسٹ کے مسلمان مشی گن آ پہنچے اور ڈیر برن شہر یہاں ان لوگوں سے بھر گیا۔ ڈیر برن عربیوں سے بھرا ہوا ہے۔ دکانوں کے بورڈ انگلش اور عربی میں لکھے ہوئے ہیں۔ اب یہاں ان کا ایک میوزیم بھی بن چکا ہے۔

بیٹری پارک میں راستوں کے ساتھ بینچیں رکھی تھیں۔ کئی ایک مجسمے ایستادہ تھے۔ سرجی کہنے لگے۔ "یہ آزادی والے مجسمے کے بچے ہوں گے۔" حالانکہ یہ دوسری جنگ عظیم میں مارے جانے والوں کی یاد میں بنائے گئے تھے۔ مختلف مقامی حکمرانوں کے مجسمے بھی یہاں لگائے گئے تھے۔ پناہ گزینوں کی حالت زار کو مجسموں کی صورت بیان کیا گیا تھا۔ ان مجسموں کے پس منظر میں ٹنڈ منڈ درخت ایک عجیب سی اداسی پھیلا رہے تھے۔

بیٹری پارک میں مختلف مقامات پر سوونیر بیچنے والوں نے مجسمہ آزادی کی پینٹنگز اور چھوٹے مجسمے فروخت کے لیے رکھے تھے۔ کوئی خرید لیتا اور کوئی ہماری طرح انہیں دیکھ کر آگے بڑھ جاتا۔ دریا اور پارک کے درمیان ایک پختہ راستہ بنا تھا۔ ایک جانب سیاحوں کے بیٹھنے کے لیے بینچ تھے۔ دریا کی جانب بہت سے لوگ دریا اور دور کھڑے مجسمہ آزادی کی تصویریں بنا رہے تھے۔ پارک میں لگے درخت بھی ایک لمبی عمر تک آ پہنچے تھے۔ ان کی عمر سو سال کے قریب تھی۔

ہم کبھی بیٹھ جاتے۔ کبھی چلنے لگتے۔ پھر کسی مجسمے کے آگے کھڑے ہو کر اسے سمجھنے کی ناکام کوشش کرتے اور آگے بڑھ جاتے۔ درختوں کو دیکھتے اور پھر اس کے پیچھے کھڑی اونچی عمارتوں کو دیکھ کر داد بھی اپنے آپ کو دیتے۔ دھوپ میں رکھے ایک بینچ پر ہم بیٹھے پرسکون دریا اور سامنے مجسمہ آزادی کو دیکھنے لگے۔ میں نے سرجی سے پوچھا۔ "پچھلے تین دن میں کہاں کہاں گئے آپ؟"

یہ سن کر پہلے تو خاموش ہو گئے اور پھر نظریں جھکائے کہنے لگے۔ "ماشاء اللہ بہت بڑا گھر ہے ان کا چار تو بیڈ روم ہیں۔ تہہ خانے میں بھی دو کمرے ہیں۔ لان بھی بہت بڑا ہے۔"

شہباز بولا۔ "تو کرتے کیا رہے۔"

وہ ہچکچا رہے تھے مگر شہباز پیچھے پڑا تھا تو بولے۔ "وہ دراصل وہاں بس نہیں آتی ہے ناں۔ میں گھر پر ہی رہا۔ سب لوگ کام پر صبح چلے جاتے ہیں۔ بچے بھی اسکول چلے جاتے ہیں۔" پھر ذرا خاموش ہوئے اور اسی حالت میں بولتے رہے جس حالت میں سر جھکائے بیٹھے تھے۔

"ورنہ تو گھر کو تالا لگا ہوتا ہے۔ میں گھر پر تھا تو انہوں نے تالا نہیں لگایا۔ میں باہر نہیں جا سکا کیونکہ میرے پاس گھر کی چابی نہیں تھی۔" فضا میں خاموشی تیر گئی۔ ہم خاموش تھے۔ سرجی تین دن گھر میں بند رہے تھے اور میرا دل سرجی کے لیے دکھی ہو گیا۔ میں نے کہا:

"سرجی! آپ ان سے کہتے کہ آپ جرسی سٹی ہی ذرا سا دکھلا دیں اور آپ بھی تو اپنی معصومیت میں چپ رہے ہوں گے۔"

میرے اس استفسار پر بولے۔ "یہ تو ایسے ہی ہوا کہ جس کی گود میں بیٹھنا اسی کی داڑھی کھسوٹنا۔"

شہباز بولا۔ "کیا فیض صاحب نے داڑھی رکھ لی ہے؟"

فرمایا۔ "نہیں کہاوت بولی ہے کہ اپنے محسن کو تنگ نہیں کیا کرتے۔" مگر سرجی کی آنکھوں میں اداسی تھی اور چہرے پر ملال تھا۔

پھر انہوں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور مجھ سے پوچھنے لگے کہ میں کہاں کہاں گیا ہوں۔ تو میں نے جھوٹ بولا۔ "یار وہ تھکاوٹ اتنی زیادہ تھی کہ گھر سے باہر بھی نہیں نکلا۔ میں نے تو خوب آرام کیا۔"

شہباز بھی موقع کی نزاکت کو سمجھ چکا تھا۔ پوچھنے پر وہ کہنے لگا۔ "میرا بھائی اتنا معروف تھا کہ مجھے باہر کہیں لے کر نہیں جا سکا۔"

سرجی نے اس کی آنکھوں میں سچائی تلاش کی اور کچھ نہ پا کر سوچ میں ڈوبے اور پھر بولے۔ "کیا پورا دن بیٹری پارک میں چارج ہوتے آئے ہیں۔ چلتے ہیں ذرا ہم بھی تو دیکھیں یہ مجسمہ آزادی آخر ہے کیا چیز۔" یہ کہہ کر اٹھ گئے۔

ہم ٹہلتے ہوئے ڈیک پر پہنچے تو ایک فیری ہمارے سامنے اپنے رستے پر دوڑ کر روانہ ہو رہی تھی۔ اگلی، پینتالیس

منٹ بعد روانہ ہوئی تھی۔ وہاں ایک میلہ سجا تھا۔ سیاحوں کا ہجوم تھا۔ ہر ایک اپنے رنگ میں رنگا تھا۔ کئی ٹھیلے لگے تھے جن پر سوینیرز بیچے جا رہے تھے۔ کسی نے اپنے آپ کو مکمل طور پر مجسمہ آزادی کے رنگ و روپ میں ڈھالا ہوا تھا اور اپنے پاؤں میں ایک باسکٹ رکھی تھی۔ آتا جاتا اس کے ہمراہ تصویر بنواتا اور کچھ ڈالر باسکٹ میں ڈال کر قہقہے لگا کر آگے بڑھ جاتا۔ سرجی اس کے ہمراہ اپنی مونچھوں پر مسکراہٹ سجائے کھڑے ہو گئے۔ مجھے حکم دیا کہ فوٹو کھینچوں۔ میں نے تصویر بنائی اور پھر شہباز سے بولے۔ ”میرے پاس کھلے نہیں ہیں۔ ذرا ایک ڈالر دینا۔“

شہباز انکار کر گیا اور اب یہ جیتا جاگتا مجسمہ آزادی ساکت کھڑا ترچھی نظروں سے سرجی کو کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔ وہ دونوں بحث کر رہے تھے۔ میں نے اپنی جیب سے ایک ڈالر کا نوٹ نکالا اور ان کو کھینچتا ہوا دور لے گیا۔

آگے بڑھے تو ایک بوڑھا اپنی سفید شیو بڑھائے ایک سائیڈ پر کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں گٹار تھا۔ اسپیکر زمین پر پڑا تھا اور مائیک لگائے کبھی گٹار پر کوئی دھن چھیڑتا اور کبھی اپنے قریب سے گزرنے والے کو مخاطب کرتا۔ ایک جوڑا گزرا تو اس سے بولا۔ ”تم لوگ برطانیہ کے لگتے ہو۔ ملکہ کیسی ہے؟ میرا اسلام دینا۔“ پھر اس نے کوئی دھن چھیڑ دی۔ وہ واقعی برطانوی تھے اور بہت خوش ہوئے۔ پھر انہوں نے کچھ نوٹ اس کے کاسے میں ڈال کر اس کی تصاویر بنوائیں۔ پھر کوئی اسپین کے ٹورسٹ قریب سے گزرے تو اس نے ہسپانوی راگ الاپا۔ کچھ ان کو انہی کی زبان میں کہا۔ وہ بہت شاد ہوئے اور گٹار والے کے کشکول میں کچھ اور نوٹ آ گرے۔ سرجی قریب کھڑے اسے دیکھ رہے تھے۔ اس نے سرجی کو دیکھا تو ہاتھ باندھ کر نمستے کہا۔

سرجی آپے سے باہر ہونے لگے اور بولے۔ ”میں پاکستانی ہوں اور مسلمان ہوں۔“ اس نے پھر مسکرا کر اسلام علیکم کہا اور سرجی نے دوبارہ شہباز سے ایک ڈالر کا نوٹ مانگ لیا۔

سامنے دیکھا تو بہت سے لوگ گھیرا ڈالے ایسے کھڑے ہیں جیسے کوئی بندر کا تماشا ہو رہا ہو۔ میں نے کہا۔ ”کہیں ریچھ اور کتے کی لڑائی تو نہیں ہو رہی؟“

سرجی کا جواب آیا۔ ”کیا شہباز کی لڑائی ہو رہی ہے؟“ شہباز ترنت بولا۔ ”ہاں تم سے۔“

اب بات ہاتھا پائی تک آنے لگی تھی۔ میں نے بیچ بچاؤ کروایا۔ سرجی مجھ سے شہباز کی شکایت کر رہے تھے۔ ”ہر وقت مجھے چرکے لگاتا رہتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”آپ بھی تو کچھ کم نہیں ہیں۔“

پھر مجھ سے خفا ہو کر بولے۔ ”میری چھاتی پر سانپ لوٹ رہے ہیں اور آپ بھی مجھے کوستے ہیں؟“

اب شہباز بھی ہنس رہا تھا اور سرجی کے دونوں کندھے اپنے ہاتھوں سے دباتے ہوئے بولا۔ ”اب یہ سیاپا ختم کرو ورنہ وہ سامنے مجسمے کی مشعل پر آپ کو بٹھا دوں گا۔“

سرجی نے دور سے مجسمے اور اس کی مشعل کو بغور دیکھا اور شہباز سے بولے ”حساب دوستاں، دردِ دل۔“

شہباز اور میں دونوں فکر میں پڑ گئے کہ اب انہوں نے کیا کہہ دیا ہے۔ ذرا تفتیش کی تو بولے ”مطلب یہ کہ دوستوں میں تکرار نہیں ہونی چاہیے۔“

یہ سن کر ہم دونوں بے تحاشا ہنسے۔

سرجی کو یہ فکر لاحق ہو گئی تھی کہ کہیں شہباز سچ مچ میں انہیں مشعل پر نہ بٹھا دے اور وہ خوبصورتی سے پسپا ہو گئے تھے۔ واقعی سرجی اور شہباز کا ساتھ میرے لیے ایک نعمت سے کم نہ تھا۔ ہم کبھی بھی ایک دوسرے سے اکتاتے نہیں تھے۔

ہم ہجوم میں گھسے تو ایک حلقے میں کرتب دکھانے والے شرٹس اتارے اپنے کسرتی جسموں کے ساتھ جمناسٹک کے مظاہرے دکھلا رہے تھے۔ سرجی کہاں چپ رہنے والے تھے۔ بولے ”یہاں بھی لکی ایرانی سرکس لگتی ہے؟“

کوئی جواب نہ آیا تو چپ ہو رہے۔ کرتب دکھلانے والوں نے خوب اِدھر اُدھر چھلانگیں لگائیں۔ پھر خوب تالیاں بجائی گئیں اور انہوں نے داد کے ساتھ نوٹ بھی سمیٹے۔ ساتھ ایک ٹھیلے سے آواز آ رہی تھی۔ ”دس ڈالر دس ڈالر“ ادھر گئے تو دیکھا ایک بندہ اپنے ٹھیلے پر بہت سے رنگوں کی ٹی شرٹس رکھے بیچ رہا ہے۔ مجسمہ آزادی کی تصویریں ہر شرٹس پر بنی تھیں۔ بیچنے والے کو دیکھا تو وہ تھا تو نوجوان مگر چہرے پر کڑے موسموں کی تھکاوٹیں جھریوں کی صورت صاف نظر آتی تھیں۔ ہمارے چہروں کو دیکھا تو ایک لحظے کے لیے ٹھٹکا اور پھر شروع ہو گیا۔ ”دس ڈالر دس ڈالر“ اس کے قریب پہنچے تو وہ پاکستانی تھا۔ پوچھنے پر بتانے لگا کہ وہ کراچی کا رہنے والا ہے۔ ایم۔ ایس سی کیا کرنے کے بعد امریکا آنے کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ آخر کار کسی نہ کسی طرح یہاں آ پہنچا اور اب پندرہ سال سے وہ یہی

کام کر رہا ہے۔

ہم حیران کھڑے اس کے چہرے پر چھائی اداسی اور کرب کو دیکھتے تھے۔ میں نے بات بدلتے ہوئے پوچھا۔
”کیا پاکستانی ٹورسٹ بھی یہاں آتے ہیں؟“

وہ بولا۔ ”بہت کم۔ جو یہاں آتا ہے تو ایک بار یہاں کا چکر لگانے آتا ہے اور پھر تا عمر نہیں آتا۔ کبھی کبھار عید میلہ بیٹری پارک میں لگتا ہے تو وہ اس میں شامل ہونے آتے ہیں مگر اس مجسمے کی طرف کسی کی نگاہ نہیں اٹھتی۔“ اس نے مجھ سے کہا۔
”اگر آپ نے شرٹ لینی ہے تو آٹھ ڈالر میں دے دوں گا۔ اپنے پاکستانی بھائی ہو۔“

میں نے شکریے کے ساتھ انکار کر دیا۔

آگے آئے تو ایک ٹھیلے والا کھڑا کھانے پینے کی چیزیں بیچ رہا تھا۔ یہ لاہور کا رہنے والا تھا۔ اس کا نام نہیں لکھ رہا ہوں۔ وہ بھی بہت زیادہ پڑھا لکھا اور ایک معروف خاندان کا تھا۔ وہ توے پر روٹیاں گرم کر کے اس میں گوشت اور چٹنی لپیٹ کر بیچ رہا تھا۔ اس کے پاس رش تھا اور کئی ٹورسٹ چسکے لے کر مرچ مصالحے کھا رہے تھے۔ وہ ذرا فارغ ہوا تو ہم سے کہنے لگا۔ ”اب بھی وقت ہے یہاں سے واپس چلے جاؤ ورنہ میری طرح ایک دن یہ ٹھیلا لگائے کھڑے ہو گے اور پاکستان میں رشتہ دار یہ سمجھتے ہوں گے کہ لڑکا امریکا میں مزے کر رہا ہے۔“

کہانیاں اس کے چہرے پر بھی بہت تھیں لیکن اس کے پاس سنانے کا وقت نہ تھا اور نہ مجھے سننی تھیں کیونکہ میں پہلے ہی چہرہ پڑھ چکا تھا۔

اتنے میں ڈیک سے ایک فیری آ گئی۔ رسے پھینک کر فیری کو ڈیک سے باندھا گیا۔ سوار سیاح پہلے ہنستے مسکراتے، بچتے بچاتے اترے اور پھر جانے والے ایک لائن میں لگ کر اس میں سوار ہوئے۔ ہم سیدھے اوپر کی منزل پر آئے جہاں کھلا آسمان، چمکتا سورج اور کبھی اٹھلاتی تو کبھی ڈھلکتی ٹھنڈی ہوائیں رقصاں تھیں۔ چاروں جانب خوش و خرم چہرے اپنے کیمرے سنبھالے اردگرد دیکھ رہے تھے کہ کون کون سے منظر کو منعکس کریں اور کسے چھوڑ دیں۔

سرجی میری جانب لپکتے ہوئے آئے اور بولے۔
”میری حسرت آج پوری ہو رہی ہے۔ بچپن سے شوق تھا کہ نیو یارک میں آ کر مجسمہ آزادی اپنی آنکھوں سے دیکھوں اور بار بار دیکھوں۔“

شہباز جو پاس کھڑا تھا، وہ بولا۔ ”مجسمے دیکھوں مگر کام نہ کروں؟“

وہ اس پر بولے۔ ”گھومنا پھرنا اور خوش ہونا بھی تو کام ہے۔“ وہ پھر اپنے چہرے پر شرارت لا کر شہباز کو دیکھتے ہوئے بولے۔ ”اگر صرف کام سے عزت جڑی ہے تو گدھوں کی زیادہ عزت ہوتی۔“

شہباز کا چہرہ سرخ ہوا اور وہ دانت پیستے ہوئے بولا۔
”یہ گدھا کس کو بولا ہے؟“ پھر دھمکی دیتے ہوئے کہا۔ ”سرجی! باز آ جاؤ۔ ورنہ یہیں جھگڑا ہو جائے گا۔“

سرجی منمنا کر بولے۔ ”اپنی نہیں تو میری عزت کا خیال کرو۔ یہ میمیں کیا سوچیں گیں؟“

پھر میموں کے لیے ایک انتہائی غلیظ قسم کی گالی شہباز کے منہ سے نکلی مگر شکر ہے میموں کی سمجھ میں نہ آئی۔ شہباز غصے میں زرد ہو رہا تھا۔ ”میری عزت کرو گے تو اپنی بھی کرواؤ گے اور سمجھ لو کہ آپ کی عزت آج سے آپ کے اپنے ہاتھ میں ہے۔“

سرجی نے بڑے سکون سے کہا۔ ”خاک ڈالنے سے چاند نہیں چھپتا۔“

ان کی نوک جھوک جاری تھی اور اسی دوران میں اپنا کیمرا نکال کر ایک بینچ پر بیٹھ کر اس میں نئی فلم ڈالنے لگا۔ اس وقت تک میموری کارڈ والا کیمرا بازار میں آیا تو تھا مگر مہنگا تھا۔ اس لیے میں اپنا پاکستان والا کیمرا لیے گھومتا تھا جس میں فلم رول پڑتے تھے۔ ایک دو اضافی رول رکھنا ضروری تھا۔ میں نے کئی اضافی رول رکھ رکھے تھے۔

رول کو کیمرے میں لوڈ کرنے کے بعد میں نے اردگرد کا جائزہ لیا۔

دریائے ہڈسن کے پانیوں پر سورج کی چمکتی کرنیں لشکارے مار رہی تھیں۔ نظر ان پر بمشکل ٹھہرتی تھی۔ فیری کچھ دیر بعد چل پڑی۔ روانگی سے پہلے اعلانات ہوئے کہ کسی حادثے کی صورت حفاظتی جیکٹ پہن لیں وہ کہاں رکھی ہیں یہ بتانے کے بعد احتیاطی تدابیر بتائی جانے لگیں کہ کسی ایمرجنسی کی حالت میں کیا کرنا ہے وغیرہ وغیرہ۔

سرجی اپنی نظریں دور کھڑے مجسمہ آزادی پر رکھے یہ افسوس کرتے سنائی دیئے کہ برف باری کا موسم ختم ہونے والا ہے اور اب پورا سال انتظار کرنا پڑے گا۔

شہباز کہہ رہا تھا کہ آپ الاسکا چلے جائیں، وہاں برف سارا سال نظر آتی ہیں۔ اسی دوران میں میں نے ان کی ایک تصویر کھینچ لی جس میں دونوں کچھ لوگوں کا راستہ روکے کہہ بحث کر

رہے ہیں۔

جیسے ہی فیری حرکت میں آئی، سب سیاحوں میں حرکت پیدا ہوئی۔ انہوں نے اپنی سیٹوں کو چھوڑا اور ریلنگ کے ساتھ لگے مینہٹن اسکائی لائن کے ساتھ اونچی بلڈنگز کی تصویریں لینے لگے۔ پانیوں کے پار یہ عمارتیں ایک شاندار منظر تخلیق کر رہی تھیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ عمارتیں خالی پڑی ہیں۔ کوئی ہنگامہ یا شور ان میں یا ان کے تلے بچھی سڑکوں پر نہیں ہے اور نہ ان کے نیچے انڈر گراؤنڈ ریلوے کا جال بچھا ہے۔

سامنے ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی جڑواں بلند عمارتیں ایک ساتھ سر جوڑے کھڑی تھیں۔ ایک ہی طرز تعمیر تھا اور ایسا لگتا تھا کہ یہ جڑواں بہنیں ہیں۔ پورے منظر پر یہ چھائی تھیں۔

اگلے سال یہ عمارتیں یہاں نہیں تھیں چند سال بعد کی بھی ایسی ایک اور تصویر اسی مقام کی ہے۔ جس میں میں ہوں مگر یہ دونوں جڑواں بہنیں نہیں ہیں کیونکہ دنیا بدلتی رہتی ہے۔

ہم بیٹری پارک سے دور ہوتے گئے اور مجسمہ آزادی پھر قریب آتا گیا۔ سب کا رخ عمارتوں سے ہٹ کر اسی کی جانب ہو گیا اور کیمرے کلک کلک کرنے لگے۔ دور سے لبرٹی آئی لینڈ پر لگے درخت نظر آ رہے تھے مگر سب کی ٹہنیاں پتوں سے خالی تھیں۔

سرجی کسی سیاح سے واقفیت بنانے کے لیے سرگرداں تھے۔ کسی سے کہتے ”کیا آپ یہاں یہ مجسمہ دیکھنے آئے ہیں؟“ اور کچھ کو یہ بتاتے کہ وہ کیا دیکھنے آئے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ آپ سب سے اتنا فری کیوں ہو رہے ہیں تو وہ بولے۔ ”ڈھلتی عمر کی دوستی بناؤں گا۔“

شہباز بولا کہ ڈھنگ سے یہ مجسمہ دیکھو اور طریقے سے واپس چلے جاؤ۔

شہباز ٹھیک کہہ رہا تھا کہ یہاں پر سب ٹورسٹ ہوتے ہیں۔ آپ ان سے مل کر ایک دو بات کر لیں اور پھر ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جائیں۔ کچھ سفر نامہ نگاروں نے یہ غلط گمان پیدا کر دیا ہے کہ ہر سیاح کو ایک لڑکی ملتی ہے جو اس پر مرتی ہے اور پھر رات کو وہ کسی ریسٹورنٹ میں کینڈل ڈنر کر رہے ہوتے ہیں۔ جب کہ حقیقی سفر میں ایسا بہت کم ہوتا ہے۔

ہم سب کی نظریں لیڈی لبرٹی پر تھیں، جی ہاں اس کو پہلے لیڈی لبرٹی ہی کہا جاتا تھا بلکہ ابھی بھی کہا جاتا ہے۔ ہماری فیری جزیرے کے قریب ہوتی گئی اور میں بھی دوسروں کی طرح تصویریں بنانے لگا۔ فیری کی اوپر والی منزل بھری تھی۔ گزرنے کا راستہ بھی نہ تھا۔ بچ بچا کر گزرتا ہوا میں بھی ایک ریلنگ کے قریب آ گیا اور اس سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اس وقت میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس مجسمے نے کیسے کیسے نظارے دیکھے ہوں گے۔ چالیس لاکھ افراد ہر سال اسے دیکھنے آتے ہیں تاکہ یہ بتا سکیں کہ ہم یہاں آئے تھے۔ ایک بار اس کو دیکھنا ہر ایک کی آرزو ہوتی ہے جو بھی پہلی بار نیو یارک آتا ہے۔

فیری لبرٹی آئی لینڈ پر لکڑی کی بنی ڈیک سے لگ گئی۔ اترتے اترتے رش کی وجہ سے بہت وقت لگ گیا۔ لکڑی کے پلیٹ فارم پر ڈولتے ہوئے ہم لبرٹی آئی لینڈ پہنچ گئے۔ لیڈی لبرٹی جہاں کھڑی تھی اس کے گرد چاروں جانب خوبصورت گھاس بچھی تھی اور پھر جزیرے کے کناروں پر پختہ راستے تھے۔ ہر جگہ بینچ پڑے تھے۔ سیاحوں کا ہجوم تھا۔ کچھ کا رخ مجسمے کی جانب تھا اور کچھ دور سے نظر آتی مینہٹن کی عمارتوں کو دیکھ رہے تھے۔ سب خوش تھے۔ کوئی کسی خوف یا ڈر میں نہ تھا۔ سب کے چہرے کھلکھلا رہے تھے۔ ہم بھی چاروں جانب سے گھوم کر اس بت کو دیکھ رہے تھے۔ سرجی نے معصومیت سے پوچھا۔ ”اس مجسمے کو اتنے اونچے چبوترے پر کس طرح سے چڑھایا ہوگا؟“

شاید انہوں نے وہ تحریریں نہیں پڑھی تھیں جو مختلف مقامات پر آویزاں تھیں۔ اسے بناتے وقت جو یادگار تصاویر لی گئی تھیں وہ بھی جا بجا لگی ہوئی تھیں۔

سرجی کے سوال پر میں نے کہا۔ ”چل کر اس کی تاریخ پڑھتے ہیں۔“

سرجی اور شہباز نے ایک بینچ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”تم پڑھ آؤ اور آ کر ہمیں بھی بتانا۔“

مسکراتے ہوئے میں یہ کہہ کر اٹھ گیا۔ ”آپ بیٹھیں، میں ابھی آ رہا ہوں۔“

واپس آیا تو میرے پاس اپنے اور ان کے سوالوں کے کافی جوابات موجود تھے۔ وہ دونوں لیڈی لبرٹی کی بجائے کسی اور لیڈی کے خم و پیچ دیکھ رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی سرجی بولے۔ ”ابھی تو گئے تھے اور واپس بھی آ گئے؟“

میں بھی بینچ پر آ بیٹھا۔ تھک چکا تھا۔ بیگ سے کوک کے ٹن نکالے اور سب بیٹھ کر پینے لگے۔ سرجی بولے۔ ”اب منہ سے کچھ پھوٹو گے کہ نہیں۔ کس طرح اس مجسمے کو اس پر رکھا گیا تھا، یہ تو بتا دو کیونکہ ان دنوں کرینیں بھی نہ تھیں۔“

میں نے کہا۔ ”یہ فرعون کے زمانے میں نہیں بنا تھا کہ کرینیں نہ ہوں۔“

شہباز بولا۔ ''ذرا مختصر کر کے بتانا۔'' پھر اپنی جیکٹ لپیٹتے ہوئے بولا۔ ''ٹھنڈی ہوا سے سردی بھی بہت لگ رہی ہے۔''

انیسویں صدی میں امریکا کے اندر شدید اور طویل خانہ جنگی تھی۔ امریکی صدر ابراہم لنکن نے غلامی کے خاتمے کا اعلان کیا اور لڑائی کا خاتمہ ہوا۔ فرانس نے سول وار کے خاتمے اور امریکا کو سو سالہ آزادی کی خوشی میں انہیں لیڈی لبرٹی کا تحفہ دیا۔ فرانس کے ایک انجینئر گستیو ایفل نے اس کا ڈیزائن بنایا تھا اور فریڈرکا ستی نے اس مجسمے کو دو ملی میٹر کے کاپر کے پتر سے تخلیق کیا تھا۔ 1876ء میں اسے تین سو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے بحری جہازوں کے ذریعے نیویارک ہاربر لایا گیا تھا۔ فریڈ کو لبرٹی آئی لینڈ کا مقام پسند آیا کہ اسے یہاں پر لگایا جائے۔ اس جزیرے پر پہلے قلعہ تھا، جس کی تصویریں ابھی تک موجود ہیں۔ انجینئر گستیو ایفل وہی تھا جس نے انہی دنوں میں ایفل ٹاور کو ڈیزائن کیا تھا۔

اب معاملہ یہ تھا کہ اس کے لیے پہلے پلیٹ فارم تیار کیا جائے۔ مجسمہ تو خود ایک سو اکیاون فٹ بلند تھا مگر پلیٹ فارم ساڑھے تین سو فٹ کا تیار کیا گیا پھر لیڈی لبرٹی کے اعضا جوڑے گئے اور دس سالوں میں اسے مکمل کیا گیا۔ 1886 میں اسے اس جگہ کھڑا کیا گیا۔ سر پر تاج ہے اور تاج سے نکلتی سات شعاعیں ہیں جو سات سمندروں اور سات براعظموں کی نشان دہی کرتی ہیں۔ سیدھے ہاتھ میں مشعل ہے جو آزادی کی علامت ہے۔ بائیں ہاتھ میں امریکا کے آئین کی کتاب ہے جس میں انسانی حقوق کی حفاظت کو علامتی طور پر بتایا گیا ہے۔ کتاب پر 4 جولائی امریکا کی آزادی کا دن لکھا ہوا ہے۔ مجسمے کا پاؤں کھلے چپل میں ہیں جو آزادی کی علامت ہے اور بائیں پاؤں کے قریب ایک ٹوٹی ہوئی زنجیر ہے جو غلامی سے آزادی کو بیان کرتی ہے۔ پہلے یہ براؤن رنگ کا تھا اور اب موسمی تبدیلیوں سے اس کا رنگ سبز ہو چکا ہے۔ کروڑوں تارکین وطن یورپ سے یہاں پہنچتے اور لیڈی صاحبہ کو دور سے دیکھ کر اپنی آزادی اور نئی زمین پر پہنچنے کا جشن مناتے تھے۔ تھکے ہارے اور نڈھال پناہ گزین اسے خوشی سے دیکھتے اور اپنے درد بھول جاتے۔ انیسویں صدی سے بیسویں صدی کے وسط تک بحری جہاز بھر بھر کر تارکین یہاں آتے اور امریکا میں انہیں پناہ مل جاتی۔ ایلس آئی لینڈ جو دریا کے بیچ کچھ فاصلے کی دوری پر ایک جزیرہ ہے، یہ جہاز وہیں لنگر انداز ہوتے۔ امریکا کی امیگریشن کا مرکزی دفتر وہاں قائم تھا۔

میں یہ سب معلومات ڈائری پر لکھ لایا تھا اور اب پڑھ کر انہیں سنا رہا تھا۔ دیکھا تو شہباز اونگھ رہا ہے اور سر جی کی نظریں میموں کی پنڈلیوں پر ہیں۔ میں تپ گیا۔ ''میں اتنی دیر سے بکواس کر رہا ہوں اور آپ لوگوں کا کوئی دھیان ہی نہیں۔''

سر جی کہنے لگے۔ ''قسم سے میں سن رہا تھا اور سب باتیں میری سمجھ میں بھی آگئی ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''بتاؤ میں کیا بکواس کر رہا تھا۔''

انہوں نے جواب دیا۔ ''ماشاء اللہ آپ نے دریا کو کوزے میں بند کر کے سب معلومات دے دی ہیں۔''

میں نے چڑ کر ان دونوں کو کہا۔ ''جس جس نے میرے ساتھ اوپر مجسمے پر چڑھنا ہے، وہ آجائے۔''

یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ شہباز بڑبڑاتا ہوا اٹھا اور سر جی کی جیکٹ کا کالر پکڑ کر انہیں گھسیٹتا ہوا میرے پیچھے پیچھے آنے لگا۔

لیڈی لبرٹی کے اندر لوہا ہی لوہا تھا۔ چکر کھاتی آہنی سیڑھیاں تھیں۔ پسینے سے بھرا شہباز کا زرد چہرہ تھا، لرزتے ہوئے سر جی اور لڑکھڑاتا ہوا میں تھا۔ معلوم نہیں میں ایسا کون سا گناہ کر بیٹھا تھا کہ ہم نے اوپر لیڈی لبرٹی کے تاج پر ہاتھ رکھنے کا قصد کر لیا۔ پچھلے کئی ماہ سے میں وقت کی سخت چکی میں پسا چلا آ رہا تھا اور کوئی ڈھنگ کی خوراک بھی نہ تھی اور وزن بھی کمزوری کی وجہ سے بہت کم ہو گیا تھا۔ جس کا خمیازہ آج میں سیڑھیاں چڑھتے وصول کر رہا تھا۔ کئی لوگ اوپر جا رہے تھے اور بہت سے نیچے اتر رہے تھے۔ شہباز تقریباً روتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''آپ نے مجھے اوپر چڑھا کر اچھا نہیں کیا۔'' پھر کچھ دیر کے لیے رکا، اپنی سانس درست کی اور کہنے لگا۔ ''اوپر سے بھی دریا اور مینہٹن ہی تو نظر آئے گا۔ کیا یہاں سے ہمیں پاکستان دکھے گا جو زبردستی ہمیں اوپر چڑھا لائے ہو۔''

سر جی بھی کھڑے سستا رہے تھے اور کہنے لگے۔ ''دمے کے مریضوں کو تو ہرگز نہیں آنا چاہیے۔'' شہباز کے پاس بولنے کی ہمت نہ تھی اور خاموش ہو کر سرخ آنکھوں سے سر جی کو گھورنے لگا۔ تبھی سر جی نے ایک ایسی حرکت کر دی کہ میرا غصے سے برا حال ہو گیا۔ ہمارے پیچھے سیاحوں کا جو غول تھا وہ بھڑ اٹھا۔

(جاری ہے)

یادیں

شیراز خان

انسانی دماغ ایک ایسا عضو ہے جس کی کارکردگی کا اندازہ لگانا بھی ممکن نہیں۔ یہ نہ صرف خاک سے بنے انسان کے ہر عضو کو متحرک رکھتا ہے بلکہ اس سے کام بھی لیتا ہے، زندگی گزارنے کے طریقے بھی واضح کرتا ہے۔ مستقبل کی تعمیر اور ماضی کے اسباق بھی یاد کراتا ہے۔ یہ یادیں ہمیں نفسیاتی طور پر چاق و چوبند رہنے میں مدد دیتی ہیں لیکن یہ یادیں ہیں کیا، اس پر ایک مختصر سی تحریر۔

یادوں کو ہم کس طرح تروتازہ رکھ سکتے ہیں؟
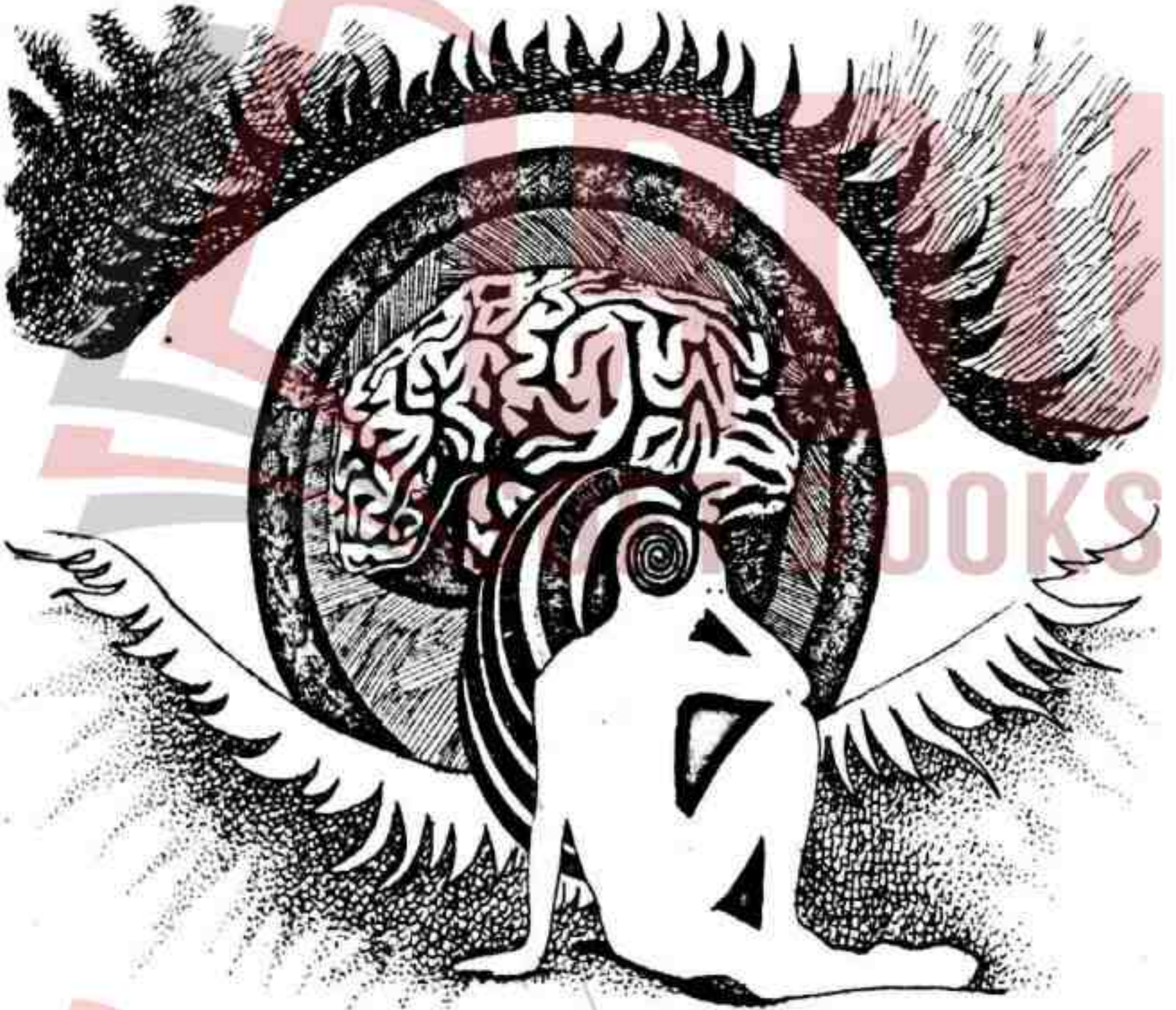
میں نے سرگزشت کے لیے جس موضوع پر لکھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ ایک اہم موضوع ہے۔ یہ وہ پرابلم ہے جو ہر شخص کے ساتھ پیش آتی ہے۔ یعنی یادداشت کی کمزوری۔

یادیں کمزور بھی ہوتی ہیں اور توانا بھی۔ میں نے کوشش کی ہے کہ آپ کے لیے اس موضوع کو آسان اور دلچسپ بنایا جائے تاکہ آپ کو اس قسم کی شکایت نہ ہو کہ ایسے موضوعات تو بہت خشک ہوتے ہیں۔

میں نے اسی لیے اس موضوع کو مختلف اقوال، اشعار اور آسان پیرائے کے اسلوب سے تحریر کیا ہے۔ یادیں انسان کے ساتھ رہتی ہیں۔ اس کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ ہم ان سے نکل کر کہیں جا نہیں سکتے۔

آگسٹ اسٹرونگ برڈ نے کہا تھا کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ہم نے کتنی دور کا سفر کیا ہے۔ یادیں سامان کی طرح ہمارے ساتھ رہتی ہیں۔

وقت گزرتا جاتا ہے۔ ہم بھولتے جاتے ہیں۔ تلخ اور اداس کرنے والی یادیں ایک نظام فطرت کے تحت ہمارے لاشعور کے کسی خانے میں جا کر پوشیدہ ہو جاتی ہیں اور جب وقت آتا ہے تو وہ اپنی پوری جزئیات کے ساتھ ہمارے سامنے آ کر یا تو ہمیں اداس کر دیتی ہیں یا ہمارے ہونٹوں پر مسکراہٹیں بکھیر دیتی ہیں۔

اچھی یادیں ایسی ہوتی ہیں جیسے آپ نے اپنے دامن میں ستارے بھر رکھے ہوں۔ رات کی تنہائی اور اداسی کی کیفیت میں جب آپ اپنی ان اچھی یادوں کے ستاروں کو اپنے دامن سے نکالتے ہیں تو آپ کا پورا کمرا روشنیوں سے بھر جاتا ہے۔

یاد رکھیں کہ ایسی روشن یادیں ان ہی کی ہوتی ہیں جن کا ماضی پاک، بے داغ یا تلخیوں سے بھرا ہوتا ہے۔ ورنہ دعا کرنی پڑتی ہے۔ "یاد ماضی عذاب ہے یارب۔ چھین لے مجھ سے حافظہ میرا۔"

"ایک صاحب نے کہا کہ وہ اپنی بیوی کی یادداشت کی وجہ سے بہت پریشان ہیں۔ پوچھا گیا کیا آپ کی بیوی ہر بات بھول جاتی ہے؟"

کہنے لگے۔ "نہیں، پرابلم یہ ہے کہ وہ ہر بات یاد رکھتی ہے۔"

یہ یادداشت ہے کیا؟

یادداشت آپ کی گزری ہوئی زندگی کے تجربات اور مشاہدات ہیں۔ یاد رکھیں کہ کسی بھی چیز کو یاد رکھنے کے لیے مشاہدے کی قوت کا ہونا بہت ضروری ہے۔

بہت سی چیزیں ہم اس لیے نہیں بھولتے کہ ہمارا حافظہ خراب تھا بلکہ اس لیے بھول جاتے ہیں کہ ہمارا مشاہدہ کمزور تھا۔

حافظہ کو ہم انگریزی میں میموری کہتے ہیں۔ انگلش کا لفظ میموری لاطینی لفظ میموریں سے لیا گیا ہے۔ سائیکلوجیکل اور نیورولوجیکل ٹرم میں یہ وہ اسٹور ہے جس میں آپ اپنے تجربات اور مشاہدات کو جمع کر لیتے ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ جب تحریر ایجاد نہیں ہوئی تھی تو لوگوں کی یادداشتیں بہت مضبوط ہوا کرتیں۔ وہ ریاستی قوانین اور مذہبی باتوں کو سن سن کر اپنی یادداشت میں اسٹور کر لیا کرتے۔ پھر آگے بڑھا دیتے۔ خود قرآن شریف کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

قرآن حفظ کر کے لوگ اس کلام کو ایک دوسرے میں منتقل کر دیا کرتے۔

تحریر کی ایجاد نے انسان کی یادداشت کے خانوں کو کمزور کرنا شروع کر دیا۔ وہ چونکہ تحریر ریکارڈ رکھنے کے قابل ہو گیا تھا۔ اس لیے اس نے یادداشت کی تلوار کے تیز کرنے کا عمل ترک کر دیا۔

یادداشت کا مرکز ہے دماغ۔ اور دماغ آپ کے اعصابی سسٹم سے منسلک ہے۔

دماغ اعصابی سسٹم کا حب ہے۔ یہ سو ملین اعصابی خلیات سے بنا ہوا ہے اور ہر خلیہ دس ہزار دوسرے خلیات سے منسلک ہے۔

آپ کا دماغ صرف صحت و مرض اور رنج و خوشی ہی کا نہیں بلکہ ہر چیز کا خالق ہے۔ یہ مصوری کے شاہ کار، بت تراشی کے نمونے، یہ دلوں کو چھو لینے والے اشعار، یہ عالیشان عمارتیں سب اسی کے مرہون منت ہیں۔ دراصل یہ وہ لہریں ہیں جو پہلے دماغ میں پیدا ہوئیں، پھر ان لہروں نے کہیں نغمہ، کہیں حسن، کہیں اہرام مصر اور کہیں تاج محل کی صورت اختیار کر لی۔

یہ کائنات تخیل کی ایک لہر ہے جو کبھی خالق کے دماغ میں پیدا ہوئی تھی۔ ذہنی تصورات اصل ہیں اور مادی اشیا ان کا عکس۔ یوں سمجھ لیں کہ حقائق کے قلعے پہلے دماغ میں، پھر زمین پر تعمیر ہوتے ہیں۔ کائنات میں لاتعداد دماغ موجود ہیں جن سے نکلی ہوئی لہریں ہر طرف رواں دواں ہیں۔

میں کوئی نیورولوجسٹ نہیں ہوں کہ دماغ کی باریکیوں اور اس کی بناوٹ وغیرہ پر کچھ لکھوں۔ یہ مضمون تو اس لیے کہ آپ کو آپ کی یادداشت کے حوالے سے کچھ مفید باتیں بتا دی جائیں۔ دماغ چونکہ یادداشت کا اسٹور ہے۔ اسی لیے اس کا بھی تذکرہ آ گیا ہے۔

ریسرچ نے بتایا ہے کہ دماغ کے دو حصے ہوتے ہیں۔ دایاں اور بایاں۔

ان دونوں حصوں کے فنکشنز الگ الگ ہوتے ہیں۔

ہاویاں۔ منطق، لاجیکل۔ تربیت یافتہ۔ یعنی واقعات کو ذہن میں ترتیب سے رکھنے والا۔

تجزیہ کرنے والا۔ جذبات میں دیکھنے والا۔

یہ تو ہو گئیں بائیں حصے کی خصوصیات۔ اب آجائیں دائیں حصے کی طرف۔

انگل پچو۔ یوں ہی بے سوچے سمجھے۔ Rawdam۔

وجدانی۔ اور کاملیت میں دیکھنے والا۔

یہ تو تھیں دماغ کے حوالے سے چند باتیں۔ اب اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔ یعنی میموری۔ یادداشت کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔ پہلی ہے Sensory memory۔ حسیاتی یا وقتی یادداشت۔

اس کا تعلق صرف آپ کی حسیات سے ہے۔ اگر ہم اس موضوع پر لکھنا شروع کر دیں تو یہ ایک الگ داستان ہو جائے گی۔

فی الحال اتنا جانتے چلیں کہ یہ وہ میموری ہے جس کا تعلق انسان کی بنیادی حسیات سے ہوتا ہے۔

میموری کی دوسری قسم ہے ورکنگ میموری۔ جبکہ تیسری قسم ہے Long Term memory۔ یہ ہمیشہ کے لیے ہوتی ہے۔ لانگ ٹرم میموری آگے جا کر دو حصوں میں بٹ جاتی ہے۔

ایک ہے Expaicit memory۔ اس کا تعلق آپ کے کانشس یعنی شعور سے ہوتا ہے۔ یہ واضح طور پر قطعی انداز میں چیزوں کی وضاحت کرتی ہے اور آپ کو یاد دلاتی رہتی ہے۔

لانگ ٹرم میموری کی دوسری قسم ہے Explicit memory۔ اس کا تعلق آپ کے لاشعور سے ہوتا ہے۔ یہ ایک مبہم انداز ہے۔ ہلکی ہلکی یادیں اس سے منسلک ہوتی ہیں۔

یادوں کا بہت گہرا تعلق وقت سے ہوتا ہے۔ لیکن یہ دونوں دو مختلف ڈائریکشن میں سفر کرتے ہیں۔ وقت ایک سمت میں سفر کرتا ہے اور یادیں دوسری سمت میں۔

یعنی وقت آگے کی طرف جا رہا ہے اور یادیں آپ کے سامنے آپ کے ماضی کو لا رہی ہیں۔

خلیل جبران نے کہا تھا کہ گزرا ہوا کل آج کی یادیں ہیں۔ اور آنے والا کل آج کے خواب۔ اس دانشور نے کتنی خوبصورتی سے یادوں، وقت اور خوابوں کو ایک ساتھ شامل کر دیا ہے۔

یادداشت کے ساتھ عام طور پر دو باتیں ہوا کرتی ہیں۔

آپ آج اور کل کی باتیں بھول جاتے ہیں۔

جیسے آپ کو یاد نہیں رہتا کہ آپ نے اپنی عینک کہاں رکھ دی۔ گاڑی کی چابی کہاں ہے۔ کل جس سے ملاقات ہوئی اس کا نام کیا تھا، وغیرہ۔ یہ سب شارٹ ٹرم میموری کی خرابیاں ہیں۔

اس کے برعکس آپ کو اپنا بچپن یاد رہتا ہے۔ اس دور کی شرارتیں، حادثات اور محبتیں وغیرہ سب یاد رہ جاتی ہیں۔

اس کی وجہ ہے ان چیزوں اور ان لوگوں سے آپ کی Attachement۔ ان سے آپ کا لگاؤ۔

وفا کا زخم ہے گہرا تو کوئی بات نہیں
لگاؤ بھی تو مجھے ان سے انتہا کا تھا

جتنا گہرا لگاؤ ہوگا۔ یادیں اسی قدر مضبوطی کے ساتھ آپ سے چمٹی رہیں گی۔

گویا آپ یادوں سے جتنا پیار کرتے ہیں، وہ اسی قدر توانا ہوتی جاتی ہیں۔

ہم نے اپنی زندگی میں نہ جانے کتنے لوگوں کو مرتے دیکھا ہوگا عزیز، رشتہ دار، دوست، محبوب، استاد اور بہت سے۔

لیکن ہوتا یہ ہے کہ ان میں سے نوّے فیصد لوگ ہمارے ذہنوں سے فراموش ہو جاتے ہیں لیکن دس فیصد ایسے ہوتے ہیں جن کو ہم کبھی فراموش نہیں کر پاتے۔ ہم ان کے جسموں کو تو کسی قبرستان میں جا کر دفن کر آتے ہیں لیکن ان کی یادوں کو اپنے ذہنوں کی کیاریوں میں دفن کر لیتے ہیں اور لاکھ کوششوں کے باوجود انہیں جھٹک نہیں پاتے۔

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن وہ اور یاد آتے ہیں
الٰہی ترک الفت پہ وہ کیوں کر یاد آتے ہیں

ہماری یادیں ہمارے ذہنوں میں اس طرح نہیں ہوتیں۔ جس طرح کسی لائبریری میں کتابیں ایک خاص ترتیب کے ساتھ سجا دی جاتی ہیں بلکہ یہ ہمارے ذہنوں کے آسمان پر اڑتے ہوئے پرندوں کی طرح ہوتی ہیں۔

ہماری یادداشت شارٹ ٹرم میموری میں اکثر ہمارا ساتھ نہیں دیتی۔

علمائے نفسیات کا نظریہ یہ ہے کہ ہر دیکھی اور سنی ہوئی چیز ہمارے تحت الشعور میں محفوظ رہتی ہے۔ اور ذہن سے

نکل کر ہمارے شعور میں آ جاتی ہے۔

علمائے روحانیت کا خیال یہ ہے کہ ہر شئے ایتھر میں موجود ہے۔ ایتھر یعنی آسٹرل ورلڈ۔ ویسے یہ آسٹرل ورلڈ بھی ایک دلچسپ سبجیکٹ ہے۔ موقع ملا تو اس پر بھی لکھنے کی کوشش کروں گا۔

تو ہم جب کسی کا نام یا کسی شعر کا کوئی مصرعہ بھول جاتے ہیں تو کچھ بے چینی سی ہو جاتی ہے۔ اسی بے چینی سے کاسمک ورلڈ میں لہریں سی اٹھتی ہیں جو ایتھری طاقتوں سے جا ٹکراتی ہیں۔ وہ طاقتیں کتاب ایتھر سے اس چیز کو تلاش کرنے کے بعد اپنا پیغام لہروں میں بھر دیتی ہیں۔ یہ لہریں ہمارے دماغ تک پہنچتی ہیں اور وہ بھولی ہوئی چیز ہمیں یاد آ جاتی ہے۔

ایسی لہریں کوئی کہانیاں نہیں ہیں۔ بلکہ اپنی پوری قوت کے ساتھ ہمارے اطراف موجود ہیں۔

سب سے پہلے فیثا غورث نے یہ انکشاف کیا تھا کہ کائنات کی ہر چیز سے لہریں نکل رہی ہیں اور آپ کے دماغ کی لہروں میں جتنی جان ہو گی، آپ کی یادداشت بھی ویسی ہی مضبوط رہے گی۔ یادوں کے بغیر کوئی کلچر نہیں۔ کوئی تہذیب نہیں اور کوئی مستقبل نہیں ہوتا۔

اچھی یادداشت کے لیے حضرت عیسیٰ نے ایک ٹوٹکا بتایا ہے کہ ”گناہوں کو چھوڑ دے، یادداشت بہتر ہو جائے گی۔“

یہ بہت کمال کی بات ہے۔ لیکن اس نسخے پر عمل کرنا ہر ایک کے بس کی بات بھی نہیں ہے۔ چلیں، اب پھر یادداشت کی بات کرتے ہیں۔ میں بہت چھوٹی چھوٹی باتوں سے ابتدا کروں گا۔

جیسے کوئی کام کرنا ہے۔ لیکن بھول جاتے ہیں۔ بجلی کا بل ادا کرنا ہے لیکن دفتر جا کر یاد ہی نہیں رہا۔ تو ایسا کریں کہ اپنی کلائی پر ایک ربڑ بینڈ چڑھا لیں۔ یعنی اس کام کو کسی آبجیکٹ کے ساتھ منسلک کر لیں۔ دفتر میں آپ جب بھی اس ربڑ بینڈ کو دیکھیں گے آپ کو بجلی کا بل یاد آ جائے گا۔

غالب نے کہا تھا۔ ”فلک کو دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی۔“

شاعر نے محبوب کو آسمان سے منسلک کر دیا۔ اب جب بھی وہ آسمان کو دیکھتا ہے۔ اسے محبوب یاد آ جاتا ہے۔ کوئی بھی کام ہو اس کو ایک علامت بنا دیں۔

دروازے پر ایک پن لگا دیں تاکہ آپ کو یاد رہے کہ آپ اس شام کسی پارٹی میں جانے والے ہیں۔ آستین میں سیفٹی پن لگا کر آپ یاد رکھ سکتے ہیں کہ آج آپ کو ای میل کرنی ہے، وغیرہ۔

آپ کو جگہوں کے نام یاد نہیں رہتے۔ یہ ایک عام سی پرابلم ہے۔ آپ اپنے دماغ کو کیمرا بنا لیں۔ جس طرف سے گزریں اس کیمرے سے راستے کی تصویریں اتارتے جائیں۔

آپ کسی کے نام کو بھی تصویر بنا کر اسے یاد رکھ سکتے ہیں۔ علامت کے طور پر یا کسی اور انداز سے۔

جیسے میری کسی جاننے والی کا نام سلطانہ ہے تو میں اپنے ذہن میں ایک سلطان کی تصویر بناؤں گا۔ ایک شخص تاج پہنے ہوئے، ہاتھ میں ایک تلوار لیے چلا آ رہا ہے۔ اس کے ساتھ ایک خاتون بھی ہے تو جب بھی میں اس سلطان کو اپنے دھیان میں لاؤں گا، وہ عورت یاد آ جائے گی۔ اس کے ساتھ اس کا نام یاد آ جائے گا۔ سلطانہ۔ آپ کو کوئی جملہ یاد کرنا ہے۔ جیسے رات گزر رہی جائے گی۔ یہ ایک جملہ ہے۔ اب یہ لفظ کا پہلا حرف لے لیں۔ ر۔ گ۔ ہ۔ ج۔ گ۔ (رات گزر رہی جائے گی)

ایک اور طریقہ ہے۔ جس کو ایکرو ناٹم کہا گیا ہے۔ اس میں کسی لفظ کے ہر حرف کو ایک تصور دے دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک شہر ہے لاہور۔

اب لاڑکانہ ہے۔ الف اسلام آباد ہے۔ ہ ہاتھی ہے۔ و وعدہ ہے اور ر ریل ہے۔

کئی بار آپ کو اس بات پر شرمندگی ہوتی ہو گی کہ کوئی آپ سے ملا اور آپ کو اس کا نام یاد نہیں رہا۔ تو اس کے نام کو یاد رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ ملاقات کے وقت آپ اس کا نام بار بار دہرائیں۔

جیسے اطہر صاحب آپ کہاں رہتے ہیں؟ اطہر صاحب آپ کا دفتر کہاں ہے۔ اطہر صاحب آپ کے کتنے بچے ہیں، وغیرہ۔ اس طرح کئی بار دہرائیں گے تو آپ کو اس کا نام یاد رہ جائے گا۔

ایک اور طریقہ ہے کہ آپ اس کا نام اپنے تصور کی انگلی سے اس کی پیشانی پر لکھ دیں۔ اور ایسا کرتے وقت ایک گہری سانس لیں۔ اس وقت یقیناً لہریں آپ کے پیٹ سے نکل کر سیدھے دماغ تک جائیں گی اور اس کا نام آپ کو یاد رہ جائے گا۔

اسٹرلیس ہال کی تکنیک۔ یہ طریقہ اس وقت استعمال

کرتے ہیں جب آپ کوئی نئی انفارمیشن لے رہے ہوں۔ یا کوئی نمبر یاد کر رہے ہوں۔

اگر آپ دائیں ہاتھ سے کام کرنے کے عادی ہیں تو انفارمیشن لیتے یا نمبر یاد کرتے ہوئے آپ دائیں مٹھی کو کھولیں اور بند کریں۔ پھر کھولیں اور بند کریں اور اس نمبر کو دہراتے جائیں۔

اور اگر بائیں ہاتھ سے کام کرنے کے عادی ہوں تو بائیں مٹھی کے ساتھ ایسا کریں۔

دن میں ایک یا دو بار آنکھیں بند کر کے آنکھوں کی پتلیوں کو دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں گھمائیں۔ پھر اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر لے جائیں۔

بہت سے لوگوں کو فوری طور پر یاد نہیں آتا کہ کس مہینے میں کتنے دن ہوتے ہیں۔ وہ انگلیوں پر حساب لگاتے ہیں یا کلینڈر دیکھنے لگتے ہیں۔ ایک آسان فارمولا ہے یاد کریں۔

تھرٹی ڈیز آف ستمبر۔ اپریل جون نومبر۔ ایک سسٹم ہوتا ہے۔ جس کو Chunking کا نام دیا گیا ہے۔ اس میں آپ طویل نمبروں کو یاد رکھ سکتے ہیں۔ جیسے 5558675309۔

ان نمبروں کو ٹکڑوں میں کر دیں۔ 555-867-5309۔ آپ کو طویل نمبر یاد رہ جائے گا۔

ایک اور طریقہ ioci کا ہے۔

اس میں ہر چیز کی ایک کہانی بناتے چلے جاتے ہیں یا اس کو ڈراما کر دیتے ہیں۔ جیسے آپ کو کچھ سامان لینے کے لیے گھر سے بھیجا گیا ہے۔ آپ کو آلو، پیاز، ٹماٹر، دھنیا اور انڈے وغیرہ لینے ہیں۔

اب آپ گھر سے نکلے آپ کو مسٹر آلو مل گئے۔ وہ بھی ساتھ ہو لیے۔ مسٹر آلو نے کہا کہ میرا اور پیاز کا جنم جنم کا ساتھ ہے۔ اس کو بھی ہمراہ لے لیں۔ آپ نے پیاز بھی لیے۔

کچھ دور پر پیاز کو ٹماٹر کا خیال آ گیا۔ ٹھیلے پر چھوٹی بہن دھنیا بھی تھی۔ اس نے رونا دھونا مچا دیا۔ اس کو بھی لے لیا گیا۔ کچھ فاصلے پر آپ کو ایک مرغی دکھائی دے گئی۔ اس کو دیکھتے ہی انڈے یاد آ گئے۔

لیں صاحب، آپ کا سودا پورا ہو گیا۔

تو آئی او سی آئی کے طریقے ہیں آپ چیزوں کو کسی کہانی کی شکل دے دیتے ہیں اور چیزیں آپ کو یاد رہ جاتی ہیں۔

اپنی حسیات سے بھی کام لیں۔ رنگ، ذائقے، آوازوں اور صورت کی بنیاد پر یاد رکھیں۔ جیسے فلاں تو اس طرح بولتی ہے۔ جیسے بلی خرخر کر رہی ہو۔ اور جب اس کا نام یاد کرنا ہو تو بلی کو ذہن میں لائیں نام یاد آ جائے گا۔

سکندر صاحب تو توے کی طرح کالے ہیں۔ اب توے کو یاد کریں گے تو سکندر صاحب یاد آ جائیں گے۔

ایک بہت مضبوط اور اہم طریقہ ہے کہ جو سنیں اسے یاد کر لیں۔

یاد رکھیں کہ ہاتھ اور ذہن کا رابطہ ہوتا ہے۔ آپ جو ہاتھ سے لکھتے ہیں اس کو ذہن جلدی جلدی کاپی کر لیتا ہے۔ فرض کریں کہ آپ نے کوئی اہم لیکچر سنا ہے تو اس کو ہاتھ سے لکھ لیں۔ اس کے بعد اگر آپ کمپیوٹر استعمال کرتے ہیں تو اس کو کمپوز کر لیں۔ لیکن ذرا مختلف انداز سے۔

آپ کو جو یاد کرنا ہے اس کو بلند آواز میں دہرائیں۔ لیکن ایک ردھم ایک آہنگ کے ساتھ۔ جیسے آپ کوئی گیت گا رہے ہوں۔

مدرسوں میں حفظ کرنے والے بچوں کو دھیان میں لائیں۔ وہ سب ایک ردھم کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔

یاد رکھنے کا مضبوط اصول دہرانا، دہرانا اور صرف دہرانا ہے۔ اگر آپ نے اپنے آپ کو سلیقے کے ساتھ آرگنائز کر لیا تو آپ کی یادداشت کی آدھی پریشانی ختم ہو جائے گی۔

جیسے آپ کو صبح دفتر جانا ہے اور کچھ چیزیں بھی ساتھ لے جاتے ہیں۔ آپ کی ذاتی چھوٹی موٹی چیزیں۔

تو گھر کے دروازے سے نکلتے ہی روانہ نہ ہو جائیں بلکہ دروازے سے باہر نکل کر تین چار دفعہ گہری گہری سانسیں لیں۔ آپ کو یاد آنے لگے گا کہ آپ کیا کیا بھول رہے ہیں۔

آپ اس کے لیے خود کو manage کریں۔

اس کا طریقہ یہ ہے کہ جو کچھ صبح رکھنا ہے ان چیزوں کو رات ہی کے وقت کسی ایسی جگہ رکھ دیں جہاں آپ کی نظر جا سکے۔ پھر آرام سے چیزیں اٹھائیں اور روانہ ہو جائیں۔

ایک عادت ہے کہ ہم گھر آ کر اپنی چیزوں کو ادھر ادھر رکھ دیتے ہیں۔ اس کے بعد تلاش کرتے رہ جاتے ہیں کہ گاڑی کی چابی کہاں ہے۔ سیل فون کہاں ہے۔ اس سے نجات کا طریقہ یہ ہے کہ ہر چیز کو ایک پراپر جگہ رکھے

کی عادت بنالیں۔ آپ کو پریشانی نہیں ہوگی۔
آپ کو جو کچھ اپنے ساتھ لے جانا ہے۔ اس کو یاد رکھنے کا ٹوٹکا یہ ہے کہ اپنے آپ کو بتاتے رہیں جیسے آپ کا نام امجد ہے۔ اب کمرے سے نکلتے ہوئے بلند آواز میں کہیں۔ "امجد تم نے گاڑی کی چابی لے لی۔ امجد تم نے اپنا موبائل اٹھالیا' امجد تم نے اپنی ڈائری رکھ لی، وغیرہ وغیرہ۔"

فرض کریں۔ آپ کو صبح ناشتے کے بعد کوئی دوا لینی ہوتی ہے لیکن اکثر بھول جاتے ہیں۔ اب ایسا کریں۔ اپنے آپ سے عہد کرلیں کہ آپ کو ناشتا نہیں کرنا۔ آپ کو صبح اپنا عہد یاد آجائے گا۔

جو لوگ پڑھنے والے ہوتے ہیں۔ ان کو یہ شکایت ہوتی ہے کہ باتیں یاد نہیں رہتیں۔

اس کی ایک وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ ایک وقت میں کئی چیزیں ہضم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نہیں ایسا نہ کریں۔ اگر آپ ایک کتاب پڑھ رہے ہیں تو اس کو پڑھتے رہیں۔ یعنی ایک وقت میں ایک کام پر توجہ کی تکنیک۔

صحت مند ذہن کے چھ ستون ہوا کرتے ہیں۔

1- پابندی سے ورزش۔ یاد رکھیں کہ جب آپ جسم کی ورزش کرتے ہیں تو اس کے ساتھ ذہن کی ورزش بھی ہو جاتی ہے۔

بہت پرانی کہاوت ہے کہ ایک صحت مند ذہن صحت مند جسم کے اندر ہی ہوتا ہے۔ یہاں صحت مند جسم سے مراد کوئی پہلوان یا باکسر ہونا نہیں ہے۔ بلکہ بیمار نہ ہونا ہے۔

2- صحت مند غذا۔ یہ بہت ضروری ہے۔ اس بارے میں آپ آگے دیکھیے گے کہ دماغی صحت کے لیے آپ کو کیا کھانا ہے یا کیا نہیں۔

3- اچھی اور پرسکون نیند۔

4- ذہن کو تحریک دلاتے رہنا۔

5- ذہنی دباؤ اور ہیجان وغیرہ سے دوری۔ ہو سکتا ہے کہ یہ اتنا آسان نہ ہو۔ لیکن مراقبہ ایسی چیز ہے جس سے آپ بڑی حد تک اس کی شدت کو کم کر سکتے ہیں۔

4- اور ایک بھرپور سماجی زندگی۔

یاد رکھیں کہ ایک خوش گوار سماجی زندگی آپ کی ذہنی صحت کے لیے بہت ضروری ہے۔ آپ نے زندگی سے دلچسپی نہ رکھنے والوں کو دیکھا ہوگا۔ عام طور پر ان کا حافظہ کمزور ہوتا ہے یا تنہا زندگی گزارنے والے الزائمر کا شکار ہو جاتے ہیں۔

الزائمر، ایک عام سا مرض ہے۔ نسیان کا مرض۔ عام طور پر عمر کے آخری حصوں میں ہوتا ہے۔ لیکن یہ کوئی کلیہ نہیں ہے۔ کسی بھی وقت ہو سکتا ہے۔ اس کا کھوج جرمنی کے فزیشن الائیز الزائمر نے لگایا تھا۔ اس کے نام پر اس مرض کا نام رکھا گیا ہے۔

ڈاکٹر الزائمر کی وفات انیس سو پندرہ میں ہوئی تھی۔

اس دوران وہ بہت سے مریضوں کا علاج کر چکا تھا۔

کیا آپ جانتے ہیں کہ ایسے بہت سے لوگ ہیں جن کی یادداشت حیرت انگیز ہوا کرتی تھی۔ یا ہوا کرتی ہے جیسے۔

انڈونیشیا کے مرحوم صدر سوئیکارنو۔ ان کی یادداشت کا یہ حال تھا کہ اگر کسی جنگل کی طرف سے گزرتے تو انہیں یاد رہتا تھا کہ پچھلے سال اس جگہ ایک درخت دیکھا تھا۔ وہ اب نظر نہیں آرہا ہے۔

ایک اسلامی اسکالر سعید مری تھے۔ ان کی یادداشت کا یہ حال تھا کہ کوئی بھی کتاب بس ایک دفعہ دیکھ کر زبانی سنا دیا کرتے تھے۔

جان دان ریان فون ڈائریکٹری کا کوئی بھی ورق ایک نظر دیکھ کر زبانی نام اور نمبر بتا دیا کرتا تھا۔ نپولین کے بارے میں مشہور ہے کہ اسے اپنی رجمنٹ کے ہر سپاہی کا نام اور چہرہ یاد تھا۔

اس قسم کی غیر معمولی یادداشت خدا کا تحفہ ہوتی ہے۔ آپ بھی محبت، توجہ اور مشاہدے کی قوت سے یہ کمال حاصل کر سکتے ہیں۔

اب یہ دیکھیں کہ آپ کی یادداشت کو تباہ کرنے والی کیا کیا چیزیں ہیں۔

1- وہ بے تحاشا دوائیں جو آپ استعمال کر چکے ہیں یا کر رہے ہیں۔ خاص طور پر اینٹی سپٹک دوائیں۔ یہ یادداشت کے سیل کو کمزور کر دیتی ہیں۔

2- شراب نوشی اور سگریٹ نوشی۔ ان میں دیگر خرابیوں کے علاوہ ایک خرابی یہ بھی ہے کہ یادداشت کو برباد کر دیتی ہیں۔ استعمال کرنے والوں کو صرف شراب اور سگریٹ ہی یاد رہ جاتی ہے۔

3- بے خوابی۔ یا بھرپور نیند کا نہ ہونا۔ رات بھر جاگتے رہنا۔ یادداشت کی کمزوری کا ایک اہم سبب ہیں۔

4- ذہنی دباؤ اور پریشانیاں۔ یہ کیفیات انسان کی

یادداشت کی دشمن ہیں۔

5- غیر صحت مند خوراک۔ یہ ایک اہم عنصر ہے۔

6- سر کی چوٹ۔ اس سے بھی یادداشت چلی جاتی ہے۔

7- کوئی جذباتی صدمہ۔ یا اسٹروک۔

8- منفی سوچ اور منفی رویہ بھی یادداشت کے دشمن ہیں۔ آپ اگر اپنے مزاج میں نیگیٹو ہیں تو آپ کے دوست اور رشتے دار بھی آپ سے دور ہو جاتے ہیں۔ یادیں تو بے چاری بہت چھوٹی سی چیز ہیں۔

9- موبائل فون کا مسلسل استعمال بھی یادداشت کو کمزور کر دیتا ہے۔ الیکٹرو میگنیٹک فیلڈ سے لہریں براہ راست آپ کے دماغ تک پہنچتی ہیں۔

10- جنک فوڈ۔ الم غلم کھانے کی عادت۔

11- بہت سے لوگ ڈائٹ سوڈا استعمال کرتے ہیں۔ اس سے بھی یادداشت پر برا اثر پڑتا ہے۔

12- مکھن سے تلے ہوئے پاپ کارن۔

13- شکر سے جتنا پرہیز کر سکتے ہیں، کریں۔

اب تک یادداشت کا جو نقصان ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب آجائیں کہ یادداشت کو بہتر کیسے بنایا جا سکتا ہے۔

اس مضمون کے ابتدائی حصے میں اس کے حوالے سے کچھ باتیں بتا دی گئی ہیں۔ اب ایسی باتیں لیں جن کو آسانی سے اپنا سکتے ہیں اور جو آپ کی یادداشت کے لیے مفید ہوں گی۔

آسکر وائلڈ نے کہا تھا کہ یادیں وہ ڈائری ہے جن کو ہم ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ اب یہ ڈائری اس وقت کارآمد ہو سکتی ہے جب یادداشت مضبوط ہو۔

اس موضوع پر پی ایچ ڈی کرنے والے مرسل ڈیناس نے کہا تھا کہ یادیں آپ کا سرمایہ ہیں۔ ان کو محفوظ رکھیں۔

اب کیسے محفوظ رکھا جائے۔ یہ طریقے یاد رکھیں۔

1- ورزش۔ کیونکہ جسم کا تعلق دماغ سے ہے۔ ورزش کے وقت دماغ کو آکسیجن کی فراہمی زیادہ ہونے لگتی ہے اور یادداشت کے خلیات مضبوط ہونے لگتے ہیں۔

2- ضروری اور پرسکون نیند۔ نیند ایسی ہو جو بار بار اچاٹ نہ ہو جاتی ہو۔

3- منظم ہو جائیں۔ ایک روٹین بنا لیں۔ اس پر عمل کریں۔ آپ دیکھیں گے کہ ہر کام معمول کے مطابق ہونے

ذہنی ہم آہنگی

جج نے میاں بیوی کی ناچاقی کے سلسلے میں فیصلہ سنانے سے قبل شوہر سے دریافت کیا۔ ”گزشتہ پندرہ سالوں میں آپ کو کبھی یہ محسوس ہوا کہ آپ دونوں میں ذہنی ہم آہنگی ہے؟“

شوہر نے جواب دیا۔ ”ایک بار محسوس ہوا تھا۔“

جج نے دلچسپی سے پوچھا۔ ”وہ کون سا موقع تھا؟“ شوہر نے جواب دیا۔

”جب ہمارے گھر میں آگ لگ گئی تھی تو ہم ایک ہی کھڑکی سے باہر کودے تھے۔“

مرسلہ: منیزہ بصیر، گوجرانوالہ

جینے کے گر

ایک صاحب نے دفتر سے فارغ ہو کر اپنی سیکرٹری کو ساتھ لیا اور ہوٹل میں کھانا کھانے چلے گئے۔ وہاں سے دونوں نے فلم کا پروگرام بنایا۔ اس کے بعد صاحب سیکرٹری کے ساتھ اس کے گھر بھی چلے گئے، رات گئے جب وہ سیکرٹری کے یہاں سے رخصت ہونے لگے تو انہوں نے اس سے ایک پنسل مانگ کر اپنے کان پر پھنسا لی گھر پہنچے تو بیوی نے تاخیر کی وجہ پوچھی صاحب نے سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔

”جھوٹ...... بکواس......“ بیوی نے فاتحانہ انداز میں کہا۔ ”مجھے معلوم ہے کہ تم دیر تک دفتر میں کام کر کے آرہے ہو...... پنسل ابھی تک تمہارے کان میں لگی ہوئی ہے۔“

از: اریشہ طارق، دبئی

لگے گا اور آپ کمزور یادداشت کی شکایت سے بچ جائیں گے۔

4- کل آپ کو جو کام کرنے ہیں ان کی ایک لسٹ بنالیں۔ اور ہر کام کی تکمیل پر کراس کرتے جائیں اور جو نہ ہو سکے اس کی وجوہات لکھیں۔

5- دوستوں کی محفلیں آباد کریں۔ آج کل ایسے مشاغل میں خود کو مصروف رکھنے کے کئی طریقے ہیں جیسے فیس بک، ہوٹلنگ، کسی سیمینار میں شرکت۔ ٹی وی پروگرامز پر بحث وغیرہ۔

6- ایسے کھیل اپنائیں جن میں آپ کو دماغی ورزش کرنی پڑے۔ جیسے شطرنج۔ دماغی صحت کے لیے یہ سب سے بہتر کھیل ہے۔ یورپ کے اسکولوں میں بچوں کے لیے شطرنج ایک لازمی سبجیکٹ ہے۔ اس کے علاوہ اسکریبل، کراس ورڈز، کوئی معما وغیرہ۔

7- کھل کر ہنسیں۔ یاد رکھیں قہقہہ بہترین تھراپی ہے۔ اپنی گاڑی میں، یا دفتر میں یا اپنے کمرے میں ایسی چیزیں رکھیں جس کو دیکھ کر آپ کے ہونٹوں پر کم از کم مسکراہٹ ہی آجائے۔

8- زیادہ سے زیادہ نئی چیزیں سیکھنے کی کوشش کریں۔

9- روزانہ کی بنیاد پر کم از کم دو نئے الفاظ ضرور سیکھیں۔

10- گھر واپس آکر یاد کریں کہ آپ نے راستے میں کون کون سی دکانیں دیکھیں۔ ان کے بورڈز کیسے تھے۔ ان پر کیا لکھا ہوا تھا۔ اپنے حافظے کی مدد سے انہیں لکھ لیں اور دوسرے دن جا کر موازنہ کریں۔

11- ڈاکٹر لارنس نے چند ورزشیں بتائی ہیں۔ جیسے آنکھیں بند کر کے اپنے کپڑوں کو تہ کریں۔ آنکھیں بند کر کے ہاتھ یا اسپون سے کھانا کھائیں۔

12- نئی زبان سیکھنے کی کوشش کریں۔ حالیہ ریسرچ ہے کہ جو شخص ایک سے زیادہ زبانیں جانتا ہے اس کی یادداشت طویل عرصے تک اس کا ساتھ دیتی ہے۔

13- گھر میں پرندے یا مچھلیوں کا اکیوریم ضرور رکھیں۔ انہیں دیکھتے رہیں۔ اس طرح آپ نیچر کے قریب رہیں گے اور نیچر آپ کی حفاظت کرے گی۔

14- گھر کی دیواروں، تکیہ غلاف، چادروں وغیرہ کے رنگ مختلف کر دیں۔ یعنی جو رنگ آپ استعمال کرتے چلے آئے ہیں، ان کو بدل دیں۔

15- آپ ٹریفک میں پھنس گئے ہیں یا کہیں تنہا بیٹھے ہوں تو اپنے پرانے دنوں کو ری کال کرنا شروع کر دیں۔

16- پُرسکون بیٹھ کر پُرسکون میوزک سنیں۔ بے ہنگم شور والی موسیقی نہ سنیں۔

17- فریش ہونے کے لیے کہیں چلے جائیں۔

18- مراقبہ کریں۔ اس سے یادداشت کو بہتر بنانے میں بہت مدد ملے گی۔

19- یوگا کریں۔ خاص طور پر یوگا کے وہ آسن جو دماغ کو تقویت دیتے ہیں۔

ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ آپ کو اپنی خوراک پر بھی توجہ دینی ہوگی۔ دماغ کی تقویت کے لیے آپ کو یہ چیزیں استعمال کرنا ہوں گی۔

الف: اومیگا منرہ۔ یہ دماغ کو تقویت دینے کے لیے بہت ضروری ہے۔ اور اس کا سب سے بڑا ذریعہ مچھلی ہے۔ جیسے سالمن، ٹونا وغیرہ۔ مچھلی الزائمر کے خطرے کو بھی کم کرتی ہے۔

ب۔ پالک، بادام۔ کلیجی۔ ہمارے حکما صدیوں سے ان غذاؤں کا استعمال کرتے آئے ہیں۔

ج: کلوریز کا استعمال کم کریں۔

د: سبزیاں اور تازہ پھل جتنا استعمال کر سکتے ہیں۔ ضرور کریں۔

ر: گرین ٹی۔ لیکن ایک خاص حد تک۔

ز: کاربوہائیڈریٹ لے سکتے ہیں لیکن زیادہ نہیں۔

س: بیریز۔ (رس بھری وغیرہ)

ش: سیب کا مربہ۔ حکمت کے دواخانے سے بہ آسانی مل جائے گا۔

ص: اخروٹ اور مونگ پھلی وغیرہ۔

ک: چاکلیٹ۔ کافی وغیرہ استعمال کر سکتے ہیں لیکن ایک حد تک۔

اس کے علاوہ وٹامن ڈی۔ وٹامن B-12، وٹامن C اور ملٹی وٹامن۔

اب ایک روحانی نسخہ ہے۔ عمل کر کے دیکھیں۔ خدا نے چاہا تو بھولنے کی بیماری ختم ہو جائے گی۔ ہر نماز کے بعد یا رحمان۔ یا رحیم دونوں ملا کر 21 مرتبہ پڑھیں۔

نام بے نام
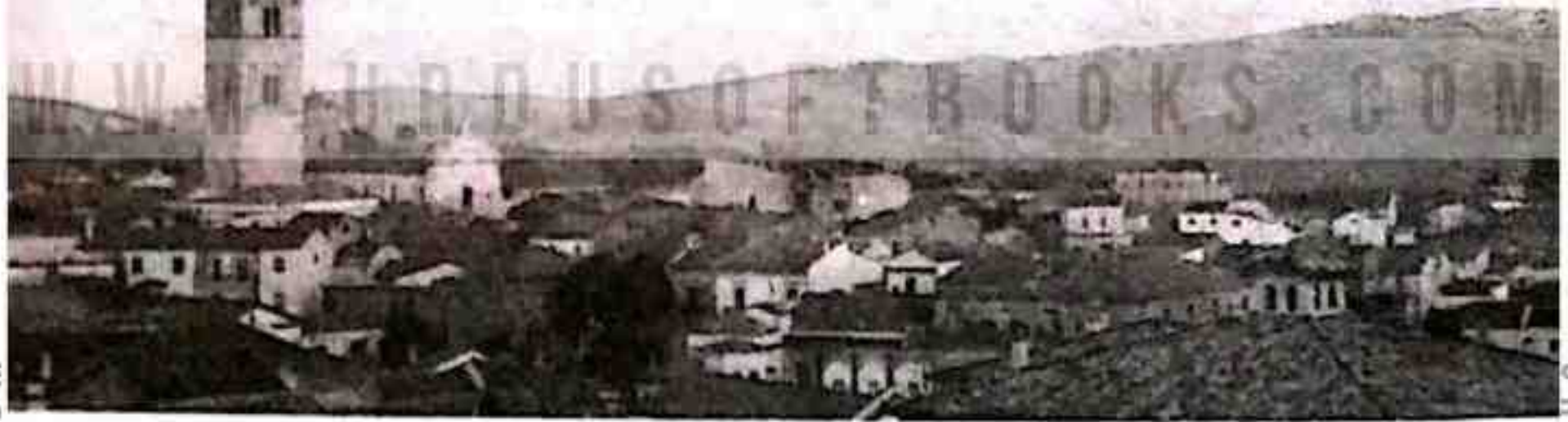
منظر

نام ہی پہچان ہے لیکن کچھ لوگ ایسے نام رکھتے ہیں جنھیں سن کر ہنسی آجائے۔ ایسے متبسم نام صرف برصغیر میں ہی نہیں، مغرب میں بھی رکھے جاتے ہیں۔

صرف معلومات میں اضافے کے لیے مختصر سی تحریر

وہ اچھے خاصے بدصورت تھے۔ میں نے جب ان کا نام دریافت کیا تو شرما کر بتایا۔ ”چاند خان۔“

خدا جانے وہ کس قسم کے چاند تھے۔ آپ بھی ایسے لوگوں سے ضرور ملے ہوں گے جن کے نام بہت عجیب وغریب ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک صاحب ہیں گھسیٹا۔ یقین کریں ان کا نام ہی ہے گھسیٹا۔ اب خدا جانے کس نے ان کو گھسیٹا تھا اور کیوں گھسیٹا تھا؟ یہ تو وہی بتا سکتے ہیں۔

لیکن یہ مضمون انسانوں کے عجیب ناموں کے حوالے سے نہیں ہے بلکہ شہروں اور قصبوں کے عجیب اور دلچسپ ناموں کے حوالے سے ہے۔

ایسے شہر دنیا کے ہر ملک میں پائے جاتے ہیں۔ لگتا ہے کہ جب ناموں کی کمی ہو جاتی تھی تو اس قسم کے نام رکھ دیے جاتے تھے۔ آئیں ذرا دنیا کے کچھ شہروں کے دلچسپ نام دیکھ لیں۔

ایکسیڈنٹ (حادثہ)۔ جی ہاں، یہ میری لینڈ امریکا کا ایک شہر ہے۔ پتا نہیں اس شہر میں یا تو بہت زیادہ حادثے ہوتے ہوں گے یا بالکل ہی نہیں ہوتے ہوں گے۔ اسی لیے نام رکھ لیا کہ چلو ہم بھی ترقی یافتہ شہروں کی صف میں شامل ہو جائیں اور فخر سے کہہ سکیں۔ جناب ہمارے یہاں بھی ایکسیڈنٹ ہوا کرتے ہیں۔

ایکسیڈنٹ پر ایک شعر یاد آرہا ہے۔ اس شعر کا تعلق میری لینڈ کے ایکسیڈنٹ سے نہیں ہے۔ بلکہ مقامی ایکسیڈنٹ سے ہے۔

ایکسیڈنٹ نگاہوں کا نئی بات نہیں
حادثے ایسے کراچی میں ہوا کرتے ہیں

اب ایک دوسرے شہر کا ذکر کرلیں۔

اس شہر کا نام ہے۔ A۔ جی ہاں۔ انگریزی کا حرف A۔ اس کے آگے پیچھے کچھ بھی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ نے اتنا مختصر ترین نام آج تک نہیں سنا ہوگا او یہ شہر ہے ناروے کا۔ اس کو یاد رکھنے میں کتنی آسانی ہوتی ہوگی۔ بس A کہہ دیا اور سمجھ میں آگیا کہ آپ کہاں تشریف لے جارہے ہیں۔

کسی کو آپ یہ کہہ دیں تو وہ کتنا برا مان جائے گا۔ ہوسکتا ہے کہ خون خرابے کی نوبت آجائے، وہ لفظ ہے۔ ”باسٹرڈ“ اور یہ نام ہے سوئیڈن کے ایک شہر کا۔ یقین نہ ہو تو خود سوئیڈن م

انٹرنیٹ پر دیکھ لیں۔ آپ کو باسٹرڈ مل جائے گا۔ پتا نہیں باسٹرڈ کے رہنے والے خود کیسے ہوں گے۔

ایک اور دلچسپ نام ملاحظہ فرمائیں۔

یہ ہے بیٹ مین (BAT MAN) یہ ایک مشہور فلمی اور افسانوی کردار ہے۔ آپ نے بھی پڑھا یا دیکھا ہوگا۔ اس نام کا ایک شہر ترکی میں واقع ہے۔ کیوں ہے۔ یہ میں نہیں بتا سکتا۔

ویسے اس نام کے کئی اور مقامات بھی دنیا میں ہیں۔

تسمانیہ کے ایک بیچ کا نام بیٹ مین رکھا گیا ہے۔

کتیا (Bitch) جی ہاں۔ اس نام کا ایک قصبہ فرانس میں ہے۔

فرانس نفیس لوگوں کا ملک ہے اور اس نفیس قسم کے لوگوں کے لیے کسی جگہ کا یہ انوکھا نام کیسا محسوس ہوتا ہوگا۔ اس کا اندازہ آپ خود کر سکتے ہیں۔

بورنگ۔ اس نام کے تین شہر ہیں۔

ایک میری لینڈ میں ہے۔ دوسرا اسکاٹ لینڈ میں اور تیسرا ٹینیسی میں۔

بلی کا گھر۔ آپ کو شاید یقین نہ آئے۔ یہ پنسلوانیا کا ایک شہر ہے۔ اس کا نام ہے۔ CAT HOUSE۔ تو بلی کا گھر ہی ہوا نا۔

چکن۔ یہ الاسکا کا ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ یہاں ایک گیس اسٹیشن، ایک پوسٹ آفس، ایک مارکیٹ اور ایک قبرستان ہے۔

سرکل۔ یہ بھی الاسکا میں ہے۔

کلائمکس۔ یہ شہر جارجیا امریکا میں ہے۔

آپ نے مرغوں کے ڈربے سنے یا دیکھے ہوں گے۔ لیکن مرغوں کا پہاڑ نہ کبھی دیکھا اور نہ سنا ہوگا۔ جی ہاں۔ آئر لینڈ کے ایک گاؤں کا نام ہے مرغوں کا پہاڑ۔ اور اس گاؤں میں سرے سے کوئی پہاڑ ہی نہیں ہے۔

کم بائی چانس۔ خدا جانے کینیڈا کے اس شہر میں کوئی جاتا ہے یا نہیں۔ یا اتفاقاً کوئی چلا جاتا ہوگا۔ اسی لیے اس کا نام کم بائی چانس رکھا گیا ہے۔

مردہ گھوڑا (DEAD HOURS) یہ بھی الاسکا کا ایک شہر ہے۔ لگتا ہے الاسکا والوں کو عجیب وغریب نام رکھنے کی عادت پڑی ہوئی ہے۔

ایک اور بہت ہی دلچسپ نام ملاحظہ فرمائیں۔

''مردہ عورت روڈ کراس کر رہی ہے۔'' جی جناب۔ یہ کوئی جملہ نہیں ہے۔ بلکہ کینیڈا کے ایک مقام کا نام ہے۔ ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہیے۔

آئر لینڈ کے ایک چھوٹے سے شہر کا نام ہے۔ ''شیطان کی اماں۔'' یعنی (DAVIL MOTHER)۔ اب ایسے نام کو کیا کہیں گے؟

ہوسکتا ہے کہ وہاں کے رہنے والے شیطان صفت ہوں۔

ایک اور دلچسپ نام دیکھیں۔

یہ نام ہے ڈش۔ یہ میکسیکو کا ایک شہر ہے۔

EYE (آنکھیں) بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ یہ انگلینڈ کے ایک شہر کا نام ہے۔

HO۔ جی ہاں HO۔ اتنا سا نام ہے۔ اور یہ نام گھانا کے ایک شہر کا ہے۔

آئر لینڈ کے ایک اور شہر کا دلچسپ نام۔ اس شہر کا نام ہے ہاسپٹل۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس شہر میں سرے سے کوئی ہاسپٹل ہی نہیں ہے۔ وہاں اگر کوئی یہ کہتا ہوگا کہ وہ ہاسپٹل جارہا ہے یا ہاسپٹل سے آرہا ہے تو خدا جانے لوگ کیا سمجھتے ہوں گے۔

مار دو یعنی KILL۔ یہ بھی آئر لینڈ ہی کے ایک شہر کا نام ہے۔ کیا کہیے۔ مار دو۔ اس طرح اور بھی بہت سے نام ہیں۔

جیسے آفس گرل (وکٹوریہ لینڈ کا شہر)

نارمل۔ امریکا کا ایک شہر۔

شیطان کی سلطنت۔ امریکا۔

WHY۔ یعنی کیوں۔ امریکا کا شہر ہے۔

یہ تو مغربی ممالک کا حال ہوا۔ اب ہندوستان کی طرف آئیں۔ یہاں بھی کچھ شہروں کے نام بہت دلچسپ ہیں۔ جیسے

پو۔ ہماچل پردیش کا ایک شہر۔

باڑھ (سیلاب) بہار کا شہر۔

دارو۔ جھارکھنڈ کا شہر۔

گدھا۔ گجرات کا شہر۔

کالا بکرا۔ پنجاب کا ایک شہر۔

کتا۔ کرناٹک میں ہے۔ اس کے علاوہ ستو ریوپی میں ہے۔

پاکستان میں بھی کچھ نام بہت دلچسپ ہیں۔ جیسے۔

ٹوبہ ٹیک سنگھ، چیچو کی ملیاں۔ قصور۔ بھائی پھیرو۔

اور کراچی کے کچھ علاقے۔ لالوکھیت۔ بھینس کالونی۔ گولی مار۔ مچھر کالونی وغیرہ۔

کیا خیال ہے ان ناموں کے بارے میں۔

کیا تیرا بگڑتا

محمد شیراز

موت سے کس کو رستگاری ہے؟ ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے لیکن بے وقت موت اقرباء کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ اسے بھولنا بھی چاہیں تو بھلا نہیں سکتے۔

چند معروف ہستیوں کی موت کا تذکرہ

موت ایک اٹل حقیقت ہے۔ اگر ہم زندہ ہیں تو ہمیں مرنا بھی ہے کیونکہ زندگی اگر آغاز ہے تو موت انجام ہے۔

ہم جب کسی کی موت کی خبر سنتے ہیں تو ایک لمحے کے لیے افسوس سا ضرور ہوتا ہے۔ چاہے وہ کوئی بھی ہو۔ ہم جب کسی کی موت کی خبر سنتے ہیں تو ہمیں کوئی حیرت نہیں ہوتی۔ کوئی شاک نہیں لگتا۔ حیرت اس وقت ہوتی ہے یا شاک اس وقت لگتا ہے جب یہ پتا چلتا ہے کہ ابھی تو اس کے جانے کے دن نہیں تھے۔ ابھی تو اس نے زندگی کی بہت کم بہاریں دیکھی تھیں۔ اس وقت ہم یہ پکار اٹھتے ہیں۔

"حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے۔"

انسانی تاریخ میں ایسے بہت سے لوگ ہیں۔

وہ آئے، انہوں نے دیکھا، فتح کیا، اپنے کارنامے پیش کیے اور دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان میں زندگی کے ہر شعبے کے لوگ ہیں۔

ادب، مصوری، موسیقی، سیاست، اداکاری، غرضیکہ ہر شعبہ۔ یہ لوگ بہت کم دنوں زندہ رہے لیکن اپنے حصے کا کام کر کے واپس چلے گئے۔

آپ نے وہ روایت تو ضرور سنی ہو گی کہ لال قلعے کے ایک مشاعرے میں ایک بچے نے ضد کی کہ وہ اپنا ایک شعر سنائے گا۔

اس مشاعرے میں ایک سے ایک شعرا موجود تھے۔ بچے کی ضد پر اس سے وہ شعر پڑھوایا گیا۔ پھر اس نے یہ شعر سنایا۔ وہ شعر اردو تاریخ کا ایک حصہ بن کر رہ گیا ہے ہم میں سے کون ہے جو اس شعر سے واقف نہیں ہے۔

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

یہ شعر روزمرہ بن کر رہ گیا ہے۔ اس بچے نے اپنی ڈیوٹی پوری کر دی تھی۔ یعنی اسے دنیا میں اسی شعر کے لیے بھیجا گیا تھا۔ اس نے اپنا فرض پورا کیا اور واپس چلا گیا۔

سکندر اعظم کے بارے میں بھی یہی ہے کہ بہت کم عمری میں اس کا انتقال ہو گیا تھا لیکن وہ اپنے حصے کا کام کر گیا۔ زندگی شاید اسی کا نام ہے کہ اپنے حصے کا کام کرو اور واپس چلے جاؤ۔

کچھ ایسے ملکی اور غیر ملکی لوگوں کے نام یاد آ رہے ہیں جو بہت کم عمری میں دنیا سے چلے گئے لیکن انہوں نے اتنی سی عمر میں شہرت حاصل کر لی تھی۔

آئیں ان کی یادوں کو تازہ کرتے ہیں۔

جیمس ڈین۔ یہ ایک باکمال اداکار تھا۔ لیکن وہ صرف 3 فلموں میں کام کر پایا تھا۔ اس کے بارے میں اُمیدیں تھیں کہ وہ آگے چل کر ایک بڑا اداکار بنے گا۔

وہ ایک لاابالی خوب صورت سا نوجوان تھا۔ اس کو گاڑیاں خریدنے کا بہت شوق تھا۔ اس نے ایک گاڑی خریدنے کی خواہش کی۔

جیمس جس وقت اپنی پسند کی گاڑی خریدنے کے لیے شوروم پہنچا تو وہاں ایک ستارہ شناس بھی موجود تھا۔ اس نے جیمس سے کہا۔ "صاحب زادے تم یہ گاڑی مت لینا۔"

"وہ کیوں؟"

"شاید یہ تمہیں راس نہ آئے اور تم اسے ایک ہفتے سے زیادہ استعمال نہ کر سکو۔"

جیمس نے اس کی بات ہنسی میں اڑا دی۔ اس نے وہ گاڑی خرید لی اور ٹھیک ایک ہفتے کے بعد ہی اس گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوا اور جیمس کی موت واقع ہو گئی۔

یہ واقعہ 1955ء کا ہے۔ اس وقت جیمس کی عمر صرف 24 برس تھی جی ہاں صرف 24 برس۔

جین مائیکل باسکٹ۔ اس نے جب چودہ پندرہ برس کی عمر میں اپنی پہلی پینٹنگ پیش کی تو لوگ چونک اٹھے۔ اس میں ایک بڑا مصور بننے کے امکانات پوری طرح موجود تھے۔

حوصلہ افزائی کے بعد اس نے تصویریں بنانے کی رفتار تیز کر دی۔ وہ عصر حاضر کے باکمال مصور پکاسو سے بہت متاثر تھا۔ بلکہ یہ کہنا درست ہو گا کہ وہ پکاسو ہی کے اسکول آف تھاٹ کو آگے بڑھا رہا تھا لیکن صرف 27 سال کی عمر میں 1988ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔

BILLY THE KIO

یہ میکسیکو کا ایک مشہور ڈاکو اور دہشت گرد تھا۔

آج بھی اس کردار کو لے کر کہانیاں لکھی جاتی ہیں۔ اور فلمیں بنائی جاتی ہیں۔ یہ ایک بے رحم قاتل تھا۔ اس نے بہت سے علاقوں میں اپنی دہشت پھیلا رکھی تھی۔ وہ بہت کم عمری میں مار دھاڑ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

اس کی زندگی سنسناتی ہوئی گولیوں کے درمیان تھی۔ بالآخر سینے پر لگنے والی ایک گولی نے اس کا کام تمام کر دیا۔

یہ واقعہ 1881ء کا۔ اور اس وقت بلی صرف 21 برس کا تھا۔ وہ صرف 21 برس کی عمر میں وہ سب کچھ کر گیا جو بڑی عمر والے بھی نہیں کر پاتے ہوں گے۔

جان کیٹس۔

انگریزی ادب سے دلچسپی رکھنے والا ایسا کون ہے جس نے کیٹس کو نہیں پڑھا ہو۔ وہ ایک بے مثال رومانی شاعر تھا۔ اس کی نظمیں انگریزی ادب کا سرمایہ خیال کی جاتی ہیں۔ اس نے بہت کم عمری میں نینسی براؤن نام کی ایک لڑکی سے محبت کی تھی۔

کیٹس کا انتقال 1821ء میں صرف 25 برس کی عمر میں ہوا تھا۔ اگر وہ کچھ دن اور زندہ رہ جاتا تو دنیا کے ادب میں اور اضافہ کر جاتا۔

کرسٹوفر مارلو۔ اس کا انتقال 1593ء میں ہوا۔ جبکہ وہ صرف 29 برس کا تھا۔

کرسٹوفر شیکسپیئر کا ہم عصر تھا اور اسی کی طرح کا ایک

باکمال ڈراما نگار۔

کہا جاتا ہے کہ کرسٹوفر اگر کچھ دن اور زندہ رہ جاتا تو شاید شیکسپیئر کا مد مقابل ثابت ہوتا۔ ڈاکٹر فاسٹس اور ٹیمبولین اس کے مشہور ڈرامے ہیں لیکن یہ باکمال ڈراما نگار صرف 29 برس کی عمر میں چل بسا تھا۔

پرسی شیلے۔

کمال کا شاعر اور ڈراما نگار۔

فرینکنائن جیسا لاجواب ڈراما لکھ کر اس نے شہرت حاصل کی۔ لیکن صرف 29 برس کی عمر میں 1822ء میں انتقال ہو گیا۔

اس کی موت کشتی کے حادثے میں ہوئی تھی۔ وہ ڈوب کر ہلاک ہوا تھا۔

طوطن خامن (فرعون بادشاہ)

شاید فراعین کا یہ پہلا بادشاہ تھا جو تخلیقی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے عوام کی فلاح کے لیے بہت سے منصوبے بنا رکھے تھے لیکن اس کی بے وقت موت نے اسے کچھ کرنے کی مہلت نہیں دی۔ ملیریا میں مبتلا ہو کر صرف اٹھارہ برس کی عمر میں اس کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کی موت 1323ء بی سی میں ہوئی تھی۔

اٹھارہ برس کی عمر کیا ہوتی ہے۔ شاید اس کو حکمرانی کے دو تین ہی سال ملے ہوں گے۔ لیکن اتنے کم عرصے میں اس کی اصلاحات کی وجہ سے اس کا نام آج بھی زندہ ہے۔

تو یہ موت اسی طرح کی ہوتی ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھتی کہ کون جوان ہے اور کون بوڑھا ہے۔ اس کا کام ہے ساتھ لے جانا۔ اور وہ اپنے ساتھ لے ہی جاتی ہے۔

پاکستان میں بھی ایسی بہت سی ناگہانی اموات ہوئی ہیں جن کے لیے یہ کہا جاتا ہے کہ ابھی تو ان کے مرنے کے دن نہیں تھے، جیسے۔

پروین شاکر۔ بے مثال شاعرہ۔ جس کے لیے بہت کچھ لکھا گیا۔ جو خود سراپا غزل تھی۔ اردو شاعری کی تاریخ میں سب سے بڑی شاعر جس کے اشعار خوب صورت جذبوں کو چھو کر گزر جاتے تھے۔ نرم و نازک لطیف جذبوں کی عکاس۔

وہ اسلام آباد کے ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہو گئی تھی۔ موت کے وقت اس کی عمر صرف 35 برس تھی۔

یہ وہ عمر ہوتی ہے جب شاعری اور تصور میں پختگی آنے لگتی ہے اور یہی عمر اس کی موت کی قرار پائی۔

نازیہ حسن۔ پاکستان میں شوبزنس کی دنیا کی ایک چند۔ نازیہ حسن سے ہمارے یہاں پاپ ... ہوا۔ یہ ایک تعلیم یافتہ اور خوب صورت لڑکی تھی۔

بھی 35 سال کی عمر میں کینسر کے عارضے میں مبتلا ہو کر انتقال کر گئی۔ اس کی موت سن 2000 میں ہوئی تھی۔

ایک اور جوان موت ثنا خان کی ہوئی تھی۔

یہ ایک اداکارہ تھی۔ ٹی وی سیریل میں کام کیا۔ اس کے کریڈٹ پر رخسار اور دو قدم دور جیسے ڈرامے ہیں۔

بابر نام کے ایک نوجوان سے اس کی شادی ہوئی اور کراچی سے حیدرآباد جاتے ہوئے ان کی گاڑی حادثے کا شکار ہو گئی۔

اس حادثے میں دونوں ہی کا انتقال ہو گیا تھا۔ ثنا خان اس وقت صرف 25 برس کی تھی۔

رؤف خالد۔ ایکٹر، ڈائریکٹر، رائٹر اور ایک ذہین استاد۔ بہت پڑھا لکھا شخص۔ جس کا یہ عزم تھا کہ وہ پاکستانی فلم انڈسٹری کو بین الاقوامی معیار کا بنا دے گا۔

اس نے ایک فلم بنائی ''لاج'' اس فلم نے دیکھنے والوں کو چونکا دیا۔ بہت دنوں کے بعد ایک اچھی تخلیق سامنے آئی تھی۔

ٹی وی کے لیے اس نے ڈراما سیریل ''مشعل'' لکھا اور شیخوپورہ کے نزدیک کار کے حادثے میں انتقال کر گیا۔

موت کے وقت اس کی عمر بھی تیس بتیس سے زیادہ نہیں تھی۔

اب ایک اور نام یاد آ رہا ہے۔ وہ ہے اسماعیل شاہ۔

اس نے ڈراما سیریل شاہین سے اپنے کام کا آغاز کیا۔ اس ڈرامے میں اس نے بدر بن مغیرہ کا کردار ادا کیا تھا۔ 29 اکتوبر 1992ء میں کوئٹہ کے قریب ایک حادثے کا شکار ہو گیا۔ یہ بھی ایک جوان موت تھی۔

اس طرح کے اور نہ جانے کتنے ہوں گے۔ جن کے ساتھ وقت اور موت نے کوئی رعایت نہیں کی ہو گی۔ بس ایسے لوگ آسمان سے گرتے ہوئے روشن ستارے کی طرح ہوتے ہیں۔ جو ذرا سی دیر کے لیے ایک روشن لکیر چھوڑتے ہوئے غائب ہو جاتے ہیں۔

لیکن سچ تو یہ ہے کہ کسی کے آنے جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ دنیا اسی طرح چلتی رہتی ہے۔

دائم آباد رہے گی دنیا
ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہو گا

قسط نمبر: 4

ناسور

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

وہ ایک سیدھا سادہ معصوم فطرت نوجوان تھا اور اس کے گرد سازشی ذہنیت والوں کا انبوہ تھا۔ ایسے سازشیوں کے لیے وہ ترنوالہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ان کے پھیلائے ہوئے تارعنکبوت میں پھنسا چلا جارہا تھا کہ اسے احساس ہوا کہ اب مفر کی کوئی راہ نہیں ہے۔ اسے بھی ان کا جواب دینے کے لیے خم ٹھونکنا ضروری ہے اور پھر اس نے کمر کس لی۔ انہی کے لہجے میں انہیں جواب دینے کی کوشش کی۔

ایک ایسی طویل کہانی جس کا ہر باب ایک نئی کہانی ہے
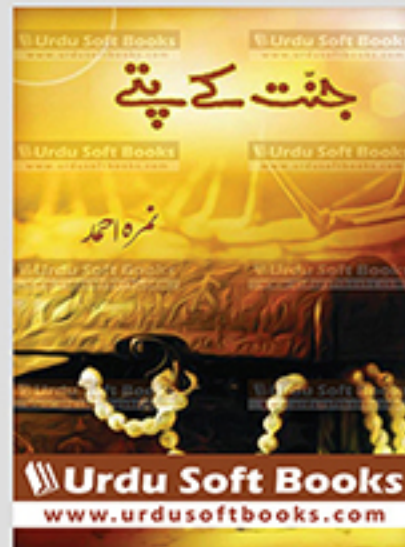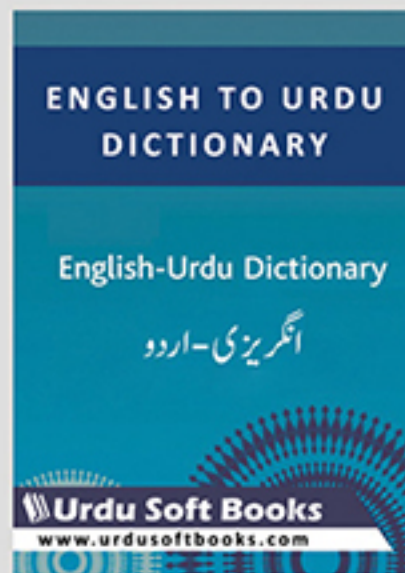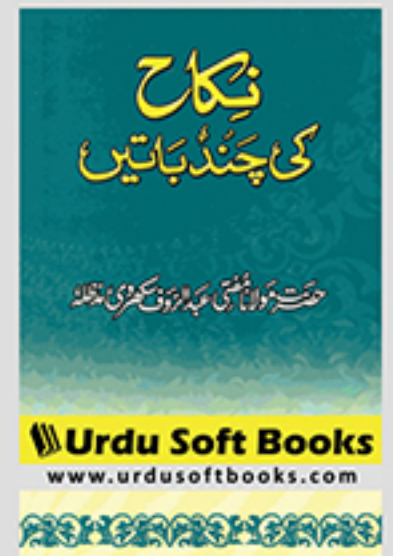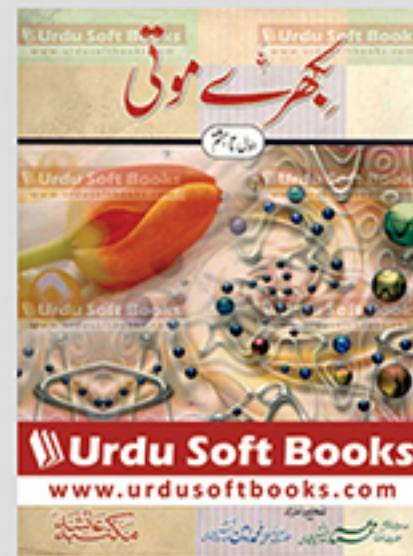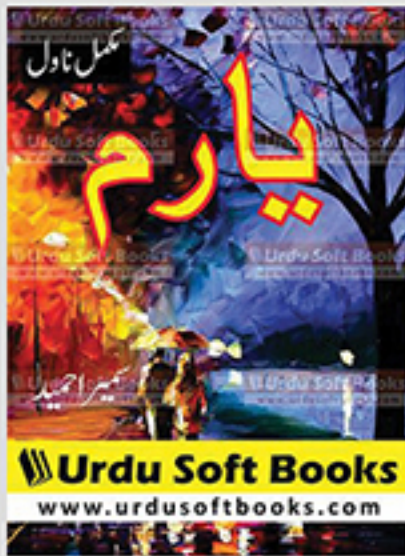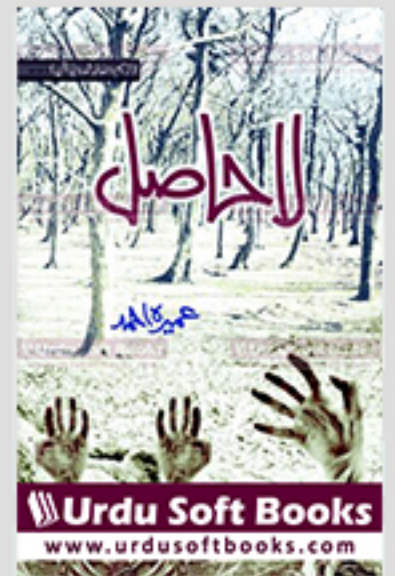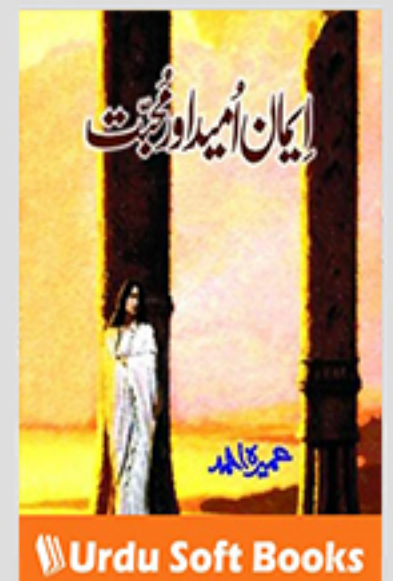
(گزشتہ اقساط کا خلاصہ)

رانا بشیر کی بیوی کا قتل ہو گیا تھا اور الزام آیا تھا احمد حسین پر۔ اس جرم میں اسے پھانسی ہو گئی۔ احمد حسین کا بیٹا نعمان ایڈووکیٹ زبیرہ کے ساتھ مل کر اصل قاتل کو ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی دوران رانا بشیر اپنی بیٹی کے ساتھ نعمان کے دروازے پر پہنچا۔ وہ معافی مانگنے آیا تھا کیونکہ اب اسے بھی لگ رہا تھا کہ قاتل کوئی اور ہے۔ نعمان ایک لاری اڈے کی یونین میں نائب ضلعی صدر بن گیا تھا۔ کچھ لوگ چاہتے تھے کہ یہ اڈا ختم ہو جائے اور اس کی زمین پر عمارت بنا کر فروخت کی جائے۔ اس سلسلے میں کچھ لوگ تندہی سے کام کر رہے تھے لیکن ان کی چال نعمان انہی پر الٹ دیتا۔ ابھی وہ اس مسئلے پر غور کر ہی رہا تھا کہ رانا بشیر کی بیٹی نے اسے ایک ڈائری دی جو مقتولہ کی تھی جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ قاتل کوئی اور ہے۔ نعمان ان دونوں مسئلوں پر کام کر ہی رہا تھا کہ ایک دن اس کے بھائی فہیم نے اس سے کہا کہ میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔

(اب آگے پڑھیں)

میری نظریں سامنے کرسی پر بیٹھے فہیم کے چہرے پر ہی چسپاں تھیں۔ میں اپنی چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ دیوار گیر کلاک پر رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ کمرے میں الیکٹرک سیور کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے فہیم کا چہرہ خاصا سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا جس سے میرے دل میں بھی تفکر کی لہر سی اٹھی تھی۔ لہٰذا اس کی بات پر میں نے بدستور اس کی طرف دیکھتے ہوئے فوراً کہا۔ ”ہاں! ہاں، کہو فہیم! کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے ناں؟“ مجھے اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر کچھ زیادہ ہی سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

وہ بولا۔ ”بھائی جان! گھر کے بڑے آپ ہی ہیں، پتا نہیں یہ بات آپ کو کیسی لگے، ممکن ہے آپ نے بھی اس طرف سے کچھ سوچ رکھا ہو لیکن آپ کی مصروفیات نے آپ کو شاید مزید سوچنے کا موقع ہی نہ دیا ہو۔ اسی لیے مجبوراً مجھے ہی کہنا پڑ رہا ہے کہ ہم ایک جوان بہن کے بھائی بھی ہیں اور میرا خیال ہے ہمیں عاصمہ بہنا کے لیے کچھ سوچ لینا چاہیے۔“ اتنا کہہ کر اس نے اپنی بات مکمل کی اور میں بے اختیار ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا اور قدرے مسکرا کر فہیم سے بولا۔

”یار! تو نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا، میں سمجھا پتا نہیں کیا معاملہ آن کھڑا ہوا ہے۔“ پھر لمحہ بھر توقف کے بعد میں نے بھی متانت سے اس کی تائید میں ہی کہا۔

”تم ٹھیک سوچ رہے ہو۔ عاصمہ بہنا کو اب اپنے گھر کی ہو جانا چاہیے، لیکن یار! سچی بات کہوں، یہ ہماری گڑیا سی بہنا ہمیں اس قدر پیاری ہے کہ جی ہی نہیں کرتا، خیر۔“ میں کچھ کہتے کہتے دانستہ چپ ہو گیا۔

”جی بھائی جان! آپ صحیح کہتے ہیں۔“ فہیم بولا۔ ”اسی کے دم سے ہی تو اس گھر میں رونق ہے، خیر سے اپنے گھر کی ہو جائے گی تو۔ اچھا ہی ہو گا۔ لیکن بھائی جان! جتنا جلدی ہو سکے، اب ہمیں اس فرض سے سبکدوش ہو ہی جانا چاہیے۔“

فہیم کا لہجہ آخر میں ایکا ایکی عجیب سا ہو گیا جس نے مجھے اندر سے تھوڑا چونکا بھی دیا تھا مگر میں نے کچھ خاص توجہ نہ دی اور اسے ایک ذمہ دار اور غیرت مند بھائی کا اپنی بہن سے متعلق اس پریشانی اور تفکر کو ایک روایتی روش پر ہی محمول کیا مگر پھر بھی جانے کیا بات تھی کہ مجھے ایسا لگا جیسے اصل بات کچھ اور ہو اور۔ فہیم کہنے سے جھجک رہا ہو۔ جب وہ اٹھ کر جانے لگا تو میں نے اسے ہولے سے آواز دی۔

”فہیم۔“ وہ دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے رکا، اور میری جانب مڑ کر بولا۔

”جی بھائی جان؟“

”بیٹھو ذرا۔“ میں نے اس بار بہ غور اور قدرے بھانپتی ہوئی نظریں اس کے چہرے پہ ڈالی تھیں۔ وہ خاموشی سے دوبارہ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا، تو میں نے کہا۔

”شاید تم اور بھی کچھ کہنا چاہ رہے ہو مجھ سے۔ کہیں میرا اندازہ غلط تو نہیں؟“

”آپ نے ٹھیک اندازہ لگایا ہے بھائی جان! مگر جانے آپ کیا سمجھیں، اسی لیے میں آگے آپ سے نہیں کہہ پایا تھا۔“ اس نے صاف گوئی سے کہا تو میں اندر سے فوراً کھٹک گیا مگر رسان بھری مسکراہٹ سے۔

”دیکھو فہیم! ہم بھائی ہی نہیں، دوست بھی ہیں، اسی لیے تم مجھ سے کوئی بھی بات بلا جھجک کہہ ڈالا کرو۔ چلو شاباش! بولو اصل بات کیا ہے؟“

میرے بے تکلفانہ لہجے پر اس نے ہمت پکڑی اور

بالآخر ایک گہری ہنکاری خارج کر کے کہا۔

”بھائی جان! آئی تھنک، بہنا کسی کے ساتھ انوالو ہے۔“

اس نے جیسے انکشاف کیا اور میں اپنی جگہ سُن ہو کر رہ گیا، چند ثانیے تو میں کچھ بول ہی نہیں پایا تھا۔ ایکا ایکی وہی شوریدہ سی آندھیوں کی بازگشت میرے اندر گونجنے لگیں، جو ایک عرصے سے میرے اندر کے ویران کھنڈر میں اکثر چلا کرتی تھیں بلکہ اس کھنڈر کا حصہ بن چکی تھیں۔ میرا اپنا چہرہ ایک دم سنجیدہ اور متفکر ہو گیا تھا بلکہ اس میں ایک گہری تشویش کا بھی عنصر شامل ہو گیا تھا لیکن پھر دوسرے ہی لمحے کچھ سوچ کر میں نے خود کو قدرے پُرسکون رکھتے ہوئے فہیم سے دھیمی آواز میں کہا۔ ”تم اگر کھل کر کہو گے تو شاید میں تمہاری بات کا ادراک زیادہ آسانی سے کر سکوں گا۔“

فہیم نے اپنا سر جھکا رکھا تھا، میری بات پر وہ اپنا چہرہ اٹھا کر اور میری طرف اسی طرح گہری متانت سے بولا۔

”بھائی جان! پہلی بات تو یہ کہ میں خدانخواستہ بہنا پر کسی قسم کا شک نہیں کر رہا کیوں کہ ہمیں اپنے ماں باپ کی تربیت پر پورا بھروسا ہے اور بہنا بھی ماشاء اللہ سمجھدار اور پڑھی لکھی ہیں اپنے برے بھلے کی تمیز بھی رکھتی ہوں گی لیکن بھائی جان! بات وہی آجاتی ہے کہ ایسے نازک اور حساس معاملات میں بڑوں کو تو تشویش ہوتی ہی ہے اگر اس کا سدباب جلد کر لیا جائے تو اتنا ہی بہتر ہوتا ہے۔“

”کیا تم نے عاصمہ کو کسی کے ساتھ دیکھا تھا؟ کون تھا وہ؟“ میرے تیزی سے سوچتے ہوئے ذہن میں یہ سوال ابھرا تھا جو میں نے فہیم سے کر ڈالا۔

”دیکھا تو نہیں بھائی جان۔ لل...... لیکن میں نے اکثر اسے سیل فون پر کسی لڑکے سے ضرور بات کرتے ہوئے دیکھا اور سنا ہے۔“

”کہیں ایسا تو نہیں کوئی بہنا کو تنگ کر رہا ہو اور تمہیں غلط فہمی ہوئی ہو؟“ میں نے کسی خیال کے تحت کہا تو وہ پورے وثوق بھرے انداز میں مگر ہولے سے جواباً بولا۔

”نہیں بھائی جان! ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔“

ایسے حساس معاملات میں ایک غیور بھائیوں کا زیادہ گہرائی میں جانا یوں بھی مناسب نہیں ہوتا ہے، شرفاء میں یہ معیوب تصور کیا جاتا تھا اور ہمارا گھرانا تو یوں بھی قدامت پسند تھا لیکن زمانے کے چلن نے کس طرح کی روشن خیالی کو جنم دے رکھا تھا، اس سے بھی استفادہ کرنا لازمی تھا۔ لہٰذا میں نے ایک چند ثانیوں کی پُرسوچ خاموشی کے بعد فہیم سے کہا۔

”فہیم! ہمیں اپنی بہنا پر پورا بھروسا ہے۔ ضرور میری طرح تم بھی یہی اچھی اُمید رکھو گے کہ وہ کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کرے گی جس سے اس کے بھائیوں کو یا اسے خود کو شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے۔ کیوں کہ وہ جانتی ہے وہ دو غیور بھائیوں کی بہن بھی ہے۔ لہٰذا ابھی عاصمہ سے اس سلسلے میں کچھ کہنا قبل از وقت ہی ہوگا، بسا اوقات ایسے معاملات کا خود ہی حل نکل آتا ہے۔ یہ بات زیادہ دیر چھپی بھی نہیں رہ سکتی۔ اسی لیے سردست اس معاملے میں خاموشی ہی بہتر رہے گی لیکن قرض والی بات جہاں تک ہے تو تم بھی یہ جانتے ہو کہ ایسے معاملات خاندان کی عورتیں ہی کیا کرتی ہیں، ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہمارے سر پہ سوائے چاچا انور شاہ کے کسی اور بزرگ خاتون کا ہاتھ نہیں ہے لیکن میں اس سلسلے میں ضرور کوئی نہ کوئی راہ نکال لوں گا۔“

”بہت بہتر بھائی جان!“ فہیم نے نیچی آواز میں کہا اور مجھ سے رخصت چاہی، میں مسکرا دیا۔ وہ چلا گیا مگر مجھے فہیم کے گومگو انداز سے کچھ ایسا ضرور لگا تھا کہ وہ مطمئن نہیں تھا۔

فہیم کے جانے کے بعد بھی میں خاصی دیر تک اس پر غور کرتا رہا اس کے بعد جب میں سونے کے لیے لائٹ آف کرنے لگا تو اچانک میرے سیل کی میسج بپ سنائی دی، میں نے میسج دیکھا تو چونک گیا۔ یہ فرحانہ نے کیا تھا اور پوچھا تھا کہ ”نعمان صاحب! کیا آپ جاگ رہے ہیں؟“

مجھے یاد آیا تھا کہ آج ہی اس کا فون بھی آیا تھا اور اس نے مجھے ایک چونکا دینے والی اطلاع دی تھی کہ ڈائری کا ”پارٹ ٹو“ اسے مل گیا تھا۔ وہ آگے بھی کچھ بتانا چاہتی تھی مگر کہتے ہی اس کا فون بند ہو گیا تھا۔ جس نے مجھے عجیب سی الجھن میں ڈال دیا تھا۔ لہٰذا اب اس کا میسج آتے ہی میں چونک پڑا تھا۔ بہرکیف میں نے ”یس“ لکھ کر اسے میسج سینڈ کر دیا تو ذرا ہی دیر بعد اس کی کال آ گئی۔ جو میں نے فوراً ریسیو کرتے ہوئے ”ہیلو“ کہا۔

”سوری تو ہے۔ میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔“ دوسری جانب سے فرحانہ کی مترنم سی آواز ابھری۔

”نہیں ڈسٹرب تو نہیں کیا البتہ آپ کی پہلے آنے والی کال نے ضرور مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا اور بات پوری نہیں ہو سکی تھی۔“ میں نے کہا تو وہ فوراً معذرت خواہانہ

انداز میں بولی۔

''جی ہاں! میں معذرت خواہ ہوں، دراصل میرے سیل کی بیٹری بھی ڈاؤن ہو گئی تھی اور یوں بھی اس میں کچھ مسئلہ ہو گیا تھا، اسی لیے اب میں ایک دوسرا سیٹ استعمال کر رہی ہوں، سم وہی ہے۔''

''کوئی بات نہیں، آپ کچھ مجھے ڈائری سے متعلق بتا رہی تھیں اور بات ادھوری رہ گئی تھی۔'' میں نے فوراً اصل بات کی طرف آتے ہوئے اسے یاد بھی کرا دیا تا کہ میری بھی الجھن رفع ہو سکے، اس پر وہ بولی۔

''جی ہاں! میں آپ کو یہی بتانا چاہ رہی تھی کہ تما کی ڈائری تو مل گئی ہے مگر وہ بھی کچھ ادھوری سی لگتی ہے۔ میرا خیال ہے آپ اگر تھوڑی زحمت کریں تو کل صبح تشریف لے آتے اور خود ایک نظر ڈال لیتے۔''

''ایک نظر کیا میں نے تو اسے مکمل اور پوری تفصیل کے ساتھ پڑھنا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''خیر! میں کل ہی ایڈووکیٹ زنیرہ سے بات کر کے آپ کو اپنی اور ان کی آمد کا بتا دوں گا۔''

''آپ خود بھی تشریف لا سکتے ہیں، نعمان صاحب!'' وہ بولی۔ میں نے کہا۔

''زنیرہ کا بھی آنا ضروری ہے کیوں کہ ہم دونوں ہی اس کیس کی اپنے طور پر تحقیق کر کے تسلی کرنا چاہتے ہیں تا کہ از سر نو کیس ری اوپن کروایا جائے تو کچھ نتیجہ خیز بھی ثابت ہو۔''

''اچھا!'' فرحانہ نے ایک گہری سی ہنکاری خارج کر کے کہا۔ پھر جیسے چند ثانیوں کی پُرسوچ خاموشی کے بعد بولی۔ ''دراصل میں آپ کے سامنے اپنے بھی کچھ ذاتی نوعیت کے خیالات شیئر کرنا چاہ رہی تھی، چلیں پھر کبھی سہی، ابھی آپ آرام کریں اور کل آنے کا پروگرام ڈن کریں۔''

میں نے اسے اثبات میں جواب دے دیا اور پھر رابطہ منقطع کر دیا۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ فرحانہ مجھ سے اپنے کس قسم کے ذاتی خیالات ''شیئر'' کرنا چاہتی تھی؟ تاہم میں نے اس کے ہاں تنہا جانے کی بجائے زنیرہ کے ساتھ ہی پہلے کی طرح جانے کا اپنا ارادہ قائم رکھا تھا۔ اس کے بعد میں سو گیا۔

☆......☆

اگلے دن میں حسبِ معمول صبح سویرے جاگ گیا۔ نہا دھو کر میں تیار ہوا اور ناشتے کے لیے ٹیبل پر آیا تو وہاں فہیم کو نہ پا کر مجھے حیرت ہوئی۔ عاصمہ ناشتا لگا رہی تھی، میں نے اس سے پوچھا۔ ''کیا فہیم ابھی تک نہیں جاگا؟ کیا چھٹی کی ہے اس نے؟'' کیوں کہ وہ چھٹی کے دن دیر سے ہی سو کر اٹھتا تھا اسی لیے میں یہی سمجھا تھا۔

''نہیں بھائی جان! فہیم بھیا تو کب کے ڈیوٹی پر جا چکے ہیں۔'' عاصمہ نے مجھے بتایا تو مجھے حیرت ہوئی اس سے پہلے وہ کبھی بھی اس طرح اکیلا ناشتا کیے بغیر نہیں گیا تھا کیوں کہ ہم تینوں بھائی بہن اکٹھے بیٹھ کر ہی کھانا کھاتے تھے۔

''اچھا! ناشتا تو ٹھیک طرح سے اس نے کر لیا تھا ناں؟'' میں نے پوچھا تو عاصمہ چائے کا فلاسک میز پر رکھتے ہوئے بولی۔ ''نہیں بھائی جان! پتا نہیں کیوں وہ آج تو ناشتا بھی کر کے نہیں گئے ایسے ہی چلے گئے۔''

''ارے! کیوں؟ طبیعت تو ٹھیک تھی اس کی؟'' میں نے قدرے چونک کر پوچھا۔

''طبیعت تو ٹھیک ہی لگ رہی تھی، بس! کہہ رہے تھے کہ آج ذرا جلدی جانا ہے، ناشتا آفس میں ہی کر لوں گا۔'' عاصمہ نے بتایا۔ بہنا کی بات سن کر میں کچھ سوچتا بن گیا۔

بہرکیف میں اور عاصمہ خاموشی سے ناشتا کرنے لگے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر میں بھی لاری اڈے پر جانے کی تیاری کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد میں عاصمہ کو خدا حافظ کہہ کر اپنی بائیک لیے گھر کے دروازے سے باہر نکلا تو بری طرح ٹھٹکا۔ محلے میں مجھے کچھ غیر معمولی پن محسوس ہوا۔ جیسے ہر کسی کو سانپ سونگھا ہوا تھا اور کئی لوگوں کو میں نے مختلف ٹولیوں کی صورت میں آپس میں چہ میگوئیاں کرتے ہوئے پایا۔

ایسے ہی وقت میں ایک شناسا سا آدمی میری طرف لپکا۔ وہ خاصا گھبرایا ہوا تھا، یہ اسلم متو کا تھا۔ محلہ کمیٹی کے صدر حاجی کریم بخش کا پرانا ملازم۔ تیس پینتیس سال عمر تھی، دھان پان سا شخص تھا۔ وہ سیدھا میری جانب لپکا تھا اور قریب آتے ہی مجھے جلدی سے سلام کرتے ہوئے بولا۔

''نعمان صاحب! آپ کو تھوڑی زحمت دوں گا، وہ اپنے حاجی صاحب آپ کو یاد کر رہے تھے۔''

میں نے بھی اسے اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر اپنی بائیک روک دی تھی۔ بولا۔

''ہاں ہاں چلو، زحمت کیسی، ویسے خیریت تو ہے

ناں؟" وہ اچک کر میرے پیچھے بائیک پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "ارے نعمان میاں! آپ کو ابھی تک نہیں پتا چلا؟ ادھر پورے محلے میں آگ لگ چکی ہے۔ خیر، چلیں حاجی صاحب کے ہاں جا کر آپ کو سب معلوم ہو جائے گا۔" اس کی بات سن کر میں بے چین سا ہو گیا اور بائیک حاجی صاحب کے گھر کی طرف بڑھا لی۔

"ارے مموکا جی! کیوں خوامخواہ تجسس پیدا کر رہے ہو، کچھ تو بتا دو آخر ہوا کیا ہے؟"

"یہ اپنے خورشید خاں صاحب ہیں ناں؟ وہی منے میاں۔" بالآخر وہ بولا۔

"ہاں۔ ہاں!" میں نے بے چینی سے گرہ لگائی۔ "کیا ہوا انہیں؟" میں نے فوراً کہا۔ مجھے یہ شخص کیسے بھول سکتا تھا؟

یہ وہی آدمی تھا، جس نے ارشاد مٹن والے کیس میں۔ میرے خلاف، ارشاد مٹن کا پورا پورا ساتھ دیا تھا اور ہر وقت اس کے ساتھ میرے خلاف محاذ میں پیش پیش رہتا تھا۔

بہر طور اب تو وہ معاملہ ہی ختم ہو گیا تھا اور ارشاد مٹن سمیت منے میاں اور ان کے حواریوں کو سخت کوفت اور شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا تھا، میں نے بھی انہیں معاف کر دیا تھا مگر اب نجانے یہ مموکا اس کے بارے میں کون سی خبر سنانا چاہتا تھا۔ اسی لیے میں نے بے چینی سے گرہ لگائی تھی کہ وہ جلدی سے اگل دے کہ آخر منے میاں کے ساتھ ہوا کیا تھا؟ وہ بولا۔

"نعمان صاحب! بات تو راز میں رکھنے کی حتی الامکان کوشش کی گئی تھی مگر لیکن بھلا ایسی باتیں چھپتی کہاں ہیں، پتا نہیں کیا معاملہ ہے اللہ ہی جانے۔" مجھے اس پر سخت غصہ آنے لگا۔ مقصد کی بات کرنے کی بجائے اپنے تجزیے گھڑے جا رہا تھا۔

اب میں اس سے کیا پوچھتا۔ چند سیکنڈوں میں ہم حاجی صاحب کے گھر کے دروازے کے باہر موجود تھے۔ ان کے مکان کے ساتھ والی بیٹھک کھلی ہوئی تھی کچھ اور بھی محلے کے لوگ اندر بیٹھے دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں منے میاں بھی براجمان تھے اور میں ان کی حالت دیکھ کر بری طرح چونکا تھا، اس کا چہرہ دھلے ہوئے لٹھے کی طرح سفید دکھائی دے رہا تھا اور وہ جیسے ایک ہی رات میں برسوں کا بیمار نظر آنے لگا تھا۔ بے شک تھوڑے دنوں پہلے وہ میرا سخت مخالف رہ چکا تھا مگر صلح صفائی کے بعد میرے دل سے اس کے لیے تمام کدورتیں صاف ہو چکی تھیں یہی سوچ کر کہ انسان غلطی کا پتلا ہے، درگزر سے ہی کام لینا چاہیے۔

بہر طور میں اپنی بائیک سے اترا، اسے سائیڈ اسٹینڈ پر لگایا اور جب تک اسلم بھی اچھل کر بائیک سے اتر چکا تھا۔ میں اندر داخل ہوا اور سلام کیا۔ اس دوران حاجی صاحب نے مجھے اپنے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا، جہاں پہلے ہی ایک شخص بیٹھا ہوا تھا وہ فوراً اٹھ کر دوسری جگہ جا بیٹھا۔ کرسی پر براجمان ہوتے ہی میں نے ایک نگاہ ان کے قریب بیٹھے منے میاں کے ستے ہوئے چہرے پر نگاہ ڈالی اور حاجی صاحب سے مخاطب ہو کے بولا۔

"خیریت تو ہے حاجی صاحب؟ کیا ہوا ہے؟"

"تمہیں ابھی تک معلوم نہیں ہوا؟" انہوں نے میری طرف دیکھتے ہوئے الٹا مجھ سے سوال کر ڈالا۔

میں نفی میں اپنا سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"نہیں۔ میں تو ڈیوٹی پر جانے کے لیے نکل رہا تھا کہ آپ کا پیغام ملا اور سیدھا ادھر ہی چلا آیا۔"

"تمہاری مہربانی بیٹا!" حاجی صاحب نے اختصاریہ کہا تو میں فوراً بولا۔

"مہربانی کی کیا بات ہے جناب! محلہ داری بھی کوئی چیز ہوتی ہے، یہ بھی ایک خاندان ہے۔ ہمارے دکھ سکھ سانجھے ہونے چاہئیں، باقی دنیا کے کام تو چلتے رہتے ہیں، آخر ہوا کیا ہے؟ پتا تو چلے؟" بالآخر میں نے اپنے اندر کی بے چینی کو اگل دیا تو حاجی صاحب نے ایک گہری اور تھکی سی ہنکاری خارج کرتے ہوئے پہلے ایک نظر اپنے ساتھ مضطرب الحال سے بیٹھے منے میاں کی طرف دیکھا، پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولے۔

"نعمان بیٹے! دیکھا جائے تو منے میاں کا دکھ ہم سب کا دکھ ہے۔ خدا نہ کرے کہ ایسا واقعہ کسی اور کے ساتھ بھی ہو لیکن اس آڑے وقت میں ہم سب کو ان کا ساتھ تو ضرور دینا چاہیے۔"

"بالکل حاجی صاحب! آپ نے درست فرمایا۔ ہم سب ان کے ساتھ ہیں۔ اللہ ہم سب کو برے وقت سے بچائے۔" میں نے پورے خلوص سے کہا تو حاجی صاحب اصل بات کی طرف آتے ہوئے بولے۔

"منے میاں کی جوان بیٹی ثوبیہ کل رات سے گھر سے غائب ہے۔"

حاجی صاحب نے ایک لرزہ دینے والا انکشاف کیا اور میں ان کی بات سن کر بالکل اسی طرح ہی متوحش انداز میں چونکا تھا جیسے یہ سانحہ صرف منے میاں کا نہ ہو۔ یہ محلہ ایک قدیم حیثیت کا حامل تھا اور تیسری نسل سے یہاں لوگ بہت امن، آشتی اور بھائی چارے سے رہتے چلے آرہے تھے۔ ہر قوم اور ہر مذہب کے لوگ یہاں رہتے تھے اور کبھی بھی آپس میں ان کا جھگڑا نہیں ہوا، تھوڑی بہت منہ ماری ہو بھی جاتی تھی تو نمٹا لی جاتی تھی۔ بہت قدامت پرست محلہ تھا اور یہاں کی خواتین پردے اور برقعے کے علاوہ کبھی گھر سے باہر نہیں نکلتی تھیں۔ کوئی نیا گھر یہاں آباد ہوتا تو ان کے بارے میں بھی چھان بین کی جاتی تھی۔

''اوہو۔ یہ تو بڑی تشویش ناک خبر ہے۔'' میں نے از راہ تاسف کہا اور ایک نظر قریب بیٹھے منے میاں پر ڈالنے کے بعد حاجی صاحب سے بولا۔ ''حاجی صاحب! پھر آپ لوگوں نے اس مسئلے کا کیا حل سوچا ہے؟ ہم آپ کے ساتھ ہیں، محلے کی ماں بیٹیاں، ہماری بھی بہنیں ہیں اور یہ صرف خورشید خاں کا نہیں ہم سب کا مسئلہ ہے۔''

''جیتے رہو نعمان بیٹا! ہمیں تم سے یہی اُمید تھی۔'' حاجی صاحب شفقت بھرے لہجے میں بولے، اس کے بعد انہوں نے ایک نظر حاضرین پر ڈالنے کے بعد مجھ سے اسی لہجے میں کہا۔

''تم ابھی ڈیوٹی پر جاؤ، تب تک ہم کوئی لائحہ عمل ترتیب دے لیتے ہیں، پھر میں تم سے بات کرکے آخری مشورہ کروں گا۔''

جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے کہ ارشاد مٹن والے کیس کے بعد میری محلے میں پہلے سے زیادہ عزت ہوگئی تھی اور یہ عزت ذلت صرف اللہ کے ہی ہاتھ میں ہوتی، مدعی لاکھ برا چاہے کیا ہوتا ہے، وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔

ارشاد مٹن نے میرے لیے جو گڑھا کھودا تھا وہ اس میں خود ہی جا گرا تھا اور اس کے لاکھ برا چاہنے کے باوجود اللہ نے میری عزت اور بڑھا دی تھی، یہ صرف اس لیے ہوا تھا کہ میں اپنی جگہ حق پر تھا۔ بہرطور اس کے بعد حاجی صاحب ہی نہیں بلکہ محلہ کمیٹی کے معتبر لوگ مجھ پر زیادہ اعتماد کرنے لگے تھے۔ اسی حق و راستی کے چلن نے مجھے ناری اڈے میں بھی سرخرو کیا تھا اور مجھے ضلعی ٹرانسپورٹ کا نائب صدر بنا دیا گیا تھا۔ میں نے حاجی صاحب کی بات پر کہا۔

''حاجی صاحب! ڈیوٹی کی خیر ہے وہ تو چلتی ہی رہتی ہے۔ آپ اس کی فکر نہ کریں۔ پہلے یہ مسئلہ ضروری ہے، آپ لوگوں نے اس کا کیا حل سوچا ہے پھر؟''

میری اس بات پر پریشان حال اور سر جھکائے بیٹھے خورشید خاں المعروف منے میاں نے اپنا سر اٹھا کے میری طرف دیکھا تھا، مجھے اس کی سوگواری آنکھوں میں تشکر کے جذبات محسوس ہوئے تھے۔

''تمہارا شکریہ بیٹے! کہ تم نے اس مسئلے کو سنجیدہ لیا۔ تمہاری موجودگی میں اب زیادہ بہتر طور پر ہم اپنا کوئی بہتر لائحہ عمل ترتیب دے سکتے ہیں۔ دراصل ابھی ہم یہ معاملہ تھانے نہیں لے جانا چاہتے ہیں، جوان اور کنواری لڑکی ذات کا معاملہ یوں بھی حساس ہوتا ہے، آگ کی طرح پھیلتا ہے اور سب کچھ خاکستر کردیتا ہے۔ اس لیے پہلے ہم چاہتے ہیں کہ اپنے طور پر کچھ کوشش کرکے دیکھ لیتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ بات بن جائے۔'' حاجی صاحب نے کہا تو میں بغیر وقت ضائع کیے ان سے مسئلے کی طرف آتے ہوئے بولا۔

''میرا خیال ہے اگر مجھے اس افسوس ناک واقعے کی تھوڑی تفصیل بتا دی جائے تا کہ میں بھی کچھ غور کرسکوں؟''

''بھئی خورشید خاں! تم خود ہی بتا دو۔ نعمان کو کیا اور کس طرح یہ ہوا تھا؟''

میری بات پر حاجی صاحب نے براہ راست منے میاں سے ہی مخاطب ہو کر کہا تو وہ میری طرف دیکھ کر بولے۔

''میری بیوی صبح فجر کی نماز کے لیے اٹھی تھی، میری بیٹی ثوبیہ کو نماز کے لیے جگانے گئی تو وہ اپنے بستر پر موجود نہیں تھی۔ میرا بیٹا اختر جو ثوبیہ سے دو برس ہی بڑا ہے، اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔ میری بیوی نے سارا گھر چھان مارا لیکن ثوبیہ کہیں نہ نظر آئی۔''

خورشید خاں اتنا بتا کر چپ ہوگیا۔ میں نے کہا۔

''خورشید صاحب! یہ معاملے اتنے حساس ہوتے ہیں کہ ان سے متعلق سوالات کرتا بھی عجیب سا ہی لگتا ہے۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو...'' میں نے اتنا کہہ کر دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو خورشید کی بجائے، حاجی صاحب میری بات کا مطلب سمجھ کر بولے۔

''تم صحیح کہتے ہو بیٹا! یہ معاملات ہی ایسے ہوتے ہیں، اللہ رب العزت سب ماں بیٹیوں کے پردے رکھے۔'' پھر وہ خورشید خاں سے مخاطب ہو کر بولے۔ ''اپنے نعمان میاں ایک شریف انسان ہیں، یہ بھی جانتے ہیں، کیا کہتے

ہو پھر تم؟"

ان کی بات پر خورشید خاں سر اٹھا کے ٹوٹے ہوئے سے لہجے میں بولا۔ "حاجی صاحب! آپ بھلا جس پر بھروسا کرتے ہوں وہ غلط کیسے ہوسکتا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ نعمان کی ہم سب ہی عزت کرتے ہیں۔ مجھے اس پر پورا بھروسا ہے۔"

"اللہ تبارک و تعالیٰ تمہاری مشکل آسان کرے۔"

حاجی صاحب نے دعائیہ انداز میں کہا اور پھر میری طرف دیکھا۔ میں ان کی نظروں کا مطلب سمجھ کر خورشید خاں سے مستفسر ہوا۔

"صرف ایک سوال پوچھوں گا آپ سے میں کہ کیا آپ نے یا آپ کی بیگم نے ایسا کچھ محسوس کیا تھا کہ آپ کی بیٹی ثوبیہ پہلے سے کسی لڑکے کے ساتھ" میں نے مصلحتاً اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو خورشید خاں بولا۔

"میں نے اور میری بیوی نے تو ایسا کبھی بھی کچھ محسوس نہیں کیا تھا۔ مگر......" وہ اتنا کہہ کر رکا تو...... بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

"مگر کیا؟"

"میرا بیٹا اختر البتہ پچھلے کچھ دنوں سے ثوبیہ سے کھچا کھچا رہنے لگا تھا بلکہ اکثر اس سے بلاوجہ لڑنے بھی لگا تھا۔ ہمیں حیرت ہوتی تھی، کیوں کہ وہ دونوں آپس میں بہت محبت کرتے تھے۔ چھوٹی موٹی ان بن بھی ہوتی تو دلار میں ہوتی تھی مگر ایک دن، بہن سے لڑتے ہوئے اختر کے منہ سے ایک بات نکل گئی تھی جو اس نے غصے میں ثوبیہ سے کہی تھی۔" وہ رکا تو میں بولا۔

"وہ کون سی بات تھی؟"

"اس نے کہا تھا۔ میں جانتا ہوں تمہارے کرتوت۔ تم سارا سارا دن اپنی کون سی سہیلی سے باتیں کرتی اور میسج کرتی رہتی ہو اور میں نے تمہیں اس سہیلی کے ساتھ بھی دیکھا تھا ایک دن۔ کہو تو اس سہیلی کا نام بھی بتادوں؟"

اس وقت میں اور میری بیوی بھی وہیں موجود تھے۔ ہم اپنے بیٹے کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکے تھے اس وقت سہیلی سے اس کی کیا مراد تھی مگر ہم نے محسوس کیا تھا کہ اس کی بات پر ثوبیہ کا چہرہ ضرور فق ہوگیا تھا اور وہ اپنے دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپائے روتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ ہم پھر بھی کچھ نہیں سمجھ پائے تھے کہ ہمارے بیٹے نے کس کی طرف اشارہ کیا تھا لیکن جب اس کے چند ہی دنوں بعد یہ سانحہ پیش آیا تو اختر پھٹ پڑا۔ اس نے بتایا کہ وہ کوئی اجنبی لڑکا تھا۔ جس کے ساتھ ثوبیہ نہ صرف باتیں کیا کرتی تھی بلکہ باہر بھی اس سے ملتی تھی۔ یہ سن کر مجھے بھی اپنے جوان بیٹے پر طیش آگیا اور میں نے غصے میں آکر اس کے منہ پر ایک تھپڑ جڑ دیا کہ اس نے ہمیں پہلے کیوں نہیں کھل کر یہ بات بتائی تھی۔ ہم اسی وقت ہی اس کا کوئی تدارک کرلیتے۔" وہ اتنا بتا کر خاموش ہوا تو اچانک مجھے گزشتہ شب ذہن میں اپنے بھائی فہیم کی باتیں گردش کرنے لگیں اور میرے دل میں ایک ہول سا اٹھا۔ اس کا مطلب تھا میرے بھائی فہیم نے بروقت ایک ذمے داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے...... میں اس سے آگے سوچنے کی ہمت نہ کرسکا۔ تاہم میں نے اپنی اس لمحاتی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"یہ آپ کے بیٹے کی غلطی تھی، اسے آپ لوگوں کو یہ بات پہلے ہی بتادینا چاہیے تھی۔"

"میں نے اسی بات پر ہی تو اس کے منہ پہ تھپڑ مارا تھا۔" خورشید خاں نے کہا۔ "اس پر اختر نے کہا تھا کہ چوں کہ ثوبیہ ہماری لاڈلی تھی اور اتنا بڑا الزام ایک بھائی کے منہ سے سن کر گھر میں الٹا اسے ہی لتاڑا نہ جائے، اسی لیے وہ خاموش رہا تھا مگر اب اس سانحے کے بعد وہ ہم سے بھی ناراض ہوگیا ہے۔"

"خیر! یہ بتائیں کہ اپنی بیٹی پر آپ لوگوں کو کتنا بھروسا تھا؟ میرا مطلب ہے، کیا آپ واقعی یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی مرضی سے۔ دراصل میں ایک دوسرے خیال پر بھی سوچنا چاہتا ہوں، یعنی اغوا۔" میں نے پوچھا تو خورشید خاں کو ایک چپ سی لگ گئی، ایسے میں وہاں موجود ہمارے علاوہ چار میں سے ایک منے میاں کے ہم عمر شخص نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

"حوصلہ رکھو۔ بھائی خورشید! اور ہمیں اپنا ہی سمجھو۔ ہم بھی بیٹیوں والے ہیں اور تمہارے ساتھ ہیں۔ جو بات ہے کھل کر نعمان صاحب کو بتادو۔ ایسے سوال تو پولیس بھی تھانے میں بڑی بیہودگی سے پوچھا کرتی ہے مگر یہاں سب ایسا کچھ نہیں ہورہا۔ ہم سب آپس میں ایک ہیں۔" مخاطب کا نام نصیر اللہ تھا۔ اس کی محلے میں پرچون کی بڑی دکان تھی۔ اس کی بات پر بے چارے خورشید خاں کو کچھ ہمت ہوئی اور بولا۔

"کیا بتاؤں بھائیو! میری تو کچھ سمجھ میں ہی نہیں آرہا

ہے۔ اپنی بچی کی طرف دیکھتا ہوں تو وہ مجھے ایسی بالکل بھی نہیں لگتی تھی اور جب اپنے بیٹے کی بات سنتا ہوں تو......

شدت غم سے اس کا لہجہ بھرا گیا تھا اور وہ اپنا جملہ ہی مکمل نہ کرسکا، رو پڑا۔ ایسے میں حاجی کریم بخش اسے حوصلہ دیتے ہوئے اس کے کاندھے کو ہولے سے تھپتھپانے لگے اور مجھے اس پر ترس آنے لگا لیکن ساتھ ہی میرے کانوں میں میرے بھائی فہیم کی بھی گزشتہ رات والی گفتگو جو اس نے بہنا سے متعلق کی تھیں اور زیادہ زور سے گردش کرنے لگیں، اس قدر کہ مجھے اس کی بازگشت صاف سنائی دینے لگی۔

''بھائی جان! آئی تھنک، بہنا کسی کے ساتھ انوالو ہے۔''

میں گھبرا سا گیا، بے چین سا ہوگیا، بڑی مشکلوں سے میں نے اپنی حالت پر قابو پایا تھا اور حاجی کریم بخش کی طرح خورشید خاں کو بھی تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ''حوصلہ رکھیے خورشید صاحب! ہم سب آپ کے اس مشکل وقت میں ساتھ ہیں اور مجھے یقین ہے کہ ہم مل بیٹھ کر اس کا کوئی نہ کوئی حل نکال ہی لیں گے۔ بس! آپ مجھ پر بھروسا کریں اور آپ کی ثوبیہ بھی میری بہنوں کی طرح ہے۔ ہم کچھ سوچتے ہیں۔''

میری بات پر اسے کچھ حوصلہ ہوا اور پھر میں نے حاجی صاحب سے گہری متانت سے کہا۔

''حاجی صاحب! میرا خیال ہے یہ معاملہ کچھ کچھ رضا مندی کا لگتا ہے اگر تھانے میں دیا جائے گا تو بلاوجہ کی جگ ہنسائی ہوگی اور میڈیا کا تو آپ کو پتا ہے کہ وہ اپنی ریٹنگ بڑھانے کے چکروں میں زیادہ رہے گا۔ مدد نہیں کرے گا۔ اس لیے ہمیں خود ہی کچھ کرنا پڑے گا۔ میرے ذہن میں کچھ لائحہ عمل آیا تو ہے اور مجھے اُمید ہے کہ اسی سے مسئلہ چھپ چھپاتے ہی حل ہوجائے گا۔''

''جیتے رہو بیٹا! اللہ تمہاری زبان مبارک کرے۔ مجھے تم سے یہی اُمید تھی۔ تم سمجھدار اور پڑھے لکھے ہو۔ ضرور کوئی نہ کوئی حل نکال ہی لوگے۔'' حاجی صاحب بولے اور خورشید خاں کو بھی قدرے چونک کر میری طرف اُمید بھری نظروں سے تکنے لگا۔ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''خورشید صاحب! مجھے آپ کے بیٹے اختر کا تعاون بھی درکار ہوگا اور پھر آپ یہ معاملہ مجھ پر چھوڑ دیں لیکن اس کڑے وقت میں آپ کا بیٹا کدھر غائب ہے؟'' میں نے آخر میں پوچھا۔ تو وہ بولا۔

''وہ تو صبح سے ہی ہم سے ناراض ہوکے گھر سے نکل گیا تھا۔''

''یہ اس کا ایک غیر دانشمندانہ فعل ہے۔ ایسے نازک وقت میں اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' میں نے گہری متانت سے کہا۔

''آجائے گا لوٹ کر اور کہاں جانا ہے اس نے۔ لیکن آپ کو اس سے کیا کام ہے؟''

خورشید خاں نے میری طرف دیکھ کر کہا تو مجھے اس کی کم عقلی پر ماتم کرنے کو جی چاہا تاہم میں بولا۔ ''خورشید صاحب! آپ کے بیٹے نے بہ قول آپ کے اس لڑکے کو دیکھ رکھا ہے، ضرور وہ کسی نہ کسی حوالے سے اسے جانتا بھی ہوگا، نہ بھی جانتا ہوگا تو کم ازکم اس نے اس کی شکل وصورت تو دیکھ رکھی ہوگی ناں! اکل کلاں یہ کیس مجبوراً تھانے لے جانا پڑا تو پولیس اس لڑکے کا خاکا تیار کرسکتی ہے۔ اس کے علاوہ میں نے اس سے اور بھی کچھ پوچھنا ہوگا۔'' میری بات اس کی سمجھ میں آئی تھی اس لیے وہ پُرسوچ انداز میں اپنا سر دھننے لگا تو حاجی صاحب سمیت وہاں موجود باقی افراد نے بھی میری بات کی تائید کی تھی۔ بالآخر میں نے ان سے اجازت چاہتے ہوئے آخر میں کہا۔

''وہ جیسے ہی آجائے مجھے مطلع کردینا اگر میں گھر ہوا تو وہیں اختر کو لے کر آجانا۔''

میں نے ایک بار پھر خورشید خاں کو تسلی دی اور سب کو سلام کرکے۔ لاری اڈے کی طرف روانہ ہوگیا۔

ضلعی صدر بننے کے بعد لاری اڈے میں میرا خاصا ٹھکا ہوگیا تھا۔ ایک الگ تھلگ کمرا بہ طور آفس دیا گیا تھا مجھے، جہاں ایک بڑا سا نیا نکور روم ائرکولر بھی رکھا تھا، ایک نئی ہنڈا ون ٹو فائیو بائیک بھی مجھے دی گئی تھی پرانی بھی میں نے رکھی ہوئی تھی۔ تنخواہ میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہو چکا تھا۔ لاری اڈے میں ہونے کی وجہ سے دیگر عام لوگوں کی طرح میں نے بھی ڈرائیونگ سیکھ لی تھی۔ چاچا نورشاہ کو بڑا منشی بنا دیا گیا تھا۔ وہ جب مجھ سے احتراماً کوئی بات کرتے بھی تو مجھے شرمندگی سی ہوتی۔ میں انہیں منع کرتا تو وہ ایک پُرشفقت مسکراہٹ کے ساتھ بولتے۔

''بیٹا! میں تمہارا نہیں، تمہارے اس عہدے کا احترام کرتا ہوں، جس کے تم حقدار ہو، تم سے تو میں صرف پیار کرتا ہوں۔ باقی کام میرے فرائض میں شامل ہیں۔'' میں ان کی بات پر مسکرا جاتا۔

لاری اڈے پر پہنچا تو سب کو خوش اور مطمئن پایا۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ ان کے سروں پہ منڈلاتی بیروزگاری کی تلوار عارضی طور پر ہی سہی ہٹ گئی تھی، نیز یہ معاملہ بہ ظاہر دب گیا تھا اور اسی لیے لاری اڈے کا ہر خاص و عام آدمی خوش اور مطمئن تھا۔

میرے کمرے کی صفائی ستھرائی کی گئی تھی۔ میز پر ہر شے سلیقے سے دھری پڑی تھی، ایک ٹیلی فون سیٹ بھی رکھا تھا۔ ایک چھوکرا ٹائپ لڑکا میرے لیے ملازم رکھ دیا گیا تھا۔ جو میرے آفس کی صفائی ستھرائی اور چائے پانی کے علاوہ دیگر چھوٹے موٹے فرائض انجام دے دیا کرتا تھا۔ روم ائیر کولر میں پانی کے ساتھ وہ برف کے ٹکڑے بھی ڈال دیتا تھا۔ یہ ایک سندھی بلوچ لڑکا تھا، نام دوست محمد تھا مگر سب اسے دوسو کہہ کر پکارتے تھے۔ یہ لیاری میں رہتا تھا۔ بہت اچھا اور دل نواز لڑکا تھا اور غریب بھی۔ قد کاٹھ کا دبلا اور درمیانہ تھا۔ عمر سترہ اٹھارہ سال ہی ہوگی۔

اس نے پہلے مجھے ٹھنڈا پانی پلایا اس کے بعد چائے لا کر دی اور پھر کہا۔

''صاحب! وہ بڑے منشی صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ آجائیں تو میں انہیں اطلاع کر دوں۔''

''ہاں...... ہاں...... بتا دو انہیں جا کر۔'' میں نے کہا وہ چلا گیا۔ میں چائے کی چسکیاں لینے لگا، تھوڑی دیر گزری، چاچا انور شاہ اندر داخل ہوئے مگر تنہا نہیں ان کے ہمراہ ایک بڑی عجیب شخصیت کا حامل ایک آدمی بھی تھا۔ آدمی بھی کیا تھا، بس اب کیا اس کی تعریف میں کہوں کہ صورت و شکل تو اللہ کی دین ہے، اس میں نقص نکالنا گناہ کے زمرے میں آتا ہے۔ بہر طور! عام سے انداز میں اگر اس کے حلیے کی تعریف کروں تو۔ جیسے کیلے کے اوپر کسی نے بڑا سا تربوز رکھ دیا ہو۔ جی ہاں! اب کوئی تو مثال دینا ہی تھی، جسم اس کا چھریرا اور خاصا لمبوترا تھا مگر سر غیر معمولی طور پر بڑا اور گول تھا، آنکھیں بھی اسی مناسبت سے بڑی اور گول تھیں، ہونٹ موٹے تھے، ہاتھ پیر پتلے پتلے۔ اس نے عام سی شلوار قمیص پہن رکھی تھی، صورت سے پرلے درجے کا احمق ہی نظر آتا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے ابھی رو پڑے گا۔ کچھ ایسی ہی روتی شکل تھی اس کی۔

مجھے حیرت تھی کہ اچھے بھلے سنجیدہ رو چاچا انور شاہ کو یہ کیا سوجھی تھی کہ اسے میرے پاس لے آیا تھا اور تھا کون؟ اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ مجھے یاد آیا کہ کچھ ہی دن پہلے تو میں نے خود چاچا انور شاہ سے کہا تھا کہ مجھے کسی ہوشیار اور چالاک مگر اس سے زیادہ وفادار آدمی کی ضرورت ہے اور چاچا نے مجھے کسی صدر الدین عرف سدو بھائی کے بارے میں بتایا تھا۔

''تت...... تو کیا یہی وہ سدو بھائی تھا؟'' میرے اندر ہول سا اٹھا کیوں کہ میں نے تو اسے دیکھتے ہی ریجیکٹ کر دیا تھا۔

''کیسے ہو بھتیجے! خیریت تو ہے، آج دیر سے آئے ہو؟'' انہوں نے اس اول جلول شخصیت کے ساتھ اندر قدم رکھتے ہوئے مجھ سے کہا تو میں نے انہیں سلام کیا فوراً اس کے ہمراہ اس ''شخصیت'' نے بھی مجھے سلام جھاڑ دیا۔

''جی ہاں چاچا! آج ذرا دیر ہو گئی، آپ بیٹھیے۔ یہ کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

چاچا انور شاہ میرے سامنے والی کرسی پر براجمان ہو گئے اور ساتھ آنے والے کو بھی اپنے پاس کی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر ایک نظر اس پر ڈال کر مجھ سے بولے۔

''بھئی برخوردار! میں نے تم سے کچھ روز پہلے ایک آدمی صدر الدین عرف سدو بھائی کا ذکر کیا تھا ناں۔ یہ وہی ذات شریف ہیں۔''

اس بھیانک انکشاف نے مجھے اندر سے لرزا کر رکھ دیا۔ میں بڑی مشکل سے تھوک نگل کر اور اپنے دماغ میں گونجنے والی گھنٹیوں کی بازگشت کے درمیان میں بھنچی بھنچی سی آواز میں بولا۔

''ج...... جی...... یہ ہے وہ۔''

''ہاں بھئی! تم ہی نے تو کہا تھا کہ تمہیں کسی ایسے آدمی کی ضرورت ہے جو ہوشیار اور وفادار ہو؟''

چاچا انور شاہ نے کہا اور میں اس وقت کو کوسنے لگا جب میں نے ان سے یہ کہا تھا، تاہم ایک نظر ان کے ساتھ مسکینی سی صورت بنائے بیٹھے سدو بھائی کی طرف دیکھا اور پھر بولا۔ ''ج...... جی ہاں! کہا تو تھا مگر......'' میں کچھ کہتے کہتے رک گیا اور پھر شاید چاچا انور شاہ بھی میری ''کنفیوژن'' کو بھانپ کر ہولے سے زیر لب مسکرائے تھے، اس کے بعد انہوں نے سدو بھائی سے مخاطب ہو کر کہا۔

''تم جاؤ ذرا میرے کمرے میں جا کر بیٹھو، میں تمہیں ابھی بلواتا ہوں۔'' سدو بھائی اٹھ کر چلا گیا۔ اس کے میرے آفس روم سے نکلتے ہی میرا جی چاہا کہ میں اب تک سدو بھائی کی موجودگی میں اپنی ہنسی کو جس عذاب ناک

حالت میں رو کے دبائے بیٹھا تھا، اگل کر اپنے سینے کا بوجھ ہلکا کرلوں، لیکن میں نے اپنی اس شدید خواہش پر بھی قابو پائے رکھا تاہم اب چاچا انور شاہ سے کھل کر بولا۔

"چاچا! یہ آپ کس عجوبے کو میرے پاس لے آئے ہیں؟ یہ میری مشکلیں کیا حل کرے گا، یہ تو خود ذہنی طور پر کسی نفسیاتی فقدان کا شکار لگ رہا ہے۔" میری بات سن کر وہ قدرے سنجیدہ لہجے میں بولے۔

"تم اس کی شکل وصورت کے حوالے سے اگر ایسا کہہ رہے ہو تو میں یہی کہوں گا کہ تم غلطی پر ہو۔ اب کیا کہا جائے کہ یہ بے چارہ ہے ہی ایسی بناوٹ کا لیکن......!"

"نہیں چاچا! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" میں نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "آپ تو جانتے ہی ہیں کہ میرے مخالفین اور دشمن کس قدر زیرک اور خرانٹ ہیں۔ مجھے اس سے لڑائی بھڑائی کا کام تو نہیں لینا ہے۔ صرف ہوشیاری اور محتاط روی کے ساتھ چند مخصوص لوگوں کی "ریکی" کروانی ہے۔ جو عام سی شکل وصورت کا ہو مگر یہ کچھ اس ساخت کا ہے کہ ایک تو فوراً کسی کی بھی نظروں میں آجائے گا، دوسرے دور سے ہی پہچان لیا جائے گا۔ یعنی اس کی شکل وصورت کو کوئی ایک بار دیکھ لے تو وہ اپنی ہزار مصروفیات کے باوجود اسے فوراً پہچان جائے گا۔"

"میں سمجھ رہا ہوں تمہاری بات۔" چاچا انور شاہ بولے۔ "لیکن پھر بھی میں تم سے یہی کہوں گا کہ تم اسے ایک بار آزما کر دیکھو۔ ورنہ پیسے واپس۔ بس! اتنا ہی کہوں گا میں۔ آگے تمہاری مرضی۔" وہ بذلہ سنجی سے مسکرا کر بولے اور میں اپنے ہونٹ بھینچے چند ثانیے کے لیے کچھ سوچتا بن گیا اس کے بعد ہولے سے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ چاچا انور شاہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولے۔

"میں اب چلوں گا۔ ہماری ایک لاری کا ٹول پلازہ کی طرف چالان ہوگیا ہے، اس سلسلے میں نکلنا ہے، یہ سدو اب تمہارے حوالے ہے۔" یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔

سچی بات تو یہ تھی کہ مجھ میں ہمت ہی نہیں پڑ رہی تھی کہ میں سدو کو بلا کر اس سے دو گھڑی بات تک کرلیتا۔ اس لیے سردست میں نے اسے نہیں بلوایا اور اپنے کچھ ضروری امور کے کاموں میں مصروف رہا، اس میں مجھے ڈیڑھ دو گھنٹہ لگ گیا پھر میں نے زنیرہ سے فون پر رابطہ کیا اور بتایا کہ فرحانہ نے مجھے فون کرکے بتایا ہے کہ انہیں ڈائری کا "پارٹ ٹو" مل گیا ہے لہٰذا اب یہ آئندہ کا کیا پروگرام ہے، وغیرہ۔

اس نے فوراً میرے ساتھ رانا بشیر کے ہاں جانے کی ہامی بھرلی اور یہی کہا کہ میں اسے اس کے آفس سے لیتا چلا جاؤں۔

تھوڑی دیر بعد میں اپنی بائیک پر لاری اڈے سے روانہ ہوگیا۔ وہاں پہنچا تو میں نے اس سے چائے وغیرہ کے تکلفات میں ڈالے بغیر چلنے کا کہا۔ اگلے چند سیکنڈوں بعد ہی وہ اپنی وائٹ مہران میں تھی اور میں بائیک پر، اسی طرح ہم رانا بشیر کے ہاں جا پہنچے۔

اس وقت دن کے ساڑھے بارہ بجنے والے تھے۔ میرا خیال تھا کہ گھر میں رانا بشیر بھی ہوگا مگر بعد میں پتا چلا کہ صرف فرحانہ ہی گھر پر تھی۔ چوکیدار نے ملازمہ کو بلوا کر ہمیں اس کے حوالے کیا جو ہمیں لے کر سیدھی ڈرائنگ روم میں پہنچی تھی۔

ہمارے وہاں بیٹھنے کے چند سیکنڈوں بعد فرحانہ اپنے چہرے پر خیر مقدمی مسکراہٹ سموئے اندر داخل ہوئی اور زنیرہ سے "چھما" ڈالنے کے بعد میری طرف مسکراتی نگاہوں سے دیکھ کر آداب کہا اور میں نے جواباً اپنے سر کو ہلکی سی جنبش دی تھی، گھر میں بھی اس کا عمومی لباس "خصوصیات" کا حامل ہی نظر آتا تھا۔ چست سیاہ ٹراؤزر اور اوپر ڈھیلی ڈھالی سی پنک کلر کی شرٹ تھی۔ اس بار بوائے کٹ بال پونی ٹیل کی بجائے ڈرائیر کیے کھلے چھوڑے ہوئے تھے۔ میک اپ ہلکا پھلکا کر رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک شاپر دبا ہوا تھا، جس کے اندر کوئی پرانی سی ڈائری نظر آرہی تھی۔ میری نظریں اسی ڈائری پر مرکوز تھیں اور پھر نجانے کیوں میرے دل و دماغ کی عجیب وغریب کیفیات ہونے لگی، یہی تو وہ ڈائری تھی جو اگر میرے باپ کو پھانسی لگنے سے پہلے مل جاتی تو اس کے لیے نجات دہندہ ثابت ہوسکتی تھی لیکن شاید میرے باپ کے نصیب میں اسی طرح ہی بے بسی کی موت مرنا لکھی تھی۔

اثنائے راہ مجھے۔ زنیرہ کے ہولے سے کھنکھارنے کی آواز سنائی دی اور میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ رسمی سے کلمات کے بعد جب فرحانہ شاپر کے اندر سے ڈائری نکالنے لگی تو زنیرہ نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ "آپ کے پیا نظر نہیں آرہے؟"

"وہ آفس میں ہیں۔" فرحانہ نے ڈائری ہاتھ میں لیتے ہوئے مختصراً جواب دیا، تو میں نے یونہی استفساریہ کہا۔

"ان کے تو علم میں ہوگی یہ بات؟"

''کون سی بات؟'' فرحانہ نے بے اختیار اپنی نگاہیں میرے چہرے پہ مرکوز کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہی کہ ڈائری کا پارٹ ٹو مل گیا ہے۔''

''ہاں!'' اس نے ایک ہنکاری خارج کرنے کے انداز میں کہا تو زنیرہ نے نجانے کس خیال کے تحت اس سے پوچھا۔

''کیا یہ بھی ان کے علم میں ہے کہ ہم اس وقت یہ ڈائری پڑھنے یہاں آئے ہوئے ہیں؟''

''نہیں۔'' اس نے پھر مختصراً جواب دیا۔ میرا سارا دھیان اس وقت ڈائری کی طرف تھا اسی لیے میں زنیرہ کے اس سوال کی گہرائی کو نہ سمجھ پایا۔ اسی وقت فرحانہ نے وہ ڈائری میری طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''کیا آپ اسے پڑھیں گے یا میں بلند آواز سے پڑھتی جاؤں؟'' میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی زنیرہ نے اس سے کہا۔ ''آپ خود ہی اسے پڑھتی جائیں، ہم سن رہے ہیں۔''

ایسے ہی وقت میں وہی ملازمہ ایک نفیس قسم کی ٹرالی دھکیلتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

''چائے آگئی، میرا خیال ہے پہلے چائے وغیرہ پی لیتے ہیں۔'' فرحانہ ٹرالی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی تو میں نے گہری متانت سے کہا۔

''اس کی کوئی ضرورت تو نہیں تھی، آپ نے بلاوجہ ہی تکلیف کی۔'' میری بات پر فرحانہ نے پہلی بار مجھے گہری نگاہ سے دیکھا اور ہولے سے مسکرائی بھی، جانے کیوں مجھے اس کی اس انداز کی مسکراہٹ میں ایک نامعلوم سی گیرائی محسوس ہوئی تھی۔

پھر وہ چائے بناتی ہوئی اسی لہجے میں بولی۔ ''تکلیف کیسی نعمان صاحب! ڈائری پڑھ کر ابھی اس گمبھیر مسئلے پر دماغ سوز ڈسکشن بھی کرنا ہے۔''

کوئی اور موقع ہوتا تو میرا اس کی بات پہ مسکرانے کو دل ضرور کرتا۔ میں خاموش رہا تو زنیرہ اس سے کچھ مسکرا کر بولی۔

''یہ بھی آپ نے ٹھیک ہی کہا۔''

مزید چند منٹ چائے وغیرہ میں صرف ہو گئے اس کے بعد فرحانہ نے ڈائری پڑھنا شروع کر دی۔ میں اور زنیرہ ہمہ تن گوش بر آواز ہو گئے۔

فرحانہ ہمیں اس دوسری ڈائری سے متعلق پہلے ہی بتا چکی تھی کہ اس کے چند ابتدائی صفحات پھٹے ہوئے تھے۔ بہر طور اس نے ڈائری پڑھنا شروع کر دی۔

☆......☆

''میں رانو کا اپنے ساتھ پیار بھرا رویہ دیکھتی ہوں تو خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین انسان سمجھتی ہوں۔ شادی کا اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود رانو کی مجھ سے محبت میں کمی کی بجائے اضافہ ہی ہوا تھا۔ حالانکہ ہماری بیٹی ماشاء اللہ خیر سے جوان ہو گئی تھی مگر رانو مجھے اب بھی اسی طرح چاہتے تھے جیسے ہم کوئی نئے نویلے شادی شدہ جوڑا ہوں۔ یہاں تک کہ وہ آج تک آفس سے شام کو واپسی میں میرے لیے راستے سے پھول لانا نہیں بھولتے، کبھی گلاب کا بکٹ، تو کبھی چنبیلی کا گجرا کبھی کوئی چھوٹا موٹا تحفہ جبکہ شادی کی سالگرہ پر بہت سی شاپنگ اور اچھا سا بھاری گفٹ۔ میں اپنے شوہر رانو کی اس قدر تعریف کیوں کر رہی ہوں۔ اس کی ایک وجہ ہے، وہ یہ کہ پچھلے کچھ دنوں سے......''

یہاں پہ آ کر فرحانہ...... ٹھہر گئی۔ میں اور زنیرہ بغور اس کی طرف تکنے لگے۔ پھر بے اختیار میرے ہی منہ سے نکلا۔

''کیا ہوا؟ آپ ڈائری پڑھتے پڑھتے رک کیوں گئیں مس فرحانہ؟''

میری بات پر اس نے کہا۔ ''میں شاید آپ کو بتا چکی ہوں کہ میں اس ڈائری کو پڑھ چکی ہوں، اس ڈائری میں کئی جگہ پر ڈائری کے الفاظ مٹے اور دھندلے سے ہیں، لگتا کچھ ایسا ہی ہے جیسے اس پر پانی پڑ گیا ہو۔ یہ لیجیے آپ بھی ذرا ایک نظر دیکھ لیں۔''

یہ کہتے ہوئے فرحانہ نے جب وہ ڈائری میری جانب بڑھانا چاہی تو زنیرہ بولی۔ ''ہم بعد میں اس کا تفصیلی معائنہ کر لیں گے۔ ابھی آپ سے جو کچھ اور جہاں تک پڑھا جا رہا ہے وہ آپ پڑھتی جائیں۔''

مجھے بھی زنیرہ کی یہ بات معقول لگی۔

فرحانہ نے ڈائری دوبارہ پڑھنی شروع کر دی۔

''میں بری طرح دہشت زدہ ہو گئی تھی۔ درمیان سے الفاظ دھندلے یا مٹے ہوئے ہونے کے باعث اگلا پیرا گراف ادھر سے ہی شروع ہوا تھا۔

''اس وقت شام کے چھ بج رہے تھے، یہ وہی وقت تھا جب رانو دفتر گئے ہوئے تھے اور آج ان کی واپسی رات گئے ہونا تھی۔ انہوں نے مجھے فون کر کے بتا دیا تھا جبکہ فرحانہ

اپنی سہیلیوں کے ساتھ طارق روڈ گئی ہوئی تھی، طارق روڈ قریب ہونے کے باعث اکثر اس کی سہیلیاں جب بھی شاپنگ کے لیے آتی تھیں تو فرحانہ سے ملنے ضرور آتی تھیں، یا وہ خود بھی چلی جاتی تھی۔

مجھے اس بات پر حیرت ہوتی تھی کہ یہ پُراسرار واقعات ہمیشہ ایسے ہی اوقات میں پیش آتے تھے جس وقت گھر پر میں اکیلی موجود ہوا کرتی تھی۔ یہ تیسری بار ہوا تھا۔ میں اس وقت حسب معمول ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی کوئی پروگرام دیکھ رہی تھی کہ مجھے فوراً ہی احساس ہوا کہ کوئی گھر میں موجود تھا۔

اسی طرح کے پہلے اور دوسرے واقعات کے بعد۔ رانو نے اپنے ایک جاننے والے بڑے پولیس افسر ڈی ایس پی چوہدری رحمت اللہ خان سے بھی مدد لی تھی۔ وہ خفیہ پولیس میں تھے اور رانو کے یونیورسٹی کے دور کے دوست بھی تھے، انہوں نے اپنے دو سادہ پوش آدمیوں کی ہمارے بنگلے کے باہر ڈیوٹی لگادی تھی لیکن وہ دونوں بھی ناکام رہے، میں بہت متوحش اور پریشان رہنے لگی۔ پولیس کے جو دو۔ سادہ پوش اہلکار بنگلے کے باہر خفیہ طور پر تعینات کیے گئے تھے انہوں نے مجھے سمجھا رکھا تھا کہ اگر میرے ساتھ دوبارہ ایسا کوئی واقعہ پیش آئے تو میں فوراً سیل فون پر انہیں مطلع کردوں۔

میں اس وقت صوفے پر بیٹھی تھی چلغوزے اور کاجو کھارہی تھی اور ساتھ ہی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ وہ شام بڑی سرد بھی تھی۔ ایسے ہی وقت میں اچانک مجھے گھر میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ میں یہی سمجھی تھی کہ شاید فرحانہ آگئی تھی، یا پھر ملازمہ ہوگی مگر مجھے یاد آیا کہ ملازمہ تو دو دن کی چھٹیوں پہ اپنے گاؤں گئی ہوئی تھی۔

بہر طور میں اٹھ بیٹھی اور جی چاہا کہ سیل فون پر باہر تعینات ان دونوں سادہ پوش خفیہ اہلکاروں کو مطلع کردوں، لیکن مجھے یہ سب ابھی قبل از وقت اور آک ورڈ سا لگا۔ تاہم میرے شریر دیور صفدر نے مجھے اپنی حفاظت کے لیے ایک چھوٹا لیڈیز ٹو ٹو پسٹل لاکر دے رکھا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ اس نے مجھے سی ویو پہ لے جا کر اسے چلانا بھی سکھا رکھا تھا۔ میں نے یہی پسٹل میز کی دراز سے نکال کر اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا اور جس جگہ مجھے کھٹکے کی آواز آئی تھی، میں دبے پاؤں اسی سمت بڑھ گئی۔ ٹی وی کی آواز میں نے کم نہیں کی تھی، کچھ سوچ کر میں نے چلتا رہنے دیا تھا۔

کھٹکے کی آواز مجھے اپنے بیڈروم کی طرف سے آئی تھی۔ میں اسی طرف بڑھتی چلی گئی تو یہ دیکھ کر میں بری طرح ٹھٹکی کہ نہ صرف بیڈروم کا دروازہ تھوڑا کھلا ہوا تھا بلکہ اندر سے روشنی بھی پڑتی نظر آرہی تھی، مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ بیڈروم کی لائٹ آف اور دروازہ بند تھا۔ جس کا صاف مطلب تھا کہ اندر کوئی موجود تھا، میرے پورے وجود میں سنسنی اور خوف کی لہریں دوڑ گئی تھی لیکن میں یہ بھی بتاتی چلوں کہ فطرتاً میں ڈرپوک بھی نہیں تھی مگر بہر حال۔ ایسے حالات اور مواقعوں میں تو اچھے اچھوں کا پتا پانی ہوجایا کرتا ہے اور پھر میں تو ایک عورت ذات بھی تھی۔

اب مجھے اس ٹو ٹو لیڈیز پسٹل کی اہمیت کا احساس ہونے لگا کہ اس کی موجودگی کے باعث میری ہمت کچھ سوا ہوگئی تھی۔ لیکن میرا پستول والا ہاتھ تھوڑا کپکپا بھی رہا تھا، میں نے اپنی ہمت اور حواسوں کو مجتمع کیا اور بہت دبے پاؤں بیڈروم کی طرف بڑھنے لگی، ابھی میں کوریڈور میں ہی تھی کہ میں ٹھٹک کر رکی، میں نے ایک سیاہ پوش کو تیزی سے بیڈروم کے دروازے سے باہر نکلتے دیکھا اور فوراً نیم تاریک سی راہداری کی دیوار سے چپک کر کھڑی ہوگئی۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

پہلے میں نے ارادہ کیا کہ اسی وقت پلٹ کر سیل فون پر باہر متعین ان دونوں سادہ پوش خفیہ اہلکاروں کو مطلع کردوں لیکن پھر کچھ سوچ کر میں نے سردست اپنا ارادہ بدل ڈالا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ پُراسرار سیاہ پوش میری نگاہوں میں آچکا تھا، جبکہ وہ ابھی مجھ سے بے خبر ہی تھا اور میں اس کی بے خبری میں اس کی حرکات وسکنات کا جائزہ بھی لینا چاہتی تھی۔ مجھے اس بات پر حیرت تھی کہ یہ اندر داخل کس طرح ہوتا ہے؟ باہر چوکیدار عجب گل بھی الرٹ رہتا تھا، ایک اعلیٰ نسل کا السیشن کتا بھی بنگلے کے وسیع لان میں مٹرگشت کرتا رہتا تھا اور میرے لیے سب سے بڑی حیرت کی بات، خفیہ پولیس کے وہ دو سادہ پوش اہلکاروں کی تھی جو خاص اسی مقصد کے لیے بنگلے کی باؤنڈری سے باہر متعین تھے کہ وہ بھی اس سے لاعلم رہے تھے۔

بہر کیف میں نے ہمت کی اور اس پُراسرار سیاہ پوش کے پیچھے دبے پاؤں بڑھی تھی، اس نے پیروں میں شاید کریپ سول کے جوتے پہن رکھے تھے اور پورا جسم سیاہ چست لباس میں ملفوف دکھائی دیتا تھا۔ اس لیے میں اس کا چہرہ دیکھنے سے بھی قاصر تھی، تاہم اپنی وضع قطع سے وہ خاصا

دراز قامت اور کسرتی جسم کا مالک شخص دکھائی ضرور دے رہا تھا، اس نے اوپر جانے والے زینے کا رخ کیا تھا، اور میں بھی اسی سمت بڑھتی چلی گئی، لیکن اب میں نے پختہ ارادہ کرلیا تھا کہ مجھے ان دونوں خفیہ اہلکاروں کو مطلع کر دینا چاہیے تھا اور میں نے ایسا ہی کیا، انہیں اپنے سیل فون پر مطلع کرنے کے بعد مجھے اپنی ہمت ذرا سوا ہوتی محسوس ہونے لگی۔ انہوں نے مجھے ہدایت دے رکھی تھی کہ میں ایسے وقت میں اپنا سیل فون سائلنٹ کرکے وائبریٹ پر کر رکھوں اور میں نے ایسا ہی کر رکھا تھا۔

میرا یہ اندازہ درست نکلا تھا کہ اس سیاہ پوش نے سیدھا اوپر رانو کے کامن روم کا ہی رخ کیا تھا، جو ان کا اسٹیڈی روم کہلاتا تھا اور وہ وہاں اکثر چھوٹا موٹا دفتری کام نمٹایا کرتے تھے اور وہیں ان کی کچھ ضروری فائلیں اور کاغذات رکھے ہوتے تھے۔ میں نے بھی اسی طرف پیش قدمی کی اور گربہ قدمی سے زینے طے کرتی اوپر پہنچی۔ تو مجھے حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔

اسٹیڈی روم کی صرف دو چابیاں تھیں ایک رانو کے پاس اور دوسری میرے پاس ہوتی تھیں، جس کے باعث میں رانو کی اسٹیڈی روم خود کھڑے ہو کے ملازمہ سے صاف کرواتی تھی، یہ رانو کی مجھے خاص ہدایت تھی کیوں کہ وہاں ان کی ضروری چیزیں ہوتی تھیں۔ لیکن میں یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ جس کا صاف مطلب تھا کہ اس پُراسرار سیاہ پوش کے پاس اس کی ڈپلی کیٹ چابی تھی، کیوں کہ اگر وہ کسی اور شے سے اس پر "طبع آزمائی" کرتا تو اسے تھوڑا وقت لگتا، میرا یہ اندازہ بالکل ٹھیک تھا کہ اس کے پاس ضرور کوئی ڈپلی کیٹ چابی تھی۔ ایسے ہی وقت میں مجھے اپنے سیل فون کی وائبریشن محسوس ہوئی، میں نے سیل کی اسکرین پہ دیکھا، یہ ان دونوں میں سے ایک اہلکار کی کال تھی جو میں نے ایک طرف کونے میں جا کر اٹینڈ کی تو معلوم ہوا کہ وہ دونوں بھی اندر آچکے تھے اور میرا پوچھ رہے تھے، میں نے انہیں اوپر آنے کا کہا اور اس سیاہ پوش کی خفیہ "کارکردگی" کے بارے میں بھی آگاہ کردیا۔ اب تو مجھے پورا یقین تھا کہ گزشتہ دنوں خطرناک قسم کی پراسراریت پھیلانے والا یہ سیاہ پوش اجنبی آج ضرور دھر لیا جائے گا۔

میں زینے کی دیوار والی سمت میں ایک قدرے تاریک گوشے میں دبکی کھڑی تھی، ان دونوں خفیہ اہلکاروں کے اوپر آنے کی منتظر تھی۔

ذرا ہی دیر بعد وہ دونوں اپنے ہاتھوں میں سروس ریوالور تھامے دبے پاؤں آ پہنچے۔

میں نے انہیں دیکھ کر بغیر کوئی آواز نکالے اپنی انگلی سے، اسٹیڈی روم کی طرف اشارہ کیا۔ جسے وہ دونوں فوراً ہی بھانپ کر اسی طرف بڑھے اور پھر میری پھٹی پھٹی نظروں نے ان دونوں کو دروازے سے ایک دم اندر داخل ہوتے بھی دیکھا۔ مجھے یقین تھا کہ اب تب میں وہ پُراسرار سیاہ پوش دھر لیا جانے والا تھا۔

اسی طرح جب کئی تابیے وسوسہ انگیز اور اندیشناک گھڑیوں میں بیت چلے تو مجھے ایک عجیب قسم کی وحشت نے آن گھیرا۔ اندر نہ کوئی گھڑبڑ کی آواز ابھری نہ ہی مجھے کوئی ایسی آوازیں سنائی دیں، جن کی میں توقع کیے بیٹھی تھی کہ ابھی وہ دونوں اس سیاہ پوش کو اپنی پستولوں کی نوک پہ رکھ کر کمرے سے باہر نمودار ہوں گے۔

ایسے میں مجھ پر ایک ایک پل بھاری سل کی طرح گزرتا محسوس ہو رہا تھا۔ اندر بدستور طاری رہنے والی خاموشی نے مجھے مزید ہراساں کردیا۔ میں نے ارادہ کیا کہ ذرا آگے جا کر دیکھوں تو ہوا کیا ہے؟ لہٰذا یہ سوچ کر ابھی میں نے آگے قدم اپنے بڑھائے ہی تھے کہ اچانک میں جہاں کی تہاں اپنی جگہ ٹھٹک کر رک گئی۔ میں نے دیکھا، خفیہ پولیس کے وہ دونوں اہلکار ہاتھ ملتے ہوئے اسٹیڈی روم سے برآمد ہو رہے تھے۔ مجھے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا۔ میں بے اختیار آگے بڑھ کر بولی۔

"کک کیا ہوا؟ آپ لوگوں نے اسے پکڑا نہیں؟"

ایسے میں میری آواز بھی ضرورت سے کچھ زیادہ ہی بلند ہوگئی تھی۔

ان میں سے ایک نے مجھ سے کہا۔ "بی بی اندر تو کوئی بھی نہیں ہے۔"

"کیا؟" اس کی بات پر میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔ "ی ی۔ یہ۔ یہ۔ کک۔ ک۔ کیا کہہ رہے ہو تم؟ وہ اندر ہی ہوگا۔ یہ کمرا پہلے بند تھا مگر۔"

"بی بی! کیا آپ نے واقعی کسی کو اندر داخل ہوتے دیکھا تھا؟ دوسرے نے مجھے ذرا شاکی نظروں سے گھورتے ہوئے پوچھا تو مجھے اس کی بات بری لگی۔ تاہم میں نے پورے یقین بھرے لہجے میں کہا۔

"کیا بات کر رہے ہیں آپ؟ میں نے خود اپنی آنکھوں سے ایک اجنبی کو اوپر زینے چڑھتے دیکھا تھا، خاصا

لمبا تڑنگا تھا وہ اور سر سے پاؤں تک اس نے سیاہ چست لباس پہن رکھا تھا۔"

میری بات پر انہوں نے پھر پورا گھر چھان مارا۔ باہر آ کر چوکیدار سے بھی پوچھا مگر اس نے بھی یہی کہا کہ وہ ان حالات کی وجہ سے آج کل دن بھر میں اپنی نیند پوری کر لیتا ہے اور ساری رات پہرا دیتے ہوئے جاگ کر گزار دیتا ہے۔ اسی لیے کم از کم اس کی موجودگی میں کسی کو اتنی جرأت نہیں ہو سکتی کہ وہ چوروں کی طرح یوں اندر داخل ہونے کی کوشش کرے۔ وغیرہ۔

دونوں پولیس اہلکار لوٹ گئے۔ ان کے انداز و اطوار سے مجھے پہلی بار محسوس ہوا تھا کہ وہ دونوں شاید میری ذہنی حالت پر شبہ کرنے لگے ہوں۔

میں نے بعد میں اسٹڈی روم کا جائزہ بھی لیا تھا۔ اندر روشنی ہو رہی تھی، سب کچھ بہ ظاہر نارمل نظر آ رہا تھا۔ مگر کوئی ذی روح اندر موجود تک نہ تھا۔

میں واپس ٹی وی لاؤنج میں آ کر بیٹھ تو گئی مگر میرا دل و دماغ پھر بھی ایک انجانے خوف کا شکار رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جس سیاہ پوش کو میں نے اپنی آنکھوں سے اپنے بیڈ روم سے چوروں کی طرح نکلتے اور پاس کے زینے طے کرتے ہوئے اوپر جاتے دیکھا ہے وہ۔ آخر گیا کہاں؟ یا پھر۔ کیا واقعی وہ میرا وہم تھا؟

میں یہ تک سوچنے پر بھی مجبور ہو گئی۔ مگر دوسرے ہی لمحے میں نے اپنے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ "بالکل نہیں۔ یہ میرا وہم نہیں ہو سکتا۔ وہ سیاہ پوش بہت چالاک اور ہوشیار ہے۔ یقیناً اسے کسی طرح بروقت کسی بات کا شبہ ہو گیا ہوگا۔" میں نے خود سے کہا۔

اس کے بعد ایک بار پھر ہمت کر کے میں اٹھی اور اوپر زینے طے کرتی ہوئی دوبارہ اسٹڈی روم کے پاس پہنچی۔ اس کا اسی طرح دروازہ کھلا ہوا تھا، لائیٹ بھی آن تھی، یہ ان دونوں سادہ پوش اہلکاروں کی ہدایت کے مطابق کیا گیا تھا کیوں کہ کل صبح فنگر پرنٹس کے ماہروں نے آ کر یہاں کا معائنہ کرنا تھا۔ میں آگے بڑھ گئی۔ اوپر ایک ماسٹر بیڈ روم بھی تھا۔ جس کا دروازہ بند تھا۔ میں نے اسے کھولنے کی کوشش نہیں کی۔

اثنائے راہ فرحانہ آ گئی۔ اس کے ہمراہ دو تین سہیلیاں بھی تھیں، جب اس کی سہیلیاں چلی گئیں تو میں نے فرحانہ کو یہ سب بتایا۔ وہ میری باتوں پر کم ہی توجہ دیتی تھی، جب سے اسے میرے وہم پر محمول کیا گیا تھا، کوئی بھی میری بات پر یقین نہیں کرتا تھا۔ حتیٰ کہ اگلے دن جب فنگر پرنٹس کی ایکسپرٹ ٹیم معائنہ کے لیے آئی تو انہیں بھی ایسے کوئی شواہد نہ ملے جن سے یہ پتا چلتا ہو کہ کوئی اجنبی یہاں آیا بھی تھا۔

مجھے دکھ اس بات کا تھا کہ رانو بھی یہی سمجھنے لگے تھے، جب ان کے دوست ڈی ایس پی سی آئی ڈی رحمت اللہ نے انہیں یہ مشورہ دیا کہ وہ مجھے کسی نفسیاتی معالج کو ایک بار دکھا دیں۔ اس بات پر اس روز میرا زندگی میں پہلی بار رانو سے تلخ کلامی کے انداز کا جھگڑا بھی ہوا۔ انہوں نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ تب میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب میں اپنے طور پر اس پراسرار اجنبی کو بے نقاب کرنے کی کوشش کروں گی۔

لیکن حیرت کی بات تھی کہ آخر وہ پُراسرار اجنبی اس طرح چوری چھپے اور نہایت ہوشیاری سے آیا بھی تھا تو کس مقصد کے لیے؟ اسے یہاں کس شے کی تلاش تھی؟

یہاں بھی ڈائری کے چند صفحات پھٹے ہوئے تھے اور کچھ دھندلے ہو رہے تھے۔ آخر میں صرف چند سطور چونکا دینے والی تھیں۔ جن کی ابتداء درمیان سے ہوئی تھی۔

"میں بری طرح دہشت زدہ تھی، اس نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کوئی شے تھی اور میں جانتی بھی کہ وہ کیا تھا۔"

اس کے بعد کے صفحات بھی پھٹے ہوئے تھے۔ ڈائری ختم ہو گئی۔ جسے فرحانہ نے بند کر کے میری طرف بڑھا دی، میں نے ذرا دیر تک ایک بار پھر کچھ تفصیلی اس کا جائزہ لیا اس کے بعد وہ زنیرہ کی طرف بڑھا دی۔ پھر میں نے فرحانہ سے سوال کیا۔ "جس روز آپ کی والدہ کا مرڈر ہوا۔ کیا آپ اس کی ذرا تفصیل بتا سکتی ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ ان کے ساتھ آخری واقعہ کیا پیش آیا تھا اور آپ سب کو بھی ان کی بات کا یقین کرنا پڑا ہو کہ یہ ان کا وہم نہیں بلکہ حقیقت تھی۔"

"شیور" وہ بولی۔ زنیرہ بھی ڈائری کا معائنہ کرنے کے بعد اسے بند کر کے فرحانہ کی طرف متوجہ ہو گئی۔ فرحانہ نے بتانا شروع کیا۔ مما کے ساتھ آخری واقعہ کچھ اس طرح کا پیش آیا تھا کہ ہمیں بھی یقین کرنا پڑا تھا کہ یہ مما کا محض وہم نہیں تھا۔

یہ واقعہ دن کے بارہ بجے پیش آیا تھا، میں کالج تھی، پپا بھی حسب معمول دفتر گئے ہوئے تھے اور مما گھر پہ اکیلی تھیں۔ اس دن انہوں نے اپنے چہیتے دیور یعنی میرے چچا

صفدر کی موجودگی کا بھی ذکر کیا تھا، وہ اس وقت اپنی بائیک پر آیا ہوا تھا۔ وہ میری مما یعنی اپنی بھابی سے کافی کلوز تھے، آج کل ان کی کہیں شادی وغیرہ کی بات چیت چل رہی تھی جو ایک جگہ زبانی کلامی حد تک تقریباً طے بھی پا چکی تھی۔ وہ اس لڑکی کی تصویر لے کر بھابی کو دکھانے آئے تھے۔ کچھ دیر بیٹھ کر وہ چلے گئے۔ ان کے جانے کے نصف گھنٹے بعد ہی مما کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا تھا، جس سے ہمیں بھی اس حقیقت کا ادراک ہوا تھا کہ مما غلط نہیں کہہ رہی تھیں۔

میں دو بجے تک ہی کالج سے لوٹتی تھی کبھی دیر بھی ہو جاتی تھی۔ اس وقت دن کا ایک بج رہا تھا جب مما کچن میں مصروف تھیں اور انہیں کھٹکے کی آواز سنائی دی تھی، اس وقت ہماری ملازمہ بھی گھر پر موجود تھی اور کپڑے دھو رہی تھی۔ جیسا کہ مما نے اپنی ڈائری میں ذکر کیا کہ ان کی بات کو واہمہ قرار دینے کے باعث۔ اب انہوں نے خود ہی اس پُراسرار سیاہ پوش کو بے نقاب کرنے کا ارادہ باندھ رکھا تھا اسی لیے انہوں نے ملازمہ کو بھی آواز نہ دی۔ وہ خود ہی اس کا کھوج لگانے کے لیے کچن سے نکلیں تو اچانک ہی ان کی نگاہ اس سیاہ پوش پر پڑ گئی جو تیزی کے ساتھ اوپر جانے کے لیے زینے کی طرف لپکنے کی کوشش کر رہا تھا اور تب ہی مما نے دہشت زدہ ہو کر چیخ خارج کی تھی۔ جب اس سیاہ پوش نے مما کو اپنی گرفت میں لینے کے لیے لپکا، تب مما الٹے پاؤں کچن کی طرف دوڑیں مگر سیاہ پوش نے انہیں چھاپ لیا، اسی وقت نجانے کس طرح مما نے اس کے چہرے سے نقاب نوچ لیا تھا اور یہی وہ وقت تھا جب ملازمہ مما کی دلدوز چیخ سن کر اس طرف کو لپکی تھی۔ وہ بھی ایک زوردار چیخ مار کر باہر کو دوڑی۔ سیاہ نقاب پوش بوکھلا گیا تھا اور مما کو چھوڑ کر ملازمہ کو پکڑنے کے لیے لپکا۔ ملازمہ نے ایک عقل مندی یہ کی تھی کہ وہ اندر کسی کمرے میں چھپنے کے لیے بھاگنے کی بجائے، سیدھی باہر کو ہی چیختی چلاتی ہوئی لپکی تھی اور تب چوکیدار عجب گل کو بھی اس طرف ہی متوجہ ہونا پڑا تھا، سوئے اتفاق اس وقت ہمارا ڈرائیور خدا بخش کار میں سوار گیٹ سے اندر داخل ہو رہا تھا۔

ادھر اتنے سارے لوگوں کو بدکتا دیکھ کر سیاہ پوش نے اسی میں ہی بہتری جانی کہ وہ بھاگ جائے اور یوں اسے راہ فرار اختیار کرتے ہوئے، کئی لوگوں نے دیکھا تو تب ہمیں جا کر مما کی بات کا سب کو یقین آیا تھا کہ یہ ان کا واہمہ نہیں تھا لیکن پھر اس کے اگلے دن ہی مما کا مرڈر ہو گیا۔

یہاں تک بتا کر فرحانہ نے سوگوار انداز میں چپ سادھ لی تو میں نے اگلا سوال کیا۔ ”آپ پلیز! اس روز والے افسوس ناک واقعے پر بھی تھوڑی روشنی ڈال دیں؟“

اپنی ماں کے اس آخری واقعے کا ذکر کرتے ہوئے فرحانہ کی دل نشیں آنکھیں ڈبڈبا سی گئی تھیں۔ تاہم اس نے اپنے دکھ اور رندھے ہوئے لہجے میں اتری رقت پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے ٹشو پیپر تھام کر آگے بولی۔ ”وہ بڑی بھیانک رات تھی۔ پپا کاروباری دورے پر ایک دن کے لیے اسلام آباد گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے اسی رات دس بجے کی فلائٹ سے واپس لوٹنا تھا۔ ہمارے ڈرائیور خدا بخش نے انہیں ائرپورٹ سے ریسیو کرنا تھا۔ جبکہ میں اپنی مما کے ساتھ ان کی ایک قریبی فرینڈ کی بیٹی کی منگنی پر گئی ہوئی تھی۔ رسم شام کی تھی اسی لیے ”ہائی ٹی“ کا ہی بندوبست کیا گیا تھا، وہ بھی کسی ڈنر سے کیا کم تھی، نو بجے ہماری واپسی ہوئی۔ ہمیں چھوڑ کر ڈرائیور خدا بخش نے ائرپورٹ کا رخ کیا۔ میں اپنے کمرے میں چلی گئی۔ تھکی ہوئی تھی، بیڈ پر یونہی کمر سیدھی کرنے کے لیے کیا لیٹی کہ میری آنکھ ہی لگ گئی۔ دوبارہ کھلی تو مجھے ملازمہ کی چیخیں سنائی دیں، میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھی، ملازمہ نے روتے ہوئے مجھے بتایا کہ مما اپنے کمرے میں بے سدھ پڑی ہیں، یہ سن کر میں حواس باختہ ہو گئی اور اٹھ کر مما کے کمرے کی طرف دوڑی، کیا دیکھتی ہوں مما اپنے بیڈ پر آڑی ترچھی پڑی ہوئی تھیں، اور ان کی گردن پر نیل کا نشان تھا۔ انہیں گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا تھا۔“

وہ اتنا بتا کر خاموش ہوئی تو زنیرہ نے سوال کیا۔ ”کیا اس وقت آپ کے پپا اسلام آباد سے آ چکے تھے؟“

”نہیں، وہ اس اندوہناک واقعے کے ایک گھنٹے بعد ہی آ سکے تھے، ان کی فلائٹ لیٹ تھی۔“

”ضابطے اور پولیس تفتیش سے کیا بات سامنے آئی تھی؟“ زنیرہ نے پوچھا۔ میں جانتا تھا کہ اسے ہی نہیں بلکہ مجھے بھی یہ بات معلوم تھی لیکن ہم اب براہ راست خود فرحانہ کی زبان سے سننا چاہتے تھے۔ وہ جواباً ایک گہرا سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔

”مما کو گلا دبوچ کر ہی ہلاک کیا گیا تھا۔ فنگر پرنٹس ایکسپرٹ کے مطابق، گلا دبوچنے والے نے اپنے ہاتھوں میں گلوز (دستانے) چڑھا رکھے تھے۔ مزید تفتیش سے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ یہ خالصتاً ڈکیتی کی واردات تھی، کیوں کہ سیف کھلا پایا گیا تھا،

یونٹز، سیونگ سرٹیفکیٹس اور جیولری کے علاوہ نقدی بھی غائب تھی۔

جب تفتیش کا دائرہ کار پھیلا تو معلوم ہوا کہ ایک روز پہلے ہی غلطی سے مما کے بیڈ روم اور دیگر چند کمروں کی چابیاں جو ایک ہی چین میں ہوتی تھیں، گم ہو گئی تھیں اور دروازے کھلوانے کے لیے وہ اپنے ساتھ تمہارے والد احمد حسین کو اپنی کار میں بیٹھا کر بنگلے پر لائی تھیں اور اس کے اگلے ہی دن یہ اندوہناک واقعہ رونما ہو چکا تھا۔ لہٰذا اس قتل اور ڈکیتی کا شبہ تمہارے والد پر ہی کیا گیا۔ کیونکہ سارے شواہد انہی کے خلاف جاتے تھے۔"

وہ اتنا بتا کر خاموش ہوئی تو میرے حلق میں پھر کڑواہٹ گھلنے لگی۔ میں نے فرحانہ کے چہرے پر اپنی نظریں گاڑتے ہوئے کسی خیال کے تحت پوچھا۔ "میرے بے گناہ باپ پر سب سے پہلے کس نے شبہ کیا تھا؟"

فرحانہ نے ذرا جھجکتے ہوئے جواب دیا۔ "پپ۔ پپا نے۔"

"وجہ؟"

"یہی کہ وقوعے سے ایک دن قبل وہی بنگلے پر مما کے ساتھ آئے تھے اور انہوں نے ڈپلی کیٹ چابیاں بنا کر دی تھیں۔ جن سے ڈور لاکز کو توڑے بغیر دروازے کھول دیئے گئے تھے۔"

"بس! یہی وجہ تھی؟" میرے لہجے کی تلخی بڑھنے لگی۔

"جج۔ جی۔ ہاں!"

"تو پھر اس پُراسرار سیاہ پوش کو آپ دونوں باپ بیٹی نے کس کھاتے میں ڈال دیا تھا؟ کیوں کہ یہ حقیقت تو ہمیں معلوم ہی نہیں تھی مگر آپ دونوں باپ بیٹی تو جانتے ہی تھے اور یہ آخری وقت میں راز آشکارا بھی ہو چکا تھا اور اس کے چشم دید گواہ بھی آپ کے گھریلو ملازمین تھے، آپ نے یہ بات کیوں نہیں پولیس کو بتائی؟ اصولاً تو آپ لوگوں کو سب سے پہلے اس سیاہ پوش پر شبہ بلکہ یقین کی حد تک شبہ کر لینا چاہیے تھا؟"

"یہی تو ہم سے غلطی ہوئی تھی۔" فرحانہ نے کہا تو میرا دماغ یک دم سلگ اٹھا۔ میں نے زہرخند لہجے میں کہا۔

"یہ غلطی نہیں تھی۔ مس فرحانہ! یہ کسی بے گناہ کی زندگی اور موت کا سوال تھا، اور ایسا دانستہ کیا گیا تھا، تمہارے باپ رانا بشیر کو ایسے ہی کسی غریب آدمی کی تلاش تھی جسے وہ قربانی کا بکرا بناتے۔ ہاں! ڈائری کے مندرجات اور اس کے پھٹے ہوئے صفحات سے مجھے شبہ نہیں بلکہ یقین ہے کہ یہ قتل تمہارے باپ نے ہی خود کروایا تھا۔"

"واٹ۔ نانسینس!" میری اس بات پر فرحانہ ایک دم بھڑک اٹھی تھی۔ برہمی کے باعث اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا، مگر پھر فوراً ہی موقع اور وقت کی "نزاکت" کو دیکھتے ہوئے اس نے خود پر قابو پایا اور بہت دھیرے سے مختصراً بولی۔ "آپ شبے کا حق رکھتے ہیں۔ لیکن، اگر ایسا ہوتا تو مما کی یہ دونوں ڈائریاں ملتے ہی وہ کیوں اپنے ضمیر کے ہاتھوں مجبور ہو کر آپ کے ہاں آتے اور اپنی پشیمانی کا اظہار کرتے۔ آپ نے تو ان کی ٹھیک ٹھاک بے عزتی بھی کر ڈالی تھی، مگر باوجود اس کے ان کے دل کی خلش کم نہیں ہوئی تھی۔ وہ اب بھی اصل قاتل کو بے نقاب کرنا چاہتے ہیں۔"

اس کی بات پر مجھے سوچنا پڑا کہ فرحانہ کیا اتنی ہی نادان تھی یا مجھے اور ایڈووکیٹ زنیرہ کو بے وقوف سمجھے ہوئے تھی۔ چنانچہ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے تلخی سے کہا۔ "انہیں اس لیے ایسا کرنا پڑا تھا کہ وہ ڈائری ان کی بجائے آپ کے ہاتھ لگی تھی، جو آپ نے پڑھ بھی لی تھی۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"جی ہاں! اگر یہ ڈائری ان کے ہاتھ لگتی تو وہ آپ کو کیا کسی کو بھی اس کی ہوا تک نہیں لگنے دیتے۔" شاید اب میری بات کا مطلب سمجھتے ہوئے اس بار وہ بھی قدرے تلخی سے بولی۔

"تو پھر آپ کو مجھ پر کیسے اعتبار آ گیا؟ میں بھی تو رانا بشیر ہی کی بیٹی ہوں، اگر ایسی بات ہوتی تو میں بھی یہ ڈائری ضائع کرنے کی کوشش کرتی یا میرے پپا مجھے اسے شو آف کرنے سے منع بھی کر سکتے تھے۔"

"فرحانہ صاحب! یا تو آپ واقعی بھولی ہیں یا پھر ہمیں آپ بے وقوف سمجھ رہی ہیں۔" میں نے بھی بالآخر کہہ ہی دیا۔ "کیا ایک باپ اپنی بیٹی کے سامنے خود کو مشکوک بنا کر جی سکتا ہے؟ وہ کبھی بھی خود کو اپنی اولاد کی نظروں میں مجرم ظاہر کرنے کی کوشش نہیں کر سکتا۔ اور آپ کے پپا نے بھی یہی کیا۔"

"نعمان صاحب! اگر آپ ایسی شکوک و شبہات والی روش اختیار کیے رکھیں گے تو میرا خیال ہے ہم اصل مجرم تک کبھی نہیں پہنچ سکیں گے۔" بالآخر فرحانہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے گہری متانت سے کہا۔ "سمجھ میں آنے والی

بات ہے کہ بھلا میرے پپا کو کیا ضرورت تھی کہ وہ میری مما کا خون کرواتے؟''

میرے اور فرحانہ کے درمیان بڑھتی ہوئی اس تلخ بحث کو دیکھتے ہوئے زنیرہ کو مداخلت کرنا پڑی اور وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ''میرا خیال ہے نعمان کہ ابھی یہ باتیں قبل از وقت ہوں گی۔ ہمیں بہرحال ابھی ایسی باتوں سے اجتناب کرنا چاہیے۔'' زنیرہ کی اس مصلحت اندیشی کو محسوس کرتے ہوئے مجھے چپ ہونا پڑا تو وہ فرحانہ کی طرف دیکھ کر بولی۔ ''یہ بتاؤ فرحانہ! کہ یہ ڈائری تمھیں ملی تھی یا تمہارے پپا کو؟'' اچانک زنیرہ نے اس سے پوچھا۔ جس کا اس نے بلا تعویق وتامل جواب دیا۔

''یہ ڈائری مجھے ملی تھی۔''

''آپ اب ایسا کریں کہ یہ دونوں ڈائریاں، ہمارے حوالے کردیں۔'' زنیرہ نے کہا اور میں اس کی بات پر غور کرنے والے انداز میں فرحانہ کے چہرے کا بھانپتی ہوئی نظروں سے جائزہ لینے لگا تو میں نے دیکھا کہ وہ اس بات پر ذرا متردد سی نظر آنے لگی۔ تاہم بولی۔

''یہ میں اپنے پپا سے پوچھ کر ہی آپ لوگوں کے حوالے کرسکتی ہوں۔''

مجھے اس کی یہ بات بھی عجیب لگی۔ میں اس ضمن میں فرحانہ سے کچھ کہنا چاہتا تھا کہ زنیرہ اس سے بولی۔ ''ٹھیک ہے، ہمیں بھی اس کی کوئی خاص جلدی نہیں ہے۔ اب جبکہ ہم اصل قاتل کو بے نقاب کرنے کے لیے نیک نیتی سے سر جوڑ کر بیٹھ ہی گئے ہیں تو پھر کیا پریشانی ہے۔ بائی دی وے! رانا صاحب کب تک آجائیں گے؟ یا پھر ہمیں دوبارہ آنا پڑے گا؟''

''پپا تو شام تک ہی آتے ہیں۔ میں ان سے پوچھ لوں گی اور پھر آپ کو بتادوں گی۔''

''بہتر ہے۔ ہم بھی تب تک باہم کوئی مشورہ کرلیں گے کہ اب ان ڈائریوں کے ملنے کے بعد ہمیں اگلا کون سا اسٹیپ اٹھانا چاہیے۔'' یہ کہتے ہوئے زنیرہ نے میری طرف بھی ایک نگاہ دیکھا تھا۔ اتنا عرصہ ایڈووکیٹ زنیرہ کے ساتھ بتانے سے ہمارے درمیان اتنی ہم آہنگی تو ہو ہی گئی تھی کہ میں اس کی نگاہوں کا مطلب اچھی طرح سمجھنے لگا تھا، اس نے مجھے سردست خاموش رہنے کا ہی اشارہ کیا تھا اور میں نے بھی چپ سادھے رکھی تھی۔

وہاں سے روانہ ہوتے وقت جب زنیرہ اپنی کار میں سوار ہونے لگی تو اس نے مجھے اپنے ساتھ چیمبر چلنے کو کہا۔ میں نے اپنی بائیک سنبھال لی اور یوں میں اس کی کار کے پیچھے پیچھے اپنی بائیک دوڑاتا ہوا۔ اس کے چیمبر میں پہنچا۔ وہاں پہنچ کر زنیرہ نے مجھے ہلکی تادیب کی۔ ''ابھی بہت سی ایسی باتیں مرحلہ وار ہمارے علم میں آتی رہیں گی، جس کی وجہ سے ہمارا شک میں مبتلا ہونا عین امر ہوگا، مگر اس کا اظہار کرکے ہم چھپے ہوئے مجرم کو بے نقاب تو کیا کریں گے بلکہ الٹا اسے ہوشیار اور محتاط کردیں گے۔ اسی لیے ابھی تم فرحانہ یا اس کے باپ کے سامنے اپنے کسی شبہے کا یوں برملا اظہار مت کیا کرو۔ تم سمجھ رہے ہو ناں میری بات؟''

''ہاں! سمجھ رہا ہوں۔'' میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ''میں آئندہ اس کا خیال رکھوں گا۔''

''گڈ'' وہ دلنشیں انداز میں مسکرائی۔ میں نے کہا۔

''آپ کا کیا خیال ہے۔ ہمیں ڈائریاں حاصل کرنے کے بعد پہلا کام کیا کرنا چاہیے؟''

''اس سلسلے میں ہمیں بھی یہ دیکھنا ہوگا کہ رانا بشیر کیا مشورہ دیتا ہے؟ آفٹر آل۔ اس کا تعاون ہماری ضرورت ہے۔ اس لیے ہماری مجبوری ہے کہ ہم اسے بھی ساتھ لے کر چلیں۔''

''میرے ذہن میں ایک بات آتی ہے۔ زنیرہ!''

''وہ کیا؟'' وہ میرے چہرے کی طرف دیکھ کر ہولے سے مسکرائی۔

''لگتا کچھ ایسے ہے مجھے کہ یہ بھی اصل مجرم کی کوئی چال ہے۔ وہ اگلا گل کھلانے کے پرتول رہا ہے۔ نیز یہ کہ وہ رفعت خانم کا قتل کروانے کے بعد بھی اپنے اصل مقصد میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوسکا ہے۔''

''تمہاری بات مجھے بہت دور کی کوڑی لاتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔'' وہ بولی۔ ''ویسے تمہارے ذہن میں اس نادر خیال کے آنے کی کوئی وجہ تو ہوگی؟''

''رفعت خانم کے قتل اور میرے باپ کی پھانسی کے بعد پہلی ڈائری کا ملنا، اس کے بعد دوسری ڈائری کا بھی اس حالت میں ہاتھ آنا کہ اس کے کچھ درمیانی صفحات بھی پھٹے ہوئے ہوں۔ اسی بات پر ہی مجھے رانا بشیر پر شبہ ہوا تھا۔ کیوں کہ یہ اس کی بیوی کی ڈائری تھی جو میرے خیال میں اگر اس کی بیٹی کے ہاتھ لگنے کی بجائے رانا بشیر کے ہاتھ لگتی تو شاید ہمیشہ کے لیے اسے تلف کردیتا۔'' میں نے کہا۔

بات کی مختصر صراحت میں ایک گہری توجیہ بیان کی تو زنیرہ میری طرف دیکھتے ہوئے پُرمعنی خیز لہجے میں بولی۔

"یہ کیس مجھے لگتا ہے پولیس کی بجائے تم ہی سلجھاؤ گے۔ بہت گمبھیر معاملہ لگتا ہے یہ۔"

"ہم دونوں مل کر یہ گتھی سلجھائیں گے اور بعد میں کسی ذمے دار پولیس افسر سے بھی مدد لیں گے۔" میں نے کہا۔

"چائے پیو گے؟"

"نہیں، میں اب چلوں گا۔" یہ کہہ کر میں وہاں سے رخصت ہو گیا۔

اڈے پر پہنچتے پہنچتے میں ایک نتیجے پر بھی پہنچ چکا تھا۔

☆......☆

تین بج رہے تھے۔ مجھے سخت بھوک محسوس ہوئی، میں نے پرس نکال کر اپنے ملازم دوسو کو آواز دی۔ وہ آیا تو میں نے اس سے پوچھا۔

"چاچا انور شاہ نے کھانا کھا لیا ہے؟"

"وہ تو نہیں ہیں،" اس نے جواب دیا۔ مجھے یاد آیا وہ ٹول پلازا کی طرف گئے ہوئے تھے، کسی لاری کا چالان ہو گیا تھا مگر میرے خیال کے مطابق انہیں اب تک آ جانا چاہیے تھا۔ بہرطور میں نے پانچ سو کا ایک نوٹ دوسو کو تھماتے ہوئے کہا کہ ہوٹل سے اپنے اور میرے لیے کھانا پارسل کروا کے لے آئے۔" دوسو نے نوٹ میرے ہاتھ سے لیا اور جانے لگا تو دروازے پر پہنچ کر رکا، پھر پلٹا اور بولا۔ "صاحب! اس آدمی کا کیا کرنا ہے؟"

"کون سے آدمی کا؟" میں نے الجھ کر پوچھا۔

"وہی صاحب! جسے آپ انتظار کے لیے بٹھا گئے تھے۔ شاید کوئی بھائی تھا، ہاں! سدو بھائی!"

"میرے خدا! وہ باگڑو۔ ابھی تک ادھر ہی ہے؟" میں بری طرح ہولا کر بولا۔

میں اسے واقعی بھول ہی گیا تھا۔

"اس سے کہو کہ بھاگ جائے یہاں سے۔" میں نے جھلا کر دوسو سے کہا تو ایک لمحے کے لیے دوسو بھی گھبرا سا گیا۔ "جی بہت بہتر صاحب!" وہ بولا۔ اور دوبارہ دروازے کی طرف پلٹا تو میں نے آواز دی۔

"ٹھہرو۔" وہ رک گیا۔ اور مجھے پُرسوچ انداز میں ہونٹ کاٹتے ہوئے تکنے لگا تو میں نے کہا۔

"جاؤ یار! اس کے لیے بھی کھانا پارسل کروا لینا اور ہاں! اسے ذرا اندر میرے پاس بھیجے جاؤ۔"

"جی بہتر صاحب!" دوسو کمرے سے نکل گیا۔ میں یوں ہی کمرے کی کھڑکی کا پردہ ہٹا کر شیشے سے باہر دیکھنے لگا۔ اس کھڑکی سے باہر لاری اڈے کا تقریباً سارا منظر صاف نظر آتا تھا۔ گرمی زوروں پہ تھی۔ اس چلچلاتی دھوپ اور گرمی میں بھی لوگ اپنے مال و اسباب اور بال بچوں کے ساتھ لاریوں کے سفر کے لیے پُرجوش نظر آ رہے تھے۔

معاً مجھے اپنے کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے کھڑکی کا پردہ برابر کر دیا۔ دیکھا وہ اول جلول میری میز کے سامنے ہی مسکینی سی صورت لیے کھڑا تھا۔

"بیٹھو۔" میں نے کہا۔ وہ خاموشی سے میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"تم ابھی تک ادھر ہی تھے؟ گھر نہیں گئے؟" میں نے اس کی طرف دیکھ کر قدرے حیرت سے پوچھا تو وہ بولا۔

"آپ کے حکم کے بغیر یہاں سے کیسے ہل سکتا تھا۔ اسی لیے بیٹھا رہا۔"

اس نے بڑے سادے سے انداز میں یہ کہا تھا۔ اس کا بولنے کا انداز مجھے کسی ریا اور چاپلوسی سے یکسر بے نیاز لگا۔ میں نے ایک بات محسوس کی تھی اور اب تک اس کی مجھے فقط ایک یہی بات اچھی لگی تھی کہ یہ بڑ گو یعنی باتونی نہیں تھا اور بہت مختصر جواب دیتا کوئی فالتو بات بھی نہیں کرتا تھا، جیسا کہ عموماً ملازمین کرتے ہیں۔ جو پوچھا جاتا، صرف اسی سوال کا جواب دیتا۔ لیکن باوصف اس کے مجھے وہ پھر بھی کہیں سے سنجیدہ رویا پختہ مزاج دکھائی نہیں دیتا تھا۔ پرلے درجے کا بےوقوف اور احمق تو وہ صورت سے ہی نظر آ رہا تھا، اور ایسے میں اس کا یوں مختصر بولنا بھی اس کے اس عیب پر پردہ ڈالنے سے قاصر تھا۔ دانا تو یہی کہتے ہیں کہ خاموشی بھی ایک انسان کے بہت سے عیوب کو ڈھانپ دیتی ہے۔

بہرطور۔ جب تک دوسو ہوٹل سے کھانا پارسل کروا کے لاتا۔ میں نے سوچا اس سے ذرا انٹرویو کے طرز میں تھوڑی سی بات چیت ہی کر لی جائے۔ آخر کو یہ چاچا انور شاہ کا "انتخاب" تھا۔

"تم کتنا پڑھے ہوئے ہو؟"

"گیارہویں تک پڑھا ہوں، بارہویں بھی کافی پڑھ لی تھی مگر کسی مجبوری کے باعث امتحان نہیں دے سکا تھا۔" اس نے جواب دیا۔

"رہتے کہاں ہو؟"

''لانڈھی میں رہتا ہوں جی، چھ نمبر میں۔''

''اور کون ہوتا ہے تمہارے ساتھ؟ میرا مطلب ہے ماں باپ، بہن بھائی، یا کوئی رشتہ دار وغیرہ؟''

''اپنے ماں باپ کا تو مجھے آج تک نہیں پتا، نہ ہی میں نے آج تک ان کی شکل بھی دیکھی تو بھائی بہن کا کیا سوال۔ ہوش سنبھالنے سے خود کو اکیلا دیکھتا چلا آرہا ہوں۔ ایک گودام ہے ادھر داؤد چورنگی کی طرف، اسی کی چوکیداری کرتا ہوں اور رات کو وہیں کہیں کونے میں پڑ کے سوجاتا ہوں۔''

مجھے اس کی بات سن کر پہلی بار اس پر ترس اور خود پر شرمندگی کا احساس ہوا۔ میں بھی انسان تھا، خود پر پارسائی کا دعویٰ مجھے بھی نہیں تھا۔ میرے اندر بھی عام انسانوں جیسی کمزوریاں پائی جاتی تھیں، اسی لیے اب تک میں نے اپنے دل میں اس بے چارے کے لیے برے القابات رکھے۔ میں نے دل ہی دل میں اللہ سے اپنے لیے معافی مانگی اور بولا۔''انور شاہ سے تمہاری کس طرح صاحب سلامت ہو گئی؟''

''گودام کے مالک رازق خان کے ہاں اکثر شاہ جی (انور شاہ) آتے رہتے ہیں۔ وہ ان کے بچپن کے دوست ہیں۔ وہیں میری بھی ان سے ملاقات ہو جاتی تھی۔'' اس نے جواب دیا۔''مگر پتا نہیں جی انہیں میری کون سی بات اچھی لگی تھی کہ وہ اکثر رازق خان سے میرے بارے میں کہتے تھے کہ''یہ آدمی وفادار لگتا ہے، مگر تم نے اسے ایک فضول کام میں لگا رکھا ہے۔ اس پر شاہ جی کو رازق خان نے بھی کہا کہ''تم اسے اپنے ساتھ رکھ لو۔ یوں بھی میں کچھ روز میں یہ گودام بیچنے چلا ہوں۔ بے چارہ اب کہاں جائے گا۔'' وہ اتنا بتا کر خاموش ہو گیا۔ بس! اتنی ہی میری ابھی اس سے بات ہو پائی تھی۔ دوسو کھانے کی تین تھیلیاں اور ایک بڑے سے پرانے اخبار میں تنوری نان لپیٹے اندر داخل ہوا۔

میں نے مرغی کے سالن کی دو پلیٹیں اور ایک دال فرائی منگوائی تھی۔ کھانا میز پر ہی لگوا دیا۔ ہم تینوں خاموشی سے کھانا کھانے میں مصروف ہو گئے۔ کھانے سے فارغ ہونے تک مجھے سدو بھائی کے سلسلے میں ایک نتیجے تک پہنچنا تھا اور یوں میں ایک فیصلہ کر چکا تھا کہ اسے ایک بار آزما کے دیکھنے میں کیا حرج ہے؟ بہ صورت دیگر میں اسے اڈے میں ہی کسی دوسرے کام میں لگوا دوں گا۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میں نے دوسو کو چائے بنوانے کا کہا اور سدو بھائی سے مخاطب ہو کے پوچھا۔

''تمہیں یہاں لانے سے پہلے انور شاہ نے کیا کہا تھا؟'' یہ سوال کرنے کے بعد مجھے فوراً احساس ہوا کہ میرا سوال اس کے لیے شاید ادھورا ہو۔ مگر وہ فوراً اس سوال کا مطلب بھانپتے ہوئے بولا۔

''انہوں نے مجھ سے یہی کہا تھا کہ آپ کو کسی راز دار، ہوشیار اور وفادار آدمی کی ضرورت ہے۔ جس سے آپ کوئی خاص کام لینا چاہتے ہیں۔'' اس کے جواب پر مجھے اس کے منہ سے''ہوشیار'' کا لفظ عجیب ہی لگا تھا، باقی دو الفاظ کی کسوٹی بھی ابھی ہنوز دلی دور است کے مترادف تھی۔ تاہم میں نے کہا۔

''میں تم سے ایک خطرناک کام لینا چاہتا ہوں اور وہ ہے کسی کی مخبری اور ریکی کرنا۔'' میرا خیال تھا کہ وہ کم از کم''خطرناک'' کے لفظ پر بدکے گا ضرور مگر اس کے برعکس وہ اسی اطمینان سے بولا۔

''جناب! مخبری اور ریکی جیسا کام تو ہوتا ہی خطرناک ہے۔ آپ حکم کریں، میں بجا لانے کی کوشش کروں گا۔'' مجھے پہلی بار اس کا جواب معقول لگا۔

''ہم'' میں نے ایک ہنکاری بھری اور آگے بولا۔ ''میں نے جن لوگوں کی تم سے جاسوسی اور مخبری کروانی ہے، ان میں لینڈ مافیا کے خطرناک ڈون سے لے کر، پیشہ ور خونی مجرم اور کچھ بااثر جاگیردار، سب ہی شامل ہوں گے اور ممکن ہے تمہیں اپنے بچاؤ کے لیے تھوڑی بہت لڑائی بھڑائی سے بھی کام لینا پڑے، ان میں فور وہیل ڈرائیونگ سے لے کر بائیک بھی چلانی آتی ہو، اب تم مجھے بتاؤ گے کہ ان میں سے تمہیں کیا کیا آتا ہے اور کیا نہیں؟'' کہتے ہوئے میں نے اپنی نظریں اس کے چہرے پر گاڑ دیں وہ کچھ کسمسانے کے انداز میں بولا۔

''جناب! جہاں تک ڈرائیونگ کی بات ہے تو مجھے صرف بائیک چلانی آتی ہے۔ روڈ سینس رکھتا ہوں، ضرورت پڑی تو موٹر کار بھی سیکھ لوں گا۔'' اتنا کہہ کر وہ ذرا ٹھہرا پھر بولا۔''رہی بات لڑائی بھڑائی کی تو وہ بھلا مجھے کہاں آتی ہوگی جناب! لیکن میرا نہیں خیال کہ میرا کوئی ایسا کام بھی ہو سکتا ہے، اگر تو میں ہوشیاری اور ٹھیک ٹھاک راز داری سے اپنا کام کرتا رہوں تو باقی اپنے دفاع کی حد تک تو اپنا بچاؤ کرنا میں بھی جانتا ہوں۔'' مجھے اس کی گفتگو کا انداز اور باتیں رفتہ رفتہ حیرانی کی طرف لے جا رہی تھیں۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں کسی''پروفیشنل'' سے گفتگو کر رہا

ہوں۔ یہی سبب تھا کہ بے اختیار میری زبان پہ یہ سوال در آیا۔
"کیا تم اس سے پہلے بھی یہ کام کرتے رہے ہو؟" یہ سوال کرتے ہوئے میں نے اپنی آنکھیں، کچھ بھانپنے کے انداز میں سکیڑ کر اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ تو وہ اسی سنجیدگی سے بولا۔ "جی ہاں جناب!"
"اس سے پہلے کس کے لیے کرتے رہے ہو یہ کام؟" میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔
"سوری جناب! یہ میں نہیں بتا سکتا۔ یہ میرے اصول کے خلاف ہے۔ جو گزر گیا، وہ ختم، جو سامنے ہے وہ شروع۔" اس نے بہ ظاہر ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا اور مجھے اس کے مسکت جواب نے یہ سوچنے پر مجبور کر ہی دیا کہ ایسے سخت اصول رکھنے والا آدمی کس قدر سچا ہو سکتا تھا اور حقیقت بھی یہی تھی۔ اگر وہ مجھے کسی اور کے بارے میں نہیں بتانا چاہتا تھا تو یقیناً میرے سلسلے میں بھی وہ یہی اصول روا رکھ سکتا تھا۔
مجھے لگ رہا تھا کہ میں اب اس سے متاثر ہو چلا ہوں۔
اثنائے راہ۔ دو سو چائے کے دو مگ لے آیا۔ ایک اس نے میرے سامنے رکھ دیا اور دوسرا سدو بھائی کے سامنے۔ پھر میں نے اسے اس ہدایت کے ساتھ جانے کا کہہ دیا کہ جب تک میں نہ کہوں، وہ کسی کو بھی اندر نہ بھیجے۔ وہ چلا گیا۔
میں نے دوبارہ اپنے سامنے والی کرسی پر بیٹھے سدو بھائی کے چہرے پر نظریں جما دیں۔ میں اس کے چہرے کے تاثرات بھانپنے کی کوشش کر رہا تھا، جو مجھے نارمل ہی محسوس ہوئے تھے۔ میں سوچنے لگا کہ اسے پہلے آزمائشی طور پر نسبتاً کوئی کم خطرناک کام دیا جائے لیکن جب میں نے اپنے مسائل کا جائزہ لیا تو میں ان میں سے صحیح طور پر تمیز ہی نہ کر سکا کہ کون سا کام کم اور کون سا زیادہ خطرناک ہو سکتا تھا؟ امر واقعہ تو یہی تھا کہ مجھے سارے ہی کام خطرناک محسوس ہوتے تھے، تاہم میں نے اپنے تئیں سوچ کر اسے ایک "کام" یا بالفاظ دیگر ایک مشن کے لیے منتخب ضرور کر لیا تھا، لیکن اس سے پہلے میں نے اس کے اور اپنے بیچ کچھ ضروری ترجیحات کا تعین کرنا اور ان کی وضاحت قلمبند کرنا مناسب جانتے ہوئے اس سے کہا۔
"میں کام میں کام سے زیادہ رازداری کی شرط کو ہمیشہ اوّلیت دیتا ہوں، اسی لیے مجھے تمہاری یہ صاف گوئی پسند آئی کہ تم نے مجھے اپنے سابقہ باس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ یقیناً تم میرے سلسلے میں بھی اسی بات کا خیال رکھو گے۔ لیکن تمہیں مجھے ضرور بتانا پڑے گا کہ تم کیا اب بھی اس کے لیے کام کرتے ہو، یا چھوڑ چکے ہو؟ یا وہ تمہیں وقتاً فوقتاً استعمال کرتا رہتا ہے؟"
"وہ بات ماضی کا حصہ بن کر دفن ہو چکی ہے، نہ وہ آدمی رہا، اور نہ ہی اس کا کوئی کام۔"
اس نے سپاٹ سا جواب دیا اور میں نے مطمئن ہو کے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی تھی۔
"تو گویا تم پہلے بھی یہ کام کر چکے ہو اور تمہیں اس کا خاصا تجربہ ہے۔"
"جی ہاں جناب! میں دراصل جس کے ساتھ کام کرتا تھا وہ خود پولیس کا مخبر تھا، مجھ سے پہلے پہل وہ ہیلپر کے طور پر کام لیتا تھا۔ پھر باقاعدہ اس نے مجھے اپنے ساتھ ملا لیا تھا، لیکن افسوس وہ بعد میں مارا گیا۔ پتا چلا کہ کسی خطرناک مجرم کی ریکی کرنے کے دوران پولیس میں موجود کسی کالی بھیڑ نے اس کے خلاف مخبری کر ڈالی تھی۔"
میں نے اس کی بات پر اپنی حیرانی اور متاثر ہونے کے انداز میں اپنی بھنویں اچکا لیں۔ اب تک اس کی باتوں نے ہی مجھے متاثر کیا تھا اور جو تھوڑی دیر پہلے میں اس کے بارے میں رائے قائم کرنے لگا تھا وہ باطل ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔ بات سے بات نکلنے کے مصداق میں نے اس سے آخری سوال کیا جو اچانک ہی میرے ذہن میں ابھرا تھا۔
"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ آخر پولیس کے اس مخبر کو تمہیں اپنے ساتھ ہیلپر کے طور پر رکھنے کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی جبکہ وہ خود بھی ایک مخبر تھا؟"
"اس میں اس کی ایک مجبوری تھی۔ لیکن اصل وجہ یہ میری وضع قطع تھی، لوگ میری صورت و شکل دیکھ کر آسانی سے دھوکا کھا جاتے تھے اور نظر انداز کر دیا کرتے تھے۔"
مجھے شاید اس کی بات پر زور سے قہقہہ لگانا چاہیے تھا مگر میں صرف مسکرا کر رہ گیا۔ مجھے اس کی بات کچھ کچھ معقول بھی لگی تھی، بہرطور۔ میں نے اسے ایک کام سمجھانے سے پہلے اچھی طرح بریف کرنا ضروری سمجھا کہ اس میں کس قدر ہوشیاری کی ضرورت ہے اور آخر میں مجھے اس سے پوچھنا پڑا کہ وہ کب اور کس طرح میرے کاموں کی رپورٹس

وغیرہ مجھ تک پہنچائے گا؟ اس پر اس نے مجھے جو جواب دیا۔ وہ یہ تھا۔

''جناب! پہلی بات تو یہ کہ اب یہ آپ کی اور میری آخری ملاقات ہونی چاہیے۔ مطلب یہ کہ آج کے بعد میں یہاں نہیں آیا کروں گا۔ کیوں کہ یہ میرا اصول ہے کہ جس کے لیے مخبری کا کام کروں، اس سے بار بار ملنے سے کتراتا ہوں، اشد مجبوری کی صورت میں اور بات ہے، آج کل سیل فون کا زمانہ ہے، اس سے کام چل سکتا ہے، دوسرے یہ کہ میرے لیے آپ کو ایک الگ سے رہائش کا بندوبست کرنا پڑے گا تو کام مزید بہتر طریقے سے ہوتا رہے گا۔ بس! ایک کمرا ہی کافی ہے۔ جہاں آپ بھی کسی فوری ضرورت کے پیش نظر مجھ سے مل سکتے ہیں اور گزر بسر کے لیے تنخواہ کے علاوہ کام مکمل ہونے پر ڈبل تنخواہ کا بونس میں لوں گا۔''

مجھے اس کی یہ صاف گوئی پسند آئی تھی۔ جو شخص اس قدر خود اعتمادی اور دھڑلے سے یہ سب کہہ رہا ہو۔ وہ ضرور اندر سے کوئی ''شے ہوگا'' میں نے فوراً ہامی بھرلی۔ اور اس سے دو دنوں کی مہلت مانگ لی، اس کے پاس ایک سستا سا موبائل فون سیٹ تھا، اور سیٹ سے زیادہ اس کے نمبر سے دلچسپی تھی جو میں نے اس سے لے لیا۔ اور پھر اسے رخصت کردیا۔

میرے اور سدو بھائی کے بیچ کوئی یاری باشی والا معاملہ نہیں تھا، یہ معاملات خالصتاً باس اور ماتحت کے حوالے سے طے ہوئے تھے۔ میں نے اپنا کام اسے بتایا تھا اور اس نے اپنا معاوضہ۔ یوں معاملات کچھ دو اور لو کے تحت طے پاچکے تھے۔ تنخواہ میں نے اس کی فی الحال دس ہزار روپے ماہانہ طے کی تھی۔ خاطر خواہ طریقے سے ''مشن'' پورا کرنے پر تنخواہ کے علاوہ مجھے اسے بیس ہزار روپے الگ سے دینا تھے اور انہی پیسوں میں اس نے کل وقتی صرف میرے لیے کام کرنا تھا۔ اب مجھے اپنا بجٹ دیکھنا تھا۔ میری اپنی تنخواہ تیس ہزار روپے تھی۔ مزید تیس سے پینتیس ہزار ''بھتے'' کی مد میں مل جایا کرتے تھے۔ (لاریوں اور بسوں وغیرہ کے اڈوں میں تنخواہ کے علاوہ ملنے والی روزانہ کمیشن کو ڈرائیوروں، منشیوں اور اسٹارٹرز کی زبان میں ''بھتا'' ہی کہا جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ یہ زور زبردستی والا بھتا نہیں تھا)

لہٰذا میرے لیے ماہانہ دس ہزار اس سے تنخواہ کے لیے نکالنا مسئلہ نہیں تھا۔ رہی بات اس کی رہائش کی تو آج کل ایک کمرا کسی کچی آبادی یا عام سے علاقے میں کرائے پر ایک ہزار سے پندرہ سو تک مل جاتا تھا۔ ملا جلا کر سدو بھائی کا میرے ذمے اگر خرچا بنتا بھی تھا تو وہ ماہانہ تقریباً بارہ ہزار کے اندر ہی بنتا۔ ہاں، اگر وہ اپنا ''کام'' کرتا رہتا تو مجھے بیس ہزار الگ سے اس کے لیے نکالنا پڑتے۔ اس میں تھوڑی مشکل تھی مگر زیادہ نہیں۔ تین چار ہی قسم کے کام تھے، جو میں نے اس سے لے کر اسے پھر خدا حافظ کہہ دیا تھا۔

☆......☆

میں نے رسٹ واچ میں وقت دیکھا، شام کے پانچ بجنے والے تھے۔ میں اکثر چھ بجے اور کبھی آٹھ بجے تک یہاں رک جاتا تھا۔ چاچا انور شاہ ابھی تک نہیں آئے تھے اور مجھے بھی آج اتنے کام تھے کہ ان سے فون پر رابطہ ہی نہ کرسکا۔ اب جا کر کہیں سر کھجانے کی فرصت ملی تو میں نے ان کے سیل فون پر رابطہ کیا مگر انہوں نے میری کال کاٹ دی، میں نے سیل سامنے میز پر رکھ دیا۔ کال منقطع کرنا اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ آچکے تھے اور وہی ہوا۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ میرے کمرے میں تھے اور آتے ہی بولے۔

''بھتیجے! تیار ہو تم؟ ہمیں آج عطا محمد صاحب سے ملنے جانا ہے۔''

میں ان کی بات پر چونکا اور بے اختیار میرا دل بھی کسی آوارہ خیال آمیزی کے باعث یکبارگی زور سے دھڑکنے لگا۔ ہاں! عطا محمد کا ذکر ہو اور مجھے اس کی پُرجمیل اور صاعقہ بار بیٹی فوزیہ یاد نہ آئے۔ یہ کیسے ممکن تھا؟ میں تو خود ایسے کسی موقع کی تاک میں تھا کہ کسی طرح عطا صاحب کے گھر کا چکر لگے اور مجھے ایک بار پھر فوزیہ کی صاعقہ بار جھلک دکھائی دے جائے مگر اس بار معاملہ ذرا اس سے بھی آگے کا تھا کیوں کہ مجھے اس کی وہ کال یاد تھی جو اس نے چند روز پہلے کی تھی اور وہ مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتی تھی مگر وہ جانے کیا بات تھی جو مجھ سے پوچھنے کی وہ پھر ہمت بھی نہ کرسکی تھی اور کس لاج کے مارے اس نے کال ہی کاٹ دی تھی۔ میں اس کے فون کا انتظار کرتا رہا تھا مگر خود سے فون کرنے کی ''جرات'' نہ کرسکا تھا۔ میرے لیے یہی کافی تھا کہ اس کے پاس کسی طرح میرا نمبر آچکا تھا اور اب میرے پاس بھی اس کا نمبر تھا، میں کئی دن سوچتا رہا تھا کہ کہیں اس لیے تو اس نے جان بوجھ کر مجھے فون تو نہیں کیا تھا کہ اس کا نمبر میں ''سیو'' کرلوں اور اس سے رابطہ کرلوں مگر پھر بعد کے حالات ہی کچھ ایسے رہے تھے کہ اس طرف سوچنے کا موقع ہی نہ ملا تھا، اس نے یقیناً میرا اصل نمبر اپنے باپ کے سیل سے ہی لیا

ہوگا۔

بہر طور میں نے اپنے اندر کی مسرت کو دباتے ہوئے بہ ظاہر عام سے لہجے میں چاچا انور شاہ سے پوچھا۔ ''خیریت ہے۔ کس سلسلے میں ملنا ہے؟ یا انہوں نے خود بلایا ہے؟''

''تم پوچھو گے نہیں کہ مجھے آج باہر سارا دن کہاں دیر ہوگئی؟'' چاچا انور شاہ نے الٹا خود ہی سوال کر ڈالا۔ میں نے کہا۔ ''ہاں! یہ تو مجھے پوچھنا تھا۔ درحقیقت آج میرا بھی سارا دن معروفیت میں گزرا تھا۔ ویسے خیریت تو ہے چاچا! آپ نے تو واقعی دیر لگادی آج، سارا دن ہی آپ نے باہر گزار دیا؟''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولے۔ ''گیا تو میں ٹول پلازا تک تھا، موٹر وے پولیس نے ہماری ایک لاری کا چالان کر دیا تھا اوور اسپیڈ کی وجہ سے بڑی مشکلوں سے وہ چھڑوایا تو وہیں ایک ٹھیکے دارا سائیں رکھیو سے ملاقات ہوگئی، عنقریب حضرت لعل شہباز قلندرؒ کا عرس شروع ہونے والا ہے، اسے ٹھیکے میں کچھ لاریاں درکار تھیں لوگوں مریدوں کو سیہون شریف لے جانے کے لیے۔ پانچ لاریاں اپنے اڈے سے تو دینے کی میں نے بھی ہامی بھرلی تھی، کچھ رقم ایڈوانس بھی پکڑلی اس سے۔ بس اسی سلسلے میں دیر ہوگئی۔''

''چلو خیر ہے چاچا!'' میں نے قدرے خوش ہو کے کہا۔ ''آپ تو چالان بھرنے گئے تھے، مگر کمائی کر کے آگئے۔'' میری بات پر وہ بھی خوش دلی سے مسکرا کر بولے۔

''بس بھتیجے! انسان رزق کے پیچھے بھاگتا ہے مگر دیکھا جائے تو رزق انسان کے پیچھے بھاگتا ہے اب ذرا آگے بھی تو سن لو۔ ہمیں ایک بہت بڑا ٹھیکا بھی دلوادیا ہے اپنے سائیں رکھیو نے۔''

''اچھا! وہ کون سا؟''

''جامشورو کا ایک وڈیرہ ہے، میر لکھمیر خان۔ ادھر کراچی میں بھی کلفٹن میں اس کا بنگلا ہے۔'' وہ بتانے لگے۔ ''اس کا چہیتا اور اکلوتا داماد ایک گڈز کمپنی کھولنا چاہتا ہے، اسے تجربہ بھی اسی کام کا ہے، اس کے لیے اسے اڈے کی ضرورت تھی، وہ آپس میں تین پارٹنر ہیں اور تینوں ہی آپس میں دوست بھی ہیں، پورے بارہ عدد دس وہیلر ہینو ٹرک ہیں ان کے پاس، ادھر ہی کراچی کے ایک شوروم میں کھڑے ہیں، ہمارے اڈے میں تو ایسا کوئی گڈز نہیں ہے، میں نے سوچا عطا صاحب سے بات کر کے اگر اسے اپنے اڈے میں تھوڑی جگہ دلوادی جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ کرائے کے علاوہ وہ بھتے کی صورت میں ہمیں کمیشن بھی دے گا۔''

چاچا انور شاہ کی بات پر میں کچھ سوچتا بن گیا پھر بولا۔

''چاچا! کیا اپنی زمین دینا اچھا رہے گا؟ جبکہ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ خاص تہواروں اور سیزن کے دنوں میں تو خود ہمیں اپنے لیے بھی اپنے اڈے کی زمین تنگ پڑ جاتی ہے؟''

''او یارا! وہ میں دیکھ لوں گا تو اس کی فکر نہ کر۔ پہلے عطا صاحب سے بات تو کرلیں۔ کیا کہتا ہے وہ۔''

میں نے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔ تھوڑی دیر بعد چاچا انور شاہ نے عطا سے بات کرلی اور انہوں نے ہمیں ملنے کا وقت دے دیا۔ چاچا انور شاہ آدھے گھنٹے میں آنے کا کہہ کر اپنے کمرے کی طرف ہو لیے۔ انہوں نے ابھی سدو بھائی کے بارے میں مجھ سے نہیں پوچھا تھا، شاید انہیں یاد ہی نہ رہا ہو۔

بہر طور میں بھی اپنی میز پر بکھرے رجسٹر اور دیگر کاغذات وغیرہ سنبھالنے لگا۔ اپنے ملازم چھوکرے دوسو کو میں نے چھٹی دے دی تھی۔ لہٰذا میں خود ہی ساری چیزیں ایک فولادی الماری میں لاک کر کے رکھنے کے بعد اپنے آفس روم کی بتیاں بجھا ہی رہا تھا کہ میرا سیل گنگنایا۔ میں نے ڈسپلے پر نگاہ ڈالی۔ تو ایک دم جیسے میرے گرد ستاروں کی کہکشاں بکھرنے لگی۔ سیل کی اسکرین پر اسی صاعقہ بار فوزیہ کا نام مجھے کسی ستارے کی مانند جگمگاتا ہوا دکھائی دیا کیوں کہ میں نے اسی کے نام سے ہی نمبر سیو کر رکھا تھا۔ میں نے اپنے دل کی بے ترتیب پڑتی دھڑکنوں پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے سیل کو فوراً اپنے کان سے لگا کر ہیلو کہا تو دوسری طرف سے فوزیہ کی مترنم رس گھولتی آواز میری سماعت سے بے تابانہ سے ٹکرائی۔

''ہیلو، پہچانا مجھے؟ کون ہوں بھلا میں.....'' اس کا انداز بڑا شوخیلا اور شوخ تھا، ایسے میں مجھے بھی شیخی سوجھی تو میں نے بھی ایک پیاسی اور ترسی ہوئی آہ سے مشابہ آواز میں جواب دیا۔

''یہ نرم اور میٹھی آواز تو میں ہزاروں لاکھوں آوازوں کے شور و شغب میں بھی پہچان سکتا ہوں۔''

''اچھا!'' بڑی ادا کے ساتھ دوسری جانب سے یہ کہا/

گیا تھا۔" تو پھر اسی لیے میرا نمبر آنے کے باوجود مجھے ابھی تک ایک فون تو کیا سستا سا ایس ایم ایس بھی نہیں کیا تم نے" اس کا شکوہ بجا تھا اور مجھے بھی جیسے بولنا راہِ الفت کی تپش میں آپوں آپ بولنا آ گیا۔ میں نے اسی کا جملہ اچک کر کہا۔

"ہاں! میرا جی تمہیں ایک سستا سا ایس ایم ایس کرنے کو نہیں چاہا تھا۔ میں تو تم سے خود ملنا چاہتا تھا۔" یہ کہتے ہوئے مجھے خود اپنے آپ پر حیرت ہوئی تھی کہ یہ میں کیا کہہ رہا تھا؟ ایک اجنبی لڑکی سے مگر نہیں وہ اب اجنبی کہاں رہی تھی اور شاید میں بھی تو اس کے لیے اجنبی کب رہا ہوں گا۔ ہم تو برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے چلے آ رہے تھے۔ رومان اور محبت کیا ہوتی ہے اور کب دل میں جوش مار کر اپنا آپ باور کراتی ہے، اس کا مجھے آج پتا چل رہا تھا۔

"کیا واقعی تم مجھ سے ملنے کی آرزو رکھتے ہو اپنے دل میں؟" اس نے اسی نرم اور میٹھی آواز میں پوچھا تو مجھ پر ایک سرور سا طاری ہونے لگا، اس کے بولنے کی ادا ہی ایسی نرالی اور وارفتہ تھی کہ جیسے سارے تکلف مٹ گئے۔ میں نے کہا۔

"ہاں! واقعی۔ میں تم سے ایک ملاقات تو کرنا ہی چاہتا تھا مگر سوچتا تھا کہیں معیوب نہ کہلاؤں۔"

دوسری جانب سے مجھے بھی اس کی ایک ترسی ہوئی آہ سے مشابہ آواز سنائی دی اور اسی درمیان وہ بولی۔ "آپ کے بولنے کا انداز میرے اندر بھی ایک نو دمیدہ سی جوت جگاتا ہوا محسوس ہو رہا ہے لیکن اس سے پہلے میں آپ کی نظروں سے گھائل ہو چکی ہوں۔ اس روز پردے کے پیچھے آپ کا اشتیاق سے تکتے جانا میں کبھی نہیں بھول پاؤں گی۔"

دونوں طرف برابر کی آگ لگی ہو تو پھر محبت کی شمعوں کو بھلا فروزاں کرنے سے کون روک سکتا ہے، گویا وہ اس روز جب بار بار مجھے پردے کی اوٹ سے اپنی دل نواز جھلک دکھا رہی تھی تو میری نظر داری کا مفہوم بھی سمجھ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "میں واقعی اس گل گلنار اپسرا کا چہرہ دیکھنے کے بعد اس کے دیدار کی دوبارہ ہوس کیے بیٹھا تھا۔"

"کھانے کی میز پر بھی آپ یہ شوق پورا کر رہے تھے، میں یہ بھی محسوس کر رہی تھی۔" وہ بولی تو میں نے کہا۔

"ہاں! مگر اس میں دیگر نظروں کی قدغن کا مجھے خوف بھی تھا کہ پرائی نگاہ کے پہرے تاڑ جاتے تو تمہارے والد کیا سمجھتے، اسی لیے میں تمہاری طرف سے نظریں چراتا رہا تھا۔"

"تمہیں مجھے وہیل چیئر پر دیکھ کر ایک جھٹکا لگا تھا ناں؟ سچ سچ بتاؤ۔ تم مجھے اس حالت میں دیکھ کر بددل ہو گئے تھے ناں؟"

"بددل نہیں ہوا تھا افسوس ہوا تھا لیکن۔" میں آگے نہ بول سکا۔ تو دوسری جانب سے وہ ایک دم بولی۔

"لیکن کیا؟"

"یہی کہ اس قدر معصوم صورت اور حسین چہرہ۔ اپنے اندر ایسا دکھ بھی چھپائے ہوگا۔ مجھے اسی بات پر افسوس ہوا تھا ورنہ بھلا آپ کا کیا قصور؟ اور ہاں بددل میں نہیں ہوا تھا اور اگر ہوتا تو پھر دوبارہ آپ سے ملنے کی تمنا کو اپنے دل میں جگہ ہی کیوں دیتا۔"

میں نے سہل اور محتاط پیرائے میں اس کی معذوری کا ذکر کر دیا تھا، بعض اٹل حقیقتوں کو چھپانے سے بھی بداعتمادی کو تقویت ملتی ہے۔ اسی لیے میں نے بھی صاف گوئی سے کام لیا تھا۔ بات سچی تھی اسی لیے اس کے دل کو بھی لگی تھی۔ یکدم بولی۔

"کیا واقعی۔ اتنے بڑے عیب کے باوجود آپ دوبارہ مجھ سے ملنا اور مجھے دیکھنا چاہتے ہیں؟"

"اس کا جواب میں آپ سے ملنے پر ہی ٹھیک طرح سے دے سکتا ہوں۔"

میرا خیال تھا کہ وہ میری بات کی تہہ میں چھپی معنی خیزیت کو نہیں بھانپ سکے گی مگر وہ بہت زیرک اور زود فہم ثابت ہوئی کیوں کہ دوسری طرف سے مجھے اس کی ایک سسکاری سے مشابہ سانس کھینچنے کی آواز سنائی دی تھی۔ وہ بے اختیاری میں کچھ کہنا چاہتی تھی مگر ایک فطری شرم اس کے آڑے آنے لگی تھی۔ پھر میں نے ہی کہا۔ "آج شاید میں چاچا انور شاہ کے ساتھ تمہاری طرف آ رہا ہوں۔"

"ہاں! مجھے پتا ہے۔" وہ اس بار فوراً بولی، مگر مجھے اس کی آواز، اس کے لہجے سے امڈتی وہ تپش صاف محسوس ہوئی تھی جو میری معنی خیز بات کے جواب میں اس کے لبوں سے نکلتی کوئی جذبات انگیز الفاظ کو ایک تڑپتی سسکاری نگل گئی تھی۔

"ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو انکل انور شاہ کا بابا جانی کو فون آیا تھا، وہ ملنے کا پوچھ رہے تھے، میں بھی قریب ہی موجود تھی اور میں نے اسی لیے آپ کو فون کیا تھا تاکہ پوچھ سکوں کہ آپ بھی ان کے ساتھ آؤ گے ناں؟"

"ایسے کسی موقع کی تو میں اس وقت سے تاک

میں رہنے لگا تھا جب میں نے پہلی بار آپ کو دیکھا تھا۔"

ایک بے اختیاری سی جیسے آپوں آپ میرے ہونٹوں سے پھسلی جا رہی تھی۔ مجھے تسلیم ہے کہ میں پہلے کبھی ایسے حالات سے نہیں گزرا تھا، مگر اس کا یہ بھی مطلب نہ تھا کہ میں آج کسی حسین لڑکی سے پہلی بار گفتگو کر رہا تھا۔ ہرگز نہیں، میں نے کالج میں کو ایجوکیشن میں ہی تعلیم حاصل کی تھی، بہت سی لڑکیوں سے میری بات چیت رہتی تھی، کچھ نے قریب ہونے کی بھی کوشش چاہی تھی، مگر اپنا مزاج ہی اور طرح کا تھا پھر ایڈووکیٹ زنیرہ تھی، وہ کیا کم خوب صورت تھی، جس کے ساتھ میں ایک وقت بتاتا چلا آرہا تھا۔ لیکن اس وہیل چیئر میں بیٹھی لڑکی میں آخر ایسی کیا بات تھی کہ اس نے آن کی آن میں میرا "اندر" تہہ بالا کر کے رکھ دیا تھا؟ کیا اصل اور سچی محبت اسی کو ہی کہتے ہیں؟ جو کی نہیں جاتی۔ "ہو جاتی" ہے اور مجھے بھی شاید فوزیہ سے محبت "ہو گئی تھی"۔

"آپ ضرور آئیے گا۔ میں انتظار کروں گی۔ اللہ حافظ۔" اس نے ایک کراہتی سی آواز سے کہا اور دوسری طرف سے یوں اچانک یہ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا، جیسے میرا حال دل جان لینے کے بعد وہ بھی جذبات سے پگھلنے لگی ہو اور خود کو جیسے پگھل کر بہہ جانے سے بچانے کی خاطر اس نے ایک انجانے خوف سے رابطہ ہی منقطع کر دیا۔ میں اپنا سیل کان سے ہٹا کر اس کی اس اسکرین کو چند ثانیے یوں تکتا رہا جیسے مجھے موبائل کی اسکرین پر اس ماہ رخ کی شبیہ دکھائی دے رہی ہو۔

اسی وقت چاچا انور شاہ کمرے میں داخل ہوئے اور ذرا عجلت میں بولے۔

"چلو بھائی بھتیجے! دیر ہو رہی ہے۔" میں نے کمرے کا دروازہ لاک کیا اور ان کے ساتھ باہر کھلے میدان میں آ گیا۔ کراچی میں بھی خوب گرمیاں پڑنے لگی تھیں، باہر حبس کی کیفیت تھی، ہوا رکی ہوئی تھی، اڈے کی باؤنڈری وال قریب بنے چھپر نما ہوٹل اور کولڈ کارنرز کھلے ہوئے تھے۔ ان سے بھی ہمیں اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی، یہاں بھی ہمارے ہی ملازمین کام کرتے تھے۔ قریب ایک سرائے بھی تھی وہ بھی اڈے کی یعنی ہماری ہی ملکیت تھی۔

ہم دونوں بائیک پر سوار ہوئے اور روانہ ہو گئے۔ عطا صاحب کے ہاں جاتے وقت میرا دل بے طرح دھڑکے جا رہا تھا، بائیک میں ہی چلا رہا تھا اور چاچا انور شاہ میرے پیچھے بیٹھے تھے اور اس نئے فیصلے کے سلسلے میں مجھ سے نجانے کیا کچھ کہتے بھی جا رہے تھے اور میں ہوں، ہاں کے انداز میں اور کبھی سر کو اپنے اثبات میں جنبش دے کر ان کا جواب دے رہا تھا۔ میرا تو سارا دھیان آج فوزیہ سے ہونے والی گفتگو پر مرکوز تھا اس کی باتیں اور اس کا نرم میٹھا لہجہ اور لفظوں ہی کی نہیں بلکہ انداز ادائیگی کی معنی خیزیت پر غور کیے جا رہا تھا۔ آج پتا چلا تھا کہ عشق یک طرفہ ہو تو سزا دیتا ہے، دو طرفہ ہو تو مزہ دیتا ہے۔ اور میں شاید اسی "مزے" کے زیر اثر تھا۔

حالاں کہ بائیک میں ہی چلا رہا تھا مگر مجھے پتا بھی نہ چلا کہ ہم کس وقت عطا صاحب کے ہاں پہنچ بھی چکے تھے۔ ان کے حویلی نما بنگلے کے قریب پہنچتے ہی مجھے ایسا لگا کہ اس کے کسی مانوس دریچے سے دو پُر اشتیاق آنکھیں مجھے دیکھ رہی ہوں گی، کسی کی نگاہ بے قراران بلند و بالا دیواروں کے کسی چور رخنوں سے قربت داری کی دوریاں پاٹنے کی چاہ میں اٹھی ہوں گی اور خود میں بھی تو شوق دیدار کے زیر اثر تھا اور چاہتا تھا کہ اس پیاسی دید کو محبوب کا دیدار، فقط ایک جھلک ہی دکھائی دے جائے۔

چوکیدار نے ہمیں پہچان کر گیٹ کھول دیا تھا اور ہم بائیک سمیت اندر داخل ہو گئے تھے جہاں ایک اور ملازم ہمیں اندر لے جانے کے لیے پہلے سے وہاں آن پہنچا تھا۔

ہم بائیک سے اترے، میں نے اسے سائیڈ اسٹینڈ پر کھڑا کیا۔ ملازم نے ہمیں ادب سے سلام کیا اور پھر پاس کی بیٹھک کی طرف اشارہ کیا۔ ہم اندر داخل ہو گئے۔ بیٹھک کیا تھی، اچھا خاصا بڑا سا کمرا تھا۔ ہم عموماً ادھر ہی بیٹھا کرتے تھے اور ادھر ہی سے مجھے کمرے کا وہ دروازہ دکھتا تھا، جو گھر کے کسی اندرونی گوشے میں کھلتا تھا۔

مگر یہ دروازہ مجھے کسی کمرے کا نہیں، بلکہ کسی کے دل کا دروازہ محسوس ہوتا تھا۔ یہ راہ الفت کا وہ دروازہ تھا، جہاں سے میری شوق دید نے ایسی منزل کی راہ پائی تھی، جو اب مشترکہ منزل قرار پانے والی تھی یا شاید پا چکی تھی۔ اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے میری نظریں غیر ارادی طور پر اسی جانب ہی اٹھی تھیں۔ ایک امید میری آنکھوں میں شعلہ بن کر چمکی تھی، لیکن مجھے یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ دروازہ بند تھا بالکل بند۔

عطا صاحب ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرواتے تھے۔ ہماری آمد کا علم ہوتے ہی وہ فوراً ہم سے آن ملتے تھے۔ اب بھی یہی ہوا، ہمیں ابھی وہاں بیٹھے تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ

وہ ہلکے سے کھنکار کر اندر داخل ہوئے۔ میں اور چاچا انور شاہ احتراماً اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہیں، باری باری سلام اور مصافحہ کیا، وہ بھی ہمیشہ کی طرح ہمارے ساتھ خوش دلی کے ساتھ ملے۔ چاچا انور شاہ نے فوراً وہی موضوع چھیڑ دیا۔ ان دونوں کے درمیان اس پر کچھ صراحت کے ساتھ گفتگو ہونے لگی جبکہ میری نظریں ایک بار پھر بار بار اسی بند دروازے کی طرف بھٹکتی رہیں۔ دل میں کئی سوالیہ نشان ابھرے۔ وہ اب تک کیوں نہیں آئی؟ کہاں رہ گئی؟ کیا کہیں مصروف تھی؟ کیا کسی موقعے کی منتظر تھی؟ میں محسوس کر رہا تھا کہ پہلے کے مقابلے میں اب زیادہ میرے اندر بے تابی سی ہونے لگی تھی۔ ناچار میں نے بھی سنجیدگی سے گفتگو میں حصہ لینا ضروری سمجھا۔ لہٰذا جب عطا محمد نے چاچا انور شاہ کی بات پر نیم رضامندی دکھاتے ہوئے مجھ سے بھی رائے لینا ضروری سمجھا تو مجھ سے مخاطب ہو کر بولے۔ ''تم کیا کہتے ہو نعمان! کرائے کی بنیاد پر بات کرنا زیادہ منافع بخش ہوگا یا پھر کمیشن؟''

جب چاچا انور شاہ نے، مجھ سے اس بات کا ذکر کیا تھا تو میں پہلے ہی اس پر غور کر چکا تھا مگر ابھی میں صرف چاچا انور شاہ کے سامنے ہی اس کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اب جب اپنی رائے دینے کا مجھے خاطر خواہ موقع ملا تو میں نے ہولے سے کھنکھار کہا۔ ''جناب عطا صاحب! کمیشن تو بہر صورت ہوگا ہی، لیکن بات اگر منافع اور آمدنی کی، کی جائے تو سب سے بہتر طریقہ کرائے کی بجائے اس وڈیرے صاحب سے۔ پارٹنر شپ کی بات کی جائے۔''

عطا صاحب کو میرا مشورہ اچھا لگا تھا، مگر چاچا انور شاہ نے کہا۔ ''لیکن ہم اس وقت کسی کے ساتھ حصہ داری کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ ابھی تک تو خود ہم پر پوری پانچ بسوں کی قسطیں واجب الادا ہیں۔ اور حصہ داری کی صورت میں ضرور ہمیں بھی رقم ڈالنا پڑے گی۔ وہ ہم کہاں سے لائیں گے؟ لون بھی اب ہمیں نہیں مل سکتا۔''

ہمیں کچھ خریدنے یا رقم ڈالنے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ ہم بس کرایہ نہیں لیں گے ان سے۔ کمیشن بھی جانے دیں گے۔ عطا محمد نے میری بات پر چاچا انور شاہ کی طرف دیکھا تھا، وہ فوراً میری طرف دیکھ کر بولے۔

''بھائی بھتیجے! اس طرح تو پھر وہ یہ سودا ہی کینسل کر دیں گے۔''

''چاچا! ہم ان سے یہ بات سودا کینسل کرنے کی نیت سے تو نہیں کریں گے اور نہ ہی شرط کے طور پر مانتے ہیں تو ٹھیک ہے، ورنہ پہلی والی ڈیل پر ہاں کہہ دیں گے۔'' میں نے کہا تو عطا محمد میری بات کی تائید میں بولے یہ بھی ٹھیک ہے اور کچھ نہیں تو کرائے کے ساتھ کمیشن تو ہمارا کھرا رہے گا ہی۔

''بالکل۔'' میں نے کہا۔ اسی وقت مجھے اندر کہیں ہلکی سی آواز سنائی دی۔ شاید کوئی برتن گرا تھا یا گرایا گیا تھا۔ بہ ظاہر یہ گھر کے اندر سے ابھرنے والی عام سی آواز تھی مگر اس کی وجہ مجھے ''خاص'' لگی تھی۔ کیوں کہ جب میں نے غیر محسوس انداز میں دروازے کی طرف دیکھا تو مجھے اپنے دل کی دھڑکنیں کنپٹیوں پہ سنائی دینے لگی تھیں۔ بند دروازہ اب تھوڑا وا ہو چکا تھا، جہاں وہی جھولتے ہوئے پھولدار پردے کی جھلک مجھے صاف نظر آ رہی تھی اور پھر جیسے اچانک میرے دل کی دھڑکنیں رکنے لگیں، پردے کا کونا جہاں سے سرکا ہوا تھا، وہاں کسی کا رخ روشن اپنی ضوفشانی کی جھلک بھی دکھلا رہا تھا، وہ پردے کے پیچھے آ گئی تھی، اور نجانے کب سے آئی ہوئی تھی کہ مجھے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے اسے اندر ''کھڑکا'' کرنا پڑا تھا۔

''تو گویا یہ اسی کی حرکت تھی۔'' میں نے دل میں مسرور ہو کر سوچا۔

''میرا تو خیال ہے ان سے ابھی یہ بات کرنی ہی نہیں چاہیے ہمیں، وہ نہ بھی مانیں تو اس طرح بعد میں خوامخواہ غلط فہمیاں پروان چڑھنے لگتی ہیں۔'' انور شاہ نے کہا۔

''جبکہ وہ پہلے ہی بارہ کی تعداد میں دس وہیلر ہینو ٹرک خرید چکے ہیں۔ انہیں کسی پارٹنر کی سرے سے ضرورت ہی نہ ہوگی۔'' مجھے انور شاہ کی یہ بات کچھ معقول تو لگی تھی، مگر میں نے کہا۔

''ہم ان لوگوں سے اشاروں کنایوں میں بات کریں اور ذرا اس طریقے سے کہ انہیں برا بھی نہ لگے اور کاروباری بات کرنا یوں بھی ہمارا حق ہے۔ اس میں کیا برائی ہے؟''

اسی دوران میری دزدیدہ نظروں نے دروازے کی طرف دیکھا تو پردے کی جھلک کے خلاء سے دو دلنشیں آنکھیں تکے جا رہی تھیں۔ جیسے شکوہ کناں ہوں۔ ''کب سے دیکھ رہی ہوں۔ اور تم ہو کہ۔ بس!'' اور میں نے اس ''بس'' کا جواب ان پر شوق آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جی بھر کے دے دیا، تو اسی وقت مجھے تکتی ہوئی ان آنکھوں نے

اپنے رخ زیبا کی بھی جھلک دکھادی، وہ تھرکتے ہوئے دل کش لب تھے، اوران پہ مچلتی ہوئی رحزیہ مسکراہٹ۔ پھر جیسے دانستہ تھوڑا زاویہ بدلا تو مجھے شفاف اور ملائم گال کی جھلک نظر آئی، مسکراتے گال پر ڈمپل بنا مجھے مخمور سا کرنے لگا تھا۔

اس دوران میں نے اس بات کا بھی دھیان رکھا تھا کہ عطا محمد کی نظریں میری نگاہوں کا رخ نہ سمجھ سکیں۔ میرا دل فوزیہ سے ملنے کے لیے بے چین سا ہونے لگا تھا، دل میں یہ خواہش شدید دم پکڑنے لگی کہ کاش! کچھ ایسا ہو جائے کہ بس! ایک بار۔ ایک بار ہی سہی میں اس کے سامنے چلا جاؤں اور وہ میرے سامنے ہو مگر کیسے؟ ایک اُمید تھی کہ شاید میرے دل میں کسی فروزاں شعلے کی مانند بھڑکتی اس بے چین سی خواہش کو وہ بھی محسوس کرلے اور وہ ہی کوئی ایسی سبیل نکال لے؟ کاش! کاش!

انور شاہ اور عطا محمد آپس میں ابھی تک اسی موضوع پر اظہار خیال کر رہے تھے اور اسی دوران ایک ادھیڑ عمر ملازمہ چائے کی ایک بڑی سی ٹرے اٹھائے اندر داخل ہو رہی تھی۔ اسی وقت میرے سیل فون کی بپ ابھری۔ میرا اس وقت کوئی میسج پڑھنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن پتا نہیں کس خیال کے تحت۔ میں نے اپنی شرٹ کی چیسٹ پاکٹ سے سیل نکال کر میسج پڑھا تو چونکا۔ یہ فوزیہ کا تھا۔ لکھا تھا۔ ''ملو گے نہیں مجھ سے؟'' آگے ایک مسکراتا ہوا سمبل تھا۔ میں نے فوراً رپلائے کر دیا۔

''اس کے لیے تو میں کب سے بے چین بیٹھا ہوا ہوں۔ پلیز! ایک دیدار تو کروادو اپنا۔'' یہ میسج لکھ کر میں نے بھی اختتام میں ایک رونی صورت کا سمبل ایڈ کر کے سینٹ کر دیا، ذرا ہی دیر میں جواب آ گیا۔

''جناب! اتنی بے چینی!! خیر میں پہلے ہی اس کا بندوبست کر چکی ہوں۔ ویٹ۔''

دو میسج پڑھ کر میرے دل بے قرار میں شگوفے پھوٹنے لگے۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا ''بندوبست'' کیے ہوئے تھی؟ کیا ایک ذرا تنہائی کی ملاقات کا؟ یا پھر ادھر ہی سب کے سامنے خود آنے کا؟''

جی چاہا کہ میں یہ پوچھ لوں۔ مگر اسی وقت عطا محمد نے مجھے چائے لینے کا کہا۔ اور میں قدرے چونک کر بولا۔ ''اس کی کیوں زحمت کی جناب!''

''نہیں بھئی زحمت کس بات کی۔'' وہ بولے۔ پھر

میں نے آگے جھک کر چائے کا کپ ٹرے سے اٹھالیا اور دروازے کی طرف کن انکھیوں سے دیکھا۔ وہ غائب تھی اور دروازہ بند تھا۔ میں چائے پینے لگا۔ ٹرے میں بسکٹ اور کیک کے علاوہ پیٹیز وغیرہ بھی تھے۔

''ہاں! بھئی تو پھر میرا خیال ہے تم دونوں ہی اس وڈیرے سے۔ کیا نام بتایا تھا اس کا؟'' عطا نے انور شاہ سے مخاطب ہو کر استفسار یہ انداز میں اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ بولے۔

''وڈیرہ ارباب خاں۔''

''ہاں! ارباب خاں، کیا اسی سے ہی بات کرنی پڑے گی یا۔ اس کے داماد سے؟''

''بات تو اب اس کے داماد شاہ نواز سے ہی کرنا ہوگی، بلکہ وہ آئے گا اڈے پر۔''

انور شاہ نے بتایا۔ تو عطا بولا۔ ''کیا مجھے بھی آنا ہوگا؟''

''آپ بھی آجاتے تو اچھا تھا۔ ورنہ تو میں اور نعمان ہی ان سے بات کرنے کے لیے کافی ہوں گے۔''

''میرا خیال ہے آپ کو ابھی آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اور چاچا انور شاہ ہی ان سے بات کرلیں گے۔'' میں نے فوراً کہا اور دونوں اثبات میں اپنے سر ہلانے لگے۔ اسی وقت اندر سے وہی ادھیڑ عمر ملازمہ آئی اور عطا محمد کے قریب آکر جھک کے اس کے کان میں کچھ کہا۔ میری نظریں ان پر ہی جمی ہوئی تھیں، اور دل ودماغ فوزیہ کی ملاقات والی بات پر اٹکا ہوا تھا کہ وہ ملازمہ عطا کے کان میں کچھ کہنے...... کے بعد سیدھی کھڑی ہوگئی۔ پھر عطا محمد اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے معذرت خواہانہ انداز میں ہم سے بولا۔

''میں ابھی آتا ہوں، ایک ضروری فون کرنا یاد آ گیا۔'' وہ یہ کہہ کر جانے لگے تو چاچا انور شاہ نے بھی فوراً اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''بس جناب! آپ آرام سے بات کیجئے۔ ہمیں بھی اجازت دیں۔''

''ارے نہیں بھئی، ایسے کیسے اجازت دوں گا۔ روٹی شوٹی کھا کے جانا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم یہاں آؤ اور کھانا کھائے بغیر چلے جاؤ۔ بیٹھو آرام سے۔ میں ابھی آتا ہوں۔''

پھر وہ مزید کچھ سنے بغیر چلے گئے۔ چاچا انور شاہ دوبارہ بیٹھ گئے۔ میں نے کچھ سوچ کر اب اپنا سیل سائلنٹ کرکے تھرتھراہٹ پر سیٹ کر دیا تھا اور وہ میرے ہاتھ میں تھا، اسی

وقت وہ تھرتھرایا۔ فوزیہ کا میسج آیا تھا۔

"اسی کمرے کی طرف آجاؤ۔" میسج پڑھ کر میں دنگ رہ گیا اور گھبرایا بھی، میں نے فوراً ریپلائی کیا۔ "کیسے آجاؤں؟ چاچا انور شاہ میرے ساتھ بیٹھے ہیں۔"

جواب آیا۔ "تو کیا ہوا؟ کیا تمہاری ان سے انڈراسٹینڈنگ نہیں ہے؟"

میں نے جواب دیا۔ "ہے تو سہی۔ مگر کچھ اچھا نہیں لگتا۔ ہوسکتا ہے وہ میری اس حرکت پہ اعتراض کریں۔"

جواب آیا۔ "کرنے دو۔ انہیں بتا دینا صاف صاف۔ آخر کو تمہارے چچا ہیں۔"

"بڑا عجیب لگے گا انہیں یہ سب۔" میں نے جواب روانہ کیا۔

"محبت بھی کرتے ہو اور ان باتوں کی بھی پروا کرتے ہو؟ بڑی مشکل سے میں نے یہ راہ نکالی ہے۔ بابا جانی کو ایک فون پر مصروف کیا ہے، میری پھوپی ہیں، میرے ہی کہنے پر انہوں نے بابا کو فون کیا ہے اور جب تک میں انہیں اشارہ نہیں دوں گی وہ ان سے باتیں کرتی رہیں گی۔ تمہیں بھی اپنے چچا کو اس راز میں شامل کرنا پڑے گا۔" اس کے آنے والے اس جواب پہ میں نے اپنا سر پکڑ لیا، تو گویا وہ اپنی پھوپی کو بھی اس "کارِ خیر" میں شامل کرچکی تھی۔

"اگر کسی اور نے دیکھ لیا تو؟"

"کوئی نہیں ہے میرے اور بابا جانی کے علاوہ اس وقت گھر میں، ملازمہ مصروف ہے اب اگر مگر چھوڑو اور جلدی آجاؤ۔"

میرے دل نے جوش مارا۔ جہاں فوزیہ سے ایک ذرا تنہائی میں ملنے کے تصور نے مجھے شاد کر رکھا تھا وہیں دنیاداری بھی آڑے آرہی تھی۔ لیکن پھر وہی ہوا جو ہوتا آیا ہے، یعنی دماغ پر دل کی فتح۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا، میری وارفتانہ نظریں اسی کمرے کے دروازے پر جمی ہوئی تھیں، جہاں وہ بھی بے تابانہ انداز میں چھپی ہوئی موجود تھی۔ مجھے آتے دیکھ کر پردہ اپنی جگہ پر آگیا، میں نے تصور کی آنکھ میں اپنے عقب میں صوفے پر بیٹھے ہوئے چاچا انور شاہ کو حیرت سے آنکھیں اور منہ پھاڑے اپنی طرف گھورتے ہوئے بھی محسوس کیا اور میرے دروازے تک پہنچنے پر شاید پیچھے سے انہوں نے مجھے ہولے سے پکارا بھی تھا مگر میں تو جیسے ایک زیرِ عمل تنویم تلے آگے ہی بڑھتا جارہا تھا، مجھے پتا بھی نہ تھا کہ میرے قدم کیوں کیسے کشاں کشاں اس کمرے کی طرف اٹھتے چلے جارہے تھے۔ جس کے پیچھے کوئی بے چینی سے میری آمد کا منتظر تھا۔ محبت کیا ہوتی ہے؟ کیوں بے خطر و دیوانہ وار آتشِ نمرود میں کود پڑنے پر مجبور کرتی ہے، اس کا اندازہ مجھے آج ہو چلا تھا۔ کوئی غیر مرئی ڈور تھی یا ریشم کی لہر جس کے سہارے میں پھسلا اور کھنچا چلا جاتا تھا اور جب میں پردہ ہٹا کر اندر کمرے میں داخل ہوا تو۔ میں ٹھٹک گیا۔ کمرا خالی تھا۔ ایک سیور روشن تھا۔ ابھی میں حیرت آمیز پریشانی میں ہی ہچکولے لے رہا تھا کہ اچانک کہیں قریب سے آواز آئی۔

"سنیئے! اس طرف آجائیے۔" میں نے بت بنے انداز میں کھڑے کھڑے آواز کی سمت اپنی گردن گھمائی اور دیکھا ایک کونے میں اسٹور نما سا ایک اور چھوٹا کمرا تھا۔ وہ وہیں موجود تھی، وہیل چیئر پر بیٹھی تھی۔ وہاں کوئی پردہ نہیں جھول رہا تھا۔

میں اسی طرف بڑھ گیا۔ وہاں نیم تاریکی سی تھی، شاید زیرو پاور کا بلب تو ضرور روشن تھا۔ میں دھڑکتے دل سے اسی کی طرف بڑھ رہا تھا اور اسی دوران مجھے کسی دوسرے کمرے سے عطا محمد کی بھی باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں، وہ فون پر ہی محوِ گفتگو تھا۔ میں تھوڑا ڈرا مگر فوزیہ کے دیدار نے مجھے پھر دلیر بنا دیا وہ مجھ سے صرف چند قدموں کے فاصلے پر تھی۔ میں اس کے قریب جا پہنچا۔ وہ ہلکے گلابی رنگ کے لباس میں ملفوف تھی، جس پر گلاب کے پھولوں کی پتیاں بنی ہوئی تھیں اور وہ خود جیسے ان کے بیچ ایک دہکتے، کھلتے گلاب ہی کی طرح نظر آرہی تھی، اس نے لمبے گھنے ریشم بال بڑے سلیقے سے کلپ کرکے پشت پر چھوڑ رکھے تھے۔ اس کی آنکھوں میں ایک گل نشیں سی نگاہ کو میں نے کسی ان کہی تڑپ کی تپش سے مخمور محسوس کیا تھا میں نے، اس کے دلآویز لبوں پر رحریہ مسکان کسی شوخ سی سرکشی کا پتا دیتی معلوم ہو رہی تھی۔ تب پھر اسی مسکان نے لفظوں کا جامہ زیب تن کچھ اس طرح سے کیا کہ وہ یادرہ جانے والا استعارہ بن گیا۔ بہت دھیرے سے۔ بہت کج کے ساتھ اور بڑے خفتہ جذبات کی ترجمانی کرتے اس کے نرم لبوں سے یہ برآمد ہوا۔

"کک۔ کیا واقعی۔ اتنے بڑے عیب کے باوجود آپ دوبارہ مجھ سے ملنا اور مجھے دیکھنا چاہتے تھے؟"

یہی تو وہ استعارہ تھا جو مجھے ہی نہیں اسے بھی یاد رہ گیا تھا۔ ہاں۔ مجھی یہاں آنے سے تھوڑی دیر پہلے ہی تو ہماری

سیل فون پر بات ہوئی تھی اور میں نے اس سے ایک ملاقات کرنے اور اسے دوبارہ جی بھر کے دیکھنے کی اپنی سی خواہش کا اظہار کیا تھا اور اس نے مجھ سے یہ کہا تھا۔

''کیا واقعی۔ اتنے بڑے عیب کے باوجود آپ دوبارہ مجھ سے ملنا اور مجھے دیکھنا چاہتے ہیں؟'' اور میں نے جب اس کے جواب میں بڑی شوریدہ سری کے ساتھ یہ کہا تھا۔

''اس کا جواب میں آپ سے ملنے پر ہی ٹھیک طرح سے دے سکتا ہوں۔''

اور میرا خیال تھا کہ وہ میری بات کی تہہ میں چھپی معنی خیزیت کو نہیں بھانپ سکے گی، مگر وہ بہت زیرک اور زود فہم ثابت ہوئی تھی، کیوں کہ دوسری طرف سے مجھے اس کی ایک سسکاری سے مشابہ سانس کھینچنے کی آواز سنائی دی تھی۔ وہ کچھ بے اختیاری میں کچھ کہہ ڈالنا چاہتی تھی مگر ایک فطری شرم اس کے آڑے آنے لگی تھی، مگر اب اس نے دوبارہ وہ بات میرے سامنے کیوں دوہرائی تھی اس کا مطلب جاننے کی ضرورت نہیں رہی تھی، اور میں نے اپنے محفوظ رکھے اس جواب کا عملی مظاہرہ کرنے کا اسے کہا تھا، جسے محسوس کر کے وہ بھی بے خودی ہو گئی تھی اور پھر وہی ہوا۔ ہر گزرتے پل بے اختیاری کی لپیٹ میں آ گئے اور میں چند قدم اس کی وہیل چیئر کے قریب بڑھ آیا، اس کی نگاہیں میرے چہرے پر جم سی گئی تھیں اور تب ہی میں وارفتہ انداز میں اس پر جھک گیا تھا اور اس نے بھی اپنی مرمریں بانہوں کا حصار میرے گلے کے گرد پہنا دیا۔ وہ چند پل میری زندگی کا سرمایہ کہلائے۔ وہ وقت جیسے رک گیا تھا۔ سب کچھ تھم گیا تھا، بس دو دل تھے جو یک جاں ہو کر دھڑک رہے تھے اور پھر میں اس سے الگ ہو گیا۔

آہ..... ان نرم و گداز ہونٹوں کا کیا لمس تھا، جیسے معصوم چاہت کا نرم گداز، جیسے گلاب کی پتیوں کا مخملی پیرہن، جس کی پاکیزگی کو ایک امانت سمجھ کر مجھے سونپ دی گئی ہو۔ اس قسم کے ساتھ کہ اب بیچ کوئی دوری نہ رہی۔

''میں یہ حسین ساعتیں کبھی نہیں بھولوں گی نعمان!''

وہ جیسے ایک خواب آگیں لہجے میں بولی تو میں بھی گویا اک عالم بے خودی میں بولا۔

''میرے لیے یہ دنیا جہاں کے خزانے سے بھی زیادہ اہم اور سرور انگیز تھا۔ فوزیہ!''

''تم۔ مجھے بھول گئے تو نہیں۔ نعمان؟''

''تم مجھے چھوڑ دو گی تو نہیں فوزیہ؟''

پھر ہم دونوں ہی ہولے سے ہنس دیے۔ میں نے اس کا نرم و گداز ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور اسے دھیرے دھیرے پیار سے مسلتے ہوئے بولا۔

''فوزیہ! مجھے ان حسین ساعتوں کی معصوم دھڑکنوں کی قسم ہے، میں اس کا مان رکھوں گا۔ اور تمہیں کبھی نہیں بھولوں گا نہ چھوڑوں گا۔ یہ حقیقت ہے کہ میں اس مزاج کا آدمی نہ تھا۔ میری روز مرہ کی زندگی اور عمومی حیثیت میں بہت سی لڑکیاں آئیں، مگر اس دل کی دھڑکنوں نے صرف ایک ہی نام آج پکارا ہے اور وہ ہے۔ فوزیہ۔ صرف فوزیہ! اور کوئی نہیں۔''

فوزیہ کی گھنیری پلکیں یکلخت بھیگ گئیں، میں پریشان ہو گیا، تڑپ کر پوچھا۔

''یہ آنسو کیسے فوزیہ؟''

وہ اپنی بھادوں جیسی برساتی پلکوں کی جھالروں کو اٹھا کر مخموری ادا سے سر اٹھا کے میری طرف دیکھنے لگی تو۔ جیسے سچے گہرے سمندروں میں پیاس سہتی ہوئی سیپ سے سچے موتی صبر و استقامت کا امتحان کامیابی سے دینے کے بعد بطور انعام عطا ہو کر اس کے مرمریں نرم و نازک گالوں پر ڈھلکنے لگے ہوں۔ پھر اس کے مہین سے لبوں میں ارتعاش سا ابھرا اور وہ اسی لہجے میں بولی۔

''سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اپنے ان آنسوؤں کو کیا نام دوں؟ خوشی کے آنسو کہوں کہ میں کتنی خوش قسمت ہوں کہ مجھے آپ جیسا بے لوث چاہنے والا ساتھی ملا، یا پھر......''

اتنا کہہ کر وہ رکی اور سر جھکا کر وہیل چیئر پر دھری اپنی ٹانگوں کو حسرت و یاس سے ایک نگاہ تکتے ہوئے دوبارہ لرزتے لہجے میں آگے بولی۔

''یا پھر۔ ان آنسوؤں کو اپنی معذور زندگی کے ان غمناک لمحوں کا نام دوں جس میں احساس محرومی کے علاوہ اب یہ خیال بھی کسی عذاب سے کم نہیں کہ میری زندگی تمہارے لیے آنے والے وقتوں میں کیا ایک بوجھ ثابت نہ ہو گی؟ میں جب تمہاری بے لوث چاہت پر فخر کروں گی تو ضمیر کی ایک کسک، ایک چبھن، کیا مجھے خود غرضی کے کچوکے نہیں لگائے گی کہ میں نے اپنے ساتھ تمہاری زندگی بھی ایک بوجھ بنا دی۔''

''بس!'' میں نے اپنا ایک ہاتھ اٹھا کر ہولے سے کہا۔ اور پھر محبت سے اس کا گل گلنار چہرہ اپنے دونوں

ہاتھوں کے پیالے میں لے لیا۔ وہ سر اٹھا کر مجھے اپنی اشکبار آنکھوں سے تکنے لگی۔ ایسے میں بہتے آنسو اس کے نرم و گداز سرخ و سپید گالوں سے موتیوں کی طرح لڑھکنے لگے۔ بے اختیار ایک بار پھر میں نے اپنے ہونٹوں کا بوسہ دے کر آنسوؤں پر جیسے بند باندھ دیا۔ وہ میری مونچھوں میں الجھ کر رک گئے۔

میں اسی طرح اس کی وہیل چیئر پر۔ اس کے حسین و دلکش چہرے پر جھکے جھکے محبت پاش مگر مستحکم لہجے میں بولا۔

"تم مجھ پر کبھی بوجھ نہیں بن سکتیں فوزیہ! اگر تم مجھے نہ ملیں تو تمہاری جدائی میرے لیے ایک جاں گسل بوجھ ضرور بن جائے گی۔ محبت صرف محبت ہوتی ہے۔ اور مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔ کیا تمہارے لیے اتنا کافی نہیں؟ اب آگے کچھ مت سوچنا سوائے میرے۔ میں چلتا ہوں۔ دیر ہو رہی ہے، فون پر باتیں ہوتی رہیں گی۔"

اس بار میں نے اس کی سرخ دہکتی پیشانی پر آخری بوسہ دیا اور پلٹ گیا۔

کمرے میں آ کر میں اپنے صوفے پر آ کر براجمان ہو گیا۔ میرے قریب بیٹھے چاچا انور شاہ حیران و پریشان نظروں سے مجھے تکتے جا رہے تھے۔ جبکہ میرے چہرے پر جذبات کی تمتماہٹ اپنے جوبن پر تھی، شاید اسی کو محسوس کرتے ہوئے سر دست انہوں نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا تھا لیکن حقیقت یہ بھی تھی کہ وہ یہ سب دیکھ کر گم صم سے ہو گئے تھے۔

کھانے کے بعد ہم عطا محمد کے گھر سے روانہ ہو گئے۔

"یہ۔ یہ کیا حرکت تھی بھائی بھتیجے؟" راستے میں انہوں نے مجھ سے پوچھ ہی لیا۔ تو میں نے بائیک کے ہینڈل پر گرفت مضبوط رکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"چاچا! ابھی مجھ سے کچھ نہ پوچھیں۔ لیکن میرا وعدہ ہے کہ میں آپ سے کچھ چھپاؤں گا بھی نہیں۔" وہ سمجھدار تھے میری بات پر مزید نہ بولے۔

میں نے پہلے انہیں ان کے گھر پر اتارا اس کے بعد اپنے گھر کی راہ لی۔

رات کے دس بج چکے تھے۔ گھر جاتے ہوئے مجھے یاد آیا کہ خورشید خاں (منے میاں) نے اپنے بیٹے اختر کو میرے پاس لے کر آنا تھا۔

میں گھر پہنچا تو فہیم نے ہی مجھے بتایا کہ خورشید خاں آیا تھا اور ان کے ہمراہ ان کا بیٹا اختر بھی تھا۔

"اوہو۔ میں نے ہی انہیں آنے کا کہہ رکھا تھا۔ خود مجھے بھی دیر ہو گئی تھی" میں خود کلامیہ بڑبڑایا اور پوچھا۔ "کچھ کہا تھا انہوں نے؟"

"یہی کہ ہم پھر تھوڑی دیر بعد آ جاتے ہیں۔" فہیم نے جواب دیا۔

"بھائی جان! کھانا لگا دوں؟" معاً عاصمہ نے آ کر پوچھا۔

"نہیں بہنا! میں نے آج باہر کھا لیا تھا۔" ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ کال بیل بجی۔

"لگتا ہے دونوں باپ بیٹا آ گئے ہیں۔" فہیم نے کہا تو میں نے اسے ان دونوں کو بیٹھک میں بٹھانے کا کہا اور خود ذرا فریش ہونے کے لیے واش روم چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد میں بیٹھک میں تھا۔ دونوں باپ بیٹا میرے سامنے کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ چہرے دونوں ہی کے اترے اترے سے نظر آ رہے تھے، البتہ اختر کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ جیسے وہ زبردستی یہاں لایا گیا ہو۔ وہ فہیم کی عمر کا نوجوان تھا، دبلا اور درمیانے قد کا۔

"نعمان صاحب! میں اسے لے آیا ہوں۔ اب آپ اس سے جو پوچھنا چاہتے ہیں پوچھ لیجیے۔" خورشید خاں نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"سب سے پہلے تو میں آپ دونوں سے معذرت چاہوں گا کہ آپ کو دوبارہ آنے کی زحمت اٹھانی پڑی۔ مجھے ایک کام کے سلسلے میں دیر ہو گئی تھی۔ ورنہ تو میں عام طور پر چھ، سات بجے تک آ جاتا ہوں۔" میں نے اخلاقاً کہا تو خورشید خاں بولا۔

"کوئی بات نہیں جناب! کام دھندے میں تو دیر سویر ہو جاتی ہے۔ اب میں اسے لے آیا ہوں۔ آپ نے اس سے جو پوچھنا ہے پوچھ لیں۔"

میں نے ایک نگاہ اس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھے اختر کی طرف دیکھا پھر خورشید خاں سے مخاطب ہو کر بولا۔

"دراصل میں اس سے تنہائی میں ہی بات کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کے لیے چائے وغیرہ کا بندوبست کرتا ہوں۔" کہتے ہوئے میں اٹھنے لگا تو وہ میرا اشارہ سمجھتے ہوئے اور مجھے ہاتھ کے اشارے سے روک کر خود ہی اپنی کرسی چھوڑتے ہوئے بولا۔

"نہیں۔ نہیں چائے وغیرہ کی کوئی ضرورت

نہیں۔ میں چلتا ہوں۔ آپ اس سے جو پوچھنا چاہتے ہیں پوچھ لیں۔" وہ خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔ اب بیٹھک میں ہم دونوں رہ گئے۔ میں نے ہولے سے کھنکھار کر اختر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھو بھائی! یہ محلہ بھی ایک خاندان کی طرح ہے اور ہم سب اس کے فرد ہیں۔ اسی طرح ہمارے دکھ سکھ بھی سانجھے ہیں۔ اور یہاں رہنے والی عزت مآب ماؤں، بیٹیوں اور بہنوں کی عزت کو بھی ہم اپنی عزت سمجھتے ہیں۔ اللہ تم لوگوں کی مشکل آسان کرے۔ لہٰذا تمہارے مسئلے کے بارے میں بات شروع کرنے سے پہلے میں تم سے اخلاقی طور پر یہ پوچھنا ضروری سمجھوں گا کہ کیا تم اس نازک مسئلے پر مجھ سے گفتگو کرنے کے لیے پوری طرح مطمئن ہو؟" میں نے دیکھا، میری بات پر جو تھوڑی دیر پہلے اس کے چہرے پہ چھائی ہوئی اکتاہٹ اور بیزاری کی جو گرد تھی وہ چھٹنے لگی تھی۔ بولا۔

"نعمان بھائی! سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے؟ ایسے مسئلے بذات خود ایک ایسا پرابلم ہوتے ہیں کہ ان پر بات کرنا بھی عجیب سا ہی لگتا ہے۔ لیکن بہرحال میں آپ کے نیک جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ آپ مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتے تھے؟"

اس کا اعتماد بحال ہوتے ہی میں نے ہولے سے کھنکھار کر کہا۔

"تمہاری بات بالکل ٹھیک ہے، اسی لیے ہم نے سر دست یہ متفقہ طور پر فیصلہ کیا تھا کہ پہلے ہم اپنے طور پر کچھ حقائق کا اندازہ کر لیں تاکہ اصل بات کا پتا چل جائے ورنہ تو تم جانتے ہی ہو کہ ایسے حساس اور نازک معاملات کو حل کرنے کی بجائے تھانے کچہریوں میں کس طرح اچھالا جاتا ہے۔ خیر!" میں ذرا تھما پھر اس کے ستے ہوئے چہرے پہ نظریں مرکوز کرتے ہوئے آگے بولا۔

"تمہارے والد سے مجھے یہ پتا چلا تھا کہ تم نے نہ صرف اس لڑکے کو دیکھ رکھا ہے، بلکہ اس کا نام بھی جانتے ہو؟ کیا یہ واقعی درست ہے؟"

"جی ہاں!" اس نے ہولے سے سر جھکا کر کہا۔ ایک غیرت مند بھائی سے اس کی بہن کے متعلق اس طرح سوالات کرنا بھی اس کے لیے ہی نہیں بلکہ خود میرے لیے بھی خجالت کا سبب تھا لیکن مجبوری تھی اسی لیے میں اس سلسلے میں محتاط الفاظ کا انتخاب کرتے ہوئے اس سے سوالات کر رہا تھا۔ آگے بولا۔

"کیا نام تھا اس کا؟"

"عزیر خاں!"

"ناک نقشہ کیسا تھا اس کا؟ نیز اس کی عمر کا تمہیں کیا اندازہ ہوتا تھا؟"

"وہ تقریباً میری ہی عمر کا تھا۔ رنگ سانولا مگر وجیہہ تھا۔ قد آپ کے جتنا ہی دراز لیکن ذرا صحت مند تھا۔" کہتے ہوئے اس نے مجھے اس کا تفصیلی ناک نقشہ بتا دیا جو میں نے اچھی طرح ذہن نشین کر لیا۔

"اچھا یہ بتاؤ تم نے اسے کتنی بار اور کہاں کہاں دیکھا تھا؟ وہ پیدل ہوتا تھا یا کسی گاڑی میں؟"

"وہ ایک کار میں ہوتا تھا، سیاہ رنگ کی کیلکس تھی۔"

"کار کا نمبر؟"

"نہیں معلوم۔"

"بہن ثوبیہ کالج جاتی تھیں؟"

"یونیورسٹی جاتی تھی۔" اس نے جواب دیا اور میں نے اس سے متعلق مزید تفصیلات پوچھنے کے بعد بغور اس کے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کرتے ہوئے کہا۔

"جب تم نے یہ سب دیکھ لیا تھا تو پھر اپنی بہن کو سرزنش ہی کر دیتے۔ یا پھر کم از کم تمہیں اپنے والدین کو بتا دینا چاہیے تھا۔ پتا تو چلتا کہ آخر معاملہ کیا تھا؟"

وہ تھوڑا جھجکتے ہوئے بولا۔

"شاید یہی میری بڑی غلطی تھی۔ میں نے بتایا تو تھا مگر لڑائی جھگڑے کے انداز میں۔ اس وقت کسی نے میری بات پر دھیان نہیں دیا تھا، مگر ثوبیہ بہن ضرور کھٹک گئی تھی۔"

"وہ لڑکا کبھی رشتے وغیرہ کی بات کرنے آیا تھا؟ میرا مطلب ہے، ثوبیہ بہن کے کھٹک جانے کے بعد تو......"

"کبھی نہیں۔ بلکہ اس کے چند ہی روز بعد یہ سانحہ پیش آ گیا تھا۔" اس نے جواب دیا۔ میں نے اس کا سیل نمبر نوٹ کر لیا اور اسے گھر بھیج دیا۔

☆......☆

اگلے دن میں علی الصباح جاگا اور سیدھا یونیورسٹی کا رخ کیا۔ جس فیکلٹی میں ثوبیہ اور عزیر خاں ہوتے تھے وہاں جا کر میں نے ایڈمنسٹریشن بلاک کے ایک کلرک کو "چائے پانی" تھما کر عزیر خاں کا سارا بائیوڈیٹا تصویر سمیت حاصل کر لیا اور یہ جان کر مجھ پر ایک چونکا دینے والا انکشاف ہوا کہ عزیر خاں، حاجی عمران خان کا اکلوتا لاڈلا بیٹا تھا۔ اس

مینا کماری کو بھارتی فلمی صنعت کی تاریخ میں ایک لیجنڈ اداکارہ کے طور پر ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ چار سال کی عمر سے انہوں نے چائلڈ اسٹار کے طور پر اداکاری کی ابتداء کی۔ ''الزام'' بطور ہیروئن ان کی پہلی فلم تھی جس کے ہیرو کشور کمار تھے۔ ان کی ہر نئی فلم ان کی اداکاری کے معیار کو اور بڑھا دیتی تھی۔ جلد ہی ان کی فنی صلاحیتوں سے پوری فلم انڈسٹری واقف ہو چکی تھی۔ بڑے سے بڑا اداکار ان کے ساتھ کام کرنے کا خواہش مند تھا۔ اپنے وقت کے سپر اسٹار دلیپ کمار نے بھی مینا کماری کے ساتھ فٹ پاتھ، کوہ نور، آزاد اور یہودی میں اداکاری کر کے اپنی دلی مسرت کا اظہار کیا اور مینا کماری کی فنی صلاحیتوں کا خراج تحسین عطا کیا۔ بندش، شاردا، دل اپنا پریت پرائی، دل ایک مندر اور پاکیزہ مینا کماری کی ایسی فلمیں ہیں جن میں وہ فن کی بلندیوں پر نظر آتی ہیں۔

بالی ووڈ کی اتنی عظیم اداکارہ ہونے کے باوجود وہ ایک ناکام اور نامراد خاتون تھیں۔ ان کی شہرت اور دولت سے دوسروں نے فائدہ اٹھایا۔ شادی سے پہلے گھر والوں نے اور شادی کے بعد شوہر نے۔ ان کی شادی رائٹر، ڈائریکٹر فلمساز اور اسٹوڈیو آنر کمال امروہوی سے ہوئی تھی جنہوں نے ایسی بیوی کی قدر نہیں کی۔ حساس طبیعت کی مالک اداکارہ کو زندگی بھر اس بات کا قلق رہا کہ انہیں کسی نے اس پیار کا مستحق نہیں سمجھا جس کی وہ حقدار تھیں۔ ایک بیٹی، ایک بہن اور ایک بیوی کی حیثیت سے وہ جس محبت کی حق دار تھیں وہ حق کسی نے ادا نہیں کیا۔ سب نے انہیں اپنے مفاد کے لیے استعمال کیا۔ ان کی حساس طبیعت نے انہیں شاعرہ بنا دیا تھا۔ وہ اندر کا دکھ اپنے اشعار کی صورت میں ظاہر کرتی تھیں۔ ان کی شاعری کا مجموعہ ''تنہا چاند'' کے نام سے چھپا جس سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو تنہا ہی محسوس کیا۔

مرسلہ: عائشہ انور۔ کراچی

کا جو ایڈریس تھا وہ بھی اسی ملیر کے مذکورہ گوٹھ کا تھا جہاں میں ایک دو بار جا بھی چکا تھا اور وہاں میرے کالج کے ایک گہرے دوست سائیں داد سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ جس نے مجھے وڈیرے حاجی مہران خان سے متعلق اپنی ذاتی اور عبرت ناک کہانی بھی سنائی تھی اور میں نے اس کی مدد کرنے کا وعدہ کیا تھا اور اب تو یہ اور بھی ضروری ہو گیا تھا کہ ہم دونوں ہی اب راہ الفت کے ہم رکاب ساتھی بن گئے تھے، فرق اتنا تھا کہ وہ اپنی محبت ''ہار'' گیا تھا بلکہ اس کی محبت زور زبردستی اور دولت کے ہتھیار سے چھین لی گئی تھی اور میری محبت کا سفر ابھی شروع ہوا تھا۔

حاجی مہران وہی تھا جس کے بارے میں مجھے پختہ یقین تھا کہ وہ لینڈ مافیائی چیف بلڈر سیٹھ ستار کی سپورٹ کر رہا تھا۔ بلکہ یہ دونوں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تھے۔

اسی وقت مجھے خیال آیا کہ مجھے اپنے بے جگر یار شیراز عرف کالیا سے بات کرنی چاہیے۔ درحقیقت میں اس سے ایک تو خاور کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا، کیوں کہ ایک وہی شخص تھا جو بڑے منشی دادن خان کے قتل کے بارے میں خفتہ و نا خفتہ حقائق سے ہمیں آگاہ کر سکتا تھا۔ نیز اس کے علاوہ میں نے کالیا۔ بلڈر سیٹھ ستار کی وائف گلشن بیگم کی اس کار کے بارے میں بھی پوچھنا تھا، جس میں چند دن قبل مجھ پر رات کے وقت شاہراہ فیصل پر حملہ کیا گیا تھا۔ شیراز کالیا اور اس کے دوستوں کی اتفاقاً وہاں آمد نے بازی پلٹ دی تھی اور میرے دشمنوں کو لینے کے دینے پڑ گئے تھے۔ ٹھیک ٹھاک مار اماری بھی ہوئی تھی۔ اور بعد میں کالیا نے ہی اس کار کا پتا چلایا تو معلوم ہوا تھا کہ یہ کار کس کی تھی۔ مگر مصلحتاً ابھی ہم نے پولیس میں اس کی رپورٹ نہیں کروائی تھی اور اپنے طور پر حقائق اکٹھے کر کے ایک ہی بار دشمن پر کاری ضرب لگانے کا ارادہ رکھے ہوئے تھے۔

میری جنگ عام مجرموں سے نہیں تھی، دوسری حقیقت یہ کہ میرے دشمن ''مجرم'' بھی نہیں تھے۔ ہاں! ان کا شمار ''شرفاء'' میں ہوتا تھا۔ ایسے ہی لوگ پیشہ ور مجرموں سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ میری ایسے ہی لوگوں سے جنگ تھی۔ اور اب تو مجھے یہ سب ایک ہی چین میں پروئے ہوئے لگتے تھے۔

بہر کیف۔ یونیورسٹی سے نکل کر میں سڑک کے کنارے پر آ گیا اور بائیک پر بیٹھے بیٹھے ہی شیراز عرف کالیا کا نمبر ملایا۔ جو فوراً مل گیا۔ وہ میرا نمبر پہچانتے ہی اپنے

مخصوص لہجے میں بولا۔
''ابے لے۔ جگری! خیریت تو ہے ناں؟ میں تو تجھے فون کرنے لگا تھا۔ بڑی عمر ہے تیری۔ بول۔ کیسا ہے تو؟''
میں اس کی بات سن کر تھوڑا چونکا اور اپنی بات شروع کرنے سے پہلے اس سے پوچھا کہ وہ مجھے کیوں فون کرنے لگا تھا۔
''بات خاص ہے تو اس وقت ہے کہاں؟'' وہ بولا۔
''میں یونیورسٹی روڈ پر ہوں۔''
''ابے لے۔ میں بھی پھر دور نہیں۔ ایک کام کر سواری ہے ناں تیرے پاس؟''
''ہاں! بائیک ہے۔''
''بس پھر یہی روڈ لیتا ہوا سیدھا چلا آ۔ موسمیات کا سگنل کراس کر کے صفورا چورنگی کی طرف آجا۔ وہاں پہنچ کر مجھے مطلع کرنا۔ میں وہیں کھڑا تیرا انتظار کر رہا ہوں۔''
وہ بولا۔ ''ابے۔ اپنا آدمی ہے یہ۔ تیری کیوں گیلی ہو رہی ہے۔'' پس منظر میں مجھے اس کی آواز سنائی دی۔ وہ شاید اپنے کسی آدمی سے کہہ رہا تھا۔ جو غالباً میرے وہاں آنے پر کالیا سے معترض ہوا ہوگا۔ میں سمجھ گیا، وہ کسی ایسی ویسی جگہ پر تھا۔
بہر طور۔ میں نے اسے اثبات میں جواب دے کر رابطہ منقطع کر دیا اور بائیک اسٹارٹ کر کے آگے روانہ ہو گیا۔
صفورا چورنگی کو درحقیقت صفورا گوٹھ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ جو یہاں سے بمشکل تین چار کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ میں الجھا ہوا تھا کہ آخر کالیا نے مجھے وہاں کیوں بلایا تھا؟ اس کے پُرجوش سے لہجے سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ میں دس منٹ میں وہاں پہنچ گیا۔ وہاں پہنچتے ہی میری نگاہ کالیا پر پڑ گئی تھی وہ تیزی سے ہاتھ ملانے کے بعد بائیک پر بیٹھ گیا تھا۔ اور مجھے ایک طرف بائیک بڑھانے کا اشارہ کیا۔
کرن اسپتال کی طرف جانے والی روڈ کے دائیں جانب وہ مجھے ایک سو بیس گز والے مکان میں لے آیا۔ وہاں گیٹ کے باہر ہی ایک پرانے ماڈل کی خیبر کار کھڑی تھی۔ اندر دو نوجوان موجود تھے۔ ان میں سے ایک کو تو میں پہچان گیا تھا یہ تارا تھا، جو تھانے اس سے ملنے اور اس کی ضمانت کے لیے آیا تھا، دونوں ہی کالیا کے قبیل کے دکھائی دیتے تھے۔ وہ بھی ہمارے ساتھ ایک کمرے میں آگئے۔

یہ ایک ایسا کمرا تھا، جو ہر قسم کے فرنیچر سے عاری تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میں بری طرح چونکا تھا۔
ننگے فرش پر میں نے جس شخص کو ننگے پڑے دیکھا وہ خاور تھا۔ یہ وہی خاور تھا۔ جو اس بدخصلت انسپکٹر راجا دلاور کے ایماء پر مجھے تھانے سے کالیا کے ساتھی کے دھوکے میں لے کر شیریں جناح کالونی کے اس وحشت انگیز گھر میں بند کر کے بھاگ گیا تھا۔ جدھر، بڑے منشی کو کسی بیدردی سے قتل کر کے اور اس کا قتل میرے سر تھوپنے کی کوشش کی گئی تھی۔ لیکن بعد میں کالیا کو اس کا حلیہ بتانے پر اسی نے ہی اسے پکڑ کر ایف سی ایم کے سامنے پیش کیا تھا اور یوں انسپکٹر دلاور کو بھی مجھ پر بے جا تشدد کرنے اور اپنی زبردستی اپنے خودساختہ بیان پر میرے دستخط کرنے پر لائن حاضر کر دیا گیا تھا۔ بعد میں مزید تفتیش کے لیے خاور کو پولیس کی تفتیش میں دے دیا گیا تھا۔
''کک ی۔ یہ۔ یہاں کیسے؟'' میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ کر کالیا سے پوچھا۔ خاور کی حالت ناگفتہ بہ ہو رہی تھی۔ کالیا نے اس کا یہاں جو حشر کر رکھا تھا اس کا تصور کسی تھانے کے عقوبت خانے سے کم نہ تھا۔ اس کے جسم پر کپڑے نام کو نہیں تھے۔ پانی کی بالٹی، کیل کھینچنے والی جمبوری، آہنی شکنجہ اور اسی سے متعلق اور بھی اوزار وہاں پھیلے نظر آ رہے تھے، اور خاور کی قابل رحم ہیئت کذائی سے صاف لگتا تھا کہ یہ سارے آلات تشدد اس پر تھوڑی دیر پہلے ہی آزمائے جا چکے تھے۔
''کیا کہتا ہے جگری!'' کالیا نے بڑے فخر سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی کیپسٹن کا پیکٹ نکال کر اس میں سے ایک سگریٹ منتخب کر کے بھارتی ایکٹر رجنی کانت کی طرح چٹکی بجا کر اسے فضاء میں اچھال کر اپنے ہونٹوں پہ داب لیا۔ اس کی اپنی وضع قطع بھی رجنی کانت جیسی ہی تھی۔
''مگر یہ یہاں کیسے آگیا اور کیوں؟ یہ تو پولیس کی تحویل میں تھا؟'' میں نے قدرے پریشان ہو کر کہا۔ کالیا نے سگریٹ کو لائیٹر دکھایا اور میری ایک نظر یہی سے فرش پر نڈھال پڑے خاور پر ڈالنے کے بعد مجھ سے بولا۔
''بےغم ہو جا جگری۔ یہ اب بھی پولیس کی تحویل میں ہی ہے۔ بس ذرا اس کے منہ سے حقائق اگلوانے کے لیے اسے یہاں لایا گیا تھا۔'' وہ مجھے پریشان سا ہوتے دیکھ کر بولا تو میں اس کی بات کا اشارہ سمجھ کر حلق سے ایک گہری

ہمکاری خارج کر کے رہ گیا۔

"کیا اگلا ہے اس نے؟" میری بات پر کالیا نے اپنے ہونٹوں سے دھواں اگلا اور بولا۔ "بہت کچھ۔ سنے گا تو ہل کر رہ جائے گا۔" پھر وہ اپنے دونوں ساتھیوں میں سے ایک کو مخاطب کر کے بولا۔ "جاؤ جمی! دو کرسیاں اٹھالا۔"

جمی دو کرسیاں لے آیا۔ جس پر میں اور کالیا براجمان ہو گئے۔ کالیا نے ایک فحش سی گالی خاور کو دیتے ہوئے مجھے بتایا۔

"یہ ہمارے مخالف گروہ یعنی استاد لاڈلہ سائیں کا آدمی ہے جو اسی بلڈر سیٹھ ستار کا آجکل ٹاؤٹ بنا ہوا ہے۔ اپنی تو اس کی دال ہمارے استاد بھا بھانے گلنے نہیں دی اب عورتوں کی طرح منہ دبا کر بلڈر سیٹھ ستار کے پردوں میں جا چھپا۔ اسی کے کہنے پر اس نے تمہارے اڈے کے آدمی فتشی دادن خان کا خون کر کے اس کی لاش شیریں جناح کے اس گھر میں پھنکوادی تھی اور تمہیں رنگے ہاتھوں پولیس کے ہاتھوں پکڑوانے کے لیے لاڈلہ سائیں کے اس کتے خاور کو استعمال کیا گیا اور اس ساری سازش میں وہ ایس ایچ او۔ راجا دلاور بھی پیش پیش تھا۔"

"ہوں ں ں......" میں نے ایک پر غور ہمکاری خارج کی۔ یہ انکشاف میرے ہوش لرزا دینے والے تھے۔ بلڈر سیٹھ ستار کے ہاتھ کتنے دراز تھے، مجھے اس کا بہ خوبی ادراک ہونے لگا تھا اور یہی وجہ تھی کہ اس سازش کے بے نقاب ہوتے ہی میرے وجود میں سنسنی کی لہر سی سرایت کر گئی تھی۔ کالیا بھی بڑی گہری نظر رکھتا تھا، میرے چہرے سے میری کیفیت دروں بھانپ کر میرے کاندھے پر دوستانہ انداز میں ہاتھ رکھ کے بولا۔

"بے غم رہ بے جگری۔! اگر تیرے دشمن اتنے طاقت ور ہیں تو تیرا یہ بے جگر یار بھی کم نہیں۔" میں نے اس کی بات کو صرف نظر کرتے ہوئے کہا۔

"یار! اس کا یہ بیان سود مند تو تب ہی ثابت ہو سکتا ہے، جب یہ عدالت میں بھی یہی بیان دے۔"

"یہ ایسا کبھی نہیں کرے گا۔" کالیا نے کہا۔ "لیکن ہمیں یہ یقین کافی ہے کہ اس نے ہمارے سامنے سب اگل دیا۔ تاکہ ہم بھی زہر کو زہر سے کاٹ سکیں۔"

میں اس کی بات کا مطلب سمجھ کر بولا۔ "نہیں یار! قانون بھی کوئی شے ہے۔ ٹھیک ہے کچھ کالی بھیڑوں کی وجہ سے معاملات خراب ہو جاتے ہیں، لیکن اب بھی اس محکمے میں ایماندار افسروں کی کمی نہیں ہے۔ تم ایسا کرو، اسے کپڑے پہناؤ اور انسانوں کے حلیے میں لاؤ۔ میں خود اس سے بات کرتا ہوں۔" کالیا مجھے یوں دیکھنے لگا جیسے میں کسی اور دنیا کی مخلوق ہوں۔

"ابے لے۔ جگری! تم اس سے کیا بات کرو گے؟"

وہ حیرت سے میری طرف دیکھ کر بولا مگر میں خاموش رہا، کالیا سمجھدار تھا اس نے دوبارہ مجھ سے کوئی بات نہ کی اور اپنے دونوں ساتھیوں، جمی اور تارا کو مخصوص اشارہ کیا، وہ فوراً حرکت میں آئے اور ذرا ہی دیر بعد خاور کو انسانی حالت میں لے آئے۔ اسے میں نے اپنی کرسی بیٹھنے کے لیے پیش کی اور پانی کا گلاس پلوایا۔ اس کے اعصاب بحال ہوئے تو میں نے اس سے کہا۔

"تم نے ابھی جو بیان دیا ہے، کیا یہ سب عدالت میں دے سکتے ہو؟"

اس نے نیم باز سی آنکھوں سے میرے چہرے کی طرف دیکھا۔ مگر جواب نہیں دیا، کالیا کو غصہ آ گیا اس نے اپنی جیب سے ایک گراری دار چاقو نکال لیا اور اس سے پہلے کہ وہ اسے دوبارہ زدوکوب کرنے کی سعی کرتا۔ میں نے اسے روک دیا اور کرسی پر نڈھال سے بیٹھے خاور کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

"تم جن لوگوں کے لیے اس طرح کا کام کرتے ہو۔ کیا تم جانتے ہو ان کی نظروں میں تمہاری کیا حیثیت ہوگی؟ ان کا اعلیٰ نسل کا کتا بھی تم سے زیادہ اہم ہوگا۔ اور اگر کسی مجبوری کی بناء پر تم دونوں میں سے اسے کسی ایک کو شوٹ کرنا پڑا تو وہ اپنے اعلیٰ نسل کے کتے کی بجائے تمہیں گولی ماردیں گے۔" میں اتنا کہہ کر چپ ہوا، میں نے اب تک خاور کی وضع قطع اور اس کے انداز و اطوار سے صاف اندازہ لگایا تھا کہ یہ ان کا اوپری ٹاؤٹ تھا۔ یعنی فارورڈ ٹاؤٹ۔ جسے عموماً قربانی کا جانور بننا پڑتا ہے۔ اس کی حیثیت سیٹھ ستار جیسے لینڈ مافیا کی چیف کے قریبی کارپردازوں میں سے نہیں لگتی تھی۔ اور ایسے لوگ تھوڑی... "کونسلنگ" سے منحرف ہونے میں بھی دیر نہیں لگاتے تھے۔ مجھے خود پر نفسیات داں ہونے کا قطعی دعویٰ نہ تھا، مگر اللہ نے عقل سلیم ہر انسان کو عطا کر رکھی ہے جسے عام فہم میں "کامن سینس" کہتے ہیں۔ بات بنی ہو تو اپنی اثر پذیری دکھاتی ضرور ہے۔

اسی وقت میں نے کن انکھیوں سے دیکھا کہ تارا، کالیا

کے قدرے قریب آ کر اس کے کان میں کچھ کہہ رہا تھا۔ اس پر کالیا نے مجھ سے کہا۔

"جگری۔! ایسے لوگ آپ کی کتابی باتیں نہیں سمجھ سکتے، ہمیں اینٹ کا جواب پتھر سے دینا ہوگا۔"

"کالیا! میرے یار۔! مجھے صرف چند منٹ دے دے۔" میں نے اس کی طرف دیکھ کر بڑی رسانیت سے کہا۔ کالیا نے فوراً اپنا سر جھکا لیا۔

میں پھر خاور کی طرف متوجہ ہوا۔

"مجھے پورا یقین ہے کہ تم میری بات سمجھ رہے ہو۔ ایسے مافیائی لوگ خود تو بیسیوں مسلح گارڈز کی معیت میں ہوتے ہیں یا بڑے آرام سے اپنے قلعہ نما کوٹھی کے آرام دہ کمرے میں، انہیں یہ سب تم لوگوں کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے۔ کبھی سوچا ہے تم نے؟ اور تم جیسے لوگ جیلوں اور تھانوں میں اکثر ان کے دشمنوں کے ہاتھوں پٹتے رہتے ہو۔ کیا ملتا ہے تمہیں اس کے بدلے میں؟"

"تم کیا چاہتے ہو؟" خاور نے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔ ذرا غور سے دیکھنے پر مجھے اس کے اترے اترے چہرے پر۔ الجھن آمیز پُرسوچ تاثرات ابھرتے محسوس ہوئے تھے۔

"یہی کہ جو بیان تم نے ادھر دیا ہے وہ عدالت میں بھی دو گے کہ تم نے ہی بلیو مون ہائیٹس بلڈر کمپنی کے مالک سیٹھ ستار کے کہنے پر منشی داون خان کا قتل کیا تھا۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"پھر کیا ہوگا؟" وہ میری طرف دیکھ کر پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔ "مجھے وعدہ معاف گواہ بنا کر آزادی کا لالچ دیا جائے گا۔ سیٹھ ستار کو پھانسی ہو جائے گی؟ ہرگز نہیں، وہ دور تک اپنا کیس لڑنے کی طاقت رکھتا ہے۔ اور میں۔ آزاد ہونے کے بعد اپنے گھر تک بھی نہیں پہنچ پاؤں گا۔ اور مجھے اس کے کتے راستے میں ہی زندگی کی قید سے آزاد کردیں گے۔ گھر پہ میری ماں، بوڑھا بیمار باپ اور جوان بہن میری راہ تکتے رہ جائیں گے۔ پھر میرا بوڑھا باپ میرے غم میں کھانس کھانس کر مرجائے گا، ماں پاگل ہوجائے گی اور جوان کنوری بہن کسی بازار کی زینت بنادی جائے گی۔"

اس کا خیال تھا کہ میں اس کی روایتی کہانی سن کر متاثر ہو جاؤں گا۔ میں نے بدستور اس کی طرف ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے تکتے ہوئے پوچھا۔

"اللہ کو مانتے ہو؟"

"مانتا ہوں۔ مگر۔"

"اس میں مگر کی کوئی گنجائش نہیں۔"

"میں اس کی آزمائشوں اور حکمتوں سے ڈرتا ہوں۔" اس نے لولا لنگڑا جواز گھڑا۔

"غلط۔" میں نے کہا۔ "اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے بندے کو برداشت سے زیادہ دکھ نہیں دیتا مگر اوقات سے زیادہ اسے نوازتا ہے۔ رہی بات آزمائشوں اور حکمتوں کی۔ تو یہ توفیق بھی قسمت والوں کو ہی ملتی ہے۔ تمہیں مل جائے تو خود کو تم خوش قسمت سمجھنا۔ مجھے دیکھو۔ میں بھی تمہاری طرح ایک عام سا بندہ ہوں۔ میرے ماں باپ تو نہیں ہیں لیکن میرے باپ کو ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت پھانسی پر لٹکا دیا گیا اور میں نے تب سے یہ پختہ عزم کر لیا کہ میں اس کے در پردہ قاتلوں کو کیفرِ کردار تک ضرور پہنچاؤں گا۔ میں ایک چھوٹے سے گھر میں رہتا ہوں۔ ایک جوان بہن ہے، بھائی ہے چھوٹا۔ لیکن میں نے بلڈرز سمیت حاجی عمران خان جیسے با اثر جاگیردار وڈیرے سے دشمنی مول لے رکھی ہے۔ کس لیے۔ حق کی خاطر۔ اور میرا اللہ میری مدد فرما رہا ہے۔" میں اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ خاور نے اپنا سر جھکا دیا تھا۔

"اسے چھوڑ دو۔ کالیا۔!" میں نے اپنے قریب کھڑے شیراز کالیا سے گمبھیر لہجے میں کہا۔ اور اس نے فوراً اپنے دونوں ساتھیوں سے تحکمانہ کہا۔

"چلو۔ اسے جہاں سے لائے تھے وہیں چھوڑ آؤ۔"

تارا اور جمی چابی بھرے کھلونوں کی طرح حرکت میں آئے اور خاور کو لے گئے۔ تھوڑی دیر بعد مجھے کار کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی جو دور ہوتے ہوتے معدوم ہو گئی۔

"ابے لے۔ جگری! تو بھی بس....." کالیا اس بار سگریٹ کو اپنی مٹھی میں پکڑتے ہوئے چٹکی بجا کر راکھ جھٹکتے ہوئے بولا۔

"میں ایسا ہی ہوں۔ کالیا!" میں نے اس کی بات کاٹی۔ "تو یہ بتا۔ کس تھانے سے لایا تھا اسے؟" اس نے مجھے متعلقہ تھانے کا نام پتا بتایا۔ اور کہا۔

"اپنے استاد بھا بھا نے ایس آئی کو خرید لیا تھا۔ اس وقت وہی قائم مقام انچارج ہے تھانے کا۔ کل صبح تک ایس ایچ او چھٹیاں گزار کر آجائے گا۔"

"ہوں۔ تو یہ بات طے ہے کہ منشی کا قتل سیٹھ ستار نے ہی کروایا تھا۔ مجھے پھانسنے کے لیے۔" میں نے خود

کلامیہ کہا تو کالیا بولا۔

''تو بے غم ہوجا۔ جگری! میں اس کا جینا حرام کر دوں گا۔''

''ابھی نہیں۔ پہلے دیکھو کہ خاور عدالت میں کیا بیان دیتا ہے۔''

''ابے لے۔ جگری! تو ابھی تک اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ وہ......''

''ہاں! میں خوش فہمیوں پر یقین رکھتا ہوں اس لیے کہ یہ اُمید جگاتی ہیں اور اللہ کو اچھی امیدیں پسند ہیں۔ چلوں گا میں اب۔'' میں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا تو وہ بڑے اسٹائل سے مسکرا کر۔

''جگری! میں نے بھی بڑے بڑے گھاگ مجرموں کے ساتھ زندگی بتائی ہے۔ شریفوں کے ساتھ بھی میرا پالا پڑا۔ مگر تو۔ تو ہے۔ تیرے جیسا آدمی میں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ تیرے میں کوئی بات تو ہے ایسی کہ تو نے کالیا کا دل جیت رکھا ہے۔ بس! خوامخواہ ہی تجھ سے بڑا دل لگتا ہے میرا۔ پر یار۔ جگری! تو اپنا خیال بھی رکھا کر۔'' میں نے مسکرا کر جواب میں اپنی سیدھے ہاتھ کی شہادت والی انگلی اوپر آسمان کی طرف اٹھا دی اور بولا۔

''وہ میرا خیال رکھتا ہے۔ اس لیے کہ میرے لیے میرا اللہ ہی کافی ہے۔''

میں نے اس کے کاندھے کو تھپکی دی اور اپنی بائیک پر بیٹھ کر سیدھا۔ لاری اڈے پہ آ گیا۔

چاچا انور شاہ نے بتایا کہ۔ وہ تینوں افراد گیارہ بجے تک پہنچنے والے تھے۔ میں نے کہلوا دیا تھا کہ انہیں میرے ہی کمرے میں لایا جائے۔ اس کے بعد میں اپنے کاموں میں مصروف ہو گیا۔

ٹھیک گیارہ بج کر بیس منٹ پر میں نے کھڑکی سے باہر اڈے کے وسیع و عریض میدان میں دیکھا۔ ایک بڑی سی جیپ اندر داخل ہو رہی تھی۔ اس میں چار افراد سوار تھے۔ چوتھا ڈرائیور ہی لگ رہا تھا، باقی تین مجھے مذکورہ ملاقاتی ہی محسوس ہوئے تھے۔

میں اپنے کام میں مگن رہا، ذرا ہی دیر بعد چاچا انور شاہ انہیں لیے اندر داخل ہو رہا تھا۔

میں اخلاقاً اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور باری باری خیر مقدمی مسکراہٹ سے ان چاروں کے ساتھ مصافحہ بھی کیا۔ ساتھ ہی بہ غور ان کا جائزہ بھی لیا۔ ایک نوجوان کو دیکھ کر جانے کیوں مجھے ایسا لگا جیسے وہ میرا کہیں دیکھا ہوا ہو۔ شناسائی کی رمق پاتے ہی میں نے یاد کرنے کی کوشش بھی چاہی لیکن زیادہ نہیں سوچ سکا۔ حقیقت یہ تھی کہ مجھے ان تینوں کو دیکھ کر مایوسی ہی ہوئی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ تینوں نوجوان تھے۔ چوتھا ذرا پختہ العمر آدمی تھا جسے میں ڈرائیور سمجھا تھا۔ میرے خیال کے مطابق ایسے لوگ سنجیدگی سے کاروبار نہیں کیا کرتے اور نہ ہی ان کے اندر اتنی قلبی وسعت ہوتی ہے کہ کاروبار کی اونچ نیچ اور تعلق داری کو برداشت کر سکیں۔ یوں بھی بہ غور ان کے چہروں کا جائزہ لینے کے بعد مجھے ایسا ہی محسوس ہوا تھا کہ یہ تینوں محض وقت گزاری کے لیے اس کام میں ہاتھ ڈالنا چاہتے ہوں وغیرہ۔ خیر ابھی تو ان کے بارے میں میرے یہ خیالات قبل از وقت ہی تھے۔ ان تینوں کا تعلق مجھے کسی جاگیردارانہ گھرانوں سے لگتا تھا۔ ہوسکتا ہے ان میں کاروبار کرنے اور پیسا کمانے کی سنجیدہ ہی لگن ہو۔

میں نے انہیں بیٹھنے کو کہا اور خود بھی اپنی سیٹ سنبھال لی۔ جس چوتھے آدمی کو میں ان کا ڈرائیور سمجھا تھا۔ وہ درحقیقت وہی ٹھیکے دار سائیں رکھیو تھا جو چاچا انور شاہ کی ہی عمر کا تھا اور اسی نے سب سے پہلے انور شاہ سے بات کی تھی۔

چھوکرے دوسو کو مہمانوں کے لیے چائے وغیرہ کا بندوبست کرنے کے لیے کہا جا چکا تھا۔

صاحب سلامت کے بعد تعارف کا سلسلہ چلا۔ میں نے بھی اپنا تعارف ضلعی نائب صدر لاری اڈا ٹرانسپورٹ کے حوالے سے کروایا جبکہ ان تینوں کا تعارف سائیں رکھیو نے کروایا۔ ایک کا نام شاہ نواز معلوم ہوا دوسرے کا بشیر جان اور تیسرے کا سائیں رکھیو نے عزیر خان کے نام سے کروایا تو مجھے ایک جھٹکا لگا۔

یہی وہ نوجوان تھا جس کی صورت مجھے شناسا سی محسوس ہوئی تھی اور اب عزیر خان کے نام سے میں چونکا تھا۔ میری اس سے کوئی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ یونیورسٹی سے صرف اس کا ڈیٹا کلکٹ کیا تھا، تصویر سمیت اور وہی تصویر میرے ذہن میں چھپاں تھی اسی لیے مجھے فوری طور پر یاد نہیں آسکا تھا۔ یہ وہی عزیر خان تھا جسے خورشید خاں کے بیٹے اختر نے اپنی گمشدہ بہن ثوبیہ کے ساتھ دیکھا تھا۔ جب میں نے اس کی ولدیت پوچھی تو مجھے یقین ہو گیا کہ وہ حاجی مہران خان کا ہی بیٹا عزیر خان تھا۔

(جاری ہے)

(عبدالجبار رومی لاہور کا جواب)

فخر عالم .... راولپنڈی

واقفِ عظمتِ کردار میں ہے کوئی
لوگ شعبدہ باز ہیں فنکار نہیں ہے کوئی

کاوش محمود .... اسلام آباد

وہ زمانہ نہیں رہا جاناں
جب بچھڑ کر ملال ہوتا تھا

احسان علی .... سیالکوٹ

وصل اک خواب ہے تعبیر کوئی ہو کہ نہ ہو
خود کھنچے جاؤ گے زنجیر کوئی ہو کہ نہ ہو

(مجی رحمٰن برٹ لیٹ یو ایس اے کا جواب)

نجمہ شفیق .... ڈیرہ اسماعیل خان

یوں تو لکھنے کے لیے کیا نہیں لکھا میں نے
پر جتنا تجھے چاہا نہیں لکھا میں نے

ارشاد علی .... مانسہرہ

یاد ہیں جور و جفا تیرے مگر میں چپ ہوں
تو ستم گر ہے بڑا تو بڑا ہرجائی ہے

(انیس احمد شادی پور کا جواب)

عبدالجبار رومی .... لاہور

یہ کیا کم ہے کہ زندگی جی رہے ہو
کسی کے لیے نہ سہی اپنے لیے تو جی رہے ہو

زاہد علی .... شادی پور

یہیں کہیں میں کسی گوشۂ جمال میں تھا
میں عشق ہونے سے پہلے بھی ایسے حال میں تھا

(سیف اللہ امجد علی کا جواب)

مجی رحمٰن .... برٹ لیٹ یو ایس اے

وہی منصفوں کی روایتیں وہی فیصلوں کی عبارتیں
میرا جرم تو کوئی اور تھا یہ میری سزا کوئی اور ہے

(نیلوفر شاہین اسلام آباد کا جواب)

عشرت فاطمہ .... جھنگ

تمہیں دانستہ محفل میں جو دیکھا ہو تو مجرم ہوں
نظر تو پھر نظر ہے ارادہ اٹھ گئی ہوتی

احمد جاوید .... ملتان

تو اپنے آپ ہو گئے یہ مرے خشک لب
ان کی نظر سے جیسے کوئی جام سا ملا

عبدالحکیم شرر .... کراچی

تم چلی جاؤ گی پرچھائیاں رہ جائیں گی
کچھ نہ کچھ حسن کی رعنائیاں رہ جائیں گی

امجد علی .... ساہیوال

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا نہ پائیدار ہو گا

(عباس علی ملک فیصل آباد کا جواب)

نزاہت افشاں .... میھورہ فتح جنگ

اے دل کے ولولو، شبِ وعدہ فریب ہے
تا زندگی سویرا سویرا کرو گے تم

یاسمین ملک .... کوئٹہ

اپنے جلتے ہوئے خوابوں کو بچانا ہو گا
تو نے ہر گام میرا ساتھ نبھانا ہو گا

عباس مشہدی .... لاہور

اس نے توڑا ہے رب سے ہر ناتا
اس لیے بے قرار ہے دنیا

(نزاہت افشاں میھورہ فتح جنگ کا جواب)

زاہد حیات .... ساہیوال

آنکھوں میں اب نمی سی رہتی ہے
زندگی میں کچھ کمی سی رہتی ہے

شبیر حسن ساجد .... سرگودھا

الٹ دے بڑھ کے بساطِ نظامِ کارِ جہاں
تو انقلابِ زمانہ کا انتظار نہ کر

ناظر احمد.........ملتان

اس کے کھونے کا بہت دکھ ہے مگر
ہم اس کو پانے کے اسباب کہاں سے لائے

عنایت حسین.........لاہور

اس دنیا میں کون ہمارے آنسو پوچھے گا
جس کو دیکھو اس کا دامن بھیگا بھیگا لگتا ہے

زاہد علی.........ملتان

اک سرسری نگاہ تھی اک بے نیاز چپ
میں بھی تھا اس کے سامنے میرا سوال بھی

(ظہیر احمد تبسم کراچی کا جواب)

قندیل آرائیں.........لاہور

اس برس بام سے گزرے گا اگر موسم گل
میں بھی پوچھوں گی بصد عجز و ادب ایک سوال

محمد خالد.........کراچی

آپ ہی آپ ہوا جیسے تقاضا کوئی
دل سے ہو کر ابھی پھر قافلہ گزرا کوئی

(سیف اللہ ملک وال کا جواب)

ادریس افضال.........منڈی بہاؤالدین

نگاہیں ملتی رہتی ہیں مگر خلوت نہیں ملتی
کوئی بھی بات کرنے کی کبھی مہلت نہیں ملتی

شبیر علی.........چنیوٹ

نہ جانے کتنے ستارے یہ کہتے ڈوب گئے
سحر کا رنگ پریشاں ہے دیکھیے کیا ہو

(محمد خالد زوب کا جواب)

ابریز گل.........پشاور

میرے ہر لفظ کی وحشت میں ہے اک عمر کا عشق
یہ کوئی کھیل تماشا نہیں لکھا میں نے

فرخندہ مرزا.........لاہور

محبت پھول کی خوشبو محبت تتلیوں کا رنگ
محبت پربتوں کی جھیل کا شفاف پانی ہے

نازش فاطمہ.........خان پور

ہار دیا ہے بیٹے نے اک ممتا کو
کیسے کیسے لوگ یہاں انساں ہوئے

کائنات شفیق.........کوئٹہ

منسوب اس کے قصے اوروں سے بھی تھے لیکن
وہ بات بہت پھیلی جو بات ہم سے

منشی محمد عزیز ہے.........لڈن وہاڑی

مان لوں اگر یہ یک طرفہ محبت تھی
مجھے دیکھ کر مسکرانے کی ضرورت کیا تھی

(انعم رفیق کراچی کا جواب)

سعید احمد چاند.........کراچی

یہ میرا شہر مرے لوگ بے خبر تو نہیں
یہیں کہیں سے کوئی وار ہونے والا ہے

(نوشین کنول جھنگ کا جواب)

نیلوفر شاہین.........اسلام آباد

یہ ادا سمجھوں حیا سمجھوں یا اظہار وفا سمجھوں
تمہاری مسکراہٹ مجھ سے پہچانی نہیں جاتی

سیف اللہ.........ملک وال

یہ تو میں سمجھا کہ سہہ سکتا نہیں تاب جمال
رخ سے پردہ تو اٹھا آگے میری تقدیر سہی

(ناصر احمد وینہ کا جواب)

محمد احسن جاوید.........ڈی جی خان

روز کہتا ہوں نہ گھر جاؤں گا اس کے لیکن
روز اسی کوچے میں اک کام نکل آتا ہے

حنیف امجد.........لاہور

رنج درد و الم یاس تمنا حسرتیں
اک تری یاد کے ہونے سے ہے کیا کیا دل میں

(رفیق احمد ناز ڈیرہ غازی خان کا جواب)

ہادیہ ایمان، ماہا ایمان.........ڈاہرانوالہ

گل اس طرح زخم رسیدوں میں مل گیا
یہ بھی لہو لگا کے شہیدوں میں مل گیا

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظرانداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

علمی آزمائش۔ 137

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوائیے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ''یک عکسی سرگزشت'' کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کرکے اس طرح سپردِ ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 مئی 2017 تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

سندھ کے سہون شریف میں جنم ہوا۔ ابتدائی تعلیم جامعۃ العربیہ حیدرآباد سے حاصل کی۔ پھر حیدرآباد سے میٹرک کیا۔ گورنمنٹ کالج حیدرآباد سے گریجویشن کیا اور یونیورسٹی سے ایم اے اسلامی تاریخ میں کیا۔ حیدرآباد میں ریڈیو اسٹیشن قائم ہوا تو ''اساں مجھو پاکستان'' نامی فیچر میں آواز شامل کی پھر ''لاکھوں میں ایک'' فلم سے فلمی دنیا میں آگئے اور اب لیجنڈ میں شمار ہوتا ہے۔

علمی آزمائش 135 کا جواب

قائداعظم محمد علی جناح سندھ کے معروف اور اہم شہر میں پیدا ہوئے۔ لندن سے قانون کی ڈگری حاصل کی۔ بمبئی میں وکالت کرنے لگے پھر سیاست میں آکر برصغیر کی ایک بڑی سیاسی پارٹی میں شمولیت اختیار کی لیکن جلد احساس ہوگیا کہ ہندو مسلمانوں کا استحصال کر رہے ہیں۔ اس لیے احتجاجاً پارٹی سے استعفیٰ دے دیا۔ برصغیر کے مسلمانوں میں بیداری پھیل رہی تھی سو انہوں نے مسلمانوں کی پارٹی میں شمولیت اختیار کرلی۔ ان کے آنے سے مسلمانوں کی پارٹی میں جان پڑگئی اور وہ پارٹی تیزی سے مقبولیت پاگئی۔ اسی شہر کراچی میں ان کا مدفن ہے۔

انعام یافتگان

1۔ عباس علی رند (حیدرآباد) 2۔ نیاز سونگی (کراچی) 3۔ صبا جاوید (لاہور)
4۔ زاہد علی شاہ (کوئٹہ) 5۔ انعام الحق (جہلم)

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

چنیوٹ سے آصف اقبال، نثار اختر۔ دیپال پور سے امیر الدین نظامی۔ کوہاٹ سے احمد علی، ابرار حسن۔ بدین

سے سید ایس ڈی ساغر۔ ہارون آباد سے غنی محمد۔ پاک پتن سے کاشان حسین۔ ڈگری سے جاوید الحق۔ جہلم سے شیر محمد۔ تلنگ سے جان شاہ۔ نوشہرہ سے نعمت اللہ۔ واہ کینٹ سے افضل خان۔ نثار حتک۔ کراچی سے امامہ عجمل، کیپٹن فواد خان پی این، خادم حسین، سعید احمد چاند، جمیل احمد جعفری، روحی بانو، نسرین عزیز، عبدالباسط، ثاقب احمد، رشید احمد سیال، رفیق الدین، شازیہ ملک، افضل خان، میمونہ حسن، خالد افضل خان، نعمان صدیقی، ابریز احمد، عارف جان، جبران صدیقی، احمد رشید، ادریس خان، قمر زمان قمر، سلطان فتح، صائم بلوچ، وحید حسن، جہانزیب احسن، ملائیکہ ادریس، حریم فاطمہ، اشفاق حسن، شاہین اجمل، جاوید محمد، رحمان گل، مدثر حسن خان۔ لاہور سے حنیف ادیب، منظر علی خان، مدثر ملک، بلقیس بٹ، ریاض الحسن، کامران احمد، خالد ملک، بتول جعفری، نازش سیال، زرین مجید، بینش صدیق بھٹی۔ ملتان سے سید حمید الدین، امام بخش ملک، محمد یحییٰ معین، عباس بٹ۔ راولپنڈی سے سعادت علی خان، امین منصوری، انور خان، فیض رحمن، حمید الحق، نقش ملتانی۔ اسلام آباد سے نعمان، نیلوفر شاہین، جمیل احمد، اسلم ملک، حنیف علی محمد، شفیق حسن، محمد چراغ حسن، صداقت علی، عز الحسن، شاہد علی شمود حسن، امجد علی شاکر علی، جمیل نوری، انور بلوچ، منصور علی۔ حیدرآباد سے مریم بنت کاشف، جمیل احمد، ندیم حسن، عطاء انصاری، عبدالرحمن، حنیف بادشاہ۔ رحیم یار خان سے ماہ زیب، عنایت، آصف ملک، ایاز احمد۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ سے زاہد خان، ظہور احمد، بتول جعفری، خدیجہ مشتاق۔ سرگودھا سے نرگس، نسیم حیات، صاحب جان، ظفر اقبال جاوید (سلانوالی)۔ منڈی بہاؤالدین سے سیف اللہ ملک وال، نیلوفر نسیم، نہال اعوان۔ فورٹ عباس سے ریحانہ صدیقی، افتخار۔ شادی وال سے ایاز احمد، صدیق خان۔ چکوال سے رضیہ احمد، عمیر شیخ، افتخار احمد۔ آزاد کشمیر سے دانش احمد۔ کوٹ ادو سے جاوید علی، عباس خان۔ چنیوٹ آباد سے فرحان علی فرحان۔ حسن ابدال سے وزیر محمد ڈرائیور۔ جیکب آباد سے: نازش سلطانہ، اقبال گوندل، ممتاز اختر، رحمن شاہ، اطہر جونیجو، فرحت اللہ بابر، نصیر الدین، فیصل بابر، ثمینہ جونیجو۔ سرگودھا سے: شریف الرحمن خان، آفرین ارشاد، سندس فریہ، انور علی ترمذی، مہوش صدیق۔ چکوال سے: ندا ملک، ماہا ملک، ارباب صدر الدین، تنویر احسن، غلام حسین زیدی۔ کمالیہ سے: اشرف سلطانی، ملک اشفاق۔ پاکپتن سے خان محمد تریال، فاطمہ توفیق۔ ڈہرانوالہ سے اقبال بٹ، اسلام شیخ — ایبٹ آباد سے احمد عرضی، نعیم جاوید۔ ٹل ہزارہ سے نسیم خان، دانش صدیقی۔ بھلوال سے عبدالجبار خان، شاہد آفاق۔ اوکاڑہ سے مدحت حیات، زرفشاں حیات۔ خانیوال سے اظہر بخاری، حسن علی۔ میرپور خاص سے طاہر الدین بیگ، انور کمال، سید نور الحسن، جہاں آرائی، انور حیات، خواجہ صدیق، محمد فیضان، کمال حیات۔ میرپورا کے سے شاہ بھٹ، زاہد شیرازی، کامران فرید۔ علی پور سے زہیب حسن، آفاق سید، نور علی۔ اٹک سے نزاہت افشاں (فتح جنگ)، احمد فریدی، شہباز الحسن، ناز ولدی۔ سکھر سے زرین عباس، ریاض جوکھیو، حفیظ احمد۔ میانوالی سے ملک آفریدی، عبدالخالق (کالا باغ)، زاہد خیران، صادق خان۔ وہاڑی سے منشی عزیز مئے (لندن)۔ پشاور سے وحیدہ جان (بارو خیل)، نصر من اللہ (حیات آباد)، مختار احمد، شاہ علی، نیاز شاہ، نوازش حسین غوری، کوثر جبیں، صالح محمد۔ بہاولپور سے مومنہ کشف، احمد علی سیال، رفیق افروز ملک، یاسمین گلزار، وحید الدین۔ بہاولنگر سے فاخر عباس، شفیق الرحمن، جنید سلطان، ارشاد حسین جعفری، ماہا ملک، فرحت خان، حباب چنگیزی، نصرت جاوید، وصی الحسن، ابرار الحق۔ نوید احسان، ذیشان احمد عباسی، توحید ملک، امجد احمد خان۔ جھنگ سے نثار احمد کرنالی (شورکوٹ)۔ فیصل آباد سے احسان الٰہی (چک جھمرہ)، فرید پراچہ، عندلیب، شاہ فیصل، ابرار احمد۔ راجن پور سے ملک محمد ظفر اللہ (کچھی درہ)۔ گوجرانوالہ سے محمد جمیل احمد، افشاں نیاز، فریدہ بتول۔ سانگھڑ سے عاشق حسین مغل (جام نواز علی)۔ چترال سے عبدالغنی، فریدہ اللہ شاہ۔ ڈیرہ غازی خان سے سید محمد حمید الدین، رفیق احمد ناز، زاہد عباس، کلیم اللہ، وحید الحسن۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے بدر منیر، نہال احمد۔ جھنگ سے اعجاز احمد ملک، فرخندہ ریاض، ناصر ہاشمی، ملک افروز۔ سیالکوٹ سے نوید شہزاد خواجہ، احسان فتح علی خان، قادر بخش۔ پنوعاقل سے عتیق الرحمن عباسی، مختار احمد، جاذب حسن۔ چکوال سے عبدالستار (طارق بن زیاد کالونی)۔ ساہیوال سے زین الایمان احمد قریشی (فرید ٹاؤن)، آغا علی رضا (امام بارگاہ)۔

ممالک غیر سے شاہ احمد (ڈیرہ دبئی)، ثاقب خان (العین)، محمد فیضان (مسقط اومان)، رشید احمد (جدہ، سعودیہ) فدا فاروق (زاہدان، ایران)، فہیم اللہ (جرمنی)۔ فیصل منصور ابراہیم (ای پنکیوچ، ساؤتھ افریقہ)۔

براوقت

محترم مدیراعلیٰ
السلام علیکم
اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے لیکن انسان اپنی عقل کو اس طرح استعمال نہیں کرتا جس کا حکم ہے اسی لیے وہ تباہی کے غار میں گرتا چلا جاتا ہے۔ مجھے بھی بہکانے کی کوشش کی گئی اگر میں بہک جاتی تو ہمیشہ کے لیے برباد ہو جاتی۔ اپنی روداد میں یہی میں نے بتانے کی کوشش کی ہے۔
نائلہ
(کراچی)

بینک کی کھڑکی کے سامنے فیس جمع کرانے والوں کی ایک لمبی قطار تھی اور وقت ختم ہونے میں صرف ایک گھنٹا رہ گیا تھا۔ مجھے یہ فکر لاحق ہو گئی کہ اگر میرا نمبر نہ آیا تو لیٹ فیس کے ساتھ پیسے جمع کروانے ہوں گے۔ مجھے رہ رہ کر ابا پر غصہ آ رہا تھا جنہوں نے پیسے دینے میں ایک ہفتہ لگا دیا لیکن اس میں ان کا بھی قصور نہیں تھا۔ ان کے پاس تو صرف گھر کے خرچ کے ہی پیسے ہوتے تھے۔ اضافی اخراجات کے لیے انہیں ابا کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتا تھا اور وہ بھی کوئی لکھ پتی تو تھے نہیں۔ میں اچھی طرح جانتی تھی کہ اپنی محدود آمدنی میں وہ کس طرح گھر چلا رہے ہیں۔ میری فیس کے لیے بھی انہوں نے دفتر سے ایڈوانس یا کسی دوست سے قرض لیا ہوگا۔ امی تو میرے یونیورسٹی میں داخلہ لینے کے ہی خلاف تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ہمارے مالی حالات ایسے نہیں کہ مزید چار سال تمہاری پڑھائی کا خرچ برداشت کر سکیں۔ ویسے بھی لڑکیاں چاہے کتنا ہی لکھ پڑھ لیں۔ شادی کے بعد انہیں ہانڈی چولہا ہی کرنا ہوتا ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے اس بات پر خود کو راضی کیا کہ وہ صرف داخلہ فیس دے دیں۔ اس کے بعد میں ٹیوشن کر کے اپنے اخراجات خود برداشت کروں گی۔

کہانی کو آگے بڑھانے سے پہلے مناسب ہوگا کہ میں اپنا پس منظر بیان کر دوں۔ میرا نام نائلہ ہے مجھ سے چھوٹے دو بھائی اور ایک بہن ہے۔ ابا ایک سرکاری دفتر میں گریڈ سولہ کے ملازم ہیں۔ ان کی تنخواہ میں بمشکل گزارہ ہوتا ہے اور مہینے کے آخری دنوں میں اکثر تنگی ہو جاتی ہے۔ وہ تو شکر ہے کہ مکان اپنا تھا ورنہ کرایہ دینا مشکل ہو جاتا، اس کے باوجود بجلی گیس کے بلوں اور پڑھائی میں اچھے خاصے پیسے خرچ ہو جاتے تھے۔ میں اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھی اور انٹر سائنس کرنے کے بعد میرا یونیورسٹی میں داخلہ ہو گیا تھا جب کہ مجھ سے چھوٹا حماد فرسٹ ایئر، فواد نویں اور بہن شائلہ اس وقت ساتویں میں پڑھ رہی تھی۔

بینک کی قطار میں کھڑے کھڑے میری ٹانگیں شل ہونے لگیں۔ میں صبح ناشتا کر کے گھر سے چلی تھی اور اس کے بعد سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ بھوک اور پیاس کی وجہ سے شدید نقاہت ہو رہی تھی۔ اچانک مجھے بہت زور کا چکر آیا۔ اس سے پہلے کہ میں گر جاتی پیچھے کھڑی ہوئی ایک لڑکی نے مجھے سنبھال لیا اور سہارا دے کر بینک کی دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی بینچ تک لے کر آئی۔

”تم یہاں بیٹھو، جب تمہارا نمبر آئے گا تو بلا لوں گی۔“ اس نے میرا شانہ تھپکتے ہوئے کہا۔

میں بینچ پر بیٹھ گئی تو وہ بولی۔ ”لگتا ہے کہ تمہیں بھوک کی وجہ سے چکر آیا ہے۔ فیس جمع ہو جائے تو ہم پیٹ پوجا کے لیے کینٹین چلتے ہیں۔“

اس کی بات سن کر مجھے فکر لاحق ہو گئی۔ فیس دینے کے بعد میرے پاس صرف بس کے کرائے کے لیے ہی پیسے بچتے۔ اس لیے میں اس کے ساتھ کینٹین جانے کی عیاشی افورڈ نہیں کر سکتی تھی لہٰذا میں نے سوچ لیا کہ کوئی بہانہ بنا کر اس کے ساتھ کینٹین جانے سے انکار کر دوں گی۔ تقریباً آدھ گھنٹا بعد اس نے مجھے اشارہ کیا۔ اس کا مطلب تھا کہ میرا نمبر آ گیا۔ میں جلدی سے اٹھی اور لائن میں اپنی جگہ پر جا کر کھڑی ہو گئی۔ اب مجھ سے آگے صرف دو لڑکیاں تھیں۔

پانچ منٹ بعد میری باری آگئی اور میں نے فیس جمع کرانے کے بعد سکھ کا سانس لیا اور اس لڑکی کا انتظار کرنے لگی تاکہ اس کا شکریہ ادا کرسکوں۔

وہ فیس دے کر آئی اور بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملانے کے بعد بولی۔ ''میرا نام شہلا ہے۔''

''مجھے نائلہ کہتے ہیں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تم بہت پیاری ہو۔ میں بہت خوش قسمت ہوں کہ پہلے روز ہی مجھے اتنی اچھی دوست مل گئی۔''

''ارے تم نے اتنی جلدی مجھے اپنا دوست بھی بنالیا۔ ابھی تو ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے بھی نہیں۔''

''تم نے پہلی نظر کی محبت کے بارے میں سنا ہے۔ بس یہی سمجھ لو۔ تم پہلی ہی نظر میں میرے دل میں اتر گئی ہو۔ تمہارے چہرے کی معصومیت اور آنکھوں کی جھجک بتا رہی ہے کہ تم ایک اچھی دوست ثابت ہوسکتی ہو۔''

''تمہارا بہت بہت شکریہ کہ تم نے مجھے اس قابل سمجھا۔'' میں نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اب چلتی ہوں امی انتظار کررہی ہوں گی۔''

''ارے ایسی بھی کیا جلدی۔'' وہ میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی۔ ''چلو کینٹین چلتے ہیں۔ پہلے کچھ کھا پی لیں پھر جانے کی بات کرنا۔ مجھے بھی بہت زور کی بھوک لگی ہے۔''

میں نے کچھ پس و پیش سے کام لیا تو وہ بولی۔ ''گھبراؤ نہیں۔ آج کی پارٹی میری طرف سے ہے۔ بل میں دوں گی۔''

میں نے جھینپتے ہوئے کہا۔ ''ایک ہی بات ہے۔ اچھا ہوتا کہ آج تم مجھے موقع دیتیں کیونکہ میں لائن میں تم سے آگے کھڑی ہوئی تھی۔''

اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''اچھا اب چلو۔ مجھ سے بالکل بھوک برداشت نہیں ہورہی۔''

اس نے سموسے اور کوک منگوائی۔ میرا چائے پینے کا موڈ ہورہا تھا لیکن میں نے اس کا ساتھ دینا مناسب سمجھا۔ چائے پینے کے دوران اس نے بتایا کہ وہ ایک غریب

گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ والد کی کریانہ کی دکان ہے جس کی آمدنی سے بمشکل گھر کا خرچ چلتا ہے۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہے۔ اس کے والد معمولی پڑھے لکھے ہیں لیکن وہ اپنی بیٹی کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کے خواہش مند ہیں۔ اسی لیے اس نے والدہ کی مخالفت کے باوجود یونیورسٹی میں داخلہ لیا ہے تاکہ ماسٹرز ڈگری حاصل کر کے اپنے والد کا خواب پورا کر سکے۔

اس کی باتوں نے مجھے بے حد متاثر کیا لیکن وہ جو کچھ کہہ رہی تھی اس پر یقین کرنا مشکل لگ رہا تھا۔ کیونکہ اس کی ظاہری حالت سے یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ کسی غریب گھر سے تعلق رکھتی ہے۔ اس نے قیمتی سوٹ اور جوتے پہن رکھے تھے اور کندھے پر لٹکا ہوا بیگ بھی میرے اندازے کے مطابق کافی مہنگا تھا۔ ایک معمولی کریانہ فروش کی لڑکی یہ چیزیں افورڈ نہیں کر سکتی تھی لیکن میں نے اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ ویسے بھی میری ٹوہ لینے کی عادت نہیں اور نہ ہی پہلی ملاقات میں یہ مناسب تھا کہ میں اس کے بارے میں مزید جاننے کی کوشش کرتی۔ اس کے برعکس وہ مجھ سے کرید کرید کر سوالات کرتی رہی۔ اس نے باتوں باتوں میں مجھ سے بہت کچھ معلوم کر لیا اور میں اپنی سادگی میں اسے بتاتی چلی گئی۔

ابھی ہم باتیں کر رہے تھے کہ ایک لڑکا آیا اور اس نے بڑی بے تکلفی سے ہائے شہلا کہہ کر اسے مخاطب کیا۔ وہ اسے دیکھ کر کھڑی ہو گئی اور خوشی سے چہکتے ہوئے بولی۔ ”ارے نوید، تم یہاں کیسے؟“

وہ ایک خالی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”جہاں تم وہاں ہم۔“

”کیا مطلب؟“ وہ شوخی سے بولی۔ ”تم یہاں بھی پہنچ گئے میرا پیچھا کرتے ہوئے۔“

”خوش فہمی ہے تمہاری۔“ اس نے مجھے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں فیس جمع کروانے آیا تھا۔ میرا ایڈمیشن ہو گیا ہے اور وہ بھی بدقسمتی سے تمہارے ڈیپارٹمنٹ میں۔“

بیرا آرڈر لینے آیا تو نوید نے پوچھا۔ ”آپ لوگ مزید کچھ لینا پسند کریں گی؟“

”اوہ نو، تھینک یو، بس تم اپنے لیے منگوا لو۔“ شہلا نے کہا۔

ان دونوں کی نوک جھوک کے درمیان میں لاتعلق بنی بیٹھی رہی۔ اچانک شہلا کو کچھ خیال آیا اور وہ بولی۔ ”ارے میں تم دونوں کا تعارف کروانا تو بھول ہی گئی۔ نوید، یہ نائلہ ہیں۔ ان سے آج ہی ملاقات ہوئی ہے اور میں نے ان سے فوراً ہی دوستی کر لی پھر میری طرف مڑ کر بولی۔ ”اور نائلہ ہماری گفتگو سے تم نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ ہم کتنے بے تکلف ہیں۔ نوید میرے ساتھ کالج میں پڑھتا تھا اور اب یہاں بھی میرے سر پر سوار رہے گا۔“

نوید نے مجھے نظر بھر کر دیکھا اور بولا۔ ”آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔ آج سے مجھے بھی اپنا دوست سمجھیں۔“

میں نے مسکرا کر سر کو ہلکے سے خم دیا لیکن منہ سے کچھ نہیں بولی۔ دراصل میں ایسی باتوں کی عادی نہیں تھی۔ میں نے لڑکیوں کے کالج میں پڑھا تھا اس لیے کبھی کسی لڑکے سے واسطہ نہیں پڑا۔ ہمارے گھر کزن وغیرہ آتے تو ان سے بھی رسمی گفتگو ہی ہوتی۔ کسی غیر لڑکے سے بات کرنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ اس لیے میری سمجھ میں نہیں آیا کہ نوید کو کیا جواب دوں۔ میں خاموش بیٹھی ان دونوں کی باتیں سنتی رہی جو کسی طرح ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ میں نے گھڑی دیکھی اور کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ”اچھا بھئی اب مجھے اجازت دو، میں چلتی ہوں۔“

”ارے بیٹھو! ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ چلی جانا۔“ شہلا میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی۔

”نہیں کافی دیر ہو گئی۔ امی انتظار کر رہی ہوں گی۔“ میں نے کہا۔

”اچھا۔ تھوڑی دیر بیٹھو ہم تمہیں چھوڑ دیں گے۔“ شہلا نے کہا۔

میں نے چونک کر اسے دیکھا تو وہ بولی۔ ”نوید کے پاس گاڑی ہے نا، یہ ہم دونوں کو چھوڑ دے گا۔“

”نہیں میں چلی جاؤں گی۔“

”آپ تکلف کر رہی ہیں۔“ نوید بولا۔ ”کہاں جائیں گی اس وقت بسوں میں دھکے کھاتی ہوئی۔“

”میں اس کی عادی ہوں۔ آپ میری فکر نہ کریں۔“ میں نے رکھائی سے کہا اور نوید کو مزید کچھ کہنے کا موقع دیئے بغیر وہاں سے چلی آئی۔

گھر آ کر میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ کمپیوٹر شاپ میں جا کر ایک پمفلٹ کا پرنٹ نکلوایا جس پر لکھا تھا۔ ”نویں اور دسویں جماعت کی طالبات کے لیے گروپ ٹیوشن دستیاب ہے۔“ اور اسے اپنے گھر کے دروازے پر چسپاں کر دیا۔ شام کو ابا گھر آئے۔ انہوں نے جب وہ

پمفلٹ دیکھا تو مجھ پر ناراض ہونے لگے اور بولے۔ ''ابھی میں زندہ ہوں اور میرے ہوتے ہوئے تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔''

میں نے آہستہ سے کہا۔ ''اس میں حرج ہی کیا ہے اگر میں چار ٹیوشنز کرکے اپنا خرچ نکال لوں۔''

''لیکن اس طرح تمہاری پڑھائی کا حرج ہوگا۔'' انہوں نے نرم پڑتے ہوئے کہا۔

''اس کی آپ فکر نہ کریں۔ میں رات کو پڑھ لیا کروں گی اور جو کسر رہ جائے گی۔ وہ یونیورسٹی کی لائبریری میں بیٹھ کر پوری کرلوں گی۔''

اس کے بعد وہ کچھ نہیں بولے۔ میں دل ہی دل میں دعا مانگ رہی تھی کہ جلدی سے دو چار ٹیوشنز مل جائیں تو میرا میٹر چل پڑے۔ اللہ نے میری سن لی اور دوسرے دن ہی دو لڑکیاں آگئیں۔ وہ دسویں جماعت میں پڑھ رہی تھیں اور سائنس کے مضامین پڑھنا چاہ رہی تھیں۔ میں نے انہیں بتا دیا کہ ہر مضمون کے لیے الگ گروپ بنے گا اور فیس بھی فی مضمون کے حساب سے لی جائے گی۔ میں نے ان سے ایڈوانس فیس کے لیے کہا اور اگلے دن چار بجے آنے کا کہہ دیا۔

ایک مہینے کے دوران لڑکیوں کی تعداد دس تک پہنچ گئی۔ اس کے بعد مزید لڑکیوں سے معذرت کرلی کیونکہ میرے پاس اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں تھی اور ویسے بھی ان ٹیوشنز سے اتنی آمدنی ہونے لگی جس سے میری ضروریات باآسانی پوری ہوسکتی تھیں۔ اس لیے میں نے اپنے اوپر زیادہ بوجھ ڈالنا مناسب نہ سمجھا اور اسی پر قناعت کرلی گو کہ امی کو یہ سب اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ انہوں نے حسب عادت ان لڑکیوں کے آنے پر اعتراض کیا لیکن دو تین دن بڑبڑانے کے بعد خاموش ہوگئیں۔

ایک ہفتے بعد یونیورسٹی میں کلاسز شروع ہوگئیں۔ میں نے ٹیوشنز سے ملنے والے پیسوں میں سے دو جوڑے جوتے اور بیگ خریدا۔ باقی پیسے بینک میں ڈال دیے۔ میرا یہی ارادہ تھا کہ ہر مہینے کچھ نہ کچھ اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرتی رہوں گی تاکہ سمسٹر کی فیس باآسانی ادا کرسکوں۔ جیسے ہی میں ڈیپارٹمنٹ پہنچی تو سب سے پہلے شہلا سے ہی سامنا ہوا۔ وہ کوریڈور میں کھڑی نوید سے باتیں کررہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی لپک کر آئی اور میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی۔

''کب سے تمہارا انتظار کررہی ہوں۔ اتنی دیر کیوں ہو گئی؟''

''بس بننے میں دیر ہوگئی پھر راستے میں ٹریفک جام بھی تھا۔'' میں نے وضاحت پیش کی حالانکہ میں وقت پر پہنچ گئی تھی اور ابھی پہلی کلاس شروع ہونے میں پندرہ منٹ باقی تھے لیکن اسے کچھ زیادہ ہی جلدی تھی اس لیے وہ کافی پہلے آگئی تھی۔

''آؤ میں تمہیں دوسرے لوگوں سے ملواؤں۔'' وہ نوید کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''مل لیں گے۔ اتنی جلدی کیا ہے۔'' میں نے ٹالتے ہوئے کہا۔ ''کلاس شروع ہونے میں دس منٹ رہ گئے ہیں۔''

''ابھی میرا موڈ تو نہیں ہے کلاس میں جانے کا۔'' وہ اٹھلاتے ہوئے بولی۔ ''ابھی تو سب لوگ کینٹین جارہے ہیں۔ وہاں بیٹھ کر کچھ دیر گپ شپ کریں گے تم بھی چلو نا۔''

''نہیں۔'' میں نے سختی سے کہا۔ ''میں یہاں پڑھنے آئی ہوں۔ وقت ضائع کرنے نہیں۔''

''جیسے تمہاری مرضی۔'' وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ ''میں تو تمہارے فائدے کے لیے ہی کہہ رہی تھی۔''

یہ کہہ کر وہ اٹھلاتی ہوئی چلی گئی اور میں سوچنے لگی کہ اس کے ساتھ جانے میں میرا کیا فائدہ ہوسکتا تھا اس کے علاوہ میرے ذہن میں اور بھی بہت سی باتیں آرہی تھیں۔ شہلا نے اس روز بھی بہت قیمتی سوٹ پہن رکھا تھا اور میں یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ ایک معمولی پرچون فروش کی لڑکی اس طرح کا لائف اسٹائل کیسے افورڈ کرسکتی ہے لیکن میں نے اپنے ذہن پر زیادہ زور نہیں دیا کیونکہ میری کریدنے اور کھوج لگانے کی عادت نہیں تھی۔ پیریڈ شروع ہونے والا تھا۔ لہٰذا میں نے کلاس روم کا رخ کیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ آدھے سے زیادہ طالب علم غائب تھے۔ ان میں شہلا اور نوید بھی شامل تھے۔

اس روز ان دونوں نے کوئی کلاس اٹینڈ نہیں کی۔ آخری کلاس ختم ہونے کے بعد جب میں بس میں سوار ہونے کے لیے پوائنٹ کی طرف جارہی تھی تو لائبریری کی سیڑھیوں کے پاس ہی مجھے شہلا اور نوید مل گئے۔ ان دونوں کے ہاتھ میں برگر اور کوک کی بوتلیں تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی نوید آگے بڑھا اور بڑی بے تکلفی سے بولا۔

''کچھ چلے گا؟''

''نو تھینکس۔'' میں نے بے رخی سے کہا۔ ''اب میں

گھر جا کر ہی کھانا کھاؤں گی۔"

"ہم بھی گھر جا رہے ہیں۔ راستے میں تمہیں ڈراپ کر دیں گے۔"

"نہیں میں بس سے چلی جاؤں گی۔" میں نے کہا اور تیز تیز قدموں سے چل دی۔

دوسرے دن بھی یہی ہوا۔ شہلا نے کوئی کلاس اٹینڈ نہیں کی۔ البتہ نوید مجھے نظر آیا اور میں سوچنے لگی کہ جب یہ کلاس میں موجود ہے تو شہلا کس کے ساتھ گھوم رہی ہے۔ پیریڈ ختم ہونے کے بعد جب میں کلاس سے باہر آئی تو اس سوال کا جواب بھی مل گیا۔ وہ کوریڈور میں کھڑی تین چار لڑکوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میرے پاس آئی اور بڑی محبت سے میرا ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔ "نیلی ڈیئر! کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں، چلو کینٹین چلتے ہیں۔"

مجھے انکار کرنا اچھا نہیں لگا۔ ویسے بھی اگلا پیریڈ خالی تھا۔ اس لیے اس کے ساتھ چلی گئی۔ اس نے چائے اور سموسے منگوائے پھر کہنے لگی۔ "تم سے تو اب تک بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا آتے ہی کلاسوں میں مصروف ہو گئیں۔"

"ہم یہاں پڑھنے کے لیے ہی تو آتے ہیں ورنہ تفریح کے لیے تو شہر میں بہت سی جگہیں ہیں۔"

"اوہ تو، ایسی بھی کیا جلدی۔ پڑھنے کے لیے تو سارا سال پڑا ہے۔" اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"دیکھو کلاس چھوڑنے میں ہمارا ہی نقصان ہے۔ اس بات کو یوں سمجھو کہ جو لیکچر ہمیں آج ملا ہے وہ دوبارہ نہیں ملے گا پھر اس کی کو کس طرح پورا کرو گی؟"

"تم کچھ بھی کہو۔" وہ چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے بولی۔ "ابھی میرا بالکل موڈ نہیں ہے کلاس میں جانے کا یہی تو دن ہیں لوگوں سے ملنے اور دوستیاں کرنے کے، تمہیں پتا ہے دوست بنانا میری ہابی ہے۔"

"یہ تمہاری سوچ ہو سکتی ہے لیکن میں اس سے متفق نہیں ہوں۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "ہماری پہلی ترجیح پڑھائی ہے ان دوستیوں سے تمہیں کیا حاصل ہوگا۔"

"تمہیں بتایا نا کہ دوست بنانا میری ہابی ہے۔ میں لوگوں میں خوش رہتی ہوں۔"

اس کے بعد میں نے اس سے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا جب ہم اٹھنے لگے تو وہ بولی۔ "نوید بہت اچھا لڑکا ہے۔ تمہیں اس کے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"میں نے کیا کیا ہے؟" میں چونکتے ہوئے بولی۔

"کل اس نے تمہیں بڑے خلوص سے اپنی گاڑی میں چھوڑنے کی پیشکش کی لیکن تم نے انکار کر کے اس کا دل توڑ دیا۔"

"گاڑی میں بیٹھنا تو دور کی بات ہے۔ مجھے تو لڑکوں سے بات کرتے ہوئے بھی جھجک محسوس ہوتی ہے۔"

"اب تم کسی گرلز کالج میں نہیں بلکہ یونیورسٹی میں پڑھ رہی ہو اور یہاں کا ماحول بالکل مختلف ہے۔ تمہیں تھوڑا سا بولڈ بننا پڑے گا ورنہ زندگی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ جاؤ گی۔"

"مجھے آگے نکلنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ میں جہاں ہوں جس حال میں ہوں خوش ہوں۔"

"آج نہیں تو کل تمہیں میری باتوں کا یقین آ جائے گا۔ فی الحال صرف یہی کہہ سکتی ہوں کہ نوید عام لڑکوں سے بہت مختلف ہے اگر تم اس کے ساتھ ڈھنگ سے دو چار باتیں کر لو گی تو تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا۔"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور ڈیپارٹمنٹ میں واپس چلی آئی۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ وہ مجھے نوید سے راہ و رسم بڑھانے کے لیے کیوں کہہ رہی ہے۔ جب کہ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ نوید تو خیر لڑکا تھا، ابھی تک میرا شہلا کے علاوہ کسی اور لڑکی سے بھی تعارف نہیں ہوا تھا اور نہ ہی مجھے اس کی کوئی جلدی تھی۔ میں اپنا سارا وقت پڑھائی کو دے رہی تھی۔ باقاعدگی سے کلاس اٹینڈ کرنے کے علاوہ میں نے خالی پیریڈ میں لائبریری جانا شروع کر دیا کیونکہ ٹیوشنز کی وجہ سے گھر پر مجھے پڑھنے کے لیے کم وقت ملتا تھا۔ اس لیے اس کی کو میں اس طرح پورا کر رہی تھی۔

ایک مہینے کے اندر ہی شہلا کے رنگ ڈھنگ بدل گئے۔ اس نے بڑی تیزی سے دوست بنائے تھے جن میں اکثریت لڑکوں کی تھی۔ وہ سب امیر گھرانوں کے بگڑے ہوئے نوجوان تھے جنہوں نے محض ڈگری کے حصول کے لیے یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا تاکہ اس کے بعد والدین کے اثر و رسوخ کی بنا کوئی اچھی پوسٹ مل جائے یا بیرون ملک اعلیٰ تعلیم کے لیے چلے جائیں۔ ان لڑکوں کے لیے پیسا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ اپنے باپ کی دولت پر خود بھی عیش کرتے اور دوستوں کو بھی مزے کرواتے تھے۔ شہلا بھی ان جیسی لگا

نیں ہاتھ دھو رہی تھی۔ وہ کبھی ایک لڑکے کے ساتھ نظر آتی تو کبھی دوسرے کے ساتھ لیکن اس نے میرا اور نوید کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ نوید تو ایک طرح سے اس کا مستقل پارٹنر تھا۔ وہ اپنا زیادہ وقت اسی کے ساتھ گزارتی اور ساتھ آتی جاتی تھی۔ وہ دن میں ایک بار مجھ سے بھی ملتی اور اکثر اپنے ساتھ کینٹین بھی لے جاتی۔ وہ مسلسل اسی کوشش میں لگی ہوتی تھی کہ میں نوید سے دوستی کرلوں۔ خدا جانے اس میں اس کا کیا مفاد تھا۔

ایک دن اس نے کینٹین میں بل دینے کے لیے پرس کھولا تو وہ نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اس کے پاس اتنے پیسے کہاں سے آئے۔ اس نے اپنے گھر کا جو نقشہ کھینچا تھا اس کے مطابق تو اس کے پاس بس کا کرایہ بھی نہیں ہونا چاہیے تھا۔ پہلی بار مجھے اس کے بارے میں جستجو ہوئی اور میں نے اس سے پوچھ ہی لیا۔

''اگر تم مائنڈ نہ کرو تو ایک بات پوچھوں؟'' میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''ہاں ہاں ضرور۔ اس میں مائنڈ کرنے والی کیا بات ہے تم میری عزیز ترین دوست ہو جو چاہو پوچھ سکتی ہو۔''

''تم نے تو کہا تھا کہ تمہارے والد کی چھوٹی سی کریانہ کی دکان ہے اور تم لوگوں کا گزارہ بڑی مشکل سے ہوتا ہے۔''

''ہاں یہی سچ ہے۔''

''لیکن تمہارا لائف اسٹائل تو کچھ اور ہی ظاہر کرتا ہے۔''

''یہ سب میری اپنی محنت اور ذہانت کا نتیجہ ہے ورنہ گھر سے تو مجھے صرف کرائے کے پیسے ملتے ہیں۔''

''کیسی محنت اور ذہانت؟'' میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم کوئی جاب کرتی ہو؟''

''یہی سمجھ لو۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''لیکن یہ کوئی نو سے پانچ والی جاب نہیں ہے بلکہ میں چلتے پھرتے اپنا کام کرتی ہوں تم مجھے سیلز گرل سمجھ سکتی ہو۔''

''لیکن تم بیچتی کیا ہو؟''

''جو ہاتھ لگ جائے اور جس چیز میں دو پیسے کا فائدہ ہو وہی بیچتی ہوں۔''

مجھے لگا جیسے وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ صبح سے شام تک یونیورسٹی میں رہنے کے بعد اس کے پاس اتنا وقت کہاں بچتا ہوگا کہ وہ گھر گھر جا کر چیزیں فروخت کرتی پھرے اور اس میں اتنی آمدنی بھی نہیں ہوتی۔ اس کا پرس تو نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ پرس تو کچھ اور ہی کہانی سنا رہا تھا۔ محنت کی کمائی سے اتنا نہیں ملتا۔ یقیناً وہ کوئی ناجائز کام کرتی ہے۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی اس نے بڑی ادا سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تم چاہو تو ہمارے ساتھ شامل ہو سکتی ہو۔ میں تمہیں بھی چار پیسے کمانے کا گر سکھا دوں گی۔''

''ہمارے؟'' میں نے چونکتے ہوئے کہا۔ ''کیا تمہارے ساتھ کوئی اور بھی اس کام میں شامل ہے۔''

''ہاں میں اور نوید مل کر یہ کام کرتے ہیں۔ وہ جو کہا ہے نا کسی نے کہ ایک سے دو اچھے ہوتے ہیں۔ نوید کی وجہ سے مجھے بہت سہولت ہے۔ بہت سا کام وہی نمٹا دیتا ہے لیکن اب ہمیں تیسرے آدمی کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ اسی لیے میں نے تمہیں اپنے ساتھ شامل ہونے کی دعوت دی ہے۔''

''بھئی مجھے تو معاف ہی رکھو۔'' میں نے اسے ٹالنے کی غرض سے کہا۔ ''مجھے اس کی اجازت نہیں ملے گی۔ میرے گھر والے تو ٹیوشن کرنے کے بھی خلاف ہیں۔ وہ مجھے کوئی اور کام کیوں کرنے دیں گے۔''

''انہیں بتانے کی ضرورت بھی کیا ہے۔'' وہ آنکھیں مٹکاتے ہوئے بولی۔ ''تم یہ کام یونیورسٹی ٹائم میں بھی کر سکتی ہو۔''

''معاف کرنا میں نے گھر والوں کو بتائے بغیر کبھی کوئی کام نہیں کیا۔ دوسری بات یہ کہ میں یہاں پڑھنے آتی ہوں اگر کسی کام میں لگ گئی تو پڑھائی کا حرج ہوگا۔''

''یہ پڑھائی تمہیں کیا دے گی۔'' اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''چار سال جھک مارنے کے بعد ڈگری ملے گی اس کے بعد بھی نوکری ملنے کی کوئی گارنٹی نہیں۔ ہمارے ساتھ کام کروگی تو کل سے ہی تمہارا میٹر چل پڑے گا۔''

''تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ تم کسی غلط چکر میں پھنس گئی ہو۔ ورنہ جائز آمدنی میں تو یہ اللے تللے نہیں ہو سکتے۔''

''اپنی اپنی سوچ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جسے تم غلط سمجھ رہی ہو۔ میرے نزدیک وہ صحیح ہو۔''

میں سمجھ گئی کہ پیسے کی کشش نے اسے اس حد تک مسحور کر دیا ہے کہ اسے غلط اور صحیح کی تمیز نہیں رہی۔ مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ وہ جان بوجھ کر ایک ایسے راستے کی طرف بڑھ رہی تھی جس کی کوئی منزل نہیں تھی اور اندھیرے اس کا

مقدر تھے جن میں وہ ساری عمر بھٹکتی رہتی۔ اس نے مجھے دوست کہا تھا۔ اس ناطے میرا فرض بنتا تھا کہ اسے تباہی کے راستے پر چلنے سے روکوں لیکن یہ تبھی ممکن تھا کہ مجھے اس کی سرگرمیوں کا پتا چل سکے۔ میرے لیے یہ جاننا ضروری تھا کہ وہ کیا کررہی ہے۔ کن لوگوں سے اس کا ملنا جلنا ہے اور اس کے پاس پیسا کہاں سے آرہا ہے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ میں اس کی پیشکش قبول کرلوں اور اس کے ساتھ شامل ہوکر معاملہ کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کروں۔ چنانچہ میں نے پینترا بدلتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے اگر تم سمجھتی ہو کہ یہ کوئی غلط کام نہیں ہے تو میں تمہارے ساتھ شامل ہونے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے کرنا کیا ہوگا؟“

”یہ میں بعد میں بتاؤں گی۔“ اس نے کہا۔ ”پہلے تم اپنے آپ کو ذہنی طور پر دو تین باتوں کے لیے تیار کرلو۔“

”وہ کیا؟“

”پہلی بات تو یہ کہ تمہیں تھوڑا بہت جھوٹ بولنے کی عادت ڈال لینی چاہیے۔ جب ہمارے ساتھ کام کروگی تو تمہیں کچھ وقت ہمارے ساتھ گزارنا ہوگا۔ اس کے لیے گھر والوں سے جھوٹ بولنا ہوگا۔ اگر وہ مطمئن ہوگئے تو تمہیں اپنا کام کرنے میں آسانی رہے گی۔ دوسری بات یہ کہ تمہیں تھوڑا سا سوشل ہونا پڑے گا۔ تم لڑکوں سے بات کرتے ہوئے جھجکتی ہو۔ یہ بہت بڑی خامی ہے۔ اسے دور کیے بغیر تم کامیاب نہیں ہوسکتیں تیسری اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ تمہیں ہر حال میں اپنا فائدہ دیکھنا ہے۔ کسی دوسرے کے نقصان سے تمہیں کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے اور نہ ہی اس سے ہمدردی کرنے یا ترس کھانے کی ضرورت ہے۔“

اس کی باتیں سن کر مجھے سو فیصد یقین ہوگیا کہ جس کام کو وہ اپنے تئیں صحیح سمجھ رہی ہے وہ سراسر غلط ہے اور اب وہ مجھے بھی اس راستے پر ڈالنے کی کوشش کررہی تھی لیکن میں اس کا ساتھ دینے پر رضامندی ظاہر کرچکی تھی اور اب میرے لیے پیچھے ہٹنا ممکن نہ تھا۔ میں نے سوچ لیا کہ ایک حد تک اس کا ساتھ دوں گی اور جہاں کہیں خطرہ محسوس ہوا، وہیں رک جاؤں گی۔ اصل مقصد تو اسے راہ راست پر لانا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی وہ بولی۔ ”تم بہت خوب صورت ہو لیکن اپنے آپ پر بالکل توجہ نہیں دیتیں۔ اب تمہارا واسطہ مردوں سے پڑے گا۔ ان سے قریب ہونے اور اپنا مطلب نکالنے کے لیے ضروری ہے کہ تم پرکشش نظر آؤ۔ اس کے لیے تمہیں اپنا حلیہ بدلنا ہوگا۔ تم بے شک گھر

میرا اللہ

ایک بزرگ کی شیطان سے بحث ہوگئی۔ شیطان نے پوچھا۔ تیرا اللہ کہاں ہے۔ بولے اللہ میرے پاس ہے۔ شیطان بولا تیرے پاس تو میں بھی کھڑا ہوں پھر بولے اللہ زندگی دیتا ہے، شیطان نے کہا یہ جنازے کیوں؟ بولے اللہ صحت دیتا ہے۔ شیطان نے کہا پھر اسپتال کیوں بیماروں سے بھرے پڑے ہیں۔ غرض یہ کہ بزرگ نے جو کچھ کہا کہ اللہ کرتا ہے۔ شیطان نے ثابت کردیا کہ اس کے برعکس بھی اللہ کرتا ہے۔ بہت پریشانی کا عالم تھا۔ اب وہ کیسے ثابت کریں، لمبی چوڑی، دلیلیں پیش کیں مگر سب کو شیطان نے توڑ کر رکھ دیا۔ ان بزرگ کے مرشد زندہ تھے، اس وقت وہ حاضر ہوئے انہوں نے کہا کہ شیطان سے کہو کہ میں نے اللہ کو دلیل کے بغیر جانا شیطان نے کہا تیرا مرشد کامل تجھے بچا گیا ورنہ تو اللہ کو دلیل سے ڈھونڈتا ہے اور میں اس کو دلیل سے توڑتا ہوں۔

اس لیے آپ اللہ کو دلیل سے نہ ڈھونڈنا آپ اس کو ایمان سے ڈھونڈنا۔

اقتباس، واصف علی واصف کی گفتگو

مرسلہ: خان یوسف، پشاور

گناہ

عذاب الٰہی سے بے خوف ہوجانا اور رحمت الٰہی سے مایوس ہوجانا سب سے بڑھا گناہ ہے۔

از کنزالعمال

انتخاب: رابعہ نعم، حیدرآباد

سے عبایا اور نقاب پہن کر آیا کرو لیکن یونیورسٹی میں نیک پروین بننے کی ضرورت نہیں۔ یہاں تمہیں ایک رنگین تتلی کی مانند نظر آنا ہوگا۔''

اس کی بات سن کر مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ لڑکوں کو بے وقوف بنا کر ان سے پیسے اور تحائف بٹورتی ہے لیکن یونیورسٹی میں پڑھنے والے طالب علم تو خود اپنے جیب خرچ کے لیے والدین کے محتاج ہوتے ہیں۔ وہ کسی لڑکی کی ناز برداریاں کیسے پوری کر سکتے ہیں۔ ویسے بھی میں نے بھی شہلا کو کسی لڑکے کے ساتھ یونیورسٹی سے باہر جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اس کی دوستی صرف ہائے ہیلو یا کینٹین میں بیٹھ کر کھانے پینے تک محدود تھی۔ یہ کوئی اور ہی چکر تھا اور مجھے اسی کا پتا لگانا تھا۔

گھر پہنچی تو رضوان میرا منتظر تھا۔ وہ میرا پھوپھی زاد ہے۔ اس نے حال ہی میں سی ایس ایس کا امتحان پاس کیا تھا اور اپنی تقرری کا انتظار کر رہا تھا۔ میں اسے پولیس کی وردی میں دیکھ کر حیران رہ گئی۔ جب اس نے بتایا کہ پولیس سروس میں شمولیت اختیار کر لی ہے اور اس کا تقرر بطور ڈی ایس پی ہمارے ہی شہر میں ہوا ہے تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ میں نے اسے مبارک باد دی تو وہ بولا۔ ''جلدی سے فریش ہو کر آجاؤ میں نے بھی ابھی تک تمہارے انتظار میں کھانا نہیں کھایا ہے۔''

رضوان میرا کزن ہی نہیں بلکہ بہت اچھا دوست بھی تھا۔ بچپن سے ہی ہمارے درمیان بڑی بے تکلفی تھی۔ میں اپنی بہت سی باتیں اس سے شیئر کر لیتی تھی اور وہ بھی مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا کرتا تھا۔ اسے ہمیشہ سے ہی پولیس میں جانے کا شوق تھا۔ جب اس نے سی ایس ایس کا امتحان دیا تب بھی اس کی یہی خواہش تھی کہ وہ پولیس میں جائے جب کہ میرا خیال تھا کہ وہ ایڈمنسٹریٹو سروس میں جائے اور سرکاری افسر بن کر مزے کرے۔ بہر حال اب وہ پولیس افسر بن گیا تھا تو میں بھی اس کی خوشی میں خوش تھی۔

کھانے کے بعد چائے کا دور چلا جب وہ جانے لگا تو اس نے مجھے اپنا وزیٹنگ کارڈ دیا اور بولا۔ ''اس پر میرا ذاتی اور دفتر کا نمبر درج ہے۔ اسے سنبھال کر رکھ لو۔ ضرورت پڑنے پر کام آئے گا۔''

میں نے وہ دونوں نمبر اپنے موبائل میں فیڈ کر لیے اور بولی۔ ''خالی کارڈ سے کام نہیں چلے گا۔ میں تو تم سے ٹریٹ لوں گی کسی اچھے سے ریسٹوران میں۔''

''فی الحال تو مٹھائی پر گزارہ کرو، تنخواہ ملنے پر ٹریٹ بھی دے دوں گا۔''

اس کے جانے کے بعد میں اپنے کمرے میں آ گئی اور شہلا کی باتوں پر غور کرنے لگی۔ میں شش و پنج میں مبتلا تھی کہ شہلا کی پیشکش قبول کروں یا نہیں۔ مجھے اس کام میں خطرہ نظر آ رہا تھا اور ڈر رہی تھی کہ کہیں شہلا کو بچاتے بچاتے خود ہی نہ پھنس جاؤں لیکن میری فطرت میں تھوڑا سا ایڈونچر بھی شامل ہے۔ دوسرے اب مجھے یہ تجسس ہو گیا تھا کہ شہلا آخر ایسا کیا کام کر رہی ہے جس میں اسے اچھی خاصی آمدنی ہو رہی ہے۔ جب ایڈونچر اور تجسس مل جائیں تو آدمی خطروں کی پروا نہیں کرتا لہٰذا میں نے بھی فیصلہ کر لیا کہ کچھ دن شہلا کے ساتھ رہ کر دیکھتی ہوں اگر مجھے کوئی خطرہ محسوس ہوا تو خاموشی سے الگ ہو جاؤں گی۔

دوسرے دن میں نے یونیورسٹی جانے سے پہلے اپنے بناؤ سنگھار پر خاص توجہ دی کیونکہ صبح کے وقت گھر میں خاصی افرا تفری ہوتی تھی اور امی چھوٹے بہن بھائیوں کا ناشتا دینے میں مصروف ہوتی تھیں۔ اس لیے انہوں نے مجھ پر کوئی توجہ نہیں دی۔ ویسے بھی میں کمرے سے عبایا پہن کر باہر آتی تھی۔ اس لیے وہ یہ دیکھ ہی نہیں سکیں کہ میں نے انتہائی چست قمیص پہن رکھی ہے۔ جس میں میرے جسمانی خطوط پوری طرح واضح ہو رہے تھے۔

یونیورسٹی پہنچ کر میں نے عبایا بیگ میں رکھا اور شہلا کی تلاش میں نکل گئی۔ پہلا پیریڈ شروع ہو چکا تھا لیکن میں نے اس کی پروا نہیں کی۔ شہلا نے مجھے دیکھا تو خوشی سے چہکتے ہوئے بولی۔ ''ہاؤ سویٹ، اس لباس میں تو تم قیامت ڈھا رہی ہو۔ آج تو نہ جانے کتنے لوگ تمہیں دیکھ کر گھائل ہو جائیں گے۔''

''فضول باتیں مت کرو۔'' میں نے جھینپتے ہوئے کہا۔ ''یہ بتاؤ کیا پروگرام کیا ہے؟''

''آؤ میں تمہیں کچھ لوگوں سے ملواتی ہوں۔ پروگرام خود بخود بن جائے گا۔''

وہ مجھے ڈیپارٹمنٹ کے عقب میں واقع لان میں لے گئی جہاں چار پانچ لڑکے گھاس پر بیٹھے سگریٹ نوشی کر رہے تھے۔ ان کی آنکھیں سرخ تھیں اور چہرے پر عجیب سی وحشت چھائی ہوئی تھی۔ میں ان میں سے کسی کو نہ پہچان سکی۔ شاید وہ ہمارے ڈیپارٹمنٹ کے نہیں تھے۔ میں نے اس سے پہلے کسی کو نشہ کرتے نہیں دیکھا تھا لیکن نہ جانے مجھے

کیوں ایسا لگا کہ وہ سب نشے میں ہیں۔ شہلا نے ان پر ایک نظر ڈالی اور بولی۔ ''ارشد کہاں ہے؟''

''وہ ابھی تک نہیں آیا۔'' ان میں سے ایک لڑکا بولا۔

''اگر کوئی کام ہے تو مجھے بتاؤ۔''

''نہیں کوئی کام نہیں ہے۔'' شہلا نے تنک کر کہا۔

''وہ نظر آجائے تو اسے کہنا کہ مجھ سے مل لے۔''

یہ کہہ کر وہ مجھے لے کر وہاں سے چل دی۔ میں نے راستے میں اس سے پوچھا۔ ''یہ لڑکے کون تھے اور تم نے ان سے میرا تعارف کیوں نہیں کروایا؟''

''دفع کرو انہیں۔'' وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''اس وقت ان کی حالت ایسی نہیں تھی کہ میں ان سے تمہارا تعارف کرواتی۔''

میں سوچ رہی تھی کہ ان لڑکوں کے پاس جاتے ہی شہلا کا ارادہ کیوں بدل گیا جب کہ وہ مجھے کچھ لوگوں سے ملوانے کے لیے ہی وہاں گئی تھی۔ اس سے زیادہ حیرت مجھے اس بات پر ہو رہی تھی کہ شہلا کا ان لڑکوں سے کیا تعلق تھا۔ ان کی ظاہری حالت ایسی نہیں تھی کہ کوئی شریف لڑکی ان سے دوستی کرے۔ مجھے یاد آیا کہ ان میں سے ایک لڑکا بار بار شہلا کی جانب دیکھ رہا تھا جیسے کچھ کہنا چاہ رہا ہو لیکن میری وجہ سے اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ پھر میں نے دیکھا کہ وہی لڑکا تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا شہلا کے پاس آیا اور سرگوشی کے انداز میں بولا۔ ''کچھ ہے؟''

شہلا نے پہلے مجھے دیکھا اور پھر اسے گھورتے ہوئے بولی۔ ''دفع ہو جاؤ میں نے کوئی دکان نہیں کھول رکھی۔''

وہ لڑکا الٹے قدموں واپس چلا گیا۔ میں نے پوچھا۔

''کیا کہہ رہا تھا؟''

''کچھ نہیں، سگریٹ مانگ رہا تھا۔''

''تم سگریٹ پیتی ہو۔'' میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

''ارے نہیں۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''یونہی ایک آدھ دفعہ نوید کے ساتھ دو چار کش لے لیے تھے۔ اس نے دیکھ لیا۔ وہ یہی سمجھ رہا ہوگا کہ میں سگریٹ پیتی ہوں۔ اس لیے مانگنے آگیا۔''

''دیکھ لیا تم نے۔ لڑکوں سے دوستی کرنے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے۔ ذرا سی لفٹ کرا دو تو سر پر چڑھ کر ناچنے لگتے ہیں۔''

''کیا کیا جائے۔'' وہ ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولی۔ ''دودھ دینے والی گائے کی دو لاتیں بھی سہنا پڑتی ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ یہی لڑکے ہمیں عیش بھی کرواتے ہیں۔ اس کا اندازہ تمہیں اس وقت ہوگا جب تم خود کسی امیر کبیر لڑکے سے دوستی کرو گی۔ اسی لیے تمہیں ارشد سے ملوانا چاہ رہی ہوں۔''

''یہ کام مجھ سے نہیں ہوگا۔''

''کون سا کام؟'' وہ انجان بنتے ہوئے بولی۔

''میں کبھی کسی لڑکے سے بے تکلف نہیں ہوئی۔ دوستی تو بہت دور کی بات ہے۔'' میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''تم خود اس سے دوستی کیوں نہیں کر لیتیں۔ مجھے کیوں آگے بڑھا رہی ہو؟''

''اس کی دو وجوہات ہیں۔ پہلی تو یہ کہ وہ مجھے نوید کی گرل فرینڈ سمجھتا ہے۔ اس لیے شاید وہ میرے قریب ہونے کی کوشش نہ کرے۔ دوسری وجہ یہ کہ میں تمہارا فائدہ چاہتی ہوں۔ تمہیں اپنے گروپ میں شامل کرنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ تمہارے ہاتھ میں بھی چار پیسے آئیں اور تم اس تنگدستی کی زندگی سے نجات حاصل کر سکو۔''

''میں لعنت بھیجتی ہوں ایسے پیسوں پر۔'' میں نے جل کر کہا۔ ''میں تو صرف اس لیے تمہارا ساتھ دے رہی تھی کہ تمہیں اس دلدل سے نکال سکوں جس میں تم دھنستی جا رہی ہو۔''

''تم میری فکر چھوڑو میں اس راستے پر اتنی دور نکل آئی ہوں کہ اب واپسی مشکل ہے۔ میں اس عیش و عشرت کی زندگی کو نہیں چھوڑ سکتی۔ میرے باپ کی تو اتنی بھی حیثیت نہیں کہ وہ مجھے سال میں ایک جوڑ اپنا کر دے سکے۔''

ابھی ہم یہ باتیں کر رہے تھے کہ سامنے سے ارشد آگیا۔ اسے دیکھتے ہی شہلا بولی۔ ''اس سے ذرا ڈھنگ سے مل لینا۔ اس کے بعد تمہاری مرضی۔''

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتی۔ وہ بالکل ہمارے قریب آگیا۔ اس نے باری باری ہم دونوں کو دیکھا اور شہلا کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''کیا بات ہے۔ مجھے کیوں ڈھونڈ رہی تھیں؟''

''کچھ نہیں۔'' شہلا سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ ''ان سے ملو یہ میری بہت ہی اچھی دوست نائلہ ہیں۔ ہمارے ڈیپارٹمنٹ میں ہی ہوتی ہیں۔''

''ہاں دیکھا تو ہے لیکن کبھی بات نہیں ہوئی۔'' وہ

میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ پھر اس نے شہلا سے کہا۔ ''یہاں کیوں کھڑی ہو۔ چلو کینٹین میں بیٹھتے ہیں۔''

''تم نائلہ کے ساتھ چلے جاؤ۔ میں ذرا نوید کو دیکھ لوں۔ صبح سے وہ بھی نظر نہیں آیا۔'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد ارشد نے کہا۔

''کیا آپ میرے ساتھ چائے پینا پسند کریں گی؟''

جی چاہا کہ انکار کردوں لیکن یہ بدتہذیبی ہوتی۔ یونیورسٹی کے ماحول میں یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں بہت سے لڑکے لڑکیاں ساتھ گھومتے پھرتے اور کینٹین میں بیٹھ کر گپیں لگایا کرتے تھے پھر اس کی شخصیت میں بھی کچھ اتنی کشش تھی کہ میں انکار نہ کرسکی اور اس لمحے میرے اندر کی وہ لڑکی بیدار ہوگئی جو نوجوانی کی حدود میں قدم رکھتے ہی خوابوں کے شہزادے کا انتظار کرنے لگتی ہے چنانچہ میں نے اثبات میں سرہلا دیا اور اس کے ساتھ کینٹین چلی گئی۔

اس نے چائے اور سموسے منگوائے پھر کہنے لگا۔

''یقین کرو نائلہ جب میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا تو دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ تم سے دوستی کروں لیکن تمہارا رویہ دیکھ کر ہمت نہیں ہوئی کیونکہ تم پہلے دن سے ہی بہت ریزرو تھیں۔ میں نے تمہیں کسی لڑکے کے یا لڑکی کے ساتھ بے تکلف ہوتے نہیں دیکھا۔ اس لیے میری بھی ہمت نہیں ہوئی۔''

وہ ایک دم ہی آپ سے تم پر آگیا تھا۔ اس کی یہ بے تکلفی مجھے اچھی لگی۔ چنانچہ میں نے بھی اس کے لیے تم کا صیغہ استعمال کرتے ہوئے کہا۔ ''ہاں یہ پہلا موقع ہے کہ کسی غیر لڑکے سے بات کررہی ہوں اور یہ بھی شہلا کی مہربانی ہے ورنہ میں اب بھی اپنے ہی خول میں بند رہتی۔''

''کیا تمہیں میرے ساتھ بیٹھنا اچھا نہیں لگ رہا؟''

''اب آہی گئی ہوں تو اچھا برا کیا؟'' میں نے خشک لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''دراصل یہ میرے مزاج کے خلاف ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ مجھے شروع سے ہی ایسا ماحول ملا جس میں لڑکوں سے ملنے یا بات کرنے کے مواقع نہیں تھے۔''

''خیر اب تو وہ ماحول نہیں ہے یہاں سب لوگ ایک دوسرے سے بے تکلف ہیں اور اگر کوئی لڑکا کسی لڑکی سے بات کرلے تو اسے معیوب نہیں سمجھا جاتا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لڑکے، لڑکیوں سے ہی دوستی کرنا کیوں چاہتے ہیں۔ وہ لڑکوں کو دوست کیوں نہیں بناتے؟''

''تمہارا خیال غلط ہے۔ سب لڑکے ایک جیسے نہیں ہوتے۔ میری مثال تمہارے سامنے ہے۔ میں نے آج تک کسی لڑکی کو دوست نہیں بنایا۔ تم پہلی لڑکی ہو جس کی طرف میں نے دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے۔ کیا تم مجھ سے دوستی کروگی؟''

اس نے کچھ اس انداز میں یہ بات کہی کہ میں انکار نہ کرسکی۔ ویسے بھی وہ دیکھنے میں خاصا مہذب اور شریف لگ رہا تھا۔ اس کا بات چیت کرنے کا انداز بھی عام لوگوں سے مختلف تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر ایک امیر اور ہینڈسم لڑکا میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا رہا ہے تو اسے انکار کرنا کفران نعمت ہوگا۔ پھر بھی میں نے اپنی بات رکھنے کے لیے کہا۔ ''ویسے تو میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتی لیکن تمہیں انکار کرنا بھی اچھا نہیں لگ رہا لیکن میری ایک شرط ہے۔''

''وہ کیا؟'' اس نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

''میں یہاں پڑھنے کے لیے آئی ہوں۔ اس لیے تمہاری خاطر کوئی کلاس نہیں چھوڑوں گی۔ ہماری ملاقات خالی پیریڈ میں ہوا کرے گی۔''

''میں جانتا ہوں کہ تم کوئی کلاس نہیں چھوڑتیں اور میں بھی تمہیں اس کے لیے مجبور نہیں کروں گا۔''

''میری دوسری شرط یہ ہے کہ ہماری دوستی صرف یونیورسٹی تک محدود ہوگی۔ میں تمہارے ساتھ کہیں باہر نہیں جاؤں گی۔''

''مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے لیکن میری بھی ایک شرط ہے۔'' اس نے چائے کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''چلو، تم بھی اپنی شرط بتادو۔'' میں نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''جب کلاس نہ ہورہی ہو تو تم سارا وقت میرے ساتھ گزاروگی۔ یہ نہ ہو کہ میں پاگلوں کی طرح تمہیں ڈھونڈتا رہوں۔''

''یہ مناسب نہیں ہوگا۔'' میں نے نرمی سے کہا۔ ''اس طرح لوگوں کو باتیں بنانے کا موقع مل جائے گا اور میں ایسا نہیں چاہتی۔''

''یہاں سب اپنے حال میں مست ہیں۔ کسی کو اتنی

فرصت نہیں کہ وہ دوسروں پر نظر رکھے۔ تم بلاوجہ ہی گھبرا رہی ہو۔"

"پھر بھی ہمیں اعتدال سے کام لینا چاہیے کسی بھی چیز کی زیادتی ٹھیک نہیں ہوتی۔"

"اچھا بابا ٹھیک ہے۔ جیسے تمہاری مرضی۔ میرے لیے یہی بہت ہے کہ تم جیسی لڑکی میری دوست بن جائے۔"

میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ پیریڈ شروع ہونے والا تھا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔ "چلو کلاس کا وقت ہو رہا ہے۔"

"پھر کب ملو گی؟" اس نے مجھے پُرشوق نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"جب خدا کو منظور ہوا۔" میں مسکراتے ہوئے بولی۔

"کوئی بات نہیں۔ میں اس وقت کا انتظار کروں گا۔" اس نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

میں نے اس سے کہا کہ وہ میرے جانے کے پانچ منٹ بعد یہاں سے روانہ ہو۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ کوئی مجھے اس کے ساتھ کینٹین سے باہر نکلتے ہوئے دیکھے۔ کوریڈور سے گزرتے ہوئے میری نظر شہلا پر پڑی۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ لپک کر میرے پاس آئی اور بولی۔ "کیسا رہا؟"

"پھر بتاؤں گی۔ اس وقت تو کلاس میں جا رہی ہوں تم بھی چلو۔"

"میرا موڈ نہیں ہے۔" اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا اور واپس اپنے گروپ میں چلی گئی۔

میں سوچنے لگی کہ جب اس لڑکی کو پڑھنا نہیں ہے تو اس نے یونیورسٹی میں داخلہ کیوں لیا۔ یقیناً وہ کوئی ایسا کام کر رہی ہے جس میں اسے زیادہ کشش نظر آتی ہے۔ اسی لیے اس کا پرس بھی نوٹوں سے بھرا رہتا ہے۔ اتنا تو میں بھی جانتی تھی کہ کسی جائز کام میں اتنی آمدنی نہیں ہوتی۔ ضرور وہ کسی ناجائز سرگرمی میں ملوث ہو گئی ہے اور مجھے اسی کا پتا لگانا تھا۔ اسی لیے اس کے کہنے پر میں نے ارشد سے دوستی کی تھی تاکہ اس کے گروپ تک رسائی حاصل کرلوں۔ اسی طرح مجھے حقیقت کا پتا چل سکتا تھا۔

کلاس ختم ہوئی تو میں گھر جانے کے ارادہ سے پوائنٹ کی طرف جانے لگی۔ راستے میں شہلا مل گئی۔ وہ نوید کے ساتھ تھی۔ اس نے نوید سے کچھ کہا ہوگا۔ تبھی وہ پارکنگ کی طرف چل دیں اور شہلا میرے پاس آ کر بولی۔ "اب بتاؤ کیسی رہی ملاقات کیا باتیں ہوئیں؟"

"مجھے پتا ہوتا کہ تمہیں سب کچھ بتانا ہوگا تو پوری گفتگو ریکارڈ کرلیتی۔ بہرحال اچھی رہی۔ وہ مجھ سے دوستی کرنا چاہتا ہے۔"

"اوہ، ہاؤ یو آر لکی۔" وہ چہکتے ہوئے بولی۔ "ایک امیرزادہ تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا رہا ہے پھر تم نے کیا جواب دیا؟"

"مجھے اس کی امارت سے کیا لینا دینا۔" میں منہ بناتے ہوئے بولی۔ "تم تو جانتی ہو کہ مجھے لڑکوں سے بات کرتے ہوئے بھی جھجک محسوس ہوتی ہے۔ آج بھی تمہارے کہنے پر اس کے ساتھ چلی گئی تھی۔"

"بے وقوف ہو تم۔" وہ ناراض ہوتے ہوئے بولی۔ "ایسے مواقع خوش نصیبوں کو ملتے ہیں۔ اس سے دوستی کرلو۔ فائدے میں رہو گی۔"

"اچھا سوچوں گی۔" میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس معاملے میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہی تھی۔ اگر میں ارشد سے دوستی کرلوں تو اسے کیا فائدہ ہوگا۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے ارشد کی امارت سے زیادہ اس کی شخصیت نے متاثر کیا تھا۔ اسی لیے میں نے اس کے ساتھ چند باتیں کرلی تھیں اور دل میں ایک خواہش جڑ پکڑنے لگی تھی کہ آئندہ بھی اس سے ملتی رہوں۔ شاید وہ مجھے اچھا لگا تھا۔

گھر پہنچی تو رضوان کو اپنا منتظر پایا۔ وہ اس وقت بھی پولیس کی وردی میں تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔ "یار کہاں رہ گئی تھیں۔ اتنی دیر سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ اسی لیے ابھی تک کھانا بھی نہیں کھایا۔"

"بھوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے۔ حالانکہ میں نے آخری پیریڈ ختم ہوتے ہی دوڑ لگا دی تھی لیکن راستے میں زیادہ ٹریفک ہونے کی وجہ سے دیر ہو گئی۔"

"اچھا تم کپڑے تبدیل کرلو۔ میں کھانا لگاتی ہوں۔" امی نے کہا۔

کھانے کے دوران کوئی بات نہیں ہوئی۔ میں جانتی تھی کہ رضوان کو کھانے کے بعد چائے پینے کی طلب ہوتی ہے۔ امی کسی کام میں مصروف ہو گئی تھیں۔ اس لیے میں چائے بنانے چلی گئی۔ چائے پینے کے دوران رضوان نے پوچھا۔ "تمہاری پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟"

"بس ٹھیک ہی ہے۔"

''اور سناؤ، یونیورسٹی میں نئے دوست بنائے یا ابھی تک اپنی دنیا میں ہی مگن ہو۔''

''سچی بات تو یہ ہے کہ میں ابھی تک وہاں کے ماحول میں ایڈجسٹ نہیں ہو سکی۔ اس لیے دوست بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بس کبھی کبھار ایک دو لوگوں سے بات ہو جاتی ہے۔''

''یہ ٹھیک نہیں ہے۔ تمہیں تھوڑا سا سوشل ہونا چاہیے۔ لوگوں سے تعلقات بڑھانے میں کئی فائدے ہیں۔ بہت سے کام ہو جاتے ہیں۔''

''میں نہیں سمجھتی کہ یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹس سے تعلقات قائم کر کے مجھے کیا فائدہ ہوگا۔''

''میں سمجھتا ہوں۔'' رضوان نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''جب تم لوگوں میں گھل مل جاؤ گی تو بہت سی ایسی باتوں کا پتا چلے گا جو ابھی تک تمہارے علم میں نہیں ہیں۔ دراصل مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ اس لیے یہ بات کہہ رہا ہوں۔''

''میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں؟'' میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

''ہمیں اطلاع ملی ہے کہ ایک گروہ تعلیمی اداروں میں منشیات کی فروخت میں ملوث ہے اور یونیورسٹی میں بھی اس کے کارندے موجود ہیں۔ انہوں نے کچھ اسٹوڈنٹس کو اپنے ساتھ ملا لیا ہے جو اپنے ساتھیوں کو اس لعنت میں مبتلا کر رہے ہیں۔ تم اگر اپنے تعلقات کا دائرہ وسیع کر لو تو ان لوگوں تک پہنچ سکتی ہو۔ اگر ان میں سے ایک بھی ہمارے ہتھے چڑھ گیا تو باقی لوگوں پر ہاتھ ڈالنا آسان ہو جائے گا۔''

''لیکن یہ کام تو تمہارا کوئی مخبر بھی کر سکتا ہے۔'' میں نے اپنی جان چھڑانے کے لیے کہا۔

''کسی بھی مخبر کے لیے باقاعدگی سے یونیورسٹی جانا اور لوگوں سے تعلقات بڑھانا آسان نہ ہوگا۔ وہ فوراً ہی نظروں میں آ جائے گا۔ یہ کام صرف تم ہی کر سکتی ہو۔''

رضوان کی بات سنتے ہی میری نگاہوں کے سامنے وہ منظر گھوم گیا جب شہلا میرے ساتھ ارشد کو ڈھونڈتی ہوئی ان لڑکوں کے پاس گئی تھی جو مجھے نشے میں لگ رہے تھے۔ پھر ان میں سے ایک لڑکے نے شہلا کے پاس آ کر کہا تھا۔ ''کچھ ہے؟'' اور شہلا نے تڑخ کر جواب دیا تھا۔ ''میں نے کوئی دکان نہیں لگا رکھی۔ یہ سوچتے ہی میں سناٹے میں آ گئی۔''

کیا شہلا بھی اس گھناؤنے کاروبار میں ملوث ہے۔ کیا اس کے یہ ٹھاٹ باٹ اسی ناجائز کمائی کی بدولت ہیں۔ مجھے فوراً اس سے دوری اختیار کر لینی چاہیے۔ کہیں میں بھی اس کی وجہ سے کسی چکر میں نہ پھنس جاؤں لیکن اس گروہ کا پتا لگانے کے لیے مجھے اس کے اور قریب ہونا پڑے گا جب تک میں اپنی آنکھوں سے اسے منشیات سپلائی کرتے ہوئے نہ دیکھ لوں۔ مجھے یقین نہیں آئے گا۔

''بولو کیا تم میری مدد کرنے کے لیے تیار ہو؟'' رضوان نے کہا۔

''کوشش کروں گی لیکن مجھے کامیابی کا بہت زیادہ یقین نہیں ہے کیونکہ یہ لوگ بڑے خفیہ طریقے سے اپنا کام کرتے ہوں گے۔''

''اس کا آسان طریقہ میں بتا دیتا ہوں۔ تم کسی ایسے لڑکے کو تلاش کرو جو بھرے ہوئے سگریٹ پی رہا ہو اس سے دوستی بڑھاؤ اور پوچھو کہ یہ سگریٹ کہاں سے ملتا ہے۔ وہ تمہیں بتا دے گا۔ اس کے بعد تمہارا کام آسان ہو جائے گا۔''

''توبہ کرو۔ میں کسی ایسے لڑکے سے کیسے دوستی کر سکتی ہوں جو نشہ کا عادی ہو.... کیا پتا وہ کوئی الٹی سیدھی حرکت کر بیٹھے۔ نہیں یہ کام مجھ سے نہیں ہوگا۔ میں کوئی اور طریقہ سوچتی ہوں۔''

دوسرے دن یونیورسٹی گئی تو سلور جوبلی گیٹ پر ہی ارشد سے ملاقات ہو گئی۔ اس روز پوائنٹ کی بس نکل گئی تھی۔ اس لیے مجھے کوچ سے جانا پڑا جو مین روڈ پر اتار دیتی تھی۔ وہاں سے ڈیپارٹمنٹ تک پیدل جانا پڑتا تھا۔ ابھی میں نے چند قدم کا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ ایک کار میرے قریب آ کر رکی۔ اسے ارشد چلا رہا تھا۔ اس نے پسنجر سیٹ کی طرف والا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ''آ جاؤ۔''

''کوئی بات نہیں۔ میں چلی جاؤں گی۔'' میں نے تکلفاً کہا۔ حالانکہ تیز دھوپ اور گرمی میں ایک قدم چلنا بھی دشوار ہو رہا تھا۔

''بیٹھ جاؤ۔ دو منٹ کی تو بات ہے۔'' اس نے اصرار کیا تو میں بیٹھ گئی۔ پارکنگ سے پہلے سڑک کے کنارے ایک کیبن تھا۔ ارشد نے گاڑی وہاں روکی اور بولا۔ ''کولڈ ڈرنک پیو گی۔ گرمی بہت ہے۔ میرا تو حلق خشک ہو رہا ہے۔''

میں نے گھڑی دیکھی تو وہ بولا۔ ''ابھی کلاس شروع

ہونے میں پندرہ منٹ ہیں۔"

اس کے بعد ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ جب میں گاڑی سے اترنے لگی تو اس نے کہا۔ "نائلہ ایک بات سنو۔"

"ہاں بولو۔"

"پہلے وعدہ کرو کہ ناراض نہیں ہو گی اور نہ ہی غصہ کرو گی۔ اگر تمہیں یہ بات پسند نہ آئے تو اسے نظر انداز کر دو گی۔ جیسے میں نے کچھ کہا ہی نہیں۔"

"اوہو بھئی اتنی لمبی تمہید کیوں باندھ رہے ہو۔ جو کہنا ہے کہہ ڈالو میں بالکل ناراض نہیں ہوں گی۔"

اس نے پچھلی سیٹ پر رکھا ہوا شاپر اٹھایا اور اس میں سے ایک ڈبہ نکالتے ہوئے کہا۔ "آج ہماری دوستی کا پہلا دن ہے۔ اس خوشی کے لمحے کو یادگار بنانے کے لیے میری طرف سے ایک حقیر تحفہ قبول کرو۔"

میں نے ڈبے کو سرسری طور سے دیکھا۔ وہ ایک جدید ماڈل کا موبائل فون تھا۔ اس کی قیمت میرے اندازے کے مطابق پندرہ بیس ہزار سے کم نہیں ہو گی۔ میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "سوری میں یہ تحفہ نہیں لے سکتی۔"

"کیوں؟" اس نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"میں نے تحفے بٹورنے کے لیے تم سے دوستی نہیں کی اور میری اتنی حیثیت نہیں کہ تمہیں بھی ایسا ہی کوئی تحفہ دے کر حساب برابر کر سکوں۔"

"جانتا ہوں کہ تمہارے اندر انا کا مادہ بہت ہے اور تم نے کسی لالچ کے تحت مجھ سے دوستی نہیں کی لیکن یہ تحفہ تو تمہیں لینا ہی ہو گا ورنہ میں سمجھوں گا کہ تم نے میرے خلوص کی قدر نہیں کی۔"

اس نے کچھ ایسی لجاجت سے یہ بات کہی کہ میرا دل پسیج گیا پھر بھی میں نے اپنی بات رکھنے کے لیے کہا۔ ایک شرط پر میں یہ تحفہ قبول کر سکتی ہوں۔ وعدہ کرو کہ آئندہ تم مجھے کوئی تحفہ نہیں دو گے۔

"ٹھیک ہے۔" وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔

"مجھے تمہاری شرط منظور ہے۔"

میں نے وہ موبائل بیگ میں رکھا اور گاڑی سے اتر کر ڈیپارٹمنٹ کی طرف چل دی۔ اس وقت میری حالت ایسی تھی جیسے کوئی چوری کا مال لے کر جا رہی ہوں۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ شہلا سے سامنا ہو۔ کہیں وہ چہرہ پڑھ کر میرے دل کا حال نہ جان لے۔ وہ سارا دن بے چینی کے عالم میں گزرا۔ مجھے سب سے زیادہ فکر یہ تھی کہ اس موبائل کو کہاں چھپا کر رکھوں گی۔ گھر میں تو اس کے استعمال کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

میں مسلسل شہلا کی ٹوہ میں لگی ہوئی تھی کہ کسی طرح اسے رنگے ہاتھوں پکڑوں لیکن ایسا کوئی موقع ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ کبھی کبھی تو میں سوچنے لگتی کہ بلاوجہ ہی اس پر شک کر رہی ہوں۔ اب میں اپنا فارغ وقت زیادہ تر اسی کے ساتھ گزارتی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ اِدھر اُدھر لیے پھرتی لیکن میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ اس نے کسی ضرورت مند کو اس کے مطلب کی چیز فراہم کی ہو۔ اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی تھیں۔ میرا اندازہ غلط تھا یا پھر وہ بڑی ہوشیاری سے اپنا کام کرتی تھی کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔

ایک دن میں کلاس روم سے باہر آئی تو بہت تیز بارش ہو رہی تھی۔ سب لوگ کوریڈور میں کھڑے ہو کر بارش رکنے کا انتظار کرنے لگے۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ ان میں زیادہ تر اجنبی چہرے تھے۔ میری کلاس کے بیشتر لوگ پہلے ہی جا چکے تھے۔ صرف میں ہی بے وقوف تھی جو پڑھنے کے شوق میں آخری پیریڈ تک بیٹھی رہی۔ اب مجھے گھر جانے کی فکر لاحق ہو گئی۔ پوائنٹ کی بس جا چکی تھی اور سڑک پر پانی کھڑا ہو گیا تھا۔ اگر بارش رک بھی جاتی تو میرے لیے سلور جوبلی گیٹ تک پہنچنا مشکل تھا اور وہاں سے بھی بس ملنے کا بہت کم امکان تھا کیونکہ بارش ہوتے ہی سڑکوں سے ٹرانسپورٹ غائب ہو جاتی ہے۔

ابھی میں انہی سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھی کہ ارشد گاڑی لے کر وہاں آ گیا۔ اس نے سیٹ پر بیٹھے بیٹھے ہی مجھے آنے کا اشارہ کیا۔ یہ نخرے دکھانے کا وقت نہیں تھا۔ اس لیے ایک لمحہ کی تاخیر کیے بغیر میں دوڑتی ہوئی اس کی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ پھر بھی میں اچھی خاصی بھیگ چکی تھی۔ میں نے دوپٹا اپنے جسم کے گرد اچھی طرح لپیٹ لیا اور کپکپاتے ہوئے بولی۔ "اچھا ہوا تم اس وقت مل گئے۔ ورنہ بڑی مشکل ہو جاتی۔"

"تمہیں پہلے ہی چلے جانا چاہیے تھا۔ ایک دو پیریڈ چھوڑ دینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"تم بھی تو ابھی تک نہیں گئے۔" میں نے اسے چڑانے کے لیے کہا۔

"میری بات اور ہے۔" اس نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "میں مرد ہوں پھر میرے پاس

گاڑی بھی ہے۔ میں دو گھنٹے بعد بھی جا سکتا ہوں لیکن تم وقت پر نہیں پہنچو گی تو گھر والے پریشان ہو جائیں گے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" میں نے جھینپتے ہوئے کہا۔ "آئندہ خیال رکھوں گی۔"

میرا خیال تھا کہ راستے میں کسی ایسی جگہ اتر جاؤں گی جہاں سے مجھے اپنے گھر کی بس مل سکے لیکن دور دور تک کوئی ٹرانسپورٹ نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس نے میری پریشانی بھانپتے ہوئے کہا۔ "تم مجھے گھر کا پتا بتاؤ میں وہیں چھوڑ دوں گا۔"

وہ ڈیفنس میں رہتا تھا اور میں نارتھ کراچی میں۔ مجھے بڑی شرمندگی ہو رہی تھی کہ وہ مجھے گھر تک چھوڑنے کی خاطر اتنا بڑا فاصلہ طے کرے گا لیکن مجبوری تھی۔ اس لیے میں نے اسے گھر کا پتا بتا دیا۔

اس کے بعد میرا حجاب کھل گیا اور میں اکثر اس کے ساتھ واپسی میں جانے لگی۔ شہلا مسلسل میری حوصلہ افزائی کر رہی تھی۔ وہ اکثر مجھ سے پوچھتی کہ ارشد نے مجھے تحفہ وغیرہ دیا کہ نہیں۔ میرا جواب سن کر وہ مایوس ہو جاتی اور کہتی۔ "ایسی دوستی کا کیا فائدہ جس میں تمہارے ہاتھ کچھ نہ آئے۔ وہ امیر گھر کا لڑکا ہے اس سے جو وصول کر سکتی ہو کر لو۔"

اس کی باتیں مجھے زہر لگتی تھیں لیکن رضوان کی خاطر اس سے تعلق قائم رکھنے پر مجبور تھی۔ ویسے ابھی تک مجھے کوئی کامیابی نہیں ہوئی تھی بہرحال میں کوشش میں لگی ہوئی تھی کہ اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لوں۔ میں دیکھ رہی تھی کہ یونیورسٹی کے آوارہ لڑکوں کے ساتھ اس کا میل جول بڑھ گیا تھا اور وہ اکثر اس کے گرد منڈلاتے رہتے ہیں۔ مجھے نوید پر حیرت ہوتی تھی کہ وہ یہ سب کیسے برداشت کر رہا تھا۔

اس دن یونیورسٹی میں کوئی فنکشن تھا۔ میرا دل تو نہیں چاہ رہا تھا کہ اس میں شرکت کروں لیکن شہلا کے بے حد اصرار پر میں تیار ہو گئی۔ پھر بھی میں نے اس سے کہا کہ واپسی میں مسئلہ ہو گا۔ اس پر وہ بولی۔ "تم ارشد کے ساتھ چلی جانا۔ جہاں کہو گی وہ تمہیں چھوڑ دے گا۔"

اس پر میں خاموش ہو گئی۔ ویسے بھی مجھے ارشد کے ساتھ گھومنا اچھا لگتا تھا۔ وہ مجھ سے کئی بار لانگ ڈرائیو پر چلنے کے لیے کہہ چکا تھا لیکن میں ہمیشہ ٹال دیا کرتی تھی کیونکہ میں ڈرتی تھی کہ کوئی ایسا حادثہ پیش نہ آ جائے جس سے میری اور میرے خاندان کی بدنامی ہو لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ اس تمام تر احتیاط کے باوجود وہ واقعہ رونما ہو گا جس کے بعد میرے اور ارشد کے راستے ہمیشہ کے لیے الگ ہو جائیں گے۔

ہوا یوں کہ فنکشن حسبِ معمول تاخیر سے شروع ہوا اور ختم ہوتے ہوتے آٹھ بج گئے۔ مجھے اس کا اندازہ تھا۔ اس لیے میں گھر پر کہہ کر آئی تھی کہ دس بجے تک واپسی ہو گی۔ میں نے ارشد سے کہا کہ وہ مجھے نیپا چورنگی پر اتار دے۔ وہاں سے میں رکشا کر لوں گی لیکن اس نے کہا کہ اس وقت رکشا میں جانا ٹھیک نہیں۔ وہ مجھے گھر تک ہی چھوڑے گا۔ راستے میں ایک سگنل پر گاڑی رکی تو اچانک ہی دو آدمی پیچھے کا دروازہ کھول کر ہماری گاڑی میں سوار ہو گئے ان میں سے ایک نے ارشد کی کنپٹی پر ریوالور رکھا اور دوسرے نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"سیدھے چلتے رہو۔ اگر کوئی گڑبڑ کی تو گولی چلا دوں گا۔" ریوالور والے نے غراتے ہوئے کہا۔

"تم کون ہو؟" ارشد نے بمشکل کہا۔

"پولیس۔" اور یہ کہہ کر ایک کارڈ کی جھلک ارشد کو دکھائی۔ "یہ لڑکی کون ہے؟"

"یہ..... یہ..... میری کلاس فیلو ہے۔ اسے گھر چھوڑنے جا رہا ہوں۔"

"اس وقت کون سی کلاس لے کر آ رہے ہو؟"

"وہ یونیورسٹی میں فنکشن تھا۔ ہم وہیں سے آ رہے ہیں؟"

"وہ فنکشن تو اب تھانے میں ہو گا۔ ہماری بھی تھوڑی تفریح ہو جائے گی۔"

تھانے کا نام سن کر ہی میری جان نکل گئی۔ خدا جانے یہ لوگ وہاں کیا سلوک کریں۔ ارشد نے کہا۔ "دیکھو ہمیں تھانے لے کر مت جاؤ۔ ہم عزت دار لوگ ہیں جو طے کرنا ہے یہیں کر لو۔"

"عزت دار لوگ اس طرح لڑکیوں کو لے کر نہیں پھرتے۔ اچھا کتنے پیسے ہیں تمہارے پاس۔"

"یہی کوئی چار پانچ ہزار ہوں گے۔"

"اس سے کیا ہو گا۔" ریوالور والا بولا۔ "اے ٹی ایم کارڈ ہے؟"

ارشد نے ان کے کہنے پر گاڑی ایک بینک کے سامنے روکی اور ریوالور والا ارشد کو لے کر اے ٹی ایم مشین سے پیسے نکالنے چلا گیا۔ ارشد کے پاس دو کارڈ تھے۔ اس نے دونوں سے بیس بیس ہزار روپے نکلوائے۔ انہوں نے

ارشد کا موبائل بھی چھین لیا اور قیمتی راڈو گھڑی بھی اپنے قبضے میں لے لی۔ یہ دونوں چیزیں ہزاروں کی مالیت کی تھیں۔ اس کے بعد انہوں نے ہمیں گاڑی سے اتارا اور بولے۔
”تم دونوں پیدل چلتے ہوئے اگلے سگنل تک آؤ۔ یہ گاڑی تمہیں وہاں مل جائے گی۔“

ہمارے پاس ان کی بات پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ مجبوراً ہمیں اترنا پڑا اور وہ گاڑی میں بیٹھ کر رفو چکر ہو گئے۔ میں غم اور صدمے سے بری طرح نڈھال ہو چکی تھی۔ مجھ سے ایک قدم بھی نہیں چلا جا رہا تھا۔ ارشد نے ایک رکشا روکا اور اس میں بیٹھ کر ہم اگلے سگنل تک آئے۔ گاڑی وہاں کھڑی ہوئی تھی لیکن ان دونوں کا کوئی پتا نہیں تھا۔ گاڑی دیکھ کر ارشد کی جان میں جان آئی۔ ورنہ وہ تو سمجھ رہا تھا کہ گاڑی بھی گئی۔ جب ہمارے حواس بحال ہوئے اور دماغ کام کرنے لگا تو میں نے کہا۔ ”ارشد وہ پولیس والے نہیں ڈاکو تھے۔ ہمارے ساتھ ہاتھ ہو گیا۔“

”وہ جو کوئی بھی تھے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ شکر کرو کہ عزت بچ گئی۔“

اس کے بعد ارشد نے کوئی بات نہیں کی۔ وہ مجھے گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ صاف لگ رہا تھا کہ اسے اپنی بے عزتی کا شدید صدمہ ہوا ہے۔ میں تھکے تھکے قدموں سے گھر میں داخل ہوئی۔ کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے کسی نے کچھ نہیں پوچھا۔ میں خاموشی سے جا کر بستر پر لیٹ گئی۔ بے اختیار میرے آنسو بہنے لگے۔ میں اس سارے واقعے کا ذمے دار اپنے آپ کو سمجھ رہی تھی۔ اگر شہلا کی باتوں میں آ کر فنکشن میں شرکت نہ کرتی تو ارشد کو مجھے چھوڑنے نہ آنا پڑتا اور نہ ہی یہ حادثہ پیش آتا۔ میں نے سوچا کہ ارشد کو فون کر کے اس سے معافی مانگوں لیکن اس کا تو موبائل ہی چھن گیا تھا۔ فون کیسے کرتی۔ میں نے یہ سوچ کر آنکھیں بند کر لیں کہ صبح یونیورسٹی میں ملے گا تو بات ہو جائے گی۔

اگلے دن سو کر اٹھی تو مجھے تیز بخار ہو رہا تھا لہٰذا یونیورسٹی جانے کا ارادہ ملتوی کر کے بستر میں ہی لیٹی رہی۔ شام تک بخار تو کم ہو گیا لیکن کمزوری بہت ہو گئی جس کی وجہ سے مزید دو دن یونیورسٹی نہ جا سکی۔ میرا خیال تھا کہ ارشد فون کرے گا لیکن اس نے بھی رابطہ نہیں کیا۔ چوتھے روز یونیورسٹی گئی تو ارشد وہاں بھی نظر نہیں آیا۔ میں نے شہلا سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ تو تین دن سے نہیں آ رہا۔ یہ سن کر میں اور پریشان ہو گئی۔ کہیں اس کی طبیعت تو خراب نہیں ہو گئی۔ میں نے اس کا نمبر ملایا تو پیغام آیا کہ آپ کا مطلوبہ نمبر کسی کے استعمال میں نہیں ہے۔ گویا اس نے سم تبدیل کر لی تھی۔ اس طرح اس سے رابطہ کا واحد ذریعہ بھی ختم ہو گیا۔

ایک ہفتہ اسی انتظار میں گزر گیا لیکن وہ یونیورسٹی نہیں آیا اور نہ ہی اس نے مجھ سے رابطہ کیا۔ میری پریشانی بڑھتی جا رہی تھی پھر آٹھویں روز اس نے مجھے فون کیا۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بول رہا تھا۔ ”میں نے تمہیں صرف یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ آج رات کی فلائٹ سے لندن جا رہا ہوں، کبھی واپس نہ آنے کے لیے، وہیں رہ کر اپنی تعلیم مکمل کروں گا اور وہیں کوئی ملازمت کر لوں گا۔ میں اس شہر میں نہیں رہ سکتا جہاں کسی شریف آدمی کی جان مال اور عزت محفوظ نہ ہو۔ میں تمہیں کبھی نہیں بھول پاؤں گا۔ تمہارے ساتھ گزارے ہوئے لمحے میری زندگی کا سرمایہ ہیں۔ ایک دوست کی حیثیت سے مشورہ دے رہا ہوں کہ شہلا سے فوراً

مسلمانوں کی آمد سے قبل کے پنجاب کی تاریخ 1930ء اور 1940ء کی دہائیوں میں برطانوی ماہرین آثار قدیمہ کی تحقیقاتی رپورٹوں کے ذریعے حقائق سے پردہ اٹھنے تک نہایت مبہم اور فقط داستانوں پر مشتمل تھی۔ 324-327 قبل مسیح میں سکندر کی یلغار پہلی ٹھوس اور قدیم ترین تاریخی حقیقت تھی۔ اس سے پہلے اسکائی لیکس بھی آ چکا تھا جس کا ذکر ویدوں میں موجود ہے۔ 1911ء کی مردم شماری پر اپنی رپورٹ میں پنڈت ہری کشن کول نے پنجاب کی تاریخ کو پانچ ہزار قبل مسیح میں آریوں کی آمد تک وسعت دی۔ کشمیر سے ملنے والی قدیم باکتری دستاویزات ”دبستان“ میں ایسے باکتری بادشاہوں کی فہرست دی گئی جو سکندر کی آمد سے تقریباً 5000 سال پہلے گزرے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انڈیا کا باکتریا سے تعلق تھا اور یہاں 8000 سال قبل مسیح میں بھی زبردست تہذیب و تمدن موجود تھا۔ ہمیں معلوم ہوا کہ آریوں نے انڈیا کی قدیم نسلوں کو آگے ...... ہنکاتے ہوئے یہاں ورود کیا۔ سوتھل اور بھیل وغیرہ انہی قدیم دراوڑیوں کے نمائندے ہیں۔

اقتباس: پنجاب کی ذاتیں۔ از: سر ڈینزل ابٹسن

مرسلہ: انیس حیدر، ملتان

دوری اختیار کرلو۔ وہ اچھی لڑکی نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اس کی وجہ سے تم کسی مصیبت میں پڑ جاؤ۔"

یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ میں ہیلو ہیلو کرتی رہ گئی۔ پھر میں نے اس نمبر پر رابطہ کرنا چاہا لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ میں دل مسوس کر رہ گئی کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ اتنی جلدی مجھ سے بچھڑ جائے گا پھر میں نے تقدیر کے فیصلے کے سامنے سر جھکا دیا اور معمول کے مطابق اگلے روز یونیورسٹی چلی گئی۔ شہلا شاید میرا ہی انتظار کر رہی تھی وہ مجھے ایک طرف لے گئی اور میری طرف ایک لفافہ بڑھاتے ہوئے بولی۔

"یہ تمہارا انعام پورے پانچ ہزار ہیں۔"

"کیسا انعام؟" میں حیرت سے بولی۔ "تم یہ پیسے مجھے کیوں دے رہی ہو؟"

"اس لیے کہ تم نے ہمارے ساتھ تعاون کیا۔ میرے کہنے پر ارشد سے دوستی کی۔ اس کے ساتھ گھومنے پھرنے لگیں پھر اس روز میرے کہنے پر فنکشن میں آئیں اور توقع کے عین مطابق ارشد تمہیں چھوڑنے گیا کہ اس کے ساتھ یہ واقعہ پیش آ گیا۔"

"تم اس بارے میں کیسے جانتی ہو؟"

"اس لیے کہ وہ پولیس والے نہیں بلکہ ہمارے آدمی تھے۔ اب تمہیں معلوم ہو گیا ہو گا کہ میرا ذریعہ آمدنی کیا ہے۔ میں اور ہمارے گروپ میں شامل دوسری لڑکیاں امیر لڑکوں سے دوستی کر کے ان سے پیسے اور تحائف بٹورتی ہیں اور اگر کوئی لڑکا ہوشیاری دکھائے تو اس کے ساتھ بھی ارشد والا سلوک ہوتا ہے اور ہم ایک ہی دفعہ میں اپنا حساب پورا کر لیتے ہیں۔ تمہیں معلوم ہے کہ ارشد سے ہمیں کتنا مال ملا۔"

"مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں اور نہ ہی میں یہ پیسے لوں گی۔ میں لوٹ کے مال میں حصہ دار بننا نہیں چاہتی۔ میرے لیے یہ حرام ہے۔"

"حرام حلال کے چکر میں پڑ گئیں تو بھوکی مر جاؤ گی۔ ارشد کے باپ نے کون سی جائز طریقے سے یہ دولت کمائی ہو گی۔ بہر حال جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب ارشد سے قطع تعلق کر لو۔ میں تمہارے لیے نیا شکار ڈھونڈتی ہوں۔"

میرا دل چاہا کہ اس کا منہ نوچ لوں لیکن مجھے ابھی اپنا حساب چکانا تھا۔ اس لیے فوری طور پر اس سے الجھنا مناسب نہ سمجھا اور میٹھے لہجے میں بولی۔ "اگر تم مجھے پہلے سے بتا دیتیں تو میں یوں خوفزدہ نہ ہوتی، پولیس کا نام سن کر تو میری جان ہی نکل گئی تھی۔"

"ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا۔ بہر حال جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ تم یہ پیسے رکھ لو اور نئے مشن کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

میں اس سے دشمنی مول لینا نہیں چاہ رہی تھی۔ اس لیے یہ سوچ کر پیسے رکھ لیے کہ کسی مستحق کو دے دوں گی۔ گھر آ کر میں نے رضوان کو فون کر کے بلایا اور اسے پورا واقعہ سنا دیا۔ وہ بہت ذہین پولیس افسر تھا۔ فوراً بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔ اس نے کہا کہ نوید ہی اس گروہ کا سرغنہ ہے۔ میں سب سے پہلے اسی پر ہاتھ ڈالتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے پکڑے جاتے ہی یہ گروہ تتر بتر ہو جائے گا اور ان کی سرگرمیاں بھی ختم ہو جائیں گی۔

ایسا ہی ہوا۔ دوسرے دن رضوان نے نوید کو اس کے گھر سے گرفتار کر لیا جب اس سے روایتی انداز میں تفتیش کی گئی تو اس نے منشیات فروشی اور لوٹ مار سمیت تمام جرائم کا اعتراف کر لیا۔ شہلا اس کی دست راست تھی۔ وہ خوب صورت لڑکیوں کو اپنے گروپ میں شامل کر کے ان کے ذریعے امیر لڑکوں کی جیبیں خالی کرواتی تھی اور جب وہ ان کے ساتھ گھومنے پھرنے کسی سنسان مقام پر جاتے تو نوید کے آدمی اپنے آپ کو پولیس والا ظاہر کر کے انہیں لوٹ لیتے۔ جب نوید کے گھر کی تلاشی لی گئی تو وہاں سے منشیات اور لوٹی ہوئی رقم کے علاوہ پولیس کی وردیاں بھی برآمد ہوئیں۔

نوید کی گرفتاری کے بعد شہلا نے یونیورسٹی آنا چھوڑ دیا۔ گروپ کے دوسرے لوگ بھی راہ راست پر آ گئے۔ اس کے بعد میں نے ان لڑکوں کو بھی نہیں دیکھا جو نشے کے طلب پوری کرنے کے لیے شہلا کے گرد منڈلاتے تھے۔ میں نے سیکنڈ سمسٹر کا امتحان دیا تو پھوپی رضوان کا رشتہ لے کر آ گئیں اور چند ماہ بعد میں رضوان کی دلہن بن کر اس کے گھر آ گئی۔ پھر کیسی یونیورسٹی اور کہاں کی پڑھائی۔ اب میں ایک پولیس آفیسر کی بیوی بن کر ازدواجی زندگی کے مزے لوٹ رہی ہوں۔ البتہ کبھی کبھی ارشد بہت یاد آتا ہے۔ وہ واقعی مخلص تھا۔ خدا جانے وہ کس حال میں ہو گا۔ میری دعا ہے کہ وہ جہاں بھی ہو خوش رہے۔ آخر میں تمام لڑکیوں سے یہ کہنا چاہوں گی کہ وہ کبھی کسی غیر لڑکے کے ساتھ گاڑی میں نہ بیٹھیں۔ برا وقت کہہ کر نہیں آتا۔

خلش

محترم مدیر سرگزشت
السلام علیکم
ایک اور سرگزشت ارسال کررہا ہوں، یہ سرگزشت ایک ایسے ٹوٹے ہوئے انسان کی ہے جس نے خود ہی اپنے آپ کو سزا دی۔ امید ہے پسند آئے گی۔

اعجاز احمد راحیل
(ساہیوال)

یہ زندگی بھی عجب شے ہے۔ کبھی راگ بن جاتی ہے تو کبھی روگ۔ انسان کو کبھی کبھی تو یہ بھی پتا نہیں چلتا کہ وہ زندگی کوگزاررہا ہے۔ یا زندگی اسے گزار رہی ہے۔

مجھے بھی اس بات کا کافی عرصے بعد ادراک ہوا جب زندگی مجھے گزار چکی تھی۔ پھر میں نے زندگی کو گزارنا شروع کر دیا۔ اب تک گزار رہا ہوں۔

میرا نام جہانگیر خاں ہے۔ میرے ماں باپ کافی عرصہ پہلے فوت ہو گئے۔ میرے ابو سردار نواز ش خاں بہت

اچھے اور رحم دل انسان تھے۔ ان کی ایک مربع زمین تھی۔ وہ دن بھر زمینوں پر کام کرتے تھے۔ میری ماں صوم وصلوٰۃ کی پابند اور پرہیزگار عورت تھی۔ شادی کے ایک سال بعد میں اور میرا بھائی ضیاء علی پیدا ہوئے۔ ہم جڑواں تھے۔

میں نے جب ہوش سنبھالا، گھر میں دولت کی خوب ریل پیل تھی۔ ہم دونوں بھائی اکٹھے اسکول جایا کرتے تھے۔ میٹرک تک ایک ساتھ پڑھتے رہے۔ ہم دونوں ہی اپنے ماں باپ کی آنکھ کا تارا تھے۔ وہ ہمارا بہت خیال رکھتے۔ میں بچپن ہی سے غصے کا تیز اور جھگڑالو تھا جبکہ ضیا انتہائی شریف تھا۔ میٹرک کے بعد میں نے تعلیم کو خیر باد کہہ دیا۔ ضیا نے بی اے کے بعد جاب کر لی۔ وہ ایک اسکول میں پڑھاتے تھے۔ میں ابو کے ساتھ زمینوں پر کام کرتا رہتا۔ ان دنوں ہم ساہیوال کے قریب ایک قصبے نور شاہ میں رہتے تھے۔

زندگی اور موت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ایک رات ابو کو ہارٹ اٹیک ہوا۔ وہ ہمیں روتا چھوڑ کر مٹی کی چادر اوڑھ کر سو گئے۔ ابو کی ناوقت موت کے دو ماہ بعد امی جان بھی چل بسیں۔ ہم دونوں بھائی اس بھری دنیا میں تنہا رہ گئے۔

وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ یہ اگر زخم دیتا ہے تو مرہم بھی دیتا ہے۔ بہرکیف زخموں کے نشان ہمیں اپنوں کی یاد دلاتے رہتے ہیں۔ ماں باپ کی موت کا صدمہ بہت بڑا ہوتا ہے۔

امی کی وفات کے چھ ماہ بعد میں نے ضیاء کو بمشکل شادی کے لیے رضامند کیا۔ گھر میں کھانا پکانے کے لیے عورت کا ہونا از بس ضروری تھا۔

وہ مان گئے۔ میں نے ساتھ والے گاؤں میں ان کی شادی کی بات پکی کر دی۔

میں ان دنوں بہت خوش تھا۔ شادی کے دن جیسے جیسے قریب آتے گئے۔ مصروفیت بھی بڑھ گئی۔ سارا کام مجھے ہی کرنا تھا۔ تاہم ہماری زمینوں پر کام کرنے والے ملازم ریاست کی بیوی رشیداں بھی میرا ہاتھ بٹاتی رہی۔

شادی سے دس دن پہلے خوشیوں بھری زندگی سوگ میں بدل گئی۔ میرے بھائی کو اس کی ہونے والی بیوی کے سابقہ منگیتر نے قتل کر دیا۔

میں وہ لمحہ کبھی نہیں بھول سکتا۔ جب ضیاء کی لاش میری آنکھوں کے سامنے تھی۔ جس کے سر پر سہرا سجنا، ہاتھوں پر مہندی لگنا تھی، وہ خون میں لتھڑے ہوئے تھے۔

''ویر! میں تمہارا بدلہ ضرور لوں گا۔''

میں چلا چلا کر کہتا رہا۔ سب چپ کرا رہے تھے مگر میرے اندر آتش فشاں تھا۔ جوان بھائی کو کندھا دینا آسان کام نہیں ہوتا۔

وہ لمحہ قیامت سے کم نہ تھا جب میں نے اپنے جوان بھائی کو لحد میں اتارا۔ ان کا قاتل مفرور ہو گیا۔ تاہم اس کے خلاف ایف آئی آر درج ہو گئی تھی۔ دو ماہ بعد میں نے ان کے قاتل حمید اور اس کے بھائی ولید کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ خود ہی تھانہ نور شاہ میں پیش ہو گیا۔

میرا چالان ہوا تو مجھے ساہیوال جیل بھیج دیا گیا۔ وہیں میری ملاقات بدر سے ہوئی۔ بدر کی شخصیت سے متاثر ہو کر میں نے اس سے دوستی کر لی۔ وہ یاروں کا یار تھا۔ جیل میں ہمارا وقت بہت اچھا گزرا۔ وہ زمانہ شناس تھا۔ اس نے مجھے بہت حوصلہ دیا۔ زمانے اور لوگوں کی چالبازیوں کا مقابلہ کرنا سکھایا۔ بعد ازاں میں بری ہو گیا۔ مجھے رہا کروانے میں ماموں ابرار نے بہت تگ و دو کی۔ وہ قصور میں رہتے تھے۔ میں نے نور شاہ والی زمین بیچ دی۔ وہاں سے ضلع قصور کے علاقے کھڈیاں خاص میں دریائے ستلج کے قریب زمین لے لی۔ یہاں آنے کے بعد میں مصروف ہو گیا۔ تاہم ایک، دو بار بدر سے ملاقات کرنے ساہیوال گیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد ماموں ابرار کی بیٹی مہروز سے میری شادی ہو گئی۔ زندگی اچھی بسر ہونے لگی۔ شادی کے ایک سال بعد اللہ نے ایک چاند سا بیٹا عطا کر دیا۔

دو سال بعد ایک بیٹی بھی ہوئی۔ بیٹے کا نام میں نے ضیاء رکھا۔ جبکہ بیٹی کا نام مہروز نے عائشہ رکھ دیا۔ ضیاء اور عائشہ اب بالترتیب بارہ اور دس سال کے ہو چکے ہیں۔

☆......☆

یہ سات سال پہلے کی بات ہے۔ وہ موسم بہار کی روشن صبح تھی۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ میں اپنی زمینوں پر چکر لگانے آیا۔ گندم کی فصل تیار تھی۔ یہ دن کسانوں کے لیے بہت اہم ہوتے ہیں۔ سال بھر کا رزق جب گھر آتا ہے تو کافی الجھنیں ختم ہو جاتی ہیں۔

سورج اونچا ہوا تو میں نے واپسی کا قصد کیا۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا سڑک پر آیا تو ایک رکشا میرے قریب آ کر رک گیا۔

''جہانگیر بھائی! آپ کا مہمان آیا ہے۔'' رکشا ڈرائیور آصف نے کہا۔

''کون ہے؟''

اسی اثنا میں ایک شخص رکشے سے اتر کر میری جانب بڑھا۔

میں حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا پھر بانہیں کھولیں اور اسے سینے سے لگالیا۔

وہ شخص کوئی اور نہیں، بدر تھا۔ بدر جو میرا جیل کا ساتھی تھا۔

"جہانگیرے! تم تو مجھے بھول ہی گئے۔ مگر میں نہیں بھولا۔ بھلا کوئی بھائیوں کو بھولتا ہے؟" وہ گرمجوشی سے اپنی بانہوں کا حصار تنگ کرتے ہوئے یار باش لہجے میں بولا۔

"بدرے! میں شرمندہ ہوں۔ بس کام ہی اتنے ہیں کہ اک پل سانس نہیں لینے دیا۔ مگر میں تمہیں ہر پل یاد کرتا رہا ہوں۔"

میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں صفائی پیش کی۔

"اچھا۔ اب رکشے والے کو فارغ کرنا چاہیے۔ وہ بے چارہ ہماری طرف دیکھ رہا ہے۔" میں نے اسے خود سے الگ کرتے ..... ہوئے کہا۔ پھر بدر کے ناں ناں کرنے پر بھی کرایہ دے دیا۔

پھر ہم باتیں کرتے ہوئے گھر کی طرف چل پڑے۔

راستے میں اس نے بتایا کہ اس کے چچا امیر علی نے کافی بھاگ دوڑ کی۔ علاقے کے معتبر بندوں کو درمیان میں ڈال کر مخالفین سے صلح کرلی۔ تھا ایکڑ زمین قصاص کے طور پر دے کر اسے رہا کروایا ہے۔ لیکن جس دن وہ رہا ہوا اسی دن اس کا چچا فوت ہو گیا تھا۔

بدر نے مجھے جیل میں بتایا تھا کہ اس دنیا میں چچا امیر علی کے سوا اس کا کوئی بھی نہیں ہے۔

ایک بار جب میں ساہیوال جیل اس سے ملاقات کرنے گیا تو اسے اپنا ایڈریس بتا دیا تھا۔ اپنے چچا کی تدفین اور کچھ ضروری کام نمٹا کر اب وہ میرے پاس آ گیا تھا۔

ہم باتیں کرتے ہوئے گھر پہنچ گئے۔

چونکہ ہم کافی عرصے بعد ملے تھے۔ اسے میرے بارے کچھ علم نہ تھا۔ میں نے بدر کا تعارف اپنی بیوی سے کروایا۔ وہ بھی مہروز، عائشہ اور ضیاء سے مل کر بہت خوش ہوا۔ پھر میں اسے اپنی شادی کے بارے بتانے لگا۔ ہماری باتوں کے دوران مہروز نے کھانا تیار کرلیا۔ بدر نہانے کے لیے غسل خانے میں چلا گیا۔ ہم دیہاتی لوگ کھلے ماحول میں رہتے ہیں۔ ہمارے دل بھی کھلے ہوتے ہیں۔ میری بیوی نے کھانے کا خاص اہتمام کیا۔ وہ فریش ہو کر آیا تو مہروز نے کھانا

بچوں کے نفسیاتی مسئلے

تعریف بہت زود اثر دوا ہے

بچے کے اچھے کاموں پر تعریف کرنا شروع کریں۔ اگر آپ پہلے ہی ایسا کر رہے ہیں تو تعریف کرنے کی مقدار بڑھا دیں۔ یعنی اور زیادہ تعریف شروع کریں تاہم اس سلسلے میں آپ بچے کی تعریف کرنے کے بجائے اس کے اچھے کام کی تعریف کریں تو زیادہ اچھی بات ہے۔ مثلاً آپ نے بچے سے کہا کہ وہ دوسرے کمرے میں پڑا تکیہ لا دے اور اس نے ایسا کر دیا ہے تو آپ اس سے یہ نہ کہیں کہ تم بڑے اچھے بچے ہو، بڑے بہادر ہو بلکہ اسے کہیں یہ بڑی اچھی بات ہے کہ آپ کہنا فوراً مانتے ہو، بہت بہت شکریہ تکیہ لا کر دینے کا۔" اسی طرح مہمان آنے پر وہ گلی کی دکان سے بوتلیں لے کر آتا ہے تو اس کا شکریہ ادا کریں اور کہیں آپ بڑوں کا کہنا مانتے ہو، ضرورت میں ان کی مدد کرتے ہو بڑی اچھی بات ہے، شاباش ویل ڈن بھئی ویل ڈن......" واضح رہے کہ اچھے کاموں پر آپ جتنی زیادہ بچے کی تعریف کریں گے بچے کو اتنی ہی زیادہ توجہ ملے گی چنانچہ وہ غلط کاموں کے ذریعے توجہ حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرے گا۔

گپ شپ بہت سے نفسیاتی مسائل کا علاج ہے

والدین بچے سے روزانہ علیحدہ علیحدہ کچھ وقت اس کی پسند کے موضوعات پر گپ شپ لگائیں خواہ چند منٹ ہی سہی۔ اس دوران تنقید، مشوروں اور ڈانٹ ڈپٹ سے پرہیز کریں اگر کوئی بات سمجھانی ہی ہو تو بعد میں سمجھائیں۔ اس دوران خود کم سے کم بولیں اور بچے کو زیادہ سے زیادہ بولنے کا موقع دیں۔ کیا، کیوں، کیسے، کہاں، کب والے سوال کریں مثلاً اگر بچے کو کرکٹ کا شوق ہے تو کام سے واپسی پر والد صاحب پوچھ سکتے ہیں۔ "آج کرکٹ کا کہاں میچ ہو رہا ہے، کیا بنا، کس کس نے نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا، کون جیتے گا اور کیوں، آئندہ میچ کب متوقع ہے۔" وغیرہ وغیرہ۔

مرسلہ: راشدہ منگل، کراچی

لگا دیا۔ کھانے میں میری پسندیدہ ڈشز بھنا ہوا دیسی مرغا، بریانی اور رائتہ تھا۔ کھانے کے بعد دودھ پتی کا دور چلا۔

''بھنا! آپ کھانا بہت اچھا بناتی ہیں۔'' بدر نے ستائشی لہجے میں کہا۔

''ہاں بدر بھائی تمھاری بھابی میں بس یہی تو ایک خوبی ہے۔'' میں نے ہنستے ہوئے قہقہہ لگایا۔

کچھ وقت ایسے ہی ہلکی مذاق میں گزر گیا۔ پھر میں اسے بیٹھک میں لے آیا تاکہ کچھ دیر آرام کر لے۔ وہ چارپائی پر لیٹ گیا۔

میں ساتھ والے گاؤں کے ایک بندے کے پاس چلا گیا۔ چار گھنٹے بعد گھر آیا تو سودا سلف بھی لیتا آیا۔ بدر بھی جاگ چکا تھا۔ میں نے اسے صابن تولیہ لا کر دیا تاکہ منہ ہاتھ دھو لے۔ وہ منہ ہاتھ دھو کر آ گیا۔ اسی اثنا میں عصر کی اذان سنائی دی۔ ہم دونوں نماز ادا کرنے مسجد کی جانب چل پڑے۔ باجماعت نماز ادا کی۔

مسجد سے باہر آ کر بدر گویا ہوا۔ ''جہانگیرے! چلو یار کہیں گھومنے چلتے ہیں۔''

میں نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور دریا ستلج کی طرف چل پڑا۔ کچھ دیر بعد ہم دریا کے کنارے کھڑے تھے۔ یہاں آ کر بدر مضطرب ہو گیا۔ ''چلو یار واپس چلتے ہیں۔''

''کیوں، کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں ہوا یار۔'' وہ وحشت زدہ لہجے میں بولا۔

ہم وہاں سے گھر کی طرف چل پڑے۔ مغرب ہو چکی تھی۔ مسجد میں نماز ادا کی اور گھر آ گئے۔ رات کا کھانا تیار تھا۔ ہم نے کھانا کھایا اور صحن میں پڑے پلنگوں پر آ کر لیٹ گئے۔

☆......☆

آسمان پر چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ ہم ماضی کی راکھ کریدنے لگے۔ اس راکھ میں گزرے وقت کے تلخ لمحوں کی چنگاریاں تھیں۔

جیل کے شب و روز تھے۔ بھانت بھانت کے لوگ، جن میں کچھ حالات کے گرداب میں پھنس کر وہاں آئے تھے۔ بدر کے ساتھ سلام دعا ہوئی۔ بعد ازاں یہی سلام دعا دوستی میں بدل گئی۔ ایک ماہ بعد ہم ایک دوسرے کے بہت قریب ہو گئے تھے۔ میں نے کروٹ بدلی، بولا۔ ''بدر آج ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔''

''بولو۔'' اس نے ہمیشہ کی طرح مختصر سا جواب دیا۔

''جب ہم جیل میں تھے۔ ایک دن وزیر جیل خانہ جات اور آئی جی صاحب دورے پر آئے تھے۔ وہ باری باری سب بیرکس کے سامنے کھڑے ہو کر ان کے مسائل وغیرہ کے بارے میں پوچھتے رہے تھے۔'' قدرے توقف کے بعد میں نے سلسلہ کلام جوڑا۔ ''آپ کو یاد ہو گا۔ جب وہ ہماری بیرک CP 5 کے سامنے آئے۔ انہوں نے فرداً فرداً ہم سے بھی پوچھا تھا۔ سب قیدیوں نے انہیں اپنے مسائل اور تکالیف سے آگاہ کیا تھا۔''

بدر نے بے قراری سے پہلو بدلا۔ شاید وہ سمجھ گیا تھا کہ میں کیا پوچھوں گا۔ تاہم میں نے اپنی بات جاری رکھی۔

''جب تمہاری باری آئی تو تم نے کیا کہا تھا؟ تمھیں یاد ہے نا؟''

وہ چپ رہا، کچھ نہ بولا۔

چند لمحے انتظار کے بعد میں نے کہا۔ ''سر! مجھے یہاں کوئی تکلیف نہیں۔ جو دکھ ہے، اس کا مداوا کوئی نہیں کر سکتا۔ اس کا علاج کسی کے پاس نہیں ہے۔'' یہی کہا تھا نا؟ پھر وزیر جیل خانہ جات کے استفسار پر بھی تم نے کچھ نہیں بتایا تھا۔''

وہ چپ چاپ لیٹا ہوا تھا۔ میں نے پھر لب کشائی کی۔ ''میں بھی وہاں پوچھتا رہا ہوں۔ تم نے کبھی اپنے ماضی کے بارے میں نہیں بتایا۔''

لحاتی توقف کے بعد میں نے کہا۔ ''تم اکثر رات کو سوتے ہوئے چیخنے چلانے لگتے تھے۔ میرے پوچھنے پر کہا کرتے کہ اک خواب نے مجھے عذاب میں ڈالا ہوا ہے۔ میں اس خواب کے متعلق متجسس تھا۔ پھر میں رہا ہو گیا۔ اب ہم کئی برسوں بعد ملے ہیں۔ مجھے بھی اس خواب کے بارے میں کچھ بتاؤ۔''

وہ خاموش لیٹا چاند کو تکتا رہا۔ کچھ نہ بولا۔ شاید وہ بتانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے کروٹ بدلی اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

☆......☆

رات کے پچھلے پہر بدر کی چیخ سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ وہ ہذیانی انداز میں چیختا ہوا نہیں نہیں کہہ رہا تھا۔

میں جلدی سے اٹھا۔ اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ مہرو بھی آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ کر ہمارے پاس آ گئی۔ میں نے اسے پانی لانے کا کہا۔ وہ گلاس اٹھا کر گھڑے کی جانب بڑھ گئی۔

''یہ لیں۔'' وہ پانی سے بھرا گلاس میری طرف

بڑھاتے ہوئے خمار آلود لہجے میں بولی۔

میں نے بدر کو سہارا دے کر اٹھایا تو اس نے گلاس پکڑ لیا۔ کلی کرنے کے بعد وہ ایک ہی سانس میں سارا پانی پی گیا۔ جب اس کی حالت سنبھل گئی تو میں نے پوچھا۔ "پھر وہی خواب دیکھا ہے نا۔"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"بدر! مجھے بتاؤ کہ وہ ایسا کون سا خواب ہے۔ جسے دیکھ کر تمہاری یہ حالت ہو جاتی ہے؟"

"کیا کرو گے پوچھ کر یار۔"

"نہیں یار! آج تمہیں بتانا پڑے گا۔"

وہ مغربی افق پر جھکے چاند کو کھوئے کھوئے انداز میں دیکھنے لگا۔ پھر ایک طویل خاموشی کے بعد بولا۔ "میں دیکھتا ہوں کہ پورے چاند کی رات جوبن پر ہوتی ہے۔ دریا کا پانی کناروں تک بہہ رہا ہوتا ہے۔ پانی میں چاند کا جھلملاتا ہوا بہت دلکش اور دلفریب عکس۔ ہر طرف گہرا سناٹا۔ جھینگروں کی آوازیں۔ ایسے میں دریا کے کنارے دو ہیولے متحرک ہیں۔ ان کی منزل کون سی ہے؟ کچھ خبر نہیں۔ وہ دونوں چلتے چلتے ریت کے ٹیلے کے اوپر رک جاتے ہیں۔

اچانک ایک ہیولہ ہاتھ میں پکڑی چھوٹی نال والی رائفل کو سیدھا کرتا ہے۔ تھوڑی سی تذبذب کے بعد وہ لبلبی دبا دیتا ہے۔ فائر کی آواز گونجتی ہے۔ دوسرا ہیولہ غیر ارادی طور پر اپنا ہاتھ آگے کر دیتا ہے۔ پھر لڑکھڑا کر دریا کے گہرے پانی میں جا گرتا ہے۔ پانی کی سرکش لہریں اسے اپنی آغوش میں لے لیتی ہیں۔ وہ ڈوب کے ابھرتا ہے۔

"بھیا" تیز نسوانی دلدوز آواز ماحول کے سکوت کو توڑتی ہے۔ پھر میں ہذیانی انداز میں چیختا ہوا دریا میں چھلانگ لگا دیتا ہوں۔" یہ سب بتا کر وہ رونے لگا۔ میں غیر ارادی طور پر اس کی پشت تھپکنے لگا۔

افق پر ٹکا پورا چاند بھی اداس لگ رہا تھا۔

☆......☆

اس رات میں نے فیصلہ کیا کہ بدر کو کہیں نہیں جانے دوں گا۔ اس سلسلے میں مہروز کے ساتھ بھی تفصیلی گفتگو کی۔ اس سے مشورہ کیا۔ وہ میری ہر بات مانتی تھی۔ انکار کیسے کرتی؟ ویسے بھی انسانی ہمدردی کا جذبہ اس کے سینے میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ کسی کے دکھ کو محسوس کرنا جانتی تھی۔ بدر کے حوالے سے بھی تڑپ اٹھی۔ اگلی صبح ناشتے کے بعد میں نے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔ وہ خاموشی سے میری بات سنتا رہا۔ میرا دل کہتا تھا کہ وہ انکار نہیں کرے گا۔ ویسے بھی اس کا اب دنیا میں کون تھا۔ جس کے پاس جاتا۔ تاہم وہ چپ تھا۔ جیسے فیصلہ کر رہا ہو کہ اسے رہنا چاہیے یا نہیں۔

"بدر بھائی! کیا سوچ رہے ہو؟ بس اب جلدی سے ہاں کر دیں نا۔" مہروز نے سنجیدگی سے کہا۔ پھر مزید بولی۔ "یہاں سے جانے کا خیال دل سے نکال دیں۔ ہم آپ کو کہیں نہیں جانے دیں گے۔"

"بہن میں آپ لوگوں کا شکر گزار ہوں۔ اصل میں، میں نہیں چاہتا کہ کسی پر بوجھ بنوں۔"

بڑی مشکل سے اس کی خاموشی ٹوٹی تھی۔

"مطلب ہم "کسی" ہیں؟ آپ ہمیں اپنا نہیں سمجھتے۔" میں سچ مچ ناراض ہونے لگا۔ بات آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "بدر۔ وہ تم ہی تھے نا؟ جو جیل میں مجھے بھائی کہتے تھے۔ مجھے اپنا سمجھتے تھے۔"

میری بات سن کر وہ بوکھلا گیا، بولا۔ "مم...... میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ آپ غلط مت سمجھیں۔"

"پھر میں جو کہہ رہا ہوں وہ مانو۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ میں کہیں نہیں جاتا۔ اب خوش؟"

میں اٹھا اور اسے گلے سے لگا لیا۔ ضیاء اور مہروز بھی خوش ہو گئے تھے۔

☆......☆

وقت کبھی ایک جگہ نہیں رکتا۔ دن گزرتے رہے۔ شامیں سحر میں بدلتی رہیں۔ سورج طلوع ہو کر غروب ہوتا رہا۔ چمکیلی صبحیں، سنہری دوپہریں، خوشگوار شامیں۔ زندگی کا ہر روپ پیارا تھا۔ بدر کو ہمارے پاس رہتے پانچ ماہ ہو چکے تھے۔ گندم کی پیداوار اچھی رہی۔ کٹائی کے دوران اس نے میرا بہت ساتھ دیا۔ پھر کپاس کاشت کی۔ ہم فصلوں کو اکٹھے پانی دینے جاتے۔ زندگی میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم کسی اجنبی کو اپنا سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

بدر اب ہمیں اپنے گھر کا فرد ہی لگتا تھا۔ اس کی عمر پچاس سے تجاوز کر چکی تھی۔ صحت بھی قابل رشک تھی۔ میں نے اور مہروز نے اس کی شادی کے بارے سوچنا شروع کر دیا۔

وہ اگست کی ایک خوشگوار شام تھی۔ ہم سب اکٹھے بیٹھے تھے۔ مہروز نے شادی کی بات چھیڑ دی۔ "بدر لالہ! ہم چاہتے ہیں کہ آپ کی شادی کر دیں۔"

یہ سن کر اس کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ "بہنا! ایسا نہیں ہو سکتا۔"

میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''کیوں نہیں ہو سکتا؟''
''میں شادی نہیں کروں گا۔'' اس کا لہجہ اٹل تھا۔
ہم کافی دیر اس موضوع پر گفتگو کرتے رہے۔ اسے سمجھاتے رہے مگر وہ نہ مانا۔ اسی اثنا میں مہروز کھانا تیار کرنے لگی۔
کھانا کھانے کے بعد ایک بار پھر ہم اسے سمجھانے لگے۔ نتیجہ صفر رہا۔ اس کی شخصیت ایک معما ثابت ہو رہی تھی۔ مگر مجھے نجانے کیوں ایسا لگنے لگا کہ اس کی زندگی میں کوئی ایسا واقعہ رونما ہوا ہے۔ جس کے اثرات اس کے ذہن و دل پر حاوی ہو گئے ہیں اور وہ بکھر کر رہ گیا ہے۔
کچھ دن بعد کپاس کی چنائی کا سیزن شروع ہو گیا۔ ہم سارا دن زمینوں پر ہی رہتے۔ بستی کی لڑکیاں اور عورتیں سارا دن کپاس چنتی تھیں۔ ہم دوسرے دن شہر پہنچ آتے۔ میں نے ایک بات محسوس کی کہ بدر کپاس چنتی لڑکیوں کو عجیب نظروں سے دیکھتا رہتا ہے۔ مجھے اس کی یہ عادت اچھی نہیں لگتی تھی۔ میں نے بارہا سوچا کہ اسے منع کروں۔ مگر اپنی سوچ کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ آخر کچھ لڑکیوں نے اس کی اس ''حرکت'' کی شکایت کی تو میں نے بدر سے دو ٹوک بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔
اسی شام جب ہم گھر آ رہے تھے۔ میں نے گفتگو کا آغاز کیا۔ ''بدرے! ہر علاقے کے الگ الگ رواج اور رسمیں ہوتی ہیں۔ ہمارے دیہاتوں میں ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔ جب کوئی اس حد کو توڑتا ہے تو ہمارے قانون کے مطابق سزا دی جاتی ہے۔'' ذرا توقف کے بعد مزید کہا۔ ''تم میرے دوست ہی نہیں بھائی بھی ہو۔ مجھے تمہاری کردار کشی گوارا نہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی تمہاری ذات پر انگلی اٹھائے یا تمہارے کردار پر شک کرے۔ ان لڑکیوں کو دیکھنا چھوڑ دو۔ اگر تم عورت کے بغیر نہیں رہ سکتے تو بتا دو میں تمہاری شادی کر دیتا ہوں۔''
''یہ کیا کہہ رہے ہو جہانگیرے؟'' وہ چیخ پڑا۔ ہم دونوں چلتے چلتے رک گئے۔ اس کے چہرے پر حزن و ملال کی کیفیت صاف نظر آ رہی تھی۔
پھر میں اسے حقیقت سے آگاہ کرنے لگا۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ میری بات کے اختتام پر وہ گہری سانس لے کر گویا ہوا۔
''جہانگیر! یہ سب لڑکیاں میری بہنیں ہیں۔ ان کو دیکھتا ہوں تو ایک بھائی کی نظر سے۔ خدا گواہ ہے کہ میرے دل میں کھوٹ نہیں ہے۔''
میں حیران نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر اسے گلے سے لگا لیا۔ ''معاف کرنا یار۔ میں نے تمہارے کردار پر شک کیا۔''
وہ لب بستہ رہا۔ ہاں کچھ لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ جو لوگوں میں آسانی سے کھلنے ملنے والے نہیں ہوتے۔ غموں کو سینے سے لگائے جیتے رہتے ہیں۔ ان میں غصہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن ان کے لہجے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ اندر سے کتنے ٹوٹے اور بکھرے ہوئے ہیں۔ ہاں۔ بدر بھی مجھے ایسا ہی لگا تھا۔ اس کی خاموشی میں جانے کیا راز پوشیدہ تھا؟ مگر مجھے لگا آج وہ کچھ بتانا چاہتا ہے۔ تاہم یہ میرا وہم ثابت ہوا۔
''اب گھر جانا چاہیے۔'' وہ دور مغربی افق پر ڈوبتے سورج کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔
ہم گھر کی جانب چل پڑے۔
سارا راستہ خاموشی سے کٹا۔ ہمارے درمیان مزید کوئی بات نہ ہوئی۔ وہ عجیب شخص تھا۔ اپنے بارے کچھ بتانا شاید اسے گوارا نہ تھا۔ کبھی کبھی میں بے بس ہو جاتا۔ میرا دل چاہتا کہ اسے جھنجوڑ کر پوچھوں۔ ''ایسا کون سا راز ہے۔ جو بتانے سے کتراتے ہو۔ کون سا روگ ہے جو مجھ سے چھپاتے ہو؟''
راز ہمیشہ راز نہیں رہتے آخر آشکار ہو جاتے ہیں۔ پتھر بھی ٹوٹ جاتے ہیں۔ مجھے اس دن کا انتظار تھا۔ جب بدر اپنے بارے کچھ بتاتا۔ میرے دل میں اس کے لیے خاص ہمدردی تھی۔ اس کا دکھ بانٹنا چاہتا تھا۔
ہم گھر آ گئے۔ منہ ہاتھ دھویا۔ اس کے بعد کھانا کھا کر صحن میں بچھی چارپائیوں پر لیٹ گئے۔
وہ گرمیوں کے دنوں کی چاندنی رات تھی۔ ہر سو چاندنی بچھی تھی۔ ہم صحن میں لیٹے باتیں کر رہے تھے۔ اچانک ڈھولک کی آواز سنائی دی۔ لڑکیاں گیت گا رہی تھیں۔
''یہاں کسی کی شادی ہے؟'' بدر نے استفساریہ انداز میں پوچھا۔
''ہاں بھائی بابا طفیل کی بیٹی کی شادی ہو رہی ہے۔'' پاس بیٹھی مہروز نے جواب دیا۔
یہ سن کر وہ گم صم سا ہو گیا۔ آواز مزید تیز ہوئی تو وہ عالم اضطراب میں کروٹیں بدلنے لگا۔ اس کی یہ کیفیت مجھ سے چھپی نہ رہ سکی۔
''بدر کیا بات ہے؟ تم بے چین سے لگ رہے ہو۔''
''کچھ بھی نہیں ہے مجھے۔'' وہ دور خلاؤں میں تکنے

لگا، پھر بولا۔

”تم سو جاؤ اور مجھے بھی سونے دو۔“ اس کی آواز میں جہاں بھر کا کرب در آیا تھا۔ اس نے کروٹ بدل لی۔ تاہم میں جانتا تھا کہ وہ جاگ رہا ہے۔

عجب معما تھا۔ چاندنی رات، دریا کا کنارہ لڑکیوں کو دیکھنا، ڈھولک کی آواز سے دہشت زدہ سا ہونا۔ میں بدر کے بارے میں سوچتے سوچتے سو گیا۔

☆......☆

اگلے دن ایک عجیب واقعہ ہوا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ ہم [illegible] طرف [illegible] کر گھر برات آئی [illegible] رستان دی۔ دلہن کی رخصتی ہو رہی تھی۔

”جہانگیر! واپس چلو۔ دوسری گلی سے گھر جاتے ہیں۔“

میں اس کی بات نہ سمجھ سکا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور کھینچتا ہوا دوسری گلی میں لے آیا۔

ابھی آدھا فاصلہ طے کیا تھا کہ سامنے برات آتی نظر آئی۔

وہ بدحواس ہو کر پلٹا۔ میرا ہاتھ بھی چھوڑ دیا۔ برات قریب آ چکی تھی۔ کہار ڈولی کندھوں پر اٹھا کر بھاگتے ہوئے لحہ بہ لحہ قریب آ رہے تھے۔

اچانک بدر کا جسم خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرزنے لگا اور اگلے ہی لمحے وہ زمین پر گر پڑا۔

وہ زمین پر لیٹا تڑپنے لگا۔ میں اسے سنبھال رہا تھا۔ برات گزری تو کچھ بندے رک گئے۔ سب حیرت اور دکھ سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس لمحے میرے ذہن میں ایک خیال برق کی طرح کوندا۔ ”کہیں وہ کسی سے محبت تو نہیں کرتا تھا۔ پھر اس کی شادی ہو گئی ہو۔ اس واقعہ نے بدر کے ذہن پر اثر کیا ہو۔ جو اس کی حالت لڑکی کی رخصتی کا منظر دیکھ کر اس طرح ہو چکی ہے۔“

وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

میں نے دو بندوں کی مدد سے اسے اٹھا کر چارپائی پر ڈالا۔ اسی اثنا میں بستی کا ایک بندہ گاڑی لے کر آ گیا تو میں اسے اسپتال لے آیا۔

ڈاکٹر نے بتایا کہ اسے گہرا صدمہ پہنچا ہے۔ میرے ذہن میں پھر خیال ابھرا۔ ”محبوبہ کی شادی کا صدمہ۔ اگر ایسا نہیں ہے تو وہ اس طرح بے ہوش نہ ہوتا۔ ہاں ضرور ایسا ہی ہوا ہوگا۔“

میری سوچ کا پنچھی محو پرواز رہا۔ اس دوران انہوں نے ڈرپ لگا دی۔ میری بیوی عائشہ کو ساتھ لے کر اسپتال میں آ گئی۔ جبکہ ضیاء کو گھر چھوڑ آئی تھی۔

رات کے نو بج گئے۔ بدر کی طبیعت اب قدرے سنبھل گئی تھی۔ تاہم ابھی ہوش میں نہیں آیا تھا۔ جوں جوں وقت گزرتا رہا۔ اضطراب اور بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ مہروز بھی کافی پریشان تھی۔ میں کمرے سے نکل کر برآمدے میں کھڑا ہو گیا۔ آسمان پر دبیز بادلوں کی تہہ مستقل اندھیرا چھپائے ہوئے تھی۔ بارش بھی ہلکی ہو جاتی۔ کبھی پھر جھڑی لگ جاتی۔ مجھے باہر آئے بمشکل آدھا گھنٹہ ہوا تھا [illegible] سے باہر آئی اور بولی۔ ”بدر بھائی کو ہوش آ گیا ہے۔“

میں جلدی سے دروازے کی طرف لپکا۔ ہم آگے پیچھے کمرے میں داخل ہوئے۔

بدر بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ ایک نرس بھی وہاں موجود تھی۔

”اب آپ کے مریض کی طبیعت کافی بہتر ہے۔ انہیں کچھ کھلا پلا دیں۔“ نرس نے اس کے بازو میں انجکشن لگاتے ہوئے کہا۔ پھر وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

مہروز نے گلاس میں جوس ڈال دیا۔ میں اس کے قریب جا کر بیٹھ گیا، بازو کا سہارا دے کر اٹھایا اور جوس پلانے لگا۔ وہ چپ چاپ جوس پیتا رہا۔ جوس پلانے کے بعد گلاس ٹیبل پر رکھا پھر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ وہ میری طرف اداس سی نظروں سے دیکھنے لگا۔ ”بدر بھائی! شکر ہے تمہیں ہوش آ گیا۔ اب سناؤ طبیعت کیسی ہے؟“

اس کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ ابھری، بولا۔

”جہانگیر! اب طبیعت کافی بہتر ہے۔ پریشان نہ ہوا کرو۔ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ زندگی بہت ظالم ہے۔ انسان کو پل پل مارتی ہے۔ موت ہمیشہ اپنے وقت پر آتی ہے۔ پھر کسی کی دعائیں آنسو کام نہیں آتے۔ اگر میں نے مرنا ہوتا تو کئی برس پہلے مر جاتا۔“

”ایسا نہ کہو یار۔“ میں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

”جہانگیر تم نے بارہا مجھ سے میرے بارے میں پوچھا۔ میرا ماضی کریدنا چاہا۔ مگر میں ٹالتا رہا۔ کیا تم میرے دکھ جاننا چاہتے ہو؟ میری روداد سننا چاہو گے؟“

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ آخر پتھر ٹوٹ گیا تھا۔

وہ ایک بھید بھری شب تھی۔ باہر آسمان پر گھرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور بجلیاں آسمان میں دور تک لہراتی نظر آ رہی تھیں۔ بدر پرت در پرت

کھلتا چلا گیا۔

☆......☆

وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ جیسے سوچ رہا ہو کہ کہاں سے کہانی شروع کی جائے۔ پھر مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔
''گزرا ہوا کل کبھی انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ میرے ماضی کا صحرا جو کہ اب ٹیلوں کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ ہاں وہ ٹیلے جو پل پل اپنی ساخت بدلتے رہتے ہیں۔ مگر ان کی خاصیت نہیں بدل سکتی۔ کبھی بھی نہیں۔ وہی کھنڈر، اجاڑ اور ویران صحرا۔ ہاں، میری زندگی بھی اس بے آب و گیاہ صحرا جیسی ہی بن چکی ہے۔''

اس نے بکھرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ذرا توقف کے بعد بولا۔ ''کئی سال پہلے میرے دل پر لگا زخم جو کہ ناسور بن گیا ہے۔ سو میں جی رہا ہوں، گویا اپنا لہو پی رہا ہوں .... کوئی چارہ گر بھی نہیں ملا۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ پھر سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولا۔ ''میں ایک کھاتے پیتے گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ میرے ابو چوہدری حیات خان اور چچا دلاور خان دو بھائی تھے۔ دونوں ایک ہی حویلی میں رہتے تھے۔ میری ماں فاطمہ اور چچی رشیداں بہنوں کی طرح رہتی تھیں۔ یہ حویلی چنیوٹ سے تھوڑا آگے دریا چناب کے قریب ہماری زمینوں پر واقع تھی۔''

میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔

''چچا دلاور خان کے چار بیٹے تھے۔ جواد، اصغر، اختر اور حماد۔ جبکہ ہم تین بہن بھائی تھے۔ دو بہنیں اور میں .... میری بڑی بہن جس کا نام سدرہ تھا۔ اس کی پیدائش کے دس سال بعد میں پیدا ہوا۔ میری پیدائش کے ایک سال بعد نمرہ پیدا ہوئی۔ دن ہنسی خوشی گزرتے رہے۔'' یہ کہہ کر اس نے گہری سانس خارج کی، پھر بولا۔ ''وقت اور بہتا پانی ایک جیسے ہوتے ہیں۔ یہ کبھی نہیں رکتے، نہ رکیں گے۔ وقت اپنی منازل طے کرتا رہا۔ میں دس سال کا ہو گیا۔ سدرہ بیس سال کی ہو چکی تھی۔ مڈل تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد اسے گھر بٹھا دیا گیا۔ پھر اس کی شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ابو جان نے بچپن ہی میں میری دونوں بہنوں کی منگنی چچا دلاور کے بیٹوں جواد اور اختر سے کر دی۔ امی نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ چچا دلاور اور چچی ہم تینوں کو اپنے بیٹوں سے بھی زیادہ پیار کرتے تھے۔ چچا زاد بھائی بھی مجھے اپنا بھائی سمجھتے تھے۔ سدرہ اور نمرہ کو بہنیں۔'' بدر سگریٹ سلگانے لگا۔ اس نے گہرا کش لیا، پھر بولا۔

''انسان جو سوچتا ہے، جو چاہتا ہے۔ ویسا کبھی نہیں ہوتا۔ ہم آنے والے وقت سے بے خبر شادی کی تیاریاں کرنے لگے۔ یہ نہیں جانتے تھے کہ غم و اندوہ کے ناگ پھن اٹھائے ہماری طرف بڑھ رہے ہیں۔ تباہی و بربادی ہمارے مقدر میں لکھی جا چکی ہے۔ بلکہ ہم خود لکھنے والے ہیں۔ ایسی تباہی کہ باقی کچھ نہیں رہنا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ حالات کے ہم خود ذمہ دار ہوتے ہیں۔ سارا ملبا مقدر پر ڈال دیتے ہیں۔''

وہ خاموش ہو گیا۔ اب باہر بارش زور پکڑ چکی تھی۔ بجلی کی چمک اور بادلوں کی ہولناک آوازیں ماحول پر خوف طاری کر رہی تھیں۔ میں متجسس نظروں سے بدر کی طرف دیکھنے لگا۔ نجانے کیوں ایسا لگ رہا تھا کہ ایک انوکھی کہانی سننے کو ملے گی۔ وہ نیا سگریٹ سلگا کر ہلکے ہلکے کش لگانے لگا۔ اس کی آنکھوں میں نمی صاف محسوس ہو رہی تھی۔

خاموشی کے طویل وقفے کے بعد اس نے لب کشائی کی۔ ''آخر وہ دن بھی آ گیا۔ جس دن میری بہن کی رخصتی تھی۔ سدرہ کا گھر بسنے والا تھا۔ لیکن نہ بس سکا۔''

''کیوں ایسا کیا ہوا؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔

''جواد بھائی کا اسی دن مرڈر ہو گیا۔''

''کک...... کیا؟'' میں اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔

''ہاں انہیں قتل کر دیا گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی۔ وہ چنیوٹ سے سرگودھا روڈ پر واقع ایک گاؤں کی امیر زادی نادیہ اور وہ ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ اس کا باپ خان محمد چوہدری بہت اثر و رسوخ والا بندہ تھا۔ جب نادیہ کو شادی کا علم ہوا تو اس نے خودکشی کر لی۔ لیکن مرنے سے پہلے اپنی بہن کو سب بتا دیا۔ یوں بات نکلی اور اس کے باپ اور بھائیوں تک جا پہنچی۔''

''پھر کیا ہوا؟'' مہروز جو کافی دیر سے خاموش تھی مستفسر ہوئی۔

''اس کے بھائیوں نے پوری پلاننگ کی۔ جواد کو عین شادی والے دن جب وہ صبح حویلی کے قریب ٹیوب ویل پر گیا۔ وہاں موت کے گھاٹ اتار دیا۔'' وہ اپنے آنسو پونچھنے لگا۔ ''چچا دلاور کا بیٹا اصغر غصے کا بہت تیز تھا۔ اس نے اپنے چند دوستوں کے ساتھ مل کر اس امیر زادی کے بھائی کو قتل کر دیا۔ پھر فرار ہو گیا۔ ان دنوں چچی بات بات پر سدرہ کو طعنے دیتی کہ تم منحوس ہو۔ آخر ایک رات سدرہ نے چناب میں کود کر خودکشی کر لی۔''

وہ سسک سسک کر رونے لگا۔ میں نے اسے سینے سے لگا

لیا۔ اس کی پشت جھکنے لگی۔

وہ روتے روتے بولا۔ ''سدرہ رخصت ہوگئی۔ اس کی ڈولی کو کندھا دینے کی بجائے اس کے جنازے کو کندھا دینا پڑا۔''

میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔ ''بدر! چپ ہو جاؤ۔ جو مقدر میں لکھا ہو انسان کو وہی ملتا ہے۔''

وہ سسکا۔ ''مقدر کو ہم خواہ مخواہ الزام دیتے ہیں۔'' وہ مجھ سے الگ ہوگیا۔ ''پھر ایک رات خان محمد چوہدری کے لوگوں نے ہماری حویلی پر دھاوا بول دیا۔ دو طرفہ فائرنگ ہونے لگی۔ اصغر بھی آیا ہوا تھا۔ اس دوران بابا جانی نے مجھے اور نمرہ کو حویلی سے نکال دیا۔ میں اسے لے کر چل پڑا۔ میری عمر دس سال تھی۔ ہم نے بمشکل آدھا کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا تھا کہ زوردار دھماکا ہوا۔ میں رک گیا۔ جب پلٹ کر دیکھا تو حویلی آگ میں جل رہی تھی۔ نو سالہ نمرہ سہم گئی۔ میں کچھ دیر وہاں رکا رہا پھر اسے ساتھ لے کر چل پڑا۔ پھر ہم بڑی سڑک پر آگئے۔ وہاں سے ایک بس میں بیٹھ کر سرگودھا چلے گئے۔ بس کنڈکٹر بھلا مانس آدمی تھا۔ اس نے کرایہ بھی نہ پوچھا۔ ہم سرگودھا میں در در کی ٹھوکریں کھاتے پھرے۔ کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔ پھر ایک دن اللہ کا ایک نیک بندہ مل گیا۔ وہ ہمیں ایک گاؤں نو چک جنوبی میں لے آیا۔ اس کا نام اسلم تھا۔ گاؤں میں سبزی کی دکان چلاتا تھا۔ اس کی بیوی خالہ صفیہ بہت اچھی عورت تھی۔ اس نے ایک ماں کی طرح ہمارا خیال رکھا۔ ان کی کوئی اولاد نہ تھی۔ ہماری صورت میں اللہ نے انھیں اولاد دے دی۔ ہمیں بھی سر چھپانے کے لیے ٹھکانا مل گیا۔''

میں اور مہروز حیرت اور دکھ سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ بدر کی انگلیوں میں دبا سگریٹ بجھ گیا تھا۔ اس نے اسے بیڈ کے قریب پڑی پلاسٹک کی بالٹی میں پھینک دیا۔ پیکٹ سے نیا سگریٹ نکال کر سلگانے لگا۔

میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ باہر بارش زور پکڑ چکی تھی۔ آسمان پر بجلی چمکتی۔ اس کے فوراً بعد بادلوں کی گڑگڑاہٹ کی ہولناک آواز سنائی دیتی۔ وہ عجب رات تھی۔ ایک درد بھری رات ..... شاید بدر کے دکھ پر آسمان کو بھی رونا آگیا تھا۔ اس نے سگریٹ سلگا لیا۔ ایک گہرا کش لیا اور سلسلہ کلام جوڑا۔

''ہم نے چچا اسلم کے گھر میں دس سال گزارے۔ شروع شروع میں ان کے ساتھ میں سبزی منڈی جاتا رہا۔ وہاں سے سبزی لے آتے۔ پھر سارا دن دکان پر گزرتا۔ نمرہ چچی صفیہ کے ساتھ گھر میں رہتی۔ چچی نے اسے قرآن پاک پڑھا دیا تھا۔ پھر میں نے چچا اسلم کو کہا کہ چچا آپ گھر پر رہا کرو۔ میں منڈی سے سبزی اکیلا لایا کروں گا۔ وہ مان گئے۔ تاہم وہ میرے آنے تک دکان کھول کر بیٹھ جاتے تھے۔''

یہاں تک بتا کر میری طرف دیکھنے لگا، پھر تلخی سے بولا۔ ''تقدیر بہت ظالم ہے۔ یہ ہمیشہ گھات میں رہتی ہے۔ کچھ ایسا ہی ہمارے ساتھ ہوا۔ تقدیر نے کاری وار کیا۔ ایک دن چچا اسلم چل بسا۔ اس کے چھ ماہ بعد خالہ صفیہ عدم سدھار گئیں۔ ہم دونوں اکیلے رہ گئے۔ اس وقت میں بیس سال کا ہو چکا تھا۔ جبکہ نمرہ انیس سال کی تھی۔ میرا قد کاٹھ اور جسامت عمر سے زیادہ لگتا تھا۔ میں کڑیل اور گھبرو جوان بن گیا۔ چچا اور چچی کی اموات کے بعد میں نے کافی دوست بنا لیے۔ ان میں ایک رشید عرف شیدا بھی تھا۔ وہ چلتا پھرتا بندہ تھا۔ ہم دونوں ایک بار چنیوٹ بھی گئے۔ میرے ذہن میں اپنی دشمنوں اور حویلی کے بارے سب یاد تھا۔ ہم حویلی کو دیکھ کر واپس آگئے۔''

اسی اثنا میں عائشہ رونے لگی۔ مہروز نے بڑی مشکل سے چپ کروایا۔ بدر جو خاموش ہو گیا تھا، بولا۔ ''میرے ذہن میں بچپن سے پکنے والا لاوا وجود کے گنبد میں آتش فشانی کرنے لگا۔ میری آنکھوں کے سامنے ہمارا گھر جلا۔ اس میں

حزارفین احمد چلیبی

رائٹ برادران کو تاریخ میں پہلی کامیاب پرواز کرنے والوں کی حیثیت سے جانا جاتا ہے لیکن یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ یہ کارنامہ سب سے پہلے استنبول (ترکی) سے تعلق رکھنے والے ہواباز حزارفین احمد نے انجام دیا۔ جنہوں نے 300 سال پہلے یورپی استنبول سے مشرقی استنبول تک کامیاب پرواز کی۔ استنبول کے ایئرپورٹ Istanbul Hazarfan Havaalan کا نام بھی اسی ہواباز کے نام پر رکھا گیا ہے۔

مرسلہ: نگہت زیدی۔ بہارہ کہو

بسنے والے نذرِ آتش ہوئے۔ بس میں اور نمرہ معجزانہ طور پر بچ گئے۔ مجھ پر لازم تھا کہ اپنے کنبے کی تباہی کا انتقام لوں۔ ہاں جن لوگوں نے ہمیں اجاڑا تھا۔ انھیں بھی تباہ و برباد کروں۔ لیکن جب میں اس پر سوچتا تو نمرہ آنکھوں کے سامنے آجاتی۔ پھر منصوبے کو عملی جامہ پہنانا مشکل لگنے لگتا۔ وقت گزرتا رہا۔ میرے سینے میں انتقام کی آگ جلنے لگی۔ جس کے شعلے مجھے ہر پل جلاتے رہے۔''

بولتے بولتے وہ رکا۔ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ زوروں کی بارش... بجلی کی چمک اور بادلوں کی گڑگڑاہٹ دل کو سہمائے دے رہی تھی۔ دور تک پھیلا اندھیرا اور بجلی کی چمک سے آنکھیں خیرہ ہوئی جارہی تھیں۔ مہروز اپنی جگہ سے اٹھی۔ کھڑکی کا پردہ برابر کردیا۔ لیکن پھر بھی چمک اندر آرہی تھی۔

وہ کھڑکی کی طرف دیکھتا رہا۔ جیسے کوئی منظر دیکھ کر پھر وہی بول کر سنانا چاہتا ہو۔ کمرے میں ٹیوب لائٹ کی مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس لمحے مجھے وہ بہت پراسرار سا لگا۔

''جہانگیر!'' خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد اس نے مجھے مخاطب کیا۔ ''میں نے رشید کو سب بتا دیا تھا۔ پھر ہم نے آیندہ کا لائحہ عمل مرتب کیا۔ ایک دن ہم خان محمد کے گاؤں کا چکر لگا آئے۔ وہاں جا کر پتا چلا کہ وہ لوگ ساہیوال کے علاقے ہڑپہ میں شفٹ ہوگئے ہیں۔ دو دن بعد ہم ہڑپہ چلے گئے۔ ان کی رہائش گاہ کا پتا چل گیا۔ پھر ہم واپس آگئے۔ سرگودھا آکر رشید نے اپنے کچھ دوستوں سے ملوایا۔ اس کے بعد سرگودھا کے ایک پٹھان نوروز خان سے ملے۔ اسلحے کی اشد ضرورت تھی۔ اس نے پانچ دن کا ٹائم دیا۔ تاہم اس نے ایک گن دے دی۔ جسے لے کر گھر آگیا۔ اس دوران میں نے ایک فیصلہ کیا۔ جو کہ سراسر جذباتی اور غلط تھا۔ میں نے نمرہ کو تیار ہونے کا کہا۔ اس نے وجہ پوچھی تو بتا دیا کہ آج رات ہم اپنی حویلی دیکھنے جائیں گے۔ وہ خوش ہوگئی۔''

اس نے سگریٹ کا گہرا کش لیا، پھر دوبارہ گویا ہوا۔

''وہ گرمیوں کا موسم تھا۔ پورے چاند کی رات تھی۔ میں اور نمرہ اپنی متروک حویلی کے قریب کھڑے تھے۔ رشید ہمیں یہاں چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ میں تذبذب کا شکار تھا۔ اپنے اندرونی خلفشار پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانا مشکل نہیں ناممکن لگنے لگا۔ کافی دیر سوچتا رہا۔ پھر سر جھٹک کر ہر سوچ کو ذہن سے نکال دیا۔ پھر نمرہ کا ہاتھ پکڑا اور دریا کی جانب چل پڑا۔ بیس منٹ بعد ہم دریا کے کنارے پر پہنچ گئے۔ ہم دونوں کنارے پر کھڑے تھے۔ آنکھوں کے سامنے دریا چناب بہہ رہا تھا۔ جس کی غضبناک لہروں نے سوہنی کو نگلا تھا۔ لیکن اس میں سوہنی کی منشا شامل تھی۔ آج اس چناب کے کنارے کچھ انوکھا ہونے والا تھا۔ میں نے نمرہ کی کلائی پکڑ لی۔ وہ سہم گئی۔

میں نے اسے آگے بڑھنے کا کہا۔ پورے چاند کی رات جوبن پر تھی۔ دریا کا پانی کناروں تک بہہ رہا تھا۔ پانی میں چاند کا جھلملاتا ہوا بہت دلکش اور دلفریب عکس۔ ہر طرف گہرا سناٹا۔ جھینگروں کی آوازیں۔ ایسے میں ہم دریا کے کنارے متحرک تھے۔ نمرہ کی منزل قریب آگئی۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ ہم دونوں چلتے چلتے ریت کے ٹیلے کے اوپر رک گئے۔

پھر میں نے ہاتھ میں پکڑی چھوٹی نال والی رائفل کو سیدھا کیا۔ تھوڑی سی تذبذب کے بعد لبلبی دبا دی۔ فائر کی آواز مہیب سناٹے میں گونجی۔ اس نے غیر ارادی طور پر اپنا ہاتھ آگے کردیا۔ پھر لڑکھڑا کر دریا کے گہرے پانی میں جا گری۔ پانی کی سرکش لہروں نے آن واحد میں اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ وہ ڈوب کے ابھری۔ کنارے کی طرف دیکھ کر چلائی۔ ''بھیا۔''

میں بے حس ہوکر کھڑا رہا۔ وہ چناب کی لہروں کا لقمہ بن گئی۔ میں وہاں سے حویلی آگیا۔ حویلی کیا ایک کھنڈر تھا۔ جس میں میرے اپنوں کی بے قرار روحیں آہ وبکا کرتی محسوس ہوتی تھیں۔ ان کی یادیں، ان کی باتیں یاد کرکے روتا رہا۔ صبح فجر کے وقت وہاں سے نکلا اور سرگودھا آگیا۔''

اتنا بتا کر وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ یہاں تک کہ اس کی ہچکی بندھ گئی۔ میں اس کی پشت تھپکنے لگا۔ وہ روتا رہا۔ آنکھوں کا ساون برساتا رہا۔ یہ آنسو بھی اللہ پاک کی نعمت ہوتے ہیں۔ جب دل غم سے بوجھل ہوجائیں تو سارے غم اور درد آنسوؤں کی شکل میں آنکھوں سے نکلتے ہیں۔ ہاں رونے سے دل کا بوجھ ہلکا ہوجاتا ہے۔ اس کو قدرے قرار آگیا۔ شاید دل کا بوجھ ہلکا ہوگیا تھا۔

پھر اس نے سسک کر کہا۔ ''جہانگیر ے! کیا کوئی اس طرح اپنی بیٹیوں جیسی بہن کو رخصت کرتا ہے؟'' ''نہیں نا۔'' اس نے خود ہی تردید کی۔ ''مگر میں اس دنیا کا وہ بدترین شخص ہوں۔ جس نے ایسا کیا۔ اب ماضی کی خلش مجھے ایک پل چین نہیں لینے دیتی۔ ہاں میں جی جی کر مر رہا ہوں۔ مگر مرتا نہیں۔ نمرہ خوابوں میں خیالوں میں آکر اپنا جرم پوچھتی ہے۔''

میرے ذہن میں جھماکا ہوا۔ کڑی سے کڑی ملتی گئی۔ آخر سرا ہاتھ آ گیا۔ سب گتھیاں سلجھتی چلی گئیں۔ معاملہ حل ہو گیا۔ چاند کی رات، دریا کا کنارہ۔ لڑکیوں کو دیکھنا، ڈھولک کی آواز سے وحشت زدہ ہو جانا۔ رخصتی کا منظر دیکھ کر بے ہوش ہو جانا۔ اسے ان سب چیزوں میں اپنی بہن کا عکس نظر آتا تھا۔ وہ یاد آتی تھی۔ اسے رخصت کرنا یاد آتا۔ لوگ بہنوں بیٹیوں کو عروسی جوڑے میں دعاؤں کے ساتھ رخصت کرتے ہیں۔ لیکن اس نے سرخ لباس کی بجائے لہو میں نہلا کر رخصت کیا تھا۔ ہمارا ماضی ملتا جلتا تھا۔ لیکن کہانی الگ الگ تھی۔

''بدر! تم نے یہ کیوں کیا؟'' میں مستفسر ہوا۔

''صرف انتقام کی آگ بجھانے کے لیے۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔ پھر بات آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''میں انتقام لینا چاہتا تھا۔ لیکن جب نمرہ کا سوچتا تو دل دہل جاتا۔ اس وقت کوئی بندہ ایسا نظر نہیں آیا۔ جس کے ہاتھ میں نمرہ کا ہاتھ دے دیتا۔ قید کے دوران مجھے اپنے فیصلے پر دلی سکون محسوس ہوا۔ کیونکہ کسی دوست نے چھ ماہ بعد پلٹ کر خبر نہ لی تھی۔ وہ در بدر بھٹکتی رہتی۔ میں نے اسے اس تکلیف سے نجات دلائی تھی۔ اس دنیا میں بہت سے گدھ نما انسان منڈلاتے پھرتے ہیں۔ جو عورتوں کو مردار سمجھ کر ان پر جھپٹتے ہیں۔ لیکن اب ماضی کا فیصلہ خلش بن گیا ہے۔''

یہ سب بتا کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ یقیناً وہ تھک چکا تھا۔ ہاں انسان کبھی کبھی خود سے لڑتے لڑتے، الجھتے ہوئے تھک جاتا ہے۔ اس سے آگے کی کہانی کا مجھے علم تھا۔ جو کہ بدر نے جیل میں سنائی تھی۔ اس نے رشید عرف شیدا اور اس کے دو اشتہاری دوستوں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ اسلحہ نوروز خان سے مل گیا۔ پھر وہ چاروں ایک رات ساہیوال کی طرف چل پڑے۔ وہ ایک خونی رات تھی۔ وہ چاروں ان پر قہر کی طرح نازل ہوئے۔ اس نے برسوں پرانی سینے میں دہکتی آگ کو ٹھنڈا کر لیا۔ ہاں اس نے خان محمد چوہدری کا گھر اسی طرح تباہ کیا، جس طرح اس نے کیا تھا۔ اس خونی کھیل میں رشید عرف شیدا مر گیا تھا۔ پھر بدر کچھ ماہ مفرور رہا۔ آخر ایک دن قانون کی گرفت میں آ گیا۔ خان محمد چوہدری کا ایک رشتہ دار مدعی بن گیا۔ بدر کو جیل ہو گئی۔ پھر ایک دن اس کا چچا جو کہ اس کے باپ کا کزن تھا، ملاقات کرنے آ گیا۔ وہ پہلے سعودی عرب میں رہتا تھا۔ اس نے اپنی سی کوشش کر کے بدر کو رہا کروا لیا۔ پھر خود بھی زندگی کی قید سے رہا ہو گیا۔

ایسی کہانیوں کا ایسا ہی انجام ہوتا ہے، ہوتا رہے گا۔

میں نے بدر کی طرف دیکھا۔ وہ بیڈ کی ٹیک سے سر لگا کر لیٹا گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ دوسرے خالی بیڈ پر مہروز عائشہ کو سینے سے چمٹائے لیٹی ہوئی تھی۔ وہ ایک عجب تھکا دینے والی رات تھی۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور کھڑکی کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر پردہ ہٹا دیا۔ بارش رک چکی تھی۔ مطلع صاف ہو گیا۔ مشرقی افق سے سورج طلوع ہو رہا تھا۔

ہم نے وہ دن اسپتال میں گزارا اور مغرب کے وقت گھر آ گئے۔

☆......☆

وقت لمحہ لمحہ آگے بڑھتا رہا۔ زندگی معمول کے مطابق چلنے لگی۔ بدر بالکل نارمل ہو گیا۔ لیکن اکثر گم صم سا رہنے لگا۔ کبھی کبھی اکیلا دریا کی طرف چلا جاتا۔ ہمیں اسپتال سے آئے ہوئے ایک ماہ ہو چکا تھا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ آکاش پر ٹکا پورا چاند روشنی بکھیرنے لگا۔ ہم گھر کے صحن کے میں لیٹے ہوئے تھے۔ رات اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ اسی اثنا میں بیرونی دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بدر اپنی چارپائی پر نہیں تھا۔ میرا دل یکبارگی دھڑکا۔ میں نے چارپائی چھوڑ دی اور بیرونی دروازے کی جانب بڑھا۔ جب باہر نکلا تو مشرق کی سمت دیکھا۔ چاند کی روشنی میں وہ نظر آ گیا۔ وہ بدر ہی تھا۔ اس کا رخ دریا کی جانب تھا۔ وہ تیز تیز چلتا ہوا دریا کی طرف جا رہا تھا۔ میں بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔ دس منٹ بعد وہ دریا کے کنارے ریت کے ٹیلے پر جا کر رک گیا۔ ایکا ایکی میرے ذہن میں ایک خیال ابھرا۔ میں بھاگ اٹھا۔ پھر پورے زور سے چلایا۔

''بدرے!''

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ پھر اپنا ہاتھ بلند کیا۔ ہاں وہ ہاتھ لہرا رہا تھا۔ مجھے الوداع کہہ رہا تھا۔ اس نے اپنا منہ دریا کی طرف کیا اور چھلانگ لگا دی۔ میں اندھا دھند بھاگتا ہوا اس کی جانب بڑھتا چلا گیا۔ ستلج بپھرا ہوا تھا۔ اس کے گہرے پانی نے بدر کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ وہ ڈوب گیا۔ دریا جوبن پر تھا۔ میں اسے بچا بھی نہ سکا۔

اس کی لاش تین دن بعد ملی۔ اسے سپرد خاک کر دیا گیا۔ اب بھی میں اس کی قبر پر جاتا ہوں۔ وہاں قبر کے پاس بیٹھ کر دیر تک روتا رہتا ہوں۔

میں اسے چاہ کر بھی نہیں بھلا سکتا۔

میرے ذہن پر ایک بھوت سوار ہو گیا تھا۔ شوبز میں جانے کا بھوت۔ یہ خیال زرینہ سے ملنے کے بعد آیا تھا۔ وہ ایک بے باک اور بولڈ قسم کی لڑکی تھی۔ میری اس سے ملاقات قریبی پارک میں ہوئی تھی۔

یہ وہ پارک تھا جہاں میرے پاپا مجھے لے کر آیا کرتے تھے۔ لیکن ان کے انتقال کے بعد زندگی جیسے روٹھ سی گئی تھی۔ کوئی خوشی نہیں۔ کوئی ولولہ نہیں سب کچھ جیسے ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ ہم تین بھائی بہن تھے۔ میں سب سے بڑی تھی۔ وہ

غلط ہاتھ

محترمہ عذرا رسول

السلام علیکم

یہ میری روداد ہے جسے اگر آپ نے سرگزشت میں شائع کردیا تو بہت سوں کا بھلا ہو گا، خاص کر ان لڑکیوں کا جو شوبز میں جانا چاہتی ہیں۔ میں نے اپنے تئیں تمام واقعات کو جمع کر کے کہانی کی شکل دے دی ہے پھر بھی اگر کہانی بن نہیں پائی ہے تو کسی اچھے رائٹر سے اسے دوبارہ لکھوا لیں لیکن شائع ضرور کریں۔

زرینہ شوکت

(کراچی)

دونوں میرے بعد تھے۔

پاپا کے جانے کے بعد ہی احساس ہوا تھا کہ زندگی تو بہت دشوار ہے۔ پاپا یہ سب کیسے کرتے ہوں گے۔ گھر میں آمدنی کا بس ایک ہی ذریعہ تھا، پاپا کی ذات۔ ان کے جانے کے بعد سب ختم ہو گیا تھا۔

خدا کا شکر ہے کہ ہمارے پاس دو کمروں کا ایک چھوٹا سا گھر تھا ورنہ نہ جانے ہمارا کیا حال ہو جاتا۔ اکیلا گھر اور کسی مرد کے بغیر۔ بھائی ابھی بہت چھوٹا تھا اور اسکول میں پڑھ رہا تھا۔ بہن فرسٹ ایئر میں تھی۔ ماں زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھیں۔ اب صرف میں رہ گئی تھی اور یہ پہاڑ جیسے مسائل تھے۔

اتفاق ہے کہ میں ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ میری دوست کہا کرتیں۔ انجم تو تو کسی ماڈل کی طرح خوبصورت ہے۔ اگر ماڈلنگ کرنے لگو تو تہلکہ مچا دو۔ لیکن مجھے ایسی باتوں میں دلچسپی نہیں تھی۔ اسی لیے میں ہنس کر خاموش ہو جاتی۔

لڑکی اگر جوان ہو اور خوبصورت بھی ہو تو اس کے آگے پیچھے دل پھینک قسم کے نوجوان ہوا کرتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی تھا۔ محلے کے بہت سے نوجوان اسی چکر میں رہتے کہ میں ان کی طرف توجہ دوں لیکن میں جانتی تھی کہ ان کی اوقات کیا ہے۔ وہ سب بے روزگار قسم کے نوجوان تھے جو ابھی تک تعلیم کے مرحلے میں تھے۔

اس کے علاوہ پاپا کی موت نے بھی مجھے وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا۔ میرے سامنے بس ایک سوال تھا کہ گھر کیسے چلایا جائے۔ اماں بے چاری اس قابل نہیں تھیں۔ بھائی اور بہن بہت چھوٹے تھے۔ رشتے دار تو تھے لیکن غربت کا کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ اسی لیے ہمارا بھی کوئی رشتہ نہیں تھا۔ کبھی کبھی کسی تقریب میں کسی سے ملاقات ہو جاتی۔ وہ اس لیے ہم سے نہیں ملا کرتے تھے کہ ہم کہیں ان سے کچھ مانگ نہ لیں۔

میرا صرف ایک مشغلہ رہ گیا تھا۔ ویسے تو نوکری تلاش کرتی پھر رہی تھی کہ کہیں اچھی سی جاب مل جائے تو گھر کے اخراجات کی طرف سے بے فکری ہو جائے۔ پارک گھر کے قریب ہی تھا۔ میں شام کے وقت وہاں چلی جایا کرتی۔ اماں کو بھی اعتراض نہیں ہوتا تھا کیوں کہ وہ ایک پردہ پارک تھا۔ یعنی صرف عورتوں کے لیے۔ شام کے وقت محلے بھر کی عورتیں وہاں آیا کرتیں۔ جاگنگ کرتیں۔ ایک دوسرے کی غیبت کرتیں۔ طرح طرح کی باتیں ہوتیں کھانے پکانے سے لے کر شوہروں کی شکایات تک۔

ایک شام ایک لڑکی دکھائی دے گئی۔ بہت اسمارٹ سی لڑکی تھی۔ اس نے بھی میری طرف دیکھا اور مسکرا دی۔ وہ جاگنگ کر رہی تھی۔ ایک چکر لگا کر میرے ہی پاس آ کر بیٹھ گئی۔

''ہیلو'' اس نے مجھے مخاطب کیا۔ ''میں زرینہ ہوں۔''

''میرا نام انجم ہے۔'' میں نے کہا۔

''میں اس محلے میں نئی آئی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''وہ سامنے والی لین میں جو نیا پورشن بنا ہے۔ وہ ہم نے کرائے پر لیا ہے۔''

میں وہ پورشن دیکھ چکی تھی۔ وہ خاصے مہنگے پورشن تھے، اس کے کرائے بھی بہت تھے۔ اگر اس نے کرائے پر لیا تھا تو ان لوگوں کی انکم ٹھیک ٹھاک ہی ہوگی۔

''اور تم کہاں رہتی ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''پارک کے بعد تیسری گلی میں میرا گھر ہے۔'' میں نے بتایا۔

وہ خاصی بے تکلف قسم کی لڑکی تھی۔ اس نے ذرا سی دیر میں دوستی کر لی تھی۔ ''تم کبھی میرے گھر آؤ۔'' اس نے آفر کی۔ ''یہاں اب تک کوئی میری سمجھ میں نہیں آئی ہے۔ تم ہی ایک معقول دکھائی دیں تو میں تمہارے پاس آ کر بیٹھ گئی۔''

''میں تقریباً روزانہ آیا کرتی ہوں۔'' میں نے بتایا۔ ''گھر کے قریب ہے نا۔ اسی لیے۔''

''ویسے کیا مشغلہ ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''فی الحال تو کچھ نہیں۔ جاب تلاش کر رہی ہوں۔'' میں نے بتا دیا۔ ''پاپا کی ڈیتھ کے بعد ضرورت ہوئی ہے کہ کہیں کچھ کروں۔''

''افسوس ہوا سن کر۔ ویسے کب ڈیتھ ہوئی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''یہی کوئی چار مہینے ہو رہے ہیں۔'' پھر میں نے اسے بتا دیا کہ میرے گھر میں کون کون ہے۔ اور میں نے کہاں تک تعلیم حاصل کی ہے۔

''میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''میرے پاپا کے انتقال کو چار برس ہو چکے ہیں۔ اس وقت مجھے دنیا اور یہاں کے حالات کے بارے میں زیادہ نہیں معلوم تھا۔ بہر حال زندگی تو گزارنی تھی نا۔ میں نے ایک جاب کر لی۔ وہاں اچھی خاصی سیلری تھی۔ اس کے باوجود کچھ نہیں ہوتا تھا۔ دنیا بھر کے اخراجات سر پر رہتے تھے۔ ہم ایک چھوٹے سے علاقے میں رہتے تھے۔ پھر کامران صاحب سے ملاقات ہو گئی۔''

''کامران صاحب کون ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

"ان کا ایک پروڈکشن ہاؤس ہے۔ جانتی ہو یہ کیا ہوتا ہے؟"

"نہیں میں نہیں جانتی۔" میں نے کہا۔

"یہ لوگ ڈرامے بناتے ہیں۔ سیریل سیریز۔ اور نہ جانے کیا کیا۔ بہت زبردست کام ہے ان کا۔ ڈرامے بنا کر مختلف چینل کو دیتے ہیں۔ بہت بڑا بزنس ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم بھی ڈراموں میں آرہی ہو۔"

"ہاں دو ڈراموں کا اگریمنٹ سائین کر چکی ہوں۔ ایڈوانس کے پیسے بھی مل گئے ہیں۔ ان ہی پیسوں سے میں نے یہ پورشن کرائے پر لیا اور گھر میں نیا فرنیچر ڈلوایا ہے۔ تم تو جانتی ہو کہ میرے گھر میں کیسے کیسے لوگ آیا کرتے ہوں گے۔"

"یعنی تمہیں ایڈوانس کے طور پر اتنے پیسے مل گئے کہ تم نے یہ سب کچھ کرلیا؟"

"ہاں تو اس میں کیا ہوا؟ پانچ لاکھ ملے تھے۔ کام ختم ہونے کے بعد پچیس اور مل جائیں گے۔ تیس میں بات ہوئی ہے۔" اس نے بتایا۔

میں چکرا کر رہ گئی۔ یہ تو اچھی خاصی رقم بتا رہی تھی۔ تیس لاکھ۔ بہت بڑی رقم ہوتی ہے۔ اگر ہمارے پاس ہوتے تو کتنا کام نکل آتا جبکہ میں دس بارہ ہزار کی جاب ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔

وہ اچانک کھڑی ہوگئی۔ "اچھا بھئی۔ اب اجازت دو۔ ایک پروڈیوسر کو آنا ہے۔ میں تو بھول ہی گئی تھی۔ تم اگر یہاں آیا کرتی ہو تو تم سے پھر ملاقات ہوگی۔" وہ مجھ سے ہاتھ ملا کر چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں بہت دیر تک وہیں بیٹھی سوچتی رہی کہ ایک یہ لائین ہے کہ جس میں پیسے ہی پیسے ہیں۔ اور ایک دوسری جابس ہیں جن میں گنتی کے پیسے ملتے ہیں۔ گھر آکر بھی میں اسی لڑکی کے بارے میں سوچتی رہی۔

دوسری صبح مجھے ایک اسکول میں انٹرویو کے لیے جانا تھا۔ اسکول قریب ہی تھا۔ انٹرویو کامیاب بھی رہا۔ لیکن جب انہوں نے تنخواہ بتائی تو میں بدک گئی۔ صرف سات ہزار روپے۔ یہ کیا ہوا۔

میں نے کہا "میڈم سات ہزار تو بہت کم ہیں۔"

"بی بی اسکولوں میں تو اتنا ہی ملتا ہے۔" وہ بہت رکھائی سے بولی۔ "اگر ایم اے انگلش ہو تو پندرہ ہزار تک مل جاتے ہیں۔"

بہت مایوسی ہوئی تھی۔ سات ہزار میں کیا ہوسکتا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔ ایک وہ لڑکی تھی۔ جس کو ہزاروں بلکہ لاکھوں ملتے تھے۔ اور ایک میں تھی۔ اس رات میں بہت دیر تک اپنے آپ کو آئینے میں دیکھتی رہی۔ میں ہر حال میں اس سے بہت بہتر تھی۔ میرا رنگ روپ اس سے بہت بہتر تھا۔ میں اس سے اچھی گفتگو کرسکتی تھی اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ میں اس سے زیادہ ذہین تھی۔ وہ لڑکیاں جن کا سہارا ان کے ساتھ نہ ہو وہ اپنے پیروں پہ کھڑی ہو کر پُراعتماد ہو جاتی ہیں۔ میں بھی اب بہت پُراعتماد تھی۔

میں نے امی کو جب یہ بتایا تھا کہ اسکول والوں نے سات آٹھ ہزار کی بات کی ہے تو وہ بے چاری اسی میں خوش ہو گئی تھیں۔ "چلو بیٹا۔ کم از کم تم اپنا خرچ تو نکال لوگی۔"

"اماں۔ سوال صرف میرا نہیں پورے گھر کا ہے۔ سات آٹھ ہزار میں گھر کیا چلے گا؟"

"تو پھر اس سے زیادہ کی نوکری کہاں ملے گی؟"

"دیکھیں میں کوشش میں تو لگی ہوں۔" میں نے کہا۔

اماں نے اس کے بعد کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ دوسری شام کو اسی پارک میں زرینہ سے پھر ملاقات ہوگئی۔ اس شام وہ جاگنگ کا لباس پہن کر آئی تھی اور سچ تو یہ ہے بہت اچھی لگ رہی تھی۔

ہم بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اس نے اپنے بارے میں بتایا کہ فلاں پروجیکٹ سے اس کو کتنے ہزار ملے تھے۔ فلاں سے باہر جانے کی آفر ہوئی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور میں سوچتی رہی کہ اس قسم کے چانس مجھے کیوں نہیں ملتے۔

میں اس سے قریب ہونا چاہتی تھی تاکہ اس کا اعتماد حاصل کرلوں۔ اور وہ مجھے بھی کوئی ایسا چانس دلوا سکے۔ اسی لیے میں نے اس سے کہا۔ "زرینہ۔ آج تمہارے یہاں جانے کو دل چاہ رہا ہے۔"

"ارے کیوں نہیں۔" وہ خوش ہوگئی تھی۔ "میں تو خود تم سے کہنے والی تھی۔ سامنے ہی تو میرا گھر ہے۔ چلو ابھی چلو۔"

میں اس کے ساتھ ہی اس کے گھر کی طرف چل دی۔ پارک کے سامنے ہی تیسری گلی میں اس کا گھر تھا جو اس نے کرائے پر لے رکھا تھا۔ بہت چھوٹا سا لیکن صاف ستھرا گھر تھا۔ میں نے ایک بات محسوس کی کہ جب میں اس کے ساتھ اس گلی میں داخل ہوئی تو کچھ نوجوان ملے جو گلی میں کھڑے تھے۔ انہوں نے ہمیں عجیب نگاہوں سے دیکھا تھا۔ ایک دو نے تو کچھ آوازیں بھی کسی تھیں۔ زرینہ ان کو دیکھ کر بڑبڑاتی رہی

تھی۔ انہیں برا بھلا کہہ رہی تھی۔
بہر حال، ہم گھر میں داخل ہوئے۔ اس کی ماں گھر میں ہی تھی۔ زرینہ نے میرا تعارف کراتے ہوئے بتایا۔ ''اماں! یہ میری نئی دوست ہیں۔ پارک میں آیا کرتی ہیں۔ آج میں ان کو اپنے ساتھ لے آئی ہوں۔''
''ارے، بہت اچھا کیا۔'' اس کی ماں نے مجھے گلے سے لگالیا۔ ''چشم بد دور۔ کتنی پیاری صورت کی ہے تیری دوست۔ بیٹھو تم دونوں۔ میں آتی ہوں۔'' وہ اندر چلی گئی۔
وہ ایک ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس نے ہلکا سا میک اپ بھی کر رکھا تھا۔ ہم ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔
''یار اس گھر میں ہمیں کوئی پریشانی نہیں ہے۔'' زرینہ نے کہا۔ ''سوائے ایک پریشانی کے۔ ان کی وجہ سے تنگ آ چکی ہوں۔''
''وہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''تم نے خود ہی دیکھ لیا ہوگا۔ گلی کے چھچھورے لونڈے نہ جانے کیا سمجھتے ہیں۔ جب نکلتی ہوں تو طرح طرح کی آوازیں کستے ہیں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ سب کو ارشد بھائی سے کہہ کر ٹھیک کروادوں۔''
''یہ ارشد بھائی کون ہیں؟''
''میرے بڑے بھائی۔'' اس نے بتایا۔ ''پھوپی زاد بھائی ہیں۔ لیکن اپنی سگی بہنوں سے زیادہ پیار کرتے ہیں۔ وہ پولس کے بڑے آفیسر ہیں۔ اگر ان کو بتادوں تو وہ ایک ایک کو اندر کردیں۔ لیکن اماں منع کرتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ گلی میں رہ کر ان کے خلاف دشمنی مول نہیں لے سکتے۔ ارشد کب تک ان کو تھانے میں بند رکھے گا۔ کبھی نہ کبھی تو باہر آئیں گے نا۔ اس وقت تو وہ انتقام لینے کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔''
''ہاں آنٹی ٹھیک کہتی ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''بس تم ان کو اگنور کرتی رہو۔ خود ہی ٹھیک ہو جائیں گے۔''
اسی دوران اس کی ماں، ہم دونوں کے لیے چائے لے کر آ گئی تھی۔ کچھ بسکٹ وغیرہ بھی تھے۔ ''ارے آنٹی اس تکلف کی کیا ضرورت تھی؟'' میں نے کہا۔
''اس میں تکلف کیا ہے۔ تم میری بچی کی دوست ہو۔ پھر پہلی بار آئی ہو۔''
چائے کے دوران اس کی ماں نے میری طرف دیکھتے ہوئے زرینہ سے کہا۔ ''ارے بیٹا۔ وہ اسٹار والے آئے تھے۔''
''کیا کہہ رہے تھے؟ زرینہ نے پوچھا۔ ''آپ نے ان کو بھگایا نہیں؟''
''زرینہ، گھر آئی روزی کو اس طرح ٹھکرایا نہیں کرتے۔'' اس کی ماں نے کہا۔ ''پانچ ہی لاکھ تو کم دے رہے ہیں۔ تم ہاں کردو۔''
''انجم، تم بتاؤ، مجھے کیا کرنا چاہیے؟'' زرینہ نے مجھ سے پوچھا۔
''جب تک مجھے کچھ معلوم نہ ہو میں کیا مشورہ دے سکتی ہوں۔'' میں نے کہا۔
''ارے بھائی ایک پروڈکشن ہاؤس ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں ان کی سیریل میں کام کروں۔ پندرہ لاکھ کی آفر ہے۔ جبکہ میں ان سے بیس کی ڈیمانڈ کر رہی ہوں۔ وہ پانچ کم دے رہے ہیں۔ چکر پر چکر لگا رہے ہیں۔ اماں کہتی ہیں کہ ان کی آفر قبول کرلو۔ کیوں کہ کریکٹر بہت اچھا ہے۔ اب تم بتاؤ۔ مجھے کیا کرنا چاہیے؟''
''میں ان معاملات کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی۔'' میں نے کہا۔ ''یہ تمہارا اپنا معاملہ ہے۔ تم اپنا فائدہ اور نقصان خود ہی دیکھ سکتی ہو۔''
''اچھا چلو یہ بتاؤ اگر تم میری جگہ ہوتیں تو کیا فیصلہ کرتیں۔'' زرینہ نے پوچھا۔
''میرے حالات اور ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو اس آفر کو قبول کرلیتی۔''
''سن لیا۔ تمہاری دوست بھی یہی کہہ رہی ہے۔'' اس کی ماں نے کہا۔
''چلو ٹھیک ہے۔ میں ایک دو دن میں ان کو جواب دے دوں گی۔''
اس وقت ایک بار پھر میرا دل چاہا کہ میں زرینہ سے پوچھوں۔ کیا میں اس شعبے میں کامیاب نہیں ہوسکتی؟ ابھی میں یہ سوچ ہی رہی تھی کہ اس کی ماں نے میری یہ مشکل آسان کر دی۔ اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ''بیٹا۔ کیا تم کو اس فیلڈ میں جانے کا شوق نہیں ہے۔ اتنی پیاری صورت ہے تمہاری۔ تم بہت کامیاب ہو سکتی ہو۔''
فوری طور پر تو میں ہاں نہیں کہہ سکتی تھی۔ اسی لیے میں نے کہا۔ ''نہیں آنٹی، میں نے کبھی اس بارے میں نہیں سوچا ہے۔''
''کوئی بات نہیں۔ جب سوچ لو بتا دینا۔''
اس عورت نے مجھے سوچنے کا موقع دے دیا تھا۔ میں جو بات کہنا چاہتی تھی۔ وہی بات اس نے کہہ دی تھی۔ کچھ دیر بعد میں نے ان لوگوں سے اجازت لی اور باہر نکل آئی۔ میرا گھر بھی

زیادہ دور نہیں تھا۔ راستے میں بس دو چار گلیاں اور ایک سڑک تھی۔

تھوڑی دور چلی تھی کہ احساس ہوا کہ کوئی میرا پیچھا کر رہا ہے۔ اس قسم کا احساس ہو ہی جاتا ہے۔ وہ یقیناً اسی گلی کا کوئی چھچھورا انسان ہوگا۔ میں نے ایک جگہ رک کر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ کوئی نوجوان نہیں تھا۔ بلکہ ایک مجہول سا انسان تھا۔ جس طرح کے ملنگ لوگ ہوا کرتے ہیں۔

اس نے ایک بوسیدہ سا لبادہ پہن رکھا تھا۔ سر کے بال الجھے ہوئے تھے۔ میں اس کو دیکھ کر ڈر گئی تھی۔ میں نے اپنے قدم تیز کر دیئے۔ وہ بھی کچھ دیر تک پیچھا کرتا رہا پھر نہ جانے کس طرف چلا گیا۔ بہرحال وہ جو بھی ہو۔ اس نے مجھے خوف زدہ کر دیا تھا۔

گھر واپس آکر میں نے اماں کو زرینہ اور اس کی ماں کے بارے میں بتا دیا۔ یہ بھی بتا دیا کہ وہ شوبز میں کام کرتی ہے۔ لیکن اپنے خیالات کے بارے میں نہیں بتایا کہ میں کیا چاہتی ہوں۔

اس دن کے بعد کئی دنوں تک زرینہ سے ملاقات نہیں ہوئی۔ وہ پارک بھی نہیں آرہی تھی۔ جبکہ میں ہر شام کو پارک جایا کرتی۔ اتفاق سے اس کا نمبر بھی میرے پاس نہیں تھا۔ ورنہ میں اس کی خیریت دریافت کر لیتی۔ خود میں نے اس کے گھر جانا مناسب نہیں سمجھا۔ کئی دنوں کے بعد وہ اچانک پارک میں دکھائی دے گئی۔ مجھے دیکھ کر وہ سیدھی میرے پاس آگئی تھی۔

"یار کہاں چلی گئی تھیں تم؟" میں نے پوچھا۔

"سوری یار۔ تم کو بتا کر نہیں جا سکی تھی۔" اس نے کہا۔ "اچانک مری جانا پڑ گیا تھا۔ ایک شوٹ نکل آئی تھی۔ ایک ہفتے کا کام تھا۔ اس کو نمٹا کر چلی آرہی ہوں۔ آج دوپہر ہی میں آئی ہوں۔"

"واہ۔ تمہارے تو مزے ہیں۔" میں نے کہا۔

"یار کیا مزے ہیں؟" وہ منہ بنا کر بولی۔ "کم بختوں نے بور کر دیا۔ رات دن کی ریکارڈنگ۔ تھک گئی۔ اور ہاں۔ تم گھر آجانا۔ بلکہ ابھی میرے ساتھ ہی چلو۔ میں نے تمہارے لیے مری سے کچھ لیا ہے۔"

"کیوں؟"

"یہ کیا بات کی؟" وہ خفا ہو گئی تھی۔ "تم میری دوست ہو۔ کیا میرا اتنا بھی حق نہیں ہے کہ تمہارے لیے کچھ لے سکوں۔ تحفہ ہے یار۔ مری کا تحفہ۔ چلو میرے ساتھ۔"

اس کی ماں گھر ہی پر تھی۔ وہ بہت گرم جوشی سے ملی تھی۔

زرینہ میرے لیے دو پرس اور ایک کشیدہ کاری کا سوٹ لے کر آئی تھی۔ اچھے خاصے مہنگے ہوں گے۔

"ارے تم نے اتنا تکلف کیوں کیا" میں نے کہا۔ "یہ تو بہت ہے۔"

"بے وقوفی کی بات مت کرو۔" اس کے انداز میں بے تکلفی اور اپنائیت تھی۔ "کچھ بھی نہیں ہے۔ میں تو اور بھی کچھ لینا چاہتی تھی لیکن ٹائم ہی نہیں تھا۔ جلدی جلدی میں جو مل سکا وہ لے آئی ہوں۔"

میں اب انکار نہیں کر سکی۔ وہ سب لے کر اس کے گھر سے باہر آگئی۔ اور ایک بار پھر اسی مجہول سے آدمی نے میرا تعاقب شروع کر دیا۔ پتا نہیں کون تھا اور مجھ سے کیا چاہتا تھا۔ اس کو دیکھ کر خوف سا محسوس ہونے لگا تھا۔ ایک مختلف انسان جس کا حلیہ بھی مختلف تھا۔ میں اس کے بارے میں زرینہ کو بتانا بھول گئی تھی۔

گھر آکر میں نے جب امی کو زرینہ کی دی ہوئی چیزیں دکھائیں تو وہ پریشان ہو گئی تھیں۔ "یہ سب کیوں لے لیا تم نے۔ نہ جان نہ پہچان۔ پتا نہیں کیسی لڑکی ہے؟"

"امی میں نے بتایا تا کہ اس کا تعلق شوبز سے ہے۔ کیا ضروری ہے کہ شوبز سے تعلق رکھنے والے خراب ہی ہوں۔"

"میں نے یہ کب کہا۔ میں تو یہ کہہ رہی ہوں کہ ذرا سوچ سمجھ کر کسی سے کچھ لیا کرو۔ اس کے علاوہ اپنی گنجائش بھی دیکھ لیا کرو۔ کیا ہمارے حالات ایسے ہیں کہ تم ایسی چیزیں اسے بدلے میں دے سکو۔"

"امی بدلے ودلے کی رسمیں پرانی ہو گئیں۔" میں نے کہا۔ "پھر میں نے تو اس سے نہیں کہا تھا۔ اس نے زبردستی یہ سب کچھ دیا ہے۔ ایک دن اس کو لے کر آؤں گی۔ تو خود اندازہ ہو جائے گا کہ وہ کیسی لڑکی ہے۔ شوبز کی لڑکیوں سے بہت الگ ہے وہ۔"

امی نے اس کے بعد کچھ نہیں کہا۔ اس کے بعد ایسا اتفاق ہوا کہ میں ایک دو دن پارک کی طرف نہیں جا سکی۔ ایک شام فرصت ملی تو چلی گئی۔ پارک کے گیٹ سے کچھ فاصلے پر تھی کہ میں نے زرینہ کو دیکھا۔ وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ وہی مجہول سا آدمی کھڑا تھا جو میرا تعاقب کیا کرتا تھا۔

میں حیران ہو کر رہ گئی۔ اس آدمی سے زرینہ کا کیا تعلق ہو سکتا تھا۔ وہ آدمی نہ جانے کیا کہہ رہا تھا اور زرینہ انکار میں اپنی گردن ہلا رہی تھی۔

یہ معاملہ میری سمجھ سے باہر تھا۔ میں ان دونوں کو دیکھتی

املا کی درستی کے لیے غلط العام اور غلط العوام کے دونوں پہلوؤں کو مدِنظر رکھا جائے کہ کون سے غلط الفاظ ہماری توجہ نہ ہونے کی وجہ سے عبارت کے حسن کو گہنا رہے ہیں۔ مثلاً غلط العوام کے حوالے سے روزمرہ زندگی کا ایک لفظ ”قلفی“ کا استعمال ہے یہ لفظ دراصل ”قفلی“ ہے مگر ہم قلفی ہی بولتے چلے جا رہے ہیں۔ اس لفظ کی ماہیت پر بھی غور نہیں کیا۔ قفلی کے معنی ڈھکنے والا ظرف ہے یا وہ نلکی جس میں دودھ اور برف ملا کر جماتے ہیں یا کھیر اور فرنی کے وہ پیالے جو ایک دوسرے کے اوپر رکھے ہوں اسی طرح ”بند“ انگریزی لفظ Bun کا مورد ہے۔ اس سے مراد انگریزی ڈبل روٹی یا کلچے کے ہیں لیکن روزمرہ میں عوام اسے ”بند“ کے لفظ سے استعمال کرتے ہیں۔ جب کہ بند فارسی لفظ ہے جس کے معنی روک، پشتہ، بندھن، جوڑ، عضو، گروہ، ٹیپ کا مصرع یا شعر، مقفل، گوبھی کی ایک قسم، خاموش، چپ وغیرہ کے ہیں۔

ایسے ہی روزمرہ زندگی میں ایک لفظ چپڑاسی کا استعمال ہے اصل لفظ چپراس ہے اس سے مراد چپراس پہننے والا شخص۔ چپراس ہندی لفظ ہے اسے چپ ڑاس بھی لکھتے ہیں مگر غلط العوام کی وجہ سے یہ چپراسی کے بجائے چپڑاسی مشہور ہو گیا۔

لفظ دوپٹا کے معنی دوپاٹ کے ہیں۔ فیلن کے لغت میں دوپٹا کے علاوہ ڈوپٹہ اور روپٹہ کے بھی درج ہیں۔ لکھنو میں بعض عورتوں کی زبان روپٹہ مستعمل رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لکھنو میں ڈوپٹا اور دہلی میں دوپٹا استعمال ہوتا رہا۔

لفظ بے نیل و مرام کی بجائے بے نیل مرام لکھنا زیادہ مناسب ہے یعنی نیل بہ معنی پہنچنا اور مرام بہ معنی غرض اور مطلب کے ہیں۔ جب کہ بے نیل و مرام سے مراد ناکام اور مقصد حاصل کیے بغیر لوٹنا۔

اردو املا میں لفظ ”میاں“ پر غور کیا جائے تو میاں ان معنوں میں استعمال ہوتا رہا اور ہو رہا ہے۔ مثلاً میاں فنِ موسیقی کا ماہر، اعلیٰ درجے کا گویا۔ میاں تحقیر اور تمسخر سے جناب کی جگہ مستعمل ہے۔ مثلاً فقیرانہ آئے صدا کر چلے۔ میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے۔ قصبوں میں اطفال باپ کو ”میاں“ کہتے ہیں اور لکھنو میں ماں باپ محبت اور شفقت کے سبب لڑکے کو میاں کہتے ہیں۔

اسی طرح ”بلبل“ جو ایک خوش آواز پرندہ ہے بہ طور مذکر اور مونث مستعمل ہے اور اسے عندلیب اور ہزار داستان بھی کہتے ہیں۔ اسی طرح یہ لفظ ”بلبل شیراز“ بہ معنی شیخ سعدی کا لقب۔ بلبل ہزار داستان، بہ طور خوش بیاں اور شیریں کلام کے

رہی۔ پھر وہ آدمی غصے میں ایک طرف چلا گیا۔ اتنا ضرور اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ زرینہ سے ناراض تھا۔ زرینہ کچھ دیر تک کھڑی رہی تھی پھر وہ پارک کی طرف بڑھ گئی۔

زرینہ کے پارک میں جانے کے بعد میں بھی پارک میں پہنچ گئی۔ زرینہ اسی بنچ پر بیٹھی تھی جس پر ہم بیٹھا کرتے تھے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی اٹھ کر میرے پاس آ گئی۔ ”بے وفا لڑکی کہاں تھیں دو دنوں تک۔“ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔

”یار میں ایک دو کاموں میں الجھ گئی تھی۔“ میں نے کہا۔ ”آج تمہاری یاد آئی تو اس طرف آ گئی۔“

ہم بنچ پر آ کر بیٹھ گئے۔ میں نے ہمت کر کے وہ بات کہہ ہی دی۔ ”یار میں جب اس طرف آ رہی تھی تو میں نے ایک مجہول سا آدمی دیکھا۔ وہ تم سے کچھ کہہ رہا تھا۔ کیا تم اس کو جانتی ہو؟“

”وہ“ زرینہ کچھ گڑبڑا گئی تھی۔ ”تم کس کی بات کر رہی ہو؟“

”ارے یار وہی جو تم سے گیٹ پر بات کر رہا تھا۔“

”اچھا وہ۔“ زرینہ نے ایک گہری سانس لی۔ ”یار وہ ایک مجذوب ٹائپ کا بندہ ہے ادھر ادھر بھٹکتا رہتا ہے۔ اس کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ نہ جانے کیا کیا کہتا رہتا ہے۔“

”آج کیا کہہ رہا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”آج۔ آج کہہ رہا تھا کہ میرے ساتھ چلو۔ میرے کپڑے دھو دو۔ میں نے اسے ڈانٹ کر بھگا دیا۔ وہ ناراض ہو کر چلا گیا۔“

”مجھے احساس ہوا کہ زرینہ کچھ چھپا رہی ہے۔ اس نے آدھا سچ بتایا ہے۔ یہ درست ہے کہ وہ ناراض ہو کر چلا گیا تھا۔ لیکن اس نے زرینہ سے یہ نہیں کہا ہو گا کہ میرے کپڑے دھو دو۔ بات کچھ اور ہو گی۔ خدا جانے۔ اس کے بعد میں نے اور کچھ نہیں پوچھا۔ اس نے بھی بات بدل دی تھی۔ ”یار یہ بتا کہ تو نے کیا سوچا؟“ اس نے پوچھا۔

”کس بارے میں؟“

”وہی شوبز کے حوالے سے۔“ اس نے کہا۔

”چلو میں تیار ہوں۔ بس ذرا امی سے بات کر لوں۔“

”ہاں، ہاں پوچھ لو ان سے۔ یہ اچھا ہوتا ہے کہ بڑوں کے علم میں ہو۔ جیسے میں امی کو سب کچھ بتا دیتی ہوں۔“

”یار ایسا کرو کہ تم میرے گھر آ کر امی سے بات کر لو۔“ میں نے کہا۔ ”ویسے تو میں امی سے تمہاری تعریف کر چکی ہوں

لیے۔ "بلبل چشم" بہ معنی ایک کیڑا کے مستعمل ہے۔ شعراء نے بلبل کو مذکر اور مونث دونوں معنوں میں استعمال کیا ہے۔

ٹہنی کسی شجر کی تنہا
بلبل تھا کوئی اداس بیٹھا
(اقبال)

گلشن میں آگ لگ رہی تھی رنگِ گل سے میر
بلبل پکاری دیکھ کر صاحب پرے پرے
(میر)

مذکر مونث کے باب میں گرہست سے گرہستن مونث لکھنا غلط ہے۔ اس لیے کہ گرہست بذاتِ خود مونث ہے جس کے معنی عیال داری، قبیل داری اور دنیاداری کے ہیں جب کہ گرہستی بھی ہندی لفظ ہے اور بہ طور مذکر استعمال ہوتا ہے جس کے معنی دنیادار، عیال دار اور گھر والا کے ہیں، اس طرح گرہستی کی مونث گرہستن لکھنا زیادہ مناسب ہے۔ یہ لفظ اردو قواعد و انشاء نہم دہم میں غلط درج ہے۔ اسی لیے بھائی کی مونث بھاوج اور بہنوئی کی مونث بہن لکھنا زیادہ مناسب ہے۔ جب کہ کتب میں بیٹا کی مونث بہن نہیں بلکہ بہو ہے۔

اشتہارات میں اہلیانِ محلہ درج ہوتا ہے جو کہ غلط لفظ ہے اس لیے اہلیان کے بجائے اہالیان اور اہالی لکھنا زیادہ مناسب ہے۔ ایسے ہی سپوٹران کے بجائے سپورٹرز لکھا جانا چاہیے۔ ان کی املا پر کوئی توجہ نہیں آتی ممتحن، متحن میں بھی بنیادی فرق ہے۔ متحن (امتحان دینے والا)، ممتحن (امتحان لینے والا) کے ہیں۔ مترجَم، مترجِم کے معنوں میں بھی فرق ہے مگر ہم ایک دوسرے کی ضد استعمال کرتے ہیں۔ مترجَم کے معنی (ترجمہ کیا ہوا) اور مترجِم کے معنی ترجمہ کرنے والا۔ ایسے ہی راشی (رشوت دینے والا) اور مرتشی (رشوت لینے والا)۔

تحقیقی مقالات میں "حواشی و تعلیقات" لکھنے کا رجحان دیکھنے کو ملتا ہے۔ جب کہ حواشی کے ساتھ تعلیقات کا لفظ لکھنا درست نہیں اس لیے کہ تعلیقات کے معنی مال و اسباب کی ضبطی، مکان کی قرقی اور قرق شدہ مال کی فہرست بنتے ہیں۔

مرسلہ: زاہد سہیل۔ نوشہرہ

لیکن بہتر ہے کہ وہ بھی تم سے مل لیں۔"

"چلو پھر کسی دن چلتے ہیں۔" اس نے کہا۔

"کسی دن کیا آج کیوں نہیں؟" میں نے کہا۔ "میرا گھر کون سا دور ہے۔ تمہارے اور میرے گھر میں ایک جیسا فاصلہ ہے۔"

کچھ سوچ کر اس نے گردن ہلا دی۔ "چلو پھر چلتے ہیں۔"

میں اسے گھر لے آئی۔ امی گھر پر ہی تھیں۔ ویسے بھی ان کا آنا جانا بہت کم ہوتا تھا۔ میں نے زرینہ کا ان سے تعارف کروایا۔ وہ بہت خوش ہوئیں۔ "امی یہ وہی ہیں۔ جن کے بارے میں آپ کو بتا چکی ہوں۔"

"ہاں بیٹا میں تو سمجھ گئی تھی۔ ماشاء اللہ بہت پیاری بچی ہے۔"

"امی۔ یہ چاہتی ہیں کہ میں ان کی طرح شوبز میں آجاؤں۔" میں نے بتایا۔

"دیکھو بیٹا۔" امی نے زرینہ سے کہا۔ "ہم سیدھے سادے لوگ ہیں۔ انجم نے ابھی دنیا نہیں دیکھی ہے۔ اسے نہیں معلوم کہ زندگی میں کیا کیا ہوتا ہے۔ میں تو چاہتی تھی کہ یہ

تو ہوتا ہے نا بیٹا۔ عورت کے پاس صرف ایک وقار ہی ہوتا ہے۔ دس نگاہیں اگر اس کو عزت سے دیکھیں تو وہی اس کی کمائی ہے۔ ورنہ دنیا بھر کی دولت بھی اس کے پاس آجائے تو کچھ بھی نہیں ہے۔ میں تو سوچتی ہوں کہ خدا کرے کوئی شریف سا لڑکا اس کی قسمت کا آجائے تو اس کی شادی کر دوں۔ تاکہ یہ اپنے گھر جا کر اپنی زندگی گزار سکے۔"

"جی آنٹی، یہ تو آپ سچ کہہ رہی ہیں۔" زرینہ نے کہا۔

میں نے محسوس کیا کہ اس کی آواز میں کھوکھلا پن تھا۔ جیسے وہ کہیں کھوئی ہوئی ہو۔ امی نے اس کے لیے چائے بنا کر دی۔ پھر اس کو دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔ اس کے جانے کے بعد امی نے کہا۔ "بیٹا لڑکی بہت اچھی ہے۔ میرا مطلب ہے دل کی بہت اچھی ہے۔ لیکن مجھے اس پر افسوس ہو رہا ہے۔"

"وہ کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"نہ جانے کیوں، مجھے ایسا لگا جیسے وہ کچھ دکھی سی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میرا وہم ہو۔ کیوں کہ تم یہ کہتی ہو کہ وہ بہت خوش ہے؟"

"یہ بات تو ہے۔ وہ بہت خوش ہے۔ اس کی بہت اچھی آمدنی ہے۔ بہت پیسے ملتے ہیں اس کو۔ جو چاہے لے سکتی

"کچھ بھی ہو بیٹا۔ میرا تجربہ کچھ اور بتا رہا ہے۔ وہ اپنی زندگی سے خوش نہیں ہے۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ یہ پسند نہیں کریں گی کہ میں شوبز میں جاؤں۔"

"نہیں بالکل نہیں۔" امی نے قطعی انداز میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔

مجھے ان کا فیصلہ بہت برا لگا تھا۔ زمانہ کہیں سے کہیں چلا گیا ہے۔ ہمارے گھروں کی مائیں بیٹیوں کو سینے سے لگا کر رکھنا چاہتی ہیں۔ اسی لیے ہمارے گھروں میں غربت رہتی ہے۔ میرے سامنے زرینہ کی مثال تھی۔ کیا نہیں تھا اس کے پاس۔ دل کھول کر خرچ کرتی تھی۔ خوش رہتی تھی۔ یہاں یہ حال ہے کہ ڈھنگ کے کپڑے بھی نہیں تھے۔ کچھ بھی ہو مجھے اپنا اور گھر کے حالات بدلنا تھے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ میں ایک دو بار اور زرینہ کو امی کے پاس لے کر آؤں گی۔ وہ اپنے طور پر سمجھائے گی تو ہو سکتا ہے کہ امی کی سمجھ میں بات آجائے۔

دوسری صبح مجھے ایک اسکول میں انٹرویو کے لیے جانا تھا۔ دل تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن امی کی وجہ سے جانا پڑا تھا۔ میں اپنے وقت پر گھر سے نکل آئی۔ اسکول زیادہ دور نہیں تھا۔ پیدل کا راستہ تھا۔ اور ابھی میں اسکول سے کچھ ہی فاصلے پر تھی کہ مجھے وہ دکھائی دے گیا۔ وہی مجہول سا آدمی۔ جس نے ایک بار میرا پیچھا کیا تھا۔ جو زرینہ سے کہہ رہا تھا کہ چل کر میرے کپڑے دھو دے۔ وہ ایک درخت کے نیچے ایک پتھر پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔ جب میں اس درخت کے برابر سے گزرنے لگی تو وہ میرے سامنے آ گیا۔

میں نے اس کو دیکھ کر اپنے قدم تیز کر لیے۔ اس سے خوف سا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے مجھے آواز دی۔ "سنو میری بات سنو۔ رک جاؤ۔"

میں اور تیز ہو گئی۔ اس نے آگے بڑھ کر اس طرح میرا راستہ روک لیا کہ میں اس سے کترا کر جا بھی نہیں سکتی تھی۔ "مجھ سے ڈرو نہیں۔" اس نے کہا۔ "میری بات سن لو۔ میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔" اس کا لہجہ نارمل تھا۔

میں رک گئی۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ وہ میرے قریب آ گیا۔

"بیٹی۔" اس نے مجھے مخاطب کیا۔ بڑی اپنائیت تھی۔ اس کے لہجے میں۔ "زرینہ کو تم کب سے جانتی ہو؟" اس نے پوچھا۔

مجھے ایک شاک سا لگا تھا۔ یہ ملنگ زرینہ کا نام بھی جانتا تھا۔ یعنی زرینہ نے اس دن اس کے بارے میں جو کہا تھا وہ غلط تھا۔ ویسے میں اسی دن کھٹک گئی تھی کہ وہ کچھ چھپا رہی تھی۔

"تم کو اس سے کیا۔" میں نے ہمت کر کے کہہ دیا۔

"بیٹا۔ مجھے غلط مت سمجھو۔" اس کی آواز میں نرمی تھی۔ "میں کوئی پاگل یا برا آدمی نہیں ہوں۔ تم سے مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ وہ اس جال سے نکل آئے۔ وہ الجھتی جا رہی ہے۔"

"تمہارا اس سے کیا واسطہ؟" میں نے پوچھا۔ "مجھے جانے دو۔ ہٹ جاؤ۔ راستہ دو مجھے۔"

"بیٹا۔ اگر میں تمہیں ایک بات بتاؤں تو کیا تم یقین کرلو گی؟"

مجھے اسکول پہنچنے کی جلدی ہو رہی تھی۔ اور یہ شخص میرا راستہ روکے کھڑا تھا۔ اسے ٹالنے کے لیے میں نے کہا۔ "کیا بات ہے بتائیں۔"

"بیٹا۔ میں زرینہ کا باپ ہوں۔ وہ بیٹی ہے میری۔" اس نے کہا۔

میں بھونچکا سی رہ گئی تھی۔ "کیا کہہ رہے ہو تم؟"

"ہاں بیٹا۔" اس کی آواز میں اداسی تھی۔ "میں بدنصیب اس کا باپ ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ میرے ساتھ رہے لیکن وہ انکار کرتی رہتی ہے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ اگر تم اس کے باپ ہو تو پھر تمہارا یہ حلیہ کیا ہے؟" میں نے کہا۔ "میں تو زرینہ کی امی سے بھی مل چکی ہوں وہ تو بالکل عام سی عورت ہیں۔"

"بیٹا، وہ عورت اس کی ماں نہیں ہے۔" اس نے انکشاف کیا۔

"کیا۔" میں اور حیران ہو گئی تھی۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"بیٹا، مجھ پر یقین کرو۔" اس نے کہا۔ "بلکہ ایسا کرو کہ تم مجھ سے ملو کہیں اور۔ یہاں کھڑے ہو کر تم سے باتیں کرنا اچھا نہیں لگ رہا۔"

میری حیرت بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اس مجہول سے آدمی کا لہجہ بہت معقول تھا۔ بہت پڑھا لکھا لہجہ تھا۔ پھر اس کا یہ حال اور اس کا یہ کہنا کہ وہ زرینہ کا باپ ہے۔ ان سب باتوں نے الجھا کر رکھ دیا تھا۔ بہر حال وہ ایک طرف ہٹ گیا اور میں اپنے آپ سے سوالات کرتی ہوئی اسکول تک پہنچ گئی۔

خدا ہی جانتا ہے کہ میں نے کیسا انٹرویو دیا۔ کیوں کہ میں تو اپنے ہوش ہی میں نہیں تھی۔

گھر پہنچی تو امی میری بدحواسی دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔

"کیا ہوا بیٹا۔ خیریت تو ہے نا۔"

"ہاں امی میرے ساتھ تو خیریت رہی لیکن جو کچھ ہوا ہے وہ بہت حیرت انگیز ہے۔"

"خدا خیر کرے۔ کیا ہو گیا۔"

میں نے انہیں تفصیل سے اب تک کی ساری کہانی سنا دی۔ یعنی اس وقت سے جب وہ مجہول سا آدمی پہلی بار میرے سامنے آیا تھا اور اس نے میرا پیچھا کیا تھا۔ پھر میں نے اس کو زرینہ کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس کے بعد آج جو کچھ ہوا۔ وہ بھی بتا دیا۔ امی بھی پریشان ہو گئی تھیں۔ "خدا جانے کیا چکر ہے۔ وہ لڑکی اسی دن مجھے کچھ پریشان سی دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے تمہیں بتایا بھی تھا۔"

"ہاں امی۔ لیکن جو کچھ بھی ہوا ہے وہ حیرت کی بات ہے۔"

دوسرے دن میرا دل نہیں چاہ رہا تھا پارک کی طرف جانے کو۔ اسی لیے بستر پر لیٹ کر کتابیں پڑھتی رہی۔ میں نے یہ نہیں بتایا کہ یہ میرا محبوب مشغلہ تھا یعنی مطالعہ۔ ابھی میں نے کتاب شروع ہی کی تھی کہ دروازے پر ہونے والی دستک نے چونکا دیا۔ اٹھنے کو دل تو نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر اٹھنا پڑا اور دروازہ کھولا تو ایک انجان سی شکل کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ ایک اچھی عمر کا باوقار سا آدمی تھا۔ اس نے بہت ڈھنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔

"جی فرمائیں۔" میں نے پوچھا۔ "کس سے ملنا ہے؟"

"بیٹی میں تم ہی سے ملنے آیا ہوں۔" اس نے کہا۔

میں اس کی آواز سن کر چونک گئی۔ یہ آواز تو اسی مجہول کی تھی لیکن کہاں وہ اور کہاں یہ معقول انسان۔

"بیٹا میں وہی ہوں۔" اس نے کہا۔ "میں کئی بار تمہارا تعاقب کر چکا ہوں۔ اسی لیے تمہارا گھر معلوم تھا۔"

اب مجھے یقین ہو گیا کہ یہ وہی ہے لیکن اس کا وہ حلیہ اور یہ حلیہ، زمین آسمان کا فرق تھا۔ اس نے میری حیرت بھانپ لی تھی۔ اس نے کہا "بیٹا میں وہی ہوں۔ میں نے اپنے آپ کو چینج کر لیا ہے۔ کل کے ملنگ اور آج کے شوکت علی میں بہت فرق ہو گیا ہے بیٹا۔"

"انکل یہ تو واقعی بہت بڑا فرق ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں، کل اور آج میں بہت فرق ہو گیا ہے۔" "آج تمہارے سامنے وہی شوکت علی کھڑا ہے جو بیس سال پہلے ہوا کرتا تھا۔"

ہم دروازے پر کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ انہیں اندر لے آؤں۔ اسی وقت امی بھی پڑوس کے گھر سے واپس آ گئیں۔ وہ اس شخص کو دروازے پر دیکھ کر حیران رہ گئی تھیں۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے پھر امی نے کہا۔ "تم۔ تم شوکت ہو نا۔"

"ہاں۔ اور تم۔ تم فوزیہ ہو نا۔"

"ہاں، ہاں۔ میں فوزیہ ہوں۔" امی نے بتایا۔

اب ایک اور حیرت۔ دونوں ایک دوسرے کو جانتے تھے۔

☆☆☆

"فوزیہ۔ میں ایک سیدھا سادا انسان تھا۔ اپنی زندگی میں خوش رہنے والا۔ میں نے تم سے شادی کرنے کا سوچا تھا لیکن ایسا ہو نہ سکا۔" شوکت نے اپنے بارے میں بتانا شروع کر دیا۔

امی انہیں گھر کے اندر لے آئی تھیں۔ امی نے بتایا کہ شوکت ان کے دور کے رشتے دار ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے گھروں میں آتے جاتے تھے امی بھی کسی حد تک ان کو پسند کرتی تھیں کیوں کہ وہ ایک مہذب انسان تھے اور اپنی پڑھائی مکمل کر رہے تھے۔ اس کے بعد وہ مزید تعلیم کے لیے ملک سے باہر چلے گئے تھے۔ پھر امی کے والدین بھی اس محلے سے کہیں شفٹ ہو گئے۔ اس کے بعد پھر پتا نہیں چلا کہ شوکت صاحب کا کیا ہوا۔ اس دوران امی کی بھی شادی ابو سے ہو گئی تھی۔ وقت گزرتا گیا۔ میں پیدا ہوئی۔ پرورش پاتی رہی۔ جوان ہو گئی اور اب اتنے برسوں کے بعد شوکت سامنے آ گئے تھے۔ وہ بھی اتنے ڈرامائی انداز میں کہ حیرت ہو رہی تھی۔

امی نے یہاں تک بتا دیا تھا۔ امی کی زندگی میں کوئی ایسا موڑ نہیں تھا جو الجھا ہوا ہو۔ البتہ شوکت صاحب بہت الٹ پھیر سے گزرے تھے۔ اور امی کو وہی کہانی سنا رہے تھے۔

"فوزیہ میں نے باہر تعلیم حاصل کی۔ جب میں باہر تھا تو اسی دوران والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ دو بھائی تھے۔ انہوں نے اپنی اپنی زندگی اختیار کر لی تھی۔ بہر حال میں تعلیم مکمل کر کے واپس آیا تو ایک اچھی جاب مل گئی تم لوگوں سے تعلق نہیں رہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم کہاں اور کس حال میں ہو۔ اور ویسے بھی ہمارے درمیان ایسی کوئی بات نہیں تھی۔"

"ہاں۔ میں نے آپ کو بھلا ہی دیا تھا۔ بس ہلکی ہلکی شکل یاد تھی۔" امی نے بتایا۔

میں ان دونوں کے درمیان بیٹھی ان کی باتیں سن رہی

تھی۔ کیسی حیرت والی بات تھی۔ کہانی کہاں سے شروع ہوئی تھی اور کہاں تک آ گئی تھی۔

''انسان سے زندگی میں کوئی نہ کوئی ایسی غلطی ہو ہی جاتی ہے جس کا خمیازہ ہمیشہ برداشت کرتا رہتا ہے۔ میں نے شادی کر لی۔ خدا جنت نصیب کرے۔ راحیلہ بہت اچھی تھی لیکن وہ زرینہ کو جنم دے کر انتقال کر گئی۔ اس وقت زرینہ صرف چھ سال کی تھی۔ ایک دو برسوں تک تو میں اکیلا ہی اس کو سنبھالتا رہا۔ پھر میں ایک عورت کے جال میں پھنس گیا۔ وہی عورت جو آج زرینہ کی ماں بنی ہوئی ہے۔ وہ ایک چالاک اور پیسوں کے لیے سب کچھ کر گزرنے والی عورت ہے۔ اس نے زرینہ کو اپنے جال میں اس طرح پھانسا ہے کہ اسے میرا وجود گراں گزرتا۔ وہ عورت اسے اپنی ہمدرد محسوس ہوتی۔ اس عورت نے اسے چمک دمک کے خواب دکھائے۔ وہ زرینہ کو غلط راستوں پر لے جانا چاہتی ہے۔''

''شوکت۔ تم نے یہ سب برداشت کیسے کر لیا؟'' امی نے پوچھا۔

''اس کی بھی ایک کہانی ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''میں اس عورت کو چھوڑ چکا ہوں۔ میرا اس سے کوئی واسطہ نہیں ہے لیکن بد قسمتی یہ ہے کہ زرینہ اسے نہیں چھوڑتی۔ کیوں کہ اس کے خیال میں وہی اس کی ہمدرد ہے۔ میں اسی کی وجہ سے ذہنی مریض بن کر رہ گیا۔ میں اپنی بیٹی کی نگرانی کے لیے پاگل بن کر گھومنے لگا تھا۔''

''شوکت انکل۔ آپ باپ ہیں۔ آپ تو قانون کے ذریعے زرینہ کو اپنے پاس رکھ سکتے تھے۔''

''ہاں رکھ سکتا تھا۔ لیکن یہ اس وقت ہوتا جب زرینہ خود میرے پاس رہنا چاہتی۔ اس کا خیال تھا کہ میں اس کا دشمن ہوں۔ اس کو ترقی کرتا نہیں دیکھ سکتا۔ یہ خیال اس عورت نے اس کے ذہن میں پیدا کر دیا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ میں زرینہ کو سمجھانے اس کے پاس گیا تو اس عورت نے اپنے جاننے والوں کے ذریعے مجھ پر قاتلانہ حملہ کروا دیا۔ میں نے بڑی مشکل سے خود کو بچایا تھا۔ اگر زرینہ میری طرف ہوتی تو پھر تو کوئی بات ہی نہیں تھی۔ لیکن بدقسمتی یہ کہ وہ میری کوئی بات سننے کو تیار ہی نہیں۔ اس عورت نے اسے جس دنیا کے خواب دکھائے ہیں اس میں بہت رنگینی ہے۔ میں پھر بھی اس کی طرف سے مایوس نہیں تھا۔ اسے سمجھانے کے لیے اس کی گلی میں مارا مارا پھرتا۔ ایسی بے بسی کی کہانی بھی تم نے نہیں سنی ہو گی۔ لیکن یہ سب حقیقت ہے۔ اس معاشرے میں کہانیاں اسی طرح جنم لیتی ہیں۔ اسی طرح کردار سامنے آتے ہیں۔ پھر یہ ہوا کہ تم میرے سامنے آ گئیں۔'' یہ بات انہوں نے مجھے دیکھ کر کہی تھی۔ ''اور میرا دل کانپ اٹھا۔ میں سمجھ گیا کہ زرینہ نے اس عورت کے کہنے پر تمہارے گرد ڈورا ڈالنا شروع کیا ہے۔ تاکہ تم کو کمائی کا ذریعہ بنایا جا سکے۔''

''خدا کی پناہ۔ تو میری بیٹی کے ساتھ یہ سب ہونے والا تھا۔'' امی کانپ کر رہ گئیں۔

''ہاں۔ اور اس وقت میرے دل میں آئی کہ کسی طرح بھی ہو۔ انجم کو اس جنجال سے بچایا جائے۔ اس کے بعد کی کہانی تمہارے سامنے ہے۔ میں اپنا حلیہ بدل کر یہاں آیا تو پتا چلا کہ انجم تمہاری بیٹی ہے۔ یہ رشتہ اور بھی گہرا ہو گیا۔ اب خدا سے دعا کرو کہ زرینہ اس کے چنگل سے نکل آئے۔''

''انکل میں کوشش کروں گی کہ زرینہ کو اس جال سے نکال سکوں۔'' میں نے کہا۔

☆☆☆

لیکن ایسا ہو نہیں سکا تھا۔

اس کہانی کا انجام کچھ اور ہو گیا تھا۔ بہت مختلف۔ اس کا اندازہ بھی نہیں تھا۔

زرینہ نے نہ جانے کیوں خودکشی کر لی تھی۔ اس کی اطلاع پانچ چھ دنوں بعد ملی تھی۔

اخبار میں تو صرف اتنا آیا کہ زرینہ نام کی ایک لڑکی نے زہر کھا کر اپنی جان دے دی ہے۔ وہ شوبز کی دنیا میں اپنے پاؤں جما رہی تھی لیکن اخبار میں یہ نہیں آ سکا تھا کہ وہ حاملہ تھی۔

اس کے بعد کی کہانی کچھ یوں ہے کہ شوکت ٹوٹ کر رہ گئے تھے۔ ان کے خدشات پورے ہو گئے تھے۔ اس عورت نے ان کی زرینہ کو برباد کروا دیا تھا اور خود کہیں غائب ہو گئی تھی۔ شوکت صاحب کو نارمل ہونے میں بہت دن لگ گئے تھے۔

ہاں۔ ایک بات اور۔

اب شوکت صاحب میرے لیے انکل نہیں رہے بلکہ پاپا ہو گئے ہیں۔ امی نے ان سے شادی کر لی ہے اور میں پاپا کی زرینہ بن کر ان کی خدمت کر رہی ہوں۔ میرے سر سے شوبز کا بھوت اتر چکا ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے کہ شوبز میں سب کچھ غلط ہی ہو۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ آپ کس کے ہاتھ میں جا رہے ہیں۔ یہاں آپ کے ہنر کی قدر ہو رہی ہے یا آپ کے جسم کی۔

☆☆☆

وفا پرست

مکرمی ایڈیٹر
سلام مسنون
میں نے جو کچھ لکھا ہے سو فیصد صحیح لکھا ہے۔ یہ تمام واقعات میرے ساتھ ہوئے ہیں۔ اگر سرگزشت میں اسے آپ نے شائع کر دیا تو مشکور رہوں گا۔
فراز احسن
(فیصل آباد)

وہ شروع ہی سے ایسی تھی۔
باوقار، اپنے آپ کو لیے دیے رکھنے والی بے پناہ محبت کرنے والی۔ اور بہت خوبصورت۔ وہ کہا کرتی کہ ہم لڑکیاں جس کو ایک بار دل میں بسا لیں اس دل میں کسی اور کا گزر نہیں ہو سکتا۔ ہم اسی کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیتی ہیں۔
میں اس کے برعکس ایک بے پروا سا انسان تھا۔ میں نے اپنی زندگی فضولیات میں گزاری تھی۔ مشاعروں،

دوستوں کی محفلوں، ہوٹلنگ، آوارہ گردی۔ ان کے علاوہ کوئی کام نہیں تھا۔ محلے میں ایک ہوٹل تھا۔ ہم سارے دوست شام کے بعد اس ہوٹل میں جا کر بیٹھ جاتے اور رات گئے تک محفل جمی رہتی۔

میں تعلیم حاصل کر رہا تھا لیکن نہ جانے کیوں مجھے یہ خیال ہوتا تھا کہ ایک دن کہیں غیب سے میرے لیے دولت کے دروازے کھل جائیں گے۔ یا پھر مجھے کوئی ایسی جاب مل جائے گی جس میں عیش ہی عیش ہوں گے۔ یعنی میں اپنے آنے والے دنوں کی طرف سے بہت پُر امید تھا۔

اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میرا خاندانی بیک گراؤنڈ بہت اچھا تھا۔ اس زمانے میں میرے بہت سے رشتے دار اعلیٰ عہدوں پر تھے۔ انہوں نے امید دلا رکھی تھی کہ میں اپنی تعلیم مکمل کرلوں پھر وہ مجھے جاب دلا دیں گے۔ اس لیے بھی مزاج میں بے پروائی سی آگئی تھی۔

میرے دوستوں کا بھی یہی خیال تھا کہ میرا فیوچر محفوظ ہے۔ میں ان سے بہت آگے نکل جاؤں گا۔

یاسمین میرے ہی محلے کی ایک لڑکی تھی جس کا میں نے ذکر کیا ہے۔ اس کے والد ایک اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ دو بھائی تھے جو تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ دو بہنیں تھیں جو اس سے چھوٹی تھیں۔ ایک پڑھا لکھا خاندان تھا۔ سنا ہے کہ اس کی والدہ بھی کسی زمانے میں اسکول ٹیچر رہ چکی تھیں۔

یاسمین بھی گرلز کالج جایا کرتی تھی لیکن اس کی چال اور اس کے انداز میں جو بات تھی وہ کسی میں نہیں تھی۔ اپنے آپ کو سمیٹ کر اس طرح چلتی جیسے چاروں طرف آندھیاں چل رہی ہوں۔ ہر ہر قدم پر اپنا خیال رکھتی ہوئی، اپنے وقار کو سنبھالتی ہوئی۔ میرے آوارہ گرد دوست بھی اس کا ذکر عزت کے ساتھ کیا کرتے تھے۔

''یار اس لڑکی کی تو بات ہی الگ ہے۔ وہ تو اس معاشرے کی معلوم ہی نہیں ہوتی۔''

''ہاں یار۔'' دوسرا اس کی تائید کرتا۔ ''اس میں جو خوبیاں ہیں۔ وہ کسی میں نہیں ہیں۔ جس کے پاس جائے گی وہ خوش قسمت ہوگا۔''

''بشرطیکہ اس کی قدر کرنے والا ہو۔ آج کل کے لونڈے تو چھچھورپن کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔''

ہمارے درمیان اس کے حوالے سے اسی قسم کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ میں نے یہ دیکھا تھا کہ یہ لڑکے کسی بھی لڑکی کے ساتھ اپنی دوستی کا اعلان کرتے پھرتے تھے لیکن یاسمین کے حوالے سے کوئی کچھ نہیں بولتا تھا۔ کسی کے پاس اس کی کوئی کہانی نہیں تھی۔ کیوں کہ وہ ایک الگ مزاج کی تھی۔

بس میرے دل میں خواہش تھی کہ وہ کسی طرح میرے قریب آجائے۔ میری ہو جائے۔ لیکن کیسے؟ ابھی تو میرا کوئی فیوچر ہی نہیں تھا۔ صرف باتیں اور اُمیدیں تھیں۔ جن کے پورا ہونے کا ابھی کوئی امکان نہیں تھا۔ ایک سال بعد امتحان ہونے والے تھے۔ اس کے بعد جو ہوتا پھر دیکھا جاتا۔

میرے محلے کی لوکیشن کچھ یوں تھی کہ چھوٹے چھوٹے کوارٹر بنے ہوئے تھے۔ کچھ لوگوں نے اپنے طور پر ان میں تعمیرات بھی کرا دی تھیں۔ یاسمین کا گھر بھی دو منزلہ تھا۔ اوپر کے کمرے میں وہ رہا کرتی تھی۔ اس کی کتابیں ہوتیں۔ اس زمانے میں کمپیوٹر وغیرہ نہیں ہوا کرتے تھے۔ اسی لیے الماریوں میں کتابیں ہوا کرتی تھیں۔

میری عزت محلے میں کچھ اس لیے بھی تھی کہ میں ایک شاعر تھا اور افسانے لکھا کرتا تھا۔ اردو سے چونکہ بہت دلچسپی تھی اسی لیے میری اردو بھی بہت اچھی تھی۔ یہ بات بہت سوں کو معلوم تھی۔ ماسٹر صاحب اکثر مجھے مشاعروں میں مل جایا کرتے تھے۔ گرچہ وہ خود شاعر نہیں تھے لیکن باذوق آدمی تھے۔

ایک دن میری قسمت مجھ پر کچھ اس طرح مہربان ہوئی کہ میں راستے میں جا رہا تھا کہ کسی نے آواز دی۔

''میاں فراز، ذرا بات تو سنو۔''

وہ ہیڈ ماسٹر صاحب تھے۔ میں مؤدب ہو کر ان کے پاس پہنچ گیا۔ ان کو سلام کر کے ان سے ہاتھ ملایا۔ ''یس سر'' میں بھی ان کو سر ہی کہا کرتا تھا۔

''فراز میاں، مجھے تم سے ایک کام ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''جی فرمائیں۔ میں حاضر ہوں۔''

''میری بیٹی اردو میں ذرا کمزور ہے اور تمہارے بارے میں سنا ہے کہ تمہاری اردو بہت اچھی ہے۔ میں تمہیں مشاعروں میں بھی سنتا رہتا ہوں۔ کیا تم میری صاحب زادی کو اردو پڑھا دو گے؟''

مجھے ایسا لگا جیسے اچانک میری ساری مرادیں پوری ہوگئی ہوں۔

میں نے اسی کے تو خواب دیکھے تھے۔ اسی کی تو خواہش کی تھی۔ وہ لڑکی جس کو دیکھ کر محلے کے لڑکے حسرت

ہی کیا کرتے تھے۔ مجھے اس کے پاس جانے کا موقع ملنے والا تھا۔ اس سے جی بھر کر باتیں کرنے کا چانس ملنے والا تھا۔

''کیوں نہیں جناب۔'' میں نے کہا۔ ''میں تیار ہوں۔ کب سے حاضر ہو جاؤں؟''

''کل ہی سے آجاؤ۔'' ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا۔

میں نے یہ خبر اپنے دوستوں کو نہیں بتائی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی کی نظر لگ جائے۔ یہ ایک بہت بڑی بات تھی۔

میں دوسری شام اس کے گھر پہنچ گیا۔ میرا اور کام ہی کیا تھا۔ نہ کہیں آنا نہ کہیں جانا۔ دروازہ اس لڑکی کی چھوٹی بہن نے کھولا تھا۔ شاید اسے میرے بارے میں بتا دیا گیا تھا۔ اس نے مجھے سلام کیا اور ایک کمرے میں لے جا کر بیٹھا دیا۔ بہت سلیقے سے سجا ہوا کمرا تھا۔ ایک الماری میں کتابیں بھی تھیں۔ جو یقیناً اس کے والد کی ہوں گی۔

کچھ دیر بعد وہ کمرے میں آ گئی۔ اسی باوقار انداز سے جو اس کے مزاج کا حصہ تھا۔

میں اس کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ سلام کر کے ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ مجھے ہوش کہاں تھا کہ اس سے کچھ کہہ سکتا۔ بالآخر ہم بیٹھ گئے۔ میں نے ابتدا کی۔ اس سے کچھ باتیں ہوئیں اور اس کی پڑھائی کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔

مختصر یہ کہ ہم ایک دوسرے کے قریب آتے چلے گئے۔ محبت کی داستانیں عام طور پر ایک ہی جیسی ہوتی ہیں۔ دل چاہتا ہے کہ بس اسی کی باتیں ہوتی رہیں۔ اسی کی بات کرتے رہیں۔ یہ ایک عجیب رشتہ ہوتا ہے بقول شاعر

''جو کہ رشتے میں کچھ نہیں ہوتے۔ ان سے رشتہ بلا کا ہوتا ہے''

وہ صحیح معنوں میں شرم و حیا کی پیکر تھی۔ اس میں تصنع نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس کی محبت میں بہت گہرائی تھی۔ میرے کچھ مخلص دوستوں کو بھی میرے اور اس کے بارے میں معلوم ہو گیا تھا۔ وہ مجھے مبارک باد دیا کرتے تھے۔

میں اس سے کہا کرتا۔ ''یاسمین تم شیشے کے نازک برتن کی طرح ہو۔ تم کو زندگی میں ایسا ہم سفر ملنا چاہیے جو تمہیں ہتھیلی کے چھالے کی طرح سنبھال کر رکھے۔''

''پھر تو تم ہی کو رکھنا ہوگا'' وہ کہا کرتی۔

''پتا نہیں کہ تم میرے نصیب میں ہو یا نہیں۔''

''لیکن میں تو تم کو اپنا نصیب بنا چکی ہوں۔ میں مشرق کی لڑکی ہوں۔ اول تو مجھ جیسی لڑکیاں اس قسم کے چکر میں نہیں پڑتیں اور اگر کسی کو اپنے دل میں بسا لیں تو پھر زندگی بھر اسی کی ہو کر رہتی ہیں۔''

اس کی ایسی باتیں میرے خون کا حصہ بن جاتیں۔ میں سرشار ہو کر رہ جاتا۔

اس نے مجھ سے کہا۔ ''فراز اب تم جاب کی کوشش کرو۔ کوئی سی بھی ہو تا کہ میں تمہارے لیے اسٹینڈ لے سکوں۔ ابھی تو تمہارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔''

اس کے کہنے پر میں نے سنجیدگی سے جاب کے لیے کوشش شروع کر دی۔ ایک آفس میں جاب بھی مل گئی۔ پرابلم یہ بھی تھی کہ وہ جگہ دور بہت تھی اور صبح آٹھ بجے وہاں پہنچنا ہوتا تھا۔ وہ بھی دو دو بسیں بدل کر جبکہ میرا یہ حال تھا کہ دس بجے سے پہلے سو کر نہیں اٹھتا تھا۔

یاسمین نے کہا۔ ''اگر تم مجھے حاصل کرنا چاہتے ہو تو یہ تو کرنا ہوگا۔ اپنی عادتیں بدلنی ہوں گی۔''

''یار مسئلہ صبح اٹھنے کا ہے۔'' میں نے کہا۔

''تم اس کی فکر مت کرو۔ میں نماز کے لیے اٹھتی ہوں۔ تم کو اٹھا دیا کروں گی۔''

میں یہ بتا چکا ہوں کہ وہ علاقہ ایسا تھا کہ چھوٹے چھوٹے کوارٹر بنے ہوئے تھے۔ میرا کمرا گلی کی طرف تھا۔ یعنی اس کا دروازہ گلی کی طرف کھلتا تھا جبکہ اس کا گھر دو گلیوں کے بعد تھا۔ اس نے اپنی بات اس طرح پوری کی کہ وہ نماز کے بعد چھوٹی بہن کے ساتھ میرے دروازے پر آ کر دستک دیتی۔ میں دروازہ کھولتا۔ وہ کمرے میں آ جاتی۔ میرے جوتوں پر پالش کرتی۔ میری چیزیں سیٹ کرتی۔ اور جب اسے یقین ہو جاتا کہ میں اب دوبارہ بستر پر نہیں لیٹوں گا تو وہ اپنے گھر چلی جاتی۔ اس وقت بھی اندھیرا ہی ہوا کرتا تھا۔

اس دور میں جب لوگوں کی نظریں بہت تیز ہوا کرتی تھیں اور ذرا سی بات میں فسانہ بن جاتا تھا، وہ اتنا بڑا خطرہ مول لے رہی تھی۔

اس کا یہ روٹین کئی مہینوں تک رہا تھا۔ اس دوران سردیاں بھی آ گئیں لیکن اس وفا پرست نے اپنی روش قائم رکھی۔

ایک دن میں نے اس سے کہا۔ ''یاسمین تم میرے لیے اتنی محنت کیوں کر رہی ہو؟''

اس نے جواب دیا۔ ''فراز۔ یہ سب میں تمہارے لیے نہیں بلکہ اپنے لیے کر رہی ہوں۔ تمہارے مستقبل سے میرا مستقبل جو وابستہ ہو گیا ہے۔''

وہ میرے لیے ٹانک کی طرح تھی۔ اس نے مجھے میرے ہونے کا احساس دلایا تھا۔ وہ کمال کی لڑکی تھی۔

ایک دن میں نے اسے جب اپنے قریب کرنا چاہا تو وہ بدک کر ایک طرف ہٹ گئی۔ ''نہیں فراز۔ تم میرے ساتھ ایسی کوئی حرکت نہیں کرو گے جو میرے مزاج کے خلاف ہو۔ میں نے تم سے محبت کی ہے۔ اس محبت کا احترام کرو۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم سے قریب ہونے کے لیے تم سے شادی کرنی ہوگی؟'' میں نے کہا۔

''اور کیا'' وہ مسکرا دی۔ ''میں تمہارے لیے اتنی محنت کیوں کر رہی ہوں۔ اسی لیے نا کہ تم اپنا مستقبل بنا لو۔ اس کے بعد مجھے حاصل کر لو۔''

یاسمین وہ لڑکی تھی جس نے مجھے نماز کا عادی بنا دیا۔ وہ جب میرے پاس آیا کرتی تو اس کا حکم ہوتا کہ میں اندر جا کر وضو کر آؤں جب تک وہ میرے کپڑوں پر استری کر رہی ہے۔ اور میرے جوتے پالش کر رہی ہے۔ میں اس کی کوئی بات نہیں ٹال سکتا تھا۔ اس کی محبت اس کا خلوص مجھے مجبور کر دیا کرتا۔ اس وقت گھر والے سو رہے ہوتے۔ میں اندر جا کر وضو کر کے واپس آ جاتا تھا۔ اس دوران وہ میرے کام کرتی رہتی۔ اس طرح اس نے مجھے دفتر اور نماز کا عادی بنا دیا تھا۔

محبت کا کیا عجب پہلو تھا۔ ورنہ کون اتنا کرتا ہے۔ اس نے اپنے طرز عمل سے ثابت کر دیا تھا کہ محبت اور وفا پرستی ابھی ختم نہیں ہوئی۔

دو تین مہینوں کے بعد جب میں صبح اٹھنے، نماز پڑھنے اور وقت پر دفتر جانے کا عادی ہو گیا تو اس نے کہا۔ ''فراز۔ ہو سکتا ہے کہ میں کل سے نہ آؤں۔''

''وہ کیوں؟''

''اس لیے کہ اب گرمیاں شروع ہو گئی ہیں۔ کچھ لوگ گلی میں چارپائی ڈال کر سونے لگے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی دیکھ لے اور کہانی بن جائے۔ ویسے مجھے اب یہ اطمینان تو ہو گیا ہے کہ تم کو صبح اٹھنے کی عادت پڑ چکی ہے اور تم پابندی سے نماز بھی پڑھنے لگے ہو۔''

''جان۔ میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھول سکوں گا۔'' میں نے کہا۔

''نہیں یہ کوئی احسان نہیں ہے۔ یہ میری محبت کا فرض ہے کہ تم کو ایک صحیح راستے پر لے آؤں۔ تمہارے سامنے ابھی بہت دور کا سفر ہے۔ اور بڑی کامیابی کے ساتھ یہ سفر طے کرنا ہے۔''

''لیکن اس سفر میں تم بھی تو میرے ساتھ ہو گی۔''

''ظاہر ہے۔'' وہ مسکرا دی۔ ''یوں سمجھو کہ میں یہ سب اپنے لیے کر رہی ہوں۔''

میں نے اپنے گھر والوں کو اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ وہ یاسمین کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کر لیں۔ سب کو اس بات پر حیرت تھی کہ یاسمین جیسی لڑکی میرے لیے کیسے راضی ہو سکتی ہے۔ میں نے یقین دلایا کہ اسی کے کہنے پر میں نے خود کو بدل لیا ہے۔ اسی کے کہنے پر میں نے سنجیدگی سے جاب شروع کی ہے اور بھی جتنی تبدیلیاں وہ مجھ میں دیکھ رہے ہیں۔ سب اسی کی وجہ سے ہیں۔ اسی نے مجھے نماز کا عادی بنایا ہے کہ مجھ جیسا انسان صبح سویرے اٹھنے لگا ہے۔

یہ تبدیلیاں سب کو دکھائی دے رہی تھیں۔ سب اس بات پر حیران بھی تھے۔

میں نے انہیں یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ روزانہ میرے پاس صبح آ کر مجھے اٹھایا کرتی ہے۔ ورنہ وہ نہ جانے کیا خیال کرنے لگتے۔

میں نے اس شام یاسمین سے کہا۔ ''سنو۔ میں تمہیں قید کرنے کی پلاننگ کر رہا ہوں۔''

''قید تو میں ہو ہی چکی ہوں۔'' اس نے کہا۔

''اب باقاعدہ قید کرنا ہے۔ میں اپنے گھر والوں کو تمہارے گھر بھیج رہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا۔ ''کاش سب ٹھیک ہو جائے۔''

''ہو جائے گا۔'' میں نے کہا ''تمہارے ابو بھی مجھے بہت پسند کرتے ہیں۔ پہلے تو وہ صرف ایک شاعر کی حیثیت سے پسند کرتے تھے لیکن جب سے انہیں یہ معلوم ہوا ہے کہ میں نے ایک ذمے دار جاب شروع کی ہے اور نماز کا پابند ہو گیا ہوں، تب سے ان کی پسندیدگی میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ انہوں نے تمہیں پڑھانے کے لیے میرا انتخاب کیا ہے۔''

''یہ بات تو ہے۔ ورنہ خاندان میں بھی ایک سے ایک پڑھے لکھے نوجوان ہیں۔ ابو ان سے بھی کہہ سکتے تھے۔ تمہیں معلوم ہے۔ میرے کتنے کزن وغیرہ ہیں لیکن کسی کو میرے پاس آنے کی اجازت نہیں ہے۔ سب آتے ہیں اور باہر کے کمرے میں بیٹھ کر چلے جاتے ہیں۔''

''پھر تو میں بہت خوش قسمت ہوا نا؟''

لیکن میری یہ خوش فہمی اس وقت رفع ہو گئی جب میرے رشتے سے انکار کر دیا گیا۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی کہ ماسٹر صاحب نے بہت پہلے اپنے کسی دوست سے ان کے بیٹے کے لیے یاسمین کا رشتہ طے کر دیا تھا۔

میرے گھر والے خفیف ہو کر چلے آئے تھے۔

میرا یہ حال تھا جیسے مجھ پر بجلی سی گر پڑی ہو، جب ایسی کیفیت ہو۔ آپ یہ سمجھنے لگیں کہ آپ اور وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہو چکے ہیں اور دنیا کی کوئی طاقت الگ نہیں کر سکتی۔ اس وقت اگر اس قسم کی بات ہو جائے تو پھر زندگی سے جی اچاٹ ہو جاتا ہے۔ ایک جنونی کیفیت ہو جاتی ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ میں نے یاسمین کو پڑھانا چھوڑ دیا۔ اب کیا کرتا۔ اس کے پاس جانے کا فائدہ ہی کچھ نہیں تھا۔ جی چاہتا تھا کہ جاب وغیرہ سب چھوڑ دوں۔ جس کے لیے یہ سب کیا تھا۔ جب اسی کو الگ کر دیا گیا تھا تو اور کیا ہو سکتا تھا۔ بقول شاعر میرا یہ حال ہو گیا تھا۔ "تجھ بن رہوں گا اپنے نصیبوں سے بے نیاز سے خود سے لڑوں گا خود کو ہرانے کے واسطے۔"

پھر یہ ہوا کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ لوگ اس محلے سے چلے گئے۔

ماسٹر صاحب نے مکان بیچ دیا تھا اور کہیں اور چلے گئے تھے۔ ایک اُمید تھی کہ اس کو راستے میں آتے جاتے دیکھ لیا کروں گا۔ وہ بھی نہیں رہا تھا۔

اس زمانے میں موبائل فون وغیرہ کی سہولیات کہاں تھیں کہ مجھے اس کے بارے میں معلوم ہو سکتا کہ کس حال میں ہے۔ میرے پاس بس اس کی یادیں رہ گئی تھیں وحشت کا یہ عالم بہت دنوں تک رہا تھا پھر ایک صبح دروازے پر دستک ہوئی۔ بالکل اسی طرح جس طرح یاسمین میرے دروازے پر آ کر دستک دیا کرتی تھی۔

اس وقت فجر کی اذان بھی نہیں ہوئی تھی۔ نہ جانے کون تھا جو اس وقت آیا تھا۔ بہر حال میں نے آواز دی "کون ہے؟"

"میں ہوں۔" یاسمین کی آواز آئی۔ "دروازہ کھولو۔"

مجھے تو یقین ہی نہیں آیا کہ یاسمین اس طرح میرے پاس بھی آ سکتی ہے۔ بالکل پہلے کی طرح۔ میں نے بے تاب ہو کر دروازہ کھول دیا۔ یاسمین ہی کھڑی تھی۔ سفید لباس میں اس وقت وہ کسی آسمانی حور کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔

انور شعور

انور شعور غزل کے مستند شاعر ہیں۔ ان کی غزلیات کے تین مجموعے آ چکے ہیں جن کے نام بالترتیب اندوختہ، مشق سخن اور می رقصم ہیں۔ یہ تقریباً پندرہ سال سے معروف روزنامہ میں مسلسل قطعہ لکھ رہے ہیں۔ انور شعور کے ہاں دو موضوعات واضح طور پر دیکھنے کو ملتے ہیں جن میں "رومان" اور "حالات و واقعات" ہیں۔ ان کی شاعری کا محور بالخصوص یہ دو موضوعات رہے۔ انکساری اور عاجزانہ طبیعت کے مالک انور شعور نے اس عہد کے تمام لوگوں سے روابط رکھے جن میں رئیس امروہوی، فیض، جون ایلیا، احفاظ الرحمن اور دیگر کئی لوگ شامل رہے۔ آپ سیاسی وسماجی اتار چڑھاؤ پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں اور ان کے خیال میں حالات کی خرابی کے پیچھے ایک اجالا ہے جس کا اپنے وقت پر ظہور ہوگا اور پاکستانی عوام کے لیے اچھا وقت لے کر آئے گا۔ دھیمے لہجے میں گفتگو کرنے والے انور شعور کے ہاں شاعری کا لہجہ بہت مضبوط ہے، ان کے لکھے ہوئے قطعات میں واقعات اور حالات کی تصویر کشی بہت عمدگی سے دیکھنے کو ملتی ہے۔ رومان اور غزل ان کی شاعری کا بنیادی نقطہ ہے۔ ان کے خیال میں کسی بھی فن کو سیکھنے کے لیے صلاحیت کے ساتھ ساتھ اس کے لیے ریاضت اور جدوجہد بہت ضروری ہے۔ ان کے خیال میں نوجوانوں کو سیکھنے کے اس رویے کو اپنی زندگی میں لازمی جگہ دینا ہوگی۔

مرسلہ: رعنا فیصل، کراچی

"یاسمین تم؟ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ "یہ تم ہی ہو نا۔"

"اتنے حیران کیوں ہو رہے ہو۔ کیا میں اسی طرح تمہارے پاس نہیں آیا کرتی تھی۔"

"وہ بات اور تھی۔ تم اسی محلے میں رہتی تھیں۔ اب اتنی دور چلی گئی ہو۔"

"اوہو۔ اب کیا ساری باتیں باہر ہی کھڑے کھڑے کرتی رہوں۔"

وہ کمرے میں آ گئی۔ اس نے پہلے کی طرح چاروں طرف دیکھا۔ "کیا مصیبت ہے۔ تم پھر بے پروا ہو گئے ہو۔ کمرے کی کیا حالت بنا رکھی ہے۔ ہٹ جاؤ ایک طرف مجھے کو آراستہ کرنے دو۔"

ماضی کی نامور اداکاراؤں نے کس کو جیون ساتھی چنا

عام طور پر فلموں کا اختتام ہیرو ہیروئن کی شادی پر ہوتا ہے جسے "ہیپی اینڈ" کہا جاتا ہے۔ ایسی فلمیں زیادہ پسند کی جاتی ہیں جن میں اپنے پیار کے لیے جدوجہد کرنے والا رومانوی جوڑا کامیاب ہوکر شادی کے بندھن میں بندھ جاتا ہے۔ اس طرح ہمارے فلمی ہیرو ہیروئن کو اکثر بار بار دولہا دلہن بننا پڑتا ہے اگرچہ وہ اپنی حقیقی زندگی میں کنوارے ہوتے ہیں جب کہ کئی ایک تو کنوارے ہی مرجاتے ہیں۔ جیسے سنجیو کمار اور ثریا وغیرہ۔ شادی ہر مرد اور عورت کے لیے ایک فطری ضرورت ہے۔ حقیقی زندگی میں سب کو شادی کرنی پڑتی ہے مگر فلم والوں کے لیے شادی ضروری ہونے کے باوجود ایک آزمائش ہوتی ہے۔ اپنے عروج کے دنوں میں وہ اپنی حقیقی شادی سے اس لیے گھبراتے ہیں کہ ان کی عوامی مقبولیت میں کمی آجائے گی اگر کسی مجبوری کے تحت شادی کر بھی لیتے ہیں تو اسے چھپاتے ہیں۔

اداکاراؤں کو یہ سوچنا پڑتا ہے کہ اگر انہوں نے اپنے عالم شباب میں شریک حیات کا انتخاب نہیں کیا تو ڈھلتی عمر میں انہیں کون قبول کرے گا۔ اس لیے کئی اداکارائیں اپنے بہتر مستقبل کا خیال کرتے ہوئے کسی دولت مند پرستار سے شادی کر لیتی ہیں۔ کچھ اداکارائیں ایسے کامیاب اداکاروں کو جیون ساتھی بنالیتی ہیں جن کے ساتھ وہ باقی زندگی آرام سے گزار سکیں۔

مقبول فلمی ہیروئنوں کا ایک طبقہ وہ ہے جو اپنے وقت کے مضبوط و مستحکم فلم سازوں ہدایت کاروں اور نگار خانوں کے مالکوں کا انتخاب کرکے اپنے مستقبل کو محفوظ بنالیتا ہے۔ آج ہم آپ کو ایسی ہی ماضی کی کچھ نامور ہیروئنوں کے بارے میں بتاتے ہیں۔

"یاسمین۔ میں حیرت سے پاگل ہو جاؤں گا۔ بتاؤ کیا ہے یہ سب۔ کیسے آگئیں؟"

"صبح سویرے بس چلتی ہے نا۔ اس میں بیٹھ کر آگئی۔" اس نے بتایا۔ "گھر والے سو رہے تھے اور جب میں واپس جاؤں گی تو اس وقت بھی سو ہی رہے ہوں گے۔"

"یاسمین۔ آخر کیوں؟" مجھ سے کچھ کہا نہیں جا رہا تھا۔ وہ کیسی لڑکی تھی۔ جو اتنی پریشانی اٹھا کر اپنے گھر سے اندھیرے میں نکل کر میرے پاس آگئی تھی۔

"میں صرف اس لیے آئی ہوں کہ تم کہیں پھر سے بے پروا نہ ہو جاؤ۔ دفتر سے ناغہ کرنے لگو۔ اپنے آپ پر دھیان دینا چھوڑ دو۔"

"لیکن یاسمین اب فائدہ ہی کیا ہے۔" میں نے کہا۔ "اب میں کس کے لیے یہ سب کروں۔"

"میرے لیے اور کس کے لیے" اس نے جواب دیا۔ "کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں تم سے دور ہوگئی ہوں؟ گھر والوں نے جو کچھ کہا وہ میں نے مان لیا ہے؟ نہیں۔ میں نے تم سے محبت کی ہے۔ میں نے کہا تھا کہ میں زندگی بھر تمہارا ساتھ نبھاؤں گی۔ اس وعدے کو ہر حال میں پورا کروں گی۔ میں نے اپنے خدا سے بھی کہہ دیا ہے۔ فراز۔ میں مشرقی لڑکی ہوں، جس کو اپنا سمجھ لیا سمجھ لیا۔ اب کوئی طاقت ہمیں جدا نہیں کر سکتی۔

"میں اس وقت تک تمہارے پاس اسی طرح آتی رہوں گی۔ جب تک تم عادی نہ ہو جاؤ۔ وقت پر آفس جانے کے۔ نماز کے۔ زندگی کو روٹین پر لانے کے۔"

"یاسمین۔ یہ سب اس وقت اچھا لگتا جب تم مجھ کو ملنے والی ہوتیں۔" میں نے کہا۔

"تم نے پھر وہی مایوسی کی بات کی۔ جب میں کہہ رہی ہوں کہ میں تمہاری ہوں۔ دنیا ہمیں الگ نہیں کر سکتی تو بات ختم ہوئی نا۔ اب اچھے بچوں کی طرح اٹھ جاؤ۔ جا کر تیار ہو جاؤ۔ دفتر جاؤ۔ میں واپس جا رہی ہوں۔ کل پھر آؤں گی۔"

"میں تمہیں اسٹاپ تک پہنچا دوں۔"

"ہرگز نہیں۔ تم اپنی تیاری کرو۔ مجھے بس مل جائے گی۔"

وہ چلی گئی۔ مجھے ایک بار پھر اس نے جینے کی راہ دکھا دی تھی۔ ایک نیا حوصلہ دے دیا تھا۔ اس نے بتا دیا تھا کہ محبت کیا ہوتی ہے۔ اس کی اتنی توجہ اتنا کرم میرے لیے بہت

دیویکارانی، جنہوں نے اشوک کمار کو فلمی اداکار کے طور پر متعارف کرایا اور پھر ایک فلم "اچھوت کنیا" میں کام کر کے اشوک کمار کی پہلی ہیروئن بنی۔ اشوک کمار نگار خانے کے ایک تکنیکی شعبہ میں کام کرتے تھے۔ فلموں میں کام کرنے کے بعد وہ بہت بڑے اداکار بنے اور بڑا نام کمایا مگر دیویکارانی نے اپنے جیون ساتھی کے انتخاب میں بمبئی ٹاکیز اسٹوڈیو کے مالک ہمنسو رائے کو پسند کیا۔ ان سے شادی کی۔ شادی کے بعد اسے عیش و آرام تو ملا مگر وہ ہمنسو رائے کے دل کی رانی بننے کا خواب پورا نہ کر سکی۔ ہمنسو رائے ایک کاروباری آدمی تھے اپنے نگار خانے پر زیادہ توجہ دیتے تھے۔ دیویکارانی کو انہوں نے ایک بیوی کی طرح رکھا۔ جو دیویکارانی کے موڈ مزاج کے خلاف تھا۔ وہ اِدھر اُدھر عشق کی پینگیں لڑانے لگی اور آخر کار ایک روسی آرٹسٹ زیورچ کے عشق میں مبتلا ہو کر ہمنسو رائے کو چھوڑ کر اس آرٹسٹ سے شادی کر لی۔

سردار اختر اپنے وقت کی بہت نامور اداکارہ تھیں۔ یوں تو ان کی بہت سی فلمیں مشہور ہوئیں جن میں پورنیما، دھرم کی دیوی، پریتما، سماج، آسرا، نئی روشنی، گھر سنسار اور ماسٹر جی قابلِ ذکر ہیں مگر سہراب مودی کی فلم "پکار" اور محبوب خان کی فلم "روٹی" کے حوالے سے ان کی شہرت آج بھی برقرار ہے۔ انہوں نے محبوب خان سے شادی کی اور بڑی کامیاب ازدواجی زندگی بسر کی۔ سردار اختر 25 جنوری 1915ء کو لاہور میں پیدا ہوئی تھیں اور 20 جنوری 1984ء میں امریکا میں ان کا انتقال ہوا۔

مس گوہر نے خاموش فلموں کے دور سے فلموں میں کام کرنا شروع کیا تھا۔ بولتی فلموں کے دور میں بھی ان کا طوطی بولتا تھا۔ رسیلی، جوبن، کالا جادو، رادھا، مدھو، موہن اور گن سندری ان کی مشہور فلمیں تھیں۔ انہوں نے جگدیش فلم کمپنی کی فلم "وشو موہنی" میں تین رول ادا کیے تھے۔ پہلی بار کسی اداکارہ نے ایک ساتھ تین کردار ادا کیے تھے۔

تھا۔ میں دن بھر اس کے بارے میں سوچتا ہی رہ گیا۔ ایک ایسی سرشاری سی ہو گئی تھی کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ دور تھی ہوئی منزل ایک بار پھر میرے پاس آ گئی تھی۔

میرا خیال تھا کہ اس نے ایک بار ہمت کر لی تھی۔ شاید اس کے بعد اس کے لیے آنا اتنا ممکن نہ ہو۔ لیکن دوسری صبح منہ اندھیرے وہ پھر میرے پاس آ گئی۔ اپنے اسی باوقار انداز سے جو اس کے مزاج کا حصہ تھا۔ کوئی بھی سوچ سکتا ہے کہ ایک لڑکی کے لیے کتنی بڑی بات ہو گی کہ وہ اپنے گھر سے نکل کر صبح سویرے کی بس پکڑے اور کسی اور کے گھر آ جائے۔ راستے میں اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ وہ لاکھوں میں ایک تھی۔ اس کا حسن کسی کو بھی پاگل بنا سکتا تھا۔ اور اس طرح اس کا گھر سے نکل کر آنا خود اس کے لیے خطرے کی بات تو تھی ہی اس کے علاوہ میری بھی ذمے داری تھی کہ وہ خیریت سے گھر پہنچ جائے۔

میں نے ایک بار اس سے کہا "یاسمین۔ مجھے اب صبح اٹھنے کی عادت پڑ چکی ہے۔ تم میرے لیے رسک مت لیا کرو۔"

اس نے جواب دیا "فراز تم نہیں جانتے کہ دن بھر اور رات بھر کے بعد میرے لیے ایک یہی تو راحت کا لمحہ آتا ہے کہ میں تمہارے پاس آ جاتی ہوں۔ ورنہ میرے لیے رہ کیا گیا ہے؟"

"کیا مطلب۔" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"مطلب یہ کہ تمہارے پاس آنا تمہارے کام کرنا اور تمہیں بڑھتے رہنے کی جدوجہد کرتے دیکھنا میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہے۔ میری زندگی کا حاصل ہے۔ ورنہ اور کچھ بھی نہیں ہے۔"

"یاسمین۔ تمہارے پاس پورا گھر ہے۔ تمہارے والدین ہیں۔ جو تم کو دیکھ کر خوش ہوتے رہتے ہیں۔ کیا یہ سب کم ہے؟"

"نہیں کم تو نہیں ہے۔ لیکن کیا یہ سب مل کر تمہارا بدل ہو سکتے ہیں؟ نہیں نا تو بس تم میری خاطر اپنے آپ کو محنت کے سانچے میں ڈھال لو۔ پھر میں سکون سے ہو جاؤں گی۔"

"میں تم سے وعدہ کرتا ہوں یاسمین۔ تم جو کچھ بھی کر رہی ہو۔ وہ میرے لیے ہی کر رہی ہو۔ اب یہ میرا وعدہ ہے کہ کل سے میں تمہیں ایک نیا فراز نظر آؤں گا۔" وہ مسکرا دی۔

دوسری صبح جب وہ میرے پاس آئی تو میں اس کے آنے سے پہلے بیدار ہو چکا تھا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس صبح

میں نے نماز کے بعد تلاوت بھی کی تھی۔ اس کے بعد بھی بہت سا وقت بچ گیا تھا۔ وہ معمول کے مطابق آئی اور بہت خوش ہوئی۔ ''ہاں یہ بات ہوئی نا۔ اب میں دیکھتی ہوں کہ تم کب تک اپنے عہد پر قائم رہتے ہو۔''

اس کے بعد میرا یہ معمول بن گیا۔ ابتدا میں نیند آتی رہی۔ دفتر میں بھی ایسا لگتا تھا جیسے میں سو جاؤں گا۔ پھر آہستہ آہستہ عادت پڑتی چلی گئی۔

میں اب ریگولر ہو گیا تھا۔ یہ سب اسی وفا پرست کی وجہ سے تھا۔

پھر ایسا ہوا کہ ایک صبح وہ نہیں آئی۔ دوسری صبح بھی وہ نہیں آئی۔ میرے لیے جیسے سورج ہی طلوع نہیں ہوا تھا۔ جب کئی دن گزر گئے تو مجھے اس کی طرف سے پریشانی ہو گئی۔ اس زمانے میں موبائل وغیرہ کا رواج نہیں تھا کہ میں اس کو فون کر کے اس کی خیریت معلوم کر پاتا۔

سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ اتنا تو معلوم تھا کہ وہ کس محلے میں رہتی ہے۔ لیکن گھر کہاں پر ہے۔ یہ میں نہیں جانتا تھا۔ لیکن جب بے تابی بہت بڑھ گئی تو میں یوں ہی اس کے محلے میں پہنچ گیا۔ خدا جانے کس امید پر گیا تھا۔

ایک جیسے مکانات بنے ہوئے تھے۔ بقول شاعر اس دیس کے ہر گھر کے دریچے پہ ہیں بیلیں۔ یہ کیسے پتا ہو کہ کہاں جا کے بسا تو۔ کیسے معلوم ہوتا۔ کس کے دروازے پر دستک دے کر پوچھتا کہ کیا یاسمین یہاں رہتی ہے۔ میں یوں ہی اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا کہ میں نے یاسمین کے والد ماسٹر صاحب کو دیکھا۔ وہ اپنے ہاتھ میں ایک شاپر لیے ایک طرف چلے جا رہے تھے۔ میں نے خاموشی سے ان کا تعاقب شروع کر دیا۔ میں ان کا گھر دیکھنا چاہتا تھا۔

کچھ دور جانے کے بعد وہ ایک گھر میں دستک دے کر داخل ہو گئے۔ اس کے گھر کا پتا چل گیا تھا۔ اب مجھے اس کا انتظار تھا۔ وہ گھر سے باہر نکلتی تو میں اس سے مل لیتا۔ میں بہت دیر تک کھڑا رہا لیکن وہ باہر نہیں آئی۔ خدا جانے وہ گھر پر ہی تھی یا کہیں گئی ہوئی تھی۔

اس دن میں ناکام ہو کر واپس آ گیا تھا۔

دوسرے دن میں نے دفتر سے چھٹی لی اور ایک بار پھر اس کے گھر کے سامنے پہنچ گیا۔ اس بار تھوڑی ہی دیر ہوئی کہ میں نے اس کی امی کو دیکھا وہ گھر سے باہر نکل رہی تھیں اور وہ اکیلی تھیں۔ یاسمین ان کے ساتھ نہیں تھی۔ اب مجھ سے برداشت نہیں ہو پا رہا تھا۔ مجھے ہر حال میں یاسمین سے ملنا تھا۔ اس کی امی مجھے بہت اچھی طرح جانتی تھیں کیوں کہ میں یاسمین کو پڑھا چکا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ انہوں نے رشتے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ میری ان لوگوں سے دشمنی ہو گئی ہو۔

میں تیز قدموں سے ان کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے سلام کیا۔ وہ ٹھٹک کر رک گئیں۔ ''ارے بیٹا۔ تم؟'' انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

مجھے اس بات کی خوشی ہوئی تھی کہ انہوں نے مجھے نہ صرف پہچان لیا تھا بلکہ بڑے خلوص سے سلام کا جواب بھی دیا تھا۔

''جی میں ذرا اس طرف ایک کام سے آیا تھا۔'' میں نے بہانہ بنایا۔

''بیٹا۔'' انہوں نے میری طرف دیکھا۔ پھر دھیرے سے بولیں۔ ''آج یاسمین کی برسی ہے۔ شریک ہونا ہو تو شام کو آ جانا۔''

''یاسمین کی برسی؟'' میں چکرا گیا تھا۔

''ہاں۔ کیا تمہیں نہیں معلوم؟ اس کے انتقال کو آج پورا ایک سال ہو گیا ہے۔ میری بچی جوانی میں چلی گئی۔'' وہ رونے لگیں تھیں۔

میرا یہ حال تھا کہ میں دم بخود رہ گیا تھا۔ وہ مر چکی تھی۔ اس کے باوجود میرے پاس آیا کرتی تھی۔ اس کا آنا جانا رہتا تھا۔ وہ مجھے صبح اٹھانے کے لیے آتی اور میرا کام کر کے چلی جاتی۔ اس کی امی تو آگے چلی گئیں لیکن میں وہیں ایک طرف ہو کر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ میرے خدا۔ کیا تھا یہ سب۔ وہ اپنی موت کے بعد بھی کس طرح میرے پاس آتی تھی؟ کیا صرف میرے لیے؟ کیا صرف اس لیے کہ میں اپنی ڈیوٹی پر وقت پر پہنچ جاؤں۔ یہ کیسا بھید تھا۔ یہ کیسی محبت تھی۔ اسی لیے وہ نہیں چاہتی تھی کہ میں اس کو گھر تک پہنچانے کے لیے آیا کروں۔ وہ نہ جانے تاریکی کی کس دنیا میں چلی جاتی تھی۔ نہ جانے کس طرح اسے اجازت ملتی ہو گی۔ کیا ہوتا ہو گا۔ یہ سب میری سمجھ سے باہر تھا۔ اگر یہ اس کی محبت کی طاقت تھی تو اس وفا پرست نے مجھ سے کیسی محبت کی تھی۔ کیا اس محبت کا کوئی جواب تھا؟

آج تک مجھے اس سوال کا جواب نہیں مل سکا ہے۔ کیا قارئین بتا سکتے ہیں کہ ایسا کیسے ممکن ہے کہ کوئی مرنے کے بعد بھی آ سکے۔
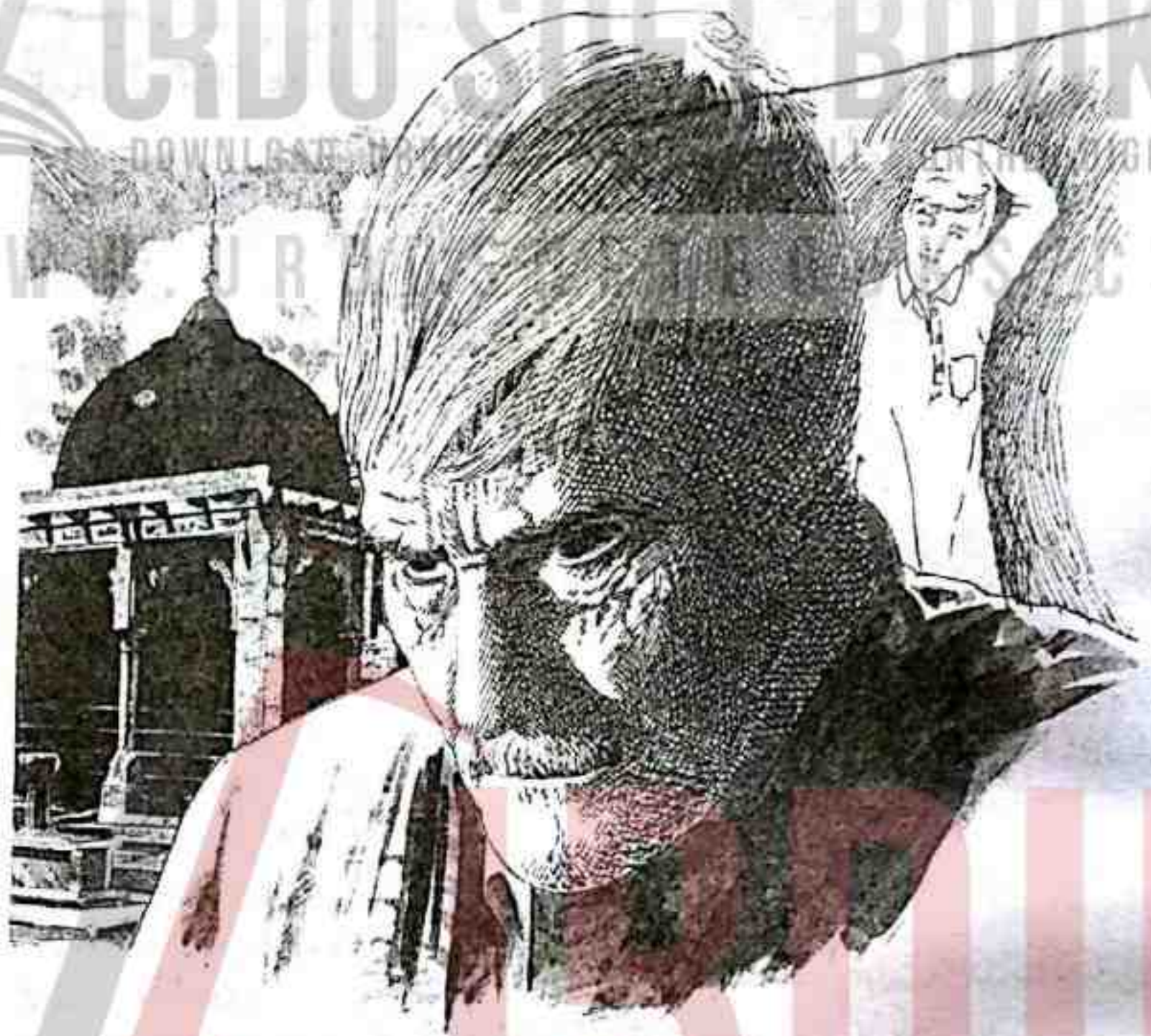
گورکن

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم
روانہ کردہ سچ بیانی کچھ الگ انداز کی ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ سرگزشت کے قارئین ایسی حیران کن کہانی کو پسند کریں گے۔

زرین قمر
(کراچی)

میری زندگی کا بڑا حصہ کہانیاں، افسانے لکھتے ہوئے گزرا ہے۔ میں بنیادی طور پر ایک رائٹر ہوں۔ ہمارے اردگرد ہونے والے واقعات، حادثات یا فسادات کے پیچھے کوئی نہ کوئی کہانی ضرور ہوتی ہے اور رائٹر ایسی کہانیوں کی کھوج میں رہتا ہے۔ بچوں کی کہانیاں لکھنے سے میرے شوق کا آغاز ہوا پھر عمر کے ساتھ ساتھ موضوعات اور انداز بیان میں پختگی آتی گئی اور شوق بڑھتا گیا۔ آج میں جو کہانی اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کر رہی ہوں وہ ایک

بچی جگ بیتی ہے۔ مجھے اس کہانی کا کبھی علم نہیں ہوتا اگر میں اپنی ساس کے ساتھ تواتر سے نورانی بابا کے مزار پر نہ جاتی۔ پہلی بار جب میں نے انہیں دیکھا تو میں انہیں کوئی مجاور ہی سمجھی لیکن پھر مجھے آہستہ آہستہ احساس ہوا کہ وہ مجاوروں میں شامل نہیں ہیں جب کہ وہ ہمیشہ ہی مزار کی جالی کے قریب ٹیک لگائے خاموش بیٹھے نظر آتے تھے۔ ان کی عمر نوے سال سے اوپر ہی رہی ہوگی۔ ان کے جسم پر ڈھیلا ڈھالا چوغہ ہوتا۔ بال بکھرے ہوئے اور دراز تھے۔ آنکھیں سرخ اور خوابیدہ سی وہ کبھی کسی سے بات نہیں کرتے تھے میں نے کئی بار اپنی ساس کی توجہ بھی ان کی طرف دلائی تھی۔

''ہاں یہ بابا ہمیشہ ہی یہاں بیٹھے ہوتے ہیں اور اگر یہاں نہیں ہوتے تو وہ سامنے جو قبرستان ہے اس میں ہوتے ہیں۔'' میری ساس نے بتایا۔ ''اکثر کوئی نہ کوئی قبر کھودتے نظر آتے ہیں۔''

اس مزار کے برابر ہی قبرستان تھا جو علاقے کا واحد قبرستان تھا اس کے چاروں اطراف گھنے درختوں کی قطار تھی جو خاصے سرسبز اور تناور تھے۔

میں نے ان سے بات کرنے کا بہانہ ڈھونڈنا شروع کر دیا اور ایک روز مجھے یہ موقع مل گیا۔ اس روز شدید گرمی تھی اور میری ساس نے کہا۔

''بہت گرمی ہے آج تم ہی چلی جاؤ اور بابا کو بھی کھانا دے آنا۔'' میری ساس اکثر مزار پر ضرورت مندوں کے لیے کھانا لے کر جاتی تھیں اور کھانا تقسیم کر کے واپس آ جاتی تھیں۔

اس روز میں اکیلی ہی گئی تھی اتفاق سے مزار پر لوگ بھی زیادہ نہیں تھے۔ شاید اس کی وجہ گرمی ہی تھی۔ میں نے اپنے کام سے کچھ وقت بچانے کے لیے کھانا مزار کے ایک مجاور کے حوالے کیا اور اسے لوگوں میں تقسیم کرنے کی ہدایت کر کے بابا کا کھانا لے کر ان کے پاس جا بیٹھی وہ ہمیشہ کی طرح لاتعلق سے بیٹھے تھے۔

''بابا!'' میں نے انہیں مخاطب کیا تو انہوں نے میری طرف دیکھا۔

''بابا کھانا کھا لیں۔'' میں نے کہا۔

''سب اللہ کا ہے اور اسی کے لیے ہے۔'' بابا نے کہا۔

''بابا آپ کہاں رہتے ہیں؟'' میں نے اپنی کہانی کے لیے مواد جمع کرنے کے لیے پہلا سوال کیا۔

''اللہ کی زمین پر۔'' بابا نے مختصر سا جواب دیا۔

''وہ تو صحیح ہے کہ ہم سب بھی اللہ کی زمین پر رہتے ہیں۔ میرا مطلب ہے آپ کا کوئی گھر، بچے، کوئی تو ہوگا۔ آپ کی اتنی عمر ہے آپ کی دیکھ بھال کون کرتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بیٹی تم مسلمان ہو؟'' بابا نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا۔

''الحمدللہ۔'' میں نے جواب دیا۔

''تو پھر یہ سوال کیوں کرتی ہو، بھلا اللہ کے سوا بھی کوئی دیکھ بھال کر سکتا ہے؟'' انہوں نے کہا۔

اور میں اس بات پر لاجواب ہو گئی۔

''یہ تو حقیقت ہے کہ اللہ ہی سب کی حفاظت اور دیکھ بھال کرتا ہے لیکن دنیا میں بھی اس نے ہم سب کے حقوق و فرائض نافذ کیے ہوئے ہیں جن کے تحت بچے بڑے ہو کر اپنے والدین کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔'' میں نے وضاحت کی تو وہ مسکرا دیے۔

''میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔'' انہوں نے افسردگی سے کہا۔

''کیا آپ مجھے اپنے بارے میں کچھ بتانا پسند کریں گے؟ اس عمر میں آپ قبریں کیوں کھودتے ہیں؟''

''تم کیوں جاننا چاہتی ہو؟'' انہوں نے پوچھا۔

''میں کہانیاں لکھتی ہوں میرا یقین ہے کہ ہر شخص کے پیچھے ایک نہ ایک کہانی ہوتی ہے۔ آپ کی عمر اکیلا پن اس مزار پر آپ کی موجودگی بتاتی ہے کہ آپ کی بھی کوئی نہ کوئی دلچسپ کہانی ہے، میں وہی جاننا چاہتی ہوں۔'' میں نے وضاحت کی جس سے بابا کے چہرے پر اطمینان کی جھلک نظر آئی۔ وہ چند لمحوں خلا میں گھورتے رہے اور پھر انہوں نے کہنا شروع کیا۔

''میرا بھی گھر تھا۔ والدین تھے، بہن بھائی تھے میں اسی بستی کے ایک چھوٹے سے گھر میں رہتا تھا اور یہاں کے اسکول میں پڑھنے جاتا تھا۔ زندگی نارمل گزر رہی تھی کہ میں ایک ایسی شخصیت سے ملا جس نے میری زندگی کا دھارا ہی بدل دیا۔''

''کیا مطلب؟ بھلا وہ کون سی شخصیت تھی؟'' میں نے سوال کیا۔

''وہ ذاہی بابا تھے۔ ان سے میری ملاقات میری خالہ صغریٰ کے انتقال سے ایک دن پہلے ہوئی تھی لیکن مجھے

یوں یاد ہے جیسے یہ کل ہی کی بات ہو۔“

”اس بات کو کتنا عرصہ ہو گیا؟“ میں نے پوچھا۔

”میری عمر اس وقت دس سال تھی میں اسکول میں پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا لیکن اسکول کی چھٹیاں تھیں اور گرمی اپنی پوری شدت پر تھی میں بہت شریر تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میرا بڑا بھائی اشرف اور اس کے دوست بھی مجھ سے دور رہتے تھے۔ اس روز وہ دونوں نہر پر نہانے گئے تھے اور میری شرارتوں کی وجہ سے مجھے اپنے ساتھ نہیں لے گئے تھے۔ چنانچہ میں نے بستی کے قبرستان میں جانے کا پروگرام بنا لیا۔ یہی قبرستان جو تم دیکھ رہی ہو اس کے چاروں طرف قریب قریب قطار سے لگے یہ درخت مجھے بہت پسند تھے۔ میں بندروں کی طرح ان کی شاخوں پر جھولتا، ایک درخت سے دوسرے درخت پر چھلانگیں لگاتا رہتا تھا۔ کبھی انہی میں سے کسی درخت کی شاخ پر بیٹھ جاتا اور اپنے ساتھ لائی ہوئی کوئی کہانی کی کتاب یا لطیفوں کی کتاب پڑھتا رہتا۔ یہاں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں مجھے بہت مزہ آتا تھا۔“ بابا اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے اپنی بات پھر شروع کی۔ ”اس روز بھی میں اپنے ساتھ لطیفوں کی کتاب لے گیا تھا تاکہ درختوں پر بیٹھ کر پڑھ سکوں۔ ابھی میں سنبھل کر بیٹھا ہی تھا کہ کسی کے گنگنانے کی آواز سنائی دی پھر لگا جیسے کوئی کسی بھاری چیز سے زمین کھود رہا ہو۔ میں نے آہستہ سے اپنی کتاب بند کی اور گردن موڑ کر اطراف کا جائزہ لیا۔ میرے پیچھے کی طرف ایک سانولی رنگت والا شخص کھڑا تھا جس کی پشت میری طرف تھی۔ وہ میرے درخت سے چھ فٹ کے فاصلے پر تھا۔ اس نے سفید اور نیلی دھاریوں والا کرتہ اور سفید پاجامہ پہنے ہوئے تھا جو اس کے ٹخنوں تک آرہا تھا۔ اس کے سر پر سفید پگڑی بندھی تھی قریب ہی مٹی ڈھونے کی ٹرالی تھی اور زمین پر کھودنے کے اوزار پڑے تھے جن پر مٹی لگی ہوئی تھی اور لگ رہا تھا کہ برسوں سے ان کی صفائی نہیں کی گئی ہے۔ اس نے اپنے سر سے پگڑی اتار کو ایک طرف رکھی اور کرتے کے دامن سے اپنا پسینا پونچھا پھر کچھ دیر تک قبروں کو دیکھتا رہا پھر ایک ٹھنڈی سانس لی۔ سر کو نفی میں جنبش دی پھر بڑبڑاتے ہوئے کھودنے کے اوزار اٹھائے اور قبرستان میں موجود سب سے پرانی قبر کی جانب بڑھ گیا۔ اس قبر سے چند گز کے فاصلے پر رک کر اس نے زمین کا جائزہ لیا اور ایک جگہ دو فٹ چوڑا اور چار فٹ لمبا نشان لگا کر آستینیں چڑھائیں اور کسی اٹھا کر کھدائی شروع کر دی۔“

”آپ نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔“ میں نے پوچھا۔

”نہیں میں درختوں میں چھپا دلچسپی سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ وہ دوپہر تک بغیر رکے کھدائی کرتا رہا اور گڑھے سے نکلنے والی مٹی ایک طرف ڈالتا رہا۔ وہ کوشش کر رہا تھا کہ گڑھے کی دیواریں بالکل سیدھی رہیں اس دوران وہ آہستہ آہستہ گنگنا رہا تھا لیکن وہ کیا گنگنا رہا تھا یہ میں نہیں سمجھ پایا کیونکہ وہ دھن میں نے کبھی نہیں سنی تھی۔ وہ کبھی کبھی رک کر خود سے باتیں بھی کرنے لگتا تھا اور کھدائی روک کر کھرپی سے گڑھے کی دیواریں بھی ہموار کرتا جاتا تھا۔“ کہتے کہتے وہ رکا۔

”پھر؟“ میری دلچسپی بڑھ رہی تھی۔

”پھر جب سورج بالکل سر پر آ گیا تو اس نے اپنا کام روک دیا اور گڑھے سے باہر آیا اور اپنے اوزار ایک طرف رکھ دیئے۔ میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ تھک گیا تھا۔ وہ کچھ دیر تک گڑھے کو دیکھتا رہا جیسے اپنے کام کا خود ہی جائزہ لے رہا ہو اس کے بعد وہ درختوں کے سائے کی طرف بڑھ گیا اور مٹی اٹھانے والی ٹرالی میں اپنا سامان رکھ دیا۔ پھر ٹرالی کو دھکا دیتا ہوا ایک درخت کے سائے میں چلا گیا۔ میں خوش تھا کہ میں چوری چھپے اس کی ہر حرکت دیکھ رہا ہوں اس تمام عرصے میں، میں نے اپنی جگہ سے بالکل حرکت نہیں کی اور نہ ہی کوئی آواز نکالی لیکن اس کے باوجود وہ چلتا ہوا بالکل اس درخت کے نیچے آ گیا تھا جس پر میں بیٹھا تھا۔ اس نے منہ اٹھا کر اوپر کی طرف یوں دیکھا تھا جیسے سارا وقت اسے علم رہا ہو کہ میں یہاں چھپا ہوا ہوں اس نے اپنے دونوں ہاتھ پیالے کی شکل میں اپنے منہ کے پاس رکھے تھے اور زور سے آواز دی تھی۔

”انوار؟“ میں حیران رہ گیا تھا۔

”تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں یہاں ہوں اور میرا نام انوار ہے؟“ میں نے بلند آواز میں پوچھا۔

”میں جانتا ہوں کہ اوپر کون ہے اور کون نہیں ہے اب تم سیدھی طرح نیچے آ جاؤ اور میرے ساتھ آنکھ مچولی مت کھیلو۔“ اس کی اس بات پر میں چند شاخیں نیچے آ گیا تھا جہاں سے میں اسے اور وہ مجھے دیکھ سکتا تھا۔ اس عمل کے دوران میری کتاب نیچے گر گئی تھی۔

”کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔“ اس نے

کہا۔

''میرے پاس کھانا ہے۔'' میں نے اسے اپنا بھورے رنگ کا بیگ دکھاتے ہوئے کہا جس میں میں اپنا دوپہر کا کھانا رکھ کر لایا تھا۔

''میرے پاس جو کھانا ہے وہ زیادہ اچھا ہے۔'' بوڑھے نے مجھے لالچ دیا اور مٹی اٹھانے کی ٹرالی میں سے ایک ٹوکری نکالی۔ پھر پیڑ کی طرف دیکھ کر بولا۔

''اگر تم .... نیچے آ کر اپنی کتاب نہیں لو گے تو میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔''

''لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ تمہاری ٹرالی میں ٹوکری نہیں تھی۔ یہ کہاں سے آئی؟'' میں نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ میری بات پر وہ ہنسنے لگا۔ اس نے اپنی پگڑی اتار کر ایک طرف رکھ دی پھر اپنی آستین سے ماتھے کا پسینا صاف کیا۔

''یہ جاننے کے لیے تمہیں نیچے آنا پڑے گا کہ ٹوکری کہاں سے آئی۔'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا اور ٹوکری میں سے سرخ رنگ کا ایک کپڑا نکالا پھر اسے درخت کے نیچے بچھا کر اس پر بیٹھ گیا اس کے بعد ٹوکری میں سے ایک برتن نکال کر اسے کھولا میں جہاں بیٹھا تھا وہیں سے بھوبی سالن کی اٹھتی ہوئی خوشبو سونگھ سکتا تھا اور اس کے پاس ابلے ہوئے انڈے، آلو اور سلاد بھی تھا اور مٹی کی چھوٹی سی مٹکی میں لسی بھی تھی۔ میں حیران تھا کہ میں نے اس کی ٹرالی میں پہلے ان چیزوں کی موجودگی محسوس نہیں کی تھی۔ ''اتنا کہہ کر بابا پھر چپ ہو گیا تھا۔

''تو پھر وہ چیزیں اس کے پاس کہاں سے آئیں؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ اس نے نہیں بتایا۔'' بابا نے جواب دیا۔ ''میں نے اس سے کہا کہ وہ وعدہ کرے کہ اگر میں نیچے آ جاؤں گا تو وہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔''

''میں کبھی کوئی وعدہ نہیں کرتا۔'' اس بوڑھے نے بے پروائی سے جواب دیا اور کھانے کا آغاز کر دیا۔ میں بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا اور فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ نیچے اتروں یا نہیں۔

''اگر تم نیچے نہیں آؤ گے تو میں یہ سارا کھانا اکیلے ہی کھا جاؤں گا۔'' اس نے کہا جیسے اسے میرے دل کا حال معلوم ہو۔ مجھے سخت بھوک لگی تھی اس کے پاس اچھا کھانا تھا جب کہ میرے پاس ڈبل روٹی کے دو سلائس اور ایک سنگترہ تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ شخص بہت بوڑھا ہے اگر اس نے مجھے تنگ بھی کیا تو میں آسانی سے بھاگ سکتا ہوں چنانچہ میں کچھ دیر سوچنے کے بعد بڑی احتیاط سے نیچے اتر آیا اور اپنے کھانے کا بیگ اس کی ٹرالی میں رکھ دیا اس میں سے اپنے ڈبل روٹی کے سلائس اور سنگترہ نکال لیا تھا اور بوڑھے کو کھانا کھاتے دیکھ رہا تھا۔

''یوں دیکھتے رہنے سے تمہارا پیٹ نہیں بھر سکتا۔'' اس نے کہا اور پھر کھانے میں مصروف ہو گیا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''میرا نام ذاہی بابا ہے۔'' اس نے اپنے دامن سے اپنا ہاتھ اور منہ پونچھتے ہوئے کہا اور پھر اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔

''مجھے تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے۔'' اس نے مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آؤ بیٹھو تم کھڑے کھڑے تو کھانا نہیں کھا سکتے۔'' اس نے کہا اور اپنی ٹوکری میں سے ایک پلیٹ نکالی اور اس میں کھانا ڈال کر میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے خاموشی سے پلیٹ تھام لی تھی اور کھانا کھانے لگا تھا۔ کھانا بہت مزیدار تھا۔ خاص طور سے بیسن کی روٹی اور چٹنی کا تو جواب ہی نہیں تھا۔

''تم نے اپنے نام کے ساتھ بابا کا لفظ کیوں لگایا ہوا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کی تین وجوہات ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''پہلی یہ کہ میری عمر تیراسی سال ہے اور اس بستی میں صرف دو افراد ہیں جو عمر میں مجھ سے بڑے ہیں۔ دوسری وجہ یہ کہ کسی کو بھی میرا پہلا والا نام نہیں آتا اور نہ ہی میں کسی کو بتاتا ہوں اسی لیے سب مجھے ذاہی بابا کہتے ہیں۔''

''اور تیسری وجہ؟'' میں نے پوچھا۔

''تیسری وجہ یہ کہ میں یہاں کا گورکن ہوں۔ میں نے اب تک بہت سے لوگوں کو دفن کیا ہے، ان میں گورے بھی تھے کالے بھی۔ غریب بھی تھے امیر بھی۔ میں نے ان میں کوئی تمیز نہیں کی جب کہ مجھے یقین ہے کہ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ ضرور سب کے درمیان کوئی نہ کوئی فرق رکھتا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے بات مکمل کی۔ میں اس کے چہرے پر موجود بے شمار جھریوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے سر اور داڑھی کے بال سفید تھے۔ یہاں تک کہ بھنویں بھی سفید ہو چکی تھیں۔ وہ مسکراتا تھا تو اس کا سارا چہرہ چمکنے لگتا تھا۔

''گورکن کا کام تو تھکا دینے والا ہوگا؟'' میں نے کہا

تو اس نے چاروں طرف دیکھا۔

''میں اپنے کام کا خود ذمہ دار ہوں یہاں کوئی حکم چلانے والا نہیں ہے۔ یہاں میں اپنی مرضی سے کام کرتا ہوں۔ دوپہر کا کھانا کھا کر کچھ دیر آرام بھی کرتا ہوں جب کہ کسی کے ساتھ کام کرتے ہوئے یہ ممکن نہیں تھا۔''

''لیکن یہاں قبرستان میں ان مردوں اور قبروں کے درمیان؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''ایسی باتیں نہیں کرتے انوار۔'' ذاہی بابا نے مجھے سمجھایا۔ ''ایک نہ ایک دن ہم سب کو مرنا ہے۔ مجھے، تمہیں، تمہارے ماں باپ کو، یہ سب زندگی کا حصہ ہے جو بھی یہاں آیا ہے اسے فنا ہونا ہے اللہ کا کہنا ہے کہ جو اس دنیا میں آیا ہے اسے موت کا مزہ بھی چکھنا ہے ہم اس وقت تک جنت میں نہیں جائیں گے جب تک دوبارہ زندہ ہو کر اپنے گناہوں کا حساب نہ دیں اور دوبارہ زندہ ہونے کے لیے مرنا ضروری ہے لیکن ہمیں ابھی اس کا احساس نہیں ہو سکتا۔'' اس نے کہا اور میں اس قبر کی طرف دیکھنے لگا جو وہ کچھ دیر پہلے کھود رہا تھا۔

''تم یہ کس کی قبر کھود رہے تھے؟''

''یہ میں نہیں بتا سکتا۔''

''کیوں؟''

''بس میں نہیں بتا سکتا۔'' اس نے کہا اور درخت کے نیچے لیٹ گیا۔ ''اب باتیں کرنے کی باری تمہاری ہے۔'' اس نے مجھ سے کہا۔

''تمہیں یوں تنہا کام کرتے ہوئے لطف محسوس ہوتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''تمہیں میرا نام کیسے پتا چلا؟ تم نے میرا نام لے کر مجھے مخاطب کیا تھا۔''

''میں نہیں جانتا بس مجھے لگا کہ تمہارا نام انوار ہوگا اور میں نے اسی نام سے تمہیں پکارا۔'' اس نے کہا۔ مجھے اس کے جواب پر حیرت ہوئی تھی۔ اس کو میری موجودگی کا پتا چل جانا، اس کی خالی ٹرالی سے کھانے کی ٹوکری کا برآمد ہونا اور اس میں موجود کھانے کا گرم اور تازہ ہونا میری سمجھ سے باہر تھا۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد وہ اٹھ بیٹھا تھا۔

''اب میرے کام کا وقت شروع ہو گیا ہے اور اب تمہیں بھی میرے ساتھ کام کرنا ہوگا جیسے کہ میں کر رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''کیا مطلب؟''

''کیونکہ میں نے تمہیں تلاش کیا ہے، تم درختوں میں چھپے مجھے دیکھ رہے تھے۔ بالکل یوں جیسے تم کوئی پرندہ ہو۔''

''میں پرندہ نہیں انوار ہوں۔'' میں نے کہا۔

''تم بچے پرندوں کی طرح ہوتے ہو۔ معصوم اور سچے، اچھا آؤ تم میرے ساتھ تھوڑا کام کرلو۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ مجھے ذاہی بابا کی بزرگی کا خیال تھا۔ میں سوچ رہا تھا وہ کافی تھک چکے ہوں گے چنانچہ ان کی مدد کرنا میرا فرض تھا۔

''کیا کھدائی کرتے وقت میں آپ کو قریب سے دیکھ سکتا ہوں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں بالکل تم دیکھ سکتے ہو لیکن پہلے یہ جگہ تو صاف کردیں۔'' ذاہی بابا نے درخت کے نیچے بکھرے ہوئے کھانے کے سامان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا پھر ہم دونوں نے سب چیزیں سمیٹیں اور ٹوکری میں رکھ دیں۔

''اس ساری دوپہر میں ذاہی بابا کو کام کرتے دیکھتا رہا تھا۔ میں کبھی قبر میں پاؤں لٹکا کر بیٹھ جاتا تھا کبھی اس کے کنارے اوندھا ہو کر لیٹ جاتا تھا۔ ذاہی بابا قبر کھودنے کے بارے میں مختلف باتیں بتاتا جا رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ زمین کا چناؤ کس طرح کیا جائے، کیسے نشانی ڈالی جائے، کیسے کھدائی کی جائے۔ درمیان میں رک رک کر وہ کوئی گانا

بھی گنگناتا جاتا تھا تو میں بھی اس کی آواز سے آواز ملانے کی کوشش کرتا تھا بعض گانے تو میں جانتا تھا لیکن بعض گانے میرے لیے نئے تھے جن میں سے ذاہی بابا نے مجھے کچھ سکھائے بھی تھے۔ جب وہ چپ ہو جاتا تو خاموشی سے میں ذاہی بابا کی گیتی کے زمین سے ٹکرانے کی آواز سنتا رہتا تھا۔

ساری دوپہر گزر گئی تھی اور سورج غروب ہونے لگا تھا تب وہ قبر مکمل ہوئی تھی اس قبر کی گہرائی ذاہی بابا کے قد کے برابر تھی۔

انہوں نے کام ختم کر کے گیتی مجھے تھما دی تھی اور خود چھلانگ لگا کر قبر سے باہر آ گئے تھے پھر انہوں نے اپنے اوزار اٹھائے تھے۔

"اب میں گھر جاؤں بابا؟" میں نے پوچھا۔

"ٹھیک ہے انوار اب تم جا سکتے ہو۔" ذاہی بابا نے مسکراتے ہوئے کہا اور میں اپنا بیگ اور کتاب لے کر گھر واپس چلا گیا لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب گھر جا کر میں نے دیکھا کہ میرا کھانا بیگ میں جوں کا توں موجود تھا۔

"اوہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" میں نے حیرت سے کہا۔

میں سوچ رہی تھی کہ ابھی انوار بابا نے بتایا تھا کہ انہوں نے ڈبل روٹی کے سلائس اور سنگترہ اپنے بیگ سے نکالے تھے تو پھر بیگ میں واپس کیسے آ گئے تھے۔

"آگے بتائیں پھر کیا ہوا؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔ میں جلدی جلدی اس کہانی کا انجام جاننا چاہتی تھی۔

"دوسرے روز سہ پہر کے وقت خالہ صغریٰ کا انتقال ہو گیا۔ میں جب صبح گھر سے نکلا تھا تو وہ ٹھیک تھیں لیکن واپسی پر میں نے انہیں مردہ دیکھا تھا۔"

"خالہ صغریٰ کون؟" میں نے پوچھا۔

"خالہ صغریٰ ہمارے گھر میں ہمارے ساتھ ہی رہتی تھیں اور میری امی ان کی دیکھ بھال کرتی تھیں کیونکہ خالہ صغریٰ بہت بیمار تھیں اور اپنا کوئی کام خود نہیں کر سکتی تھیں۔ میں خالہ صغریٰ کا کھانا ان کے کمرے میں دینے جاتا تھا اور وہ ہمیشہ اس میں سے ..... کچھ نہ کچھ مجھے ضرور دیتی تھیں۔ اس دن جب میں نے ان کے کمرے میں قدم رکھا تو مجھے کسی تبدیلی کا احساس ہوا جب کہ میرے ساتھ میری امی بھی تھیں اور انہوں نے کچھ بھی محسوس نہیں کیا تھا اور وہ کھڑکیوں کی طرف بڑھ گئی تھیں۔ انہیں ہمیشہ کی طرح کھول رہی تھیں۔ خالہ صغریٰ اپنے تکیے پر سر رکھے لیٹی تھیں۔ ان کے شانوں تک گلابی پھولدار چادر پڑی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ سو رہی ہوں لیکن مجھے احساس ہو رہا تھا جیسے وہ سو نہیں رہی تھیں۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ سانس نہیں لے رہی تھیں۔ ان کا جسم ساکت تھا پھر امی نے کئی بار انہیں اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ میں خاموش کھڑا دیکھ رہا تھا پھر میری امی نے مجھ سے کہا تھا کہ اپنے ابو کو بلا لاؤں۔

دوسرے روز صغریٰ خالہ کو اسی قبر میں دفن کر دیا گیا تھا جو ذاہی بابا نے ایک روز پہلے کھودی تھی۔ تمام لوگ ان کی قبر پر پھول ڈال رہے تھے اور میں خاموش کھڑا یہ سوچ رہا تھا کہ ذاہی بابا کو کیسے علم ہو گیا کہ خالہ صغریٰ مرنے والی ہیں اور انہیں ان کے لیے قبر کھودنا چاہیے۔ میں سارا وقت قبرستان میں انہیں ڈھونڈتا رہا لیکن وہ مجھے نظر نہیں آئے۔"

پھر کئی ہفتوں تک میری ملاقات ان سے نہ ہو سکی میں قبرستان جاتا انہیں ڈھونڈتا اور ناکام واپس آ جاتا۔ میں حیران تھا کہ وہ کہاں چلے گئے میرا قبرستان کے کئی کئی چکر لگانا آخر کار میری امی سے چھپا نہیں رہا اور ایک دن انہوں نے مجھے اپنے کمرے میں بلا لیا۔

"تم قبرستان اتنا کیوں جاتے ہو۔ اگر تمہارے ابو کو پتا چل گیا تو وہ کیا کہیں گے؟" انہوں نے کہا۔

"جی امی۔" میں نے مختصر سا جواب دیا۔

"تمہاری خالہ صغریٰ تم سے بہت محبت کرتی تھیں۔" انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "تم جب پیدا ہوئے تو بہت کمزور تھے۔ میں اکیلی تمہاری دیکھ بھال نہیں کر سکتی تھی تب ہی تمہاری خالہ صغریٰ یہاں آ گئی تھیں اور انہوں نے تمہاری بہت دیکھ بھال کی۔ تمہاری پرورش میں ان کی محنت اور محبت کا بہت دخل ہے میں جانتی ہوں کہ تمہیں بھی خالہ صغریٰ سے محبت ہے تب ہی تم کھنچے ہوئے قبرستان چلے جاتے ہو لیکن تم وہاں زیادہ نہ جایا کرو۔" امی نے سمجھایا۔

"جی امی۔" میں اس سے زیادہ نہ کہہ سکا۔

"جب میں جاؤں گی تو تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔ ہم وہاں پھول ڈال کر آ جائیں گے۔" انہوں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا لیکن وہ کبھی وہاں نہیں گئیں۔ کچھ عرصے بعد مایوس ہو کر میں نے ذاہی بابا کو تلاش کرنا چھوڑ دیا۔ امی کے منع کرنے کی وجہ سے میں قبرستان بھی نہیں جاتا تھا۔ پھر میں نے قبرستان کے باہر بنے ہوئے پرانے مکان میں جانا شروع کر دیا جو خالی پڑا رہتا تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ آسیب زدہ ہے۔ میں تقریباً دو ماہ تک

وہاں جاتا رہا اور پھر اچانک ایک روز ذاہی بابا سے وہاں میری ملاقات ہو گئی۔ میں اس ویران گھر میں بیٹھا تھا اور کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھ رہا تھا۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔

''کیا بات ہے انوار!'' اچانک مجھے ذاہی بابا کی آواز سنائی دی لیکن میں نے کوئی حیرت کا مظاہرہ نہیں کیا۔

''کیسے ہو ذاہی بابا؟'' میں نے پوچھا۔

''اچھا ہوں۔'' انہوں نے ایک جانب بیٹھتے ہوئے کہا۔

''میں جب آپ سے ملا تھا تو آپ جو قبر کھود رہے تھے اس میں خالہ صغریٰ کو دفن کیا گیا تھا۔ آپ کو کیسے پتا چلا کہ وہ مرنے والی ہیں۔'' میں نے اپنے دل میں چھپا سوال ان سے کر دیا۔ وہ خاموشی سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

''میں یہ سوال پوچھنے کے لیے کب سے آپ کو ڈھونڈ رہا ہوں۔''

''بھئی ہم سب کو مرنا ہے۔'' ذاہی بابا نے کہا۔ ''میں نے یہ بات تمہیں پہلے بھی کہی تھی۔''

''لیکن تمہیں یہ کیسے پتا چلا کہ کس کو کب مرنا ہے۔''

''میں نہیں جانتا بس مجھے علم ہو جاتا ہے کیونکہ مجھے قبر کھودنا ہوتی ہے۔'' ذاہی بابا نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''کیا آپ جانتے ہیں کہ کون کب مرے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں سب کے متعلق نہیں جانتا۔'' انہوں نے کہا۔ ''میں صرف اس بستی کے لوگوں کے بارے میں جانتا ہوں۔''

''لیکن آپ کو یہ کیسے پتا چلتا ہے کہ اب کس کی قبر کھودنا ہے؟'' میں گھما پھرا کر وہی سوال کر رہا تھا۔

''بس مجھے پتا چل جاتا ہے۔'' ذاہی بابا نے وہی جواب دیا۔ ''اب تم کل کی مثال لے لو۔''

''کیا کل کوئی مرنے والا ہے؟''

''میں یہ نہیں کہوں گا میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ مجھے قبرستان میں ایک قبر کھودنا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ تم اس کام میں میری مدد کرو۔''

''تو گویا کل کوئی اس بستی میں مرنے والا ہے لیکن وہ کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نہیں بتا سکتا۔''

''یہ وہ ہاجرہ نانی ہوں گی جو بہت دنوں سے بیمار ہیں۔'' میں بستی کے بوڑھے لوگوں کے نام لینے لگا آخر میں، میں نے گل خان کا نام لیا اس پر وہ چونک گئے۔

''میں نے تمہیں بتایا نا کہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن میں اتنا کہوں گا کہ کل مرنے والا شخص ایک جھگڑے میں مارا جائے گا۔''

''بس تو یہ گل خان ہی ہو سکتا ہے۔ اس کا ہوٹل ہے اور وہ ہر وقت اپنے گاہکوں سے جھگڑتا رہتا ہے۔''

''ہو سکتا ہے تمہارا خیال درست ہو۔'' ذاہی بابا نے کہا۔

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ مرنے والا کون ہے بس ہمیں ایک قبر کل کھودنا ہے اور تم مجھ سے وہاں ملو گے۔''

''اگر بارش ہوئی تو میں نہیں آسکوں گا۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' ذاہی بابا میرے جواب سے مطمئن نظر آرہے تھے۔

دوسرے روز بارش نہیں ہوئی اور میں وعدے کے مطابق قبرستان پہنچ گیا پھر میں نے ذاہی بابا کے ساتھ مل کر قبر کھودی ہم سہ پہر تک اپنے کام سے فارغ ہو گئے تھے۔

''یہ کام بہت اچھا ہے انوار۔'' ذاہی بابا نے قبر پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں اس کام پر فخر کرنا چاہیے۔''

''اب تم اپنے گھر جاؤ اور غسل کر کے آرام کرو۔'' انہوں نے کہا اور میں اثبات میں سر ہلاتا قبرستان کی حدود سے باہر نکل گیا لیکن میں گھر نہیں گیا تھا۔ میرا رخ گل خان کے ہوٹل کی طرف تھا۔ میں اسے دیکھنا چاہتا تھا کیونکہ میرے خیال میں، میں اس کی قبر کھود کر آیا تھا۔

جب میں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ وہاں لوگوں کا ہجوم تھا اور ایک ایمبولینس بھی کھڑی تھی۔ میں ان کے درمیان جگہ بناتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ ہوٹل کا دروازہ کھلا تھا اور دو آدمی اسٹریچر پر ایک جسم لا رہے تھے جس پر سفید چادر پڑی تھی۔ دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ جو بھی ہے مر چکا ہے لیکن میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے پھر مجھے لوگوں کی باتوں سے پتا چلا کہ وہ گل خان تھا۔ اس کا جھگڑا ایک گاہک سے ہو گیا تھا جس نے چاقو مار کر اسے ہلاک کر دیا تھا اور اگلے روز ذاہی بابا کی بنائی ہوئی قبر میں دفن کر دیا گیا تھا۔

''یہ تو بڑی حیرت کی بات ہے۔'' میں جو بغور انوار بابا

دنیا کی پہلی متحرک فلم

آج دنیا بھر میں فلمیں بنتی اور دیکھی دکھائی جاتی ہیں۔ تفریح کے بے شمار ذرائع ہیں مگر فلم بینی بہترین تفریح سمجھی جاتی ہے۔ اب تو گھر بیٹھے بھی فلمیں دیکھنے کی آسانی ہے۔ کبھی آپ نے سوچا ہے کہ فلمسازی کی ابتدا کب ہوئی، کہاں ہوئی، کیسے ہوئی؟

برصغیر میں پہلی خاموش فلم "راجا ہریش چندر" اور پہلی بولتی فلم "عالم آرا" کے بارے میں تو آپ نے سنا اور پڑھا ہوگا مگر یقیناً یہ نہیں سنا ہوگا کہ دنیا میں پہلی متحرک فلم کب بنی، کہاں بنی اور کس نے بنائی؟

آپ کی دلچسپی اور جانکاری کے لیے ہم آپ کو بتاتے ہیں کہ 1888ء لیڈز میں پہلی حرکت کرتی ہوئی فلم بنائی گئی تھی لیکن اس کے فلم میکر سنیما کی تاریخ میں اپنا نام آنے سے پہلے ہی کہیں غائب ہو گئے تھے۔ ان کا نام لی پرنس تھا۔

14 اکتوبر 1888ء کو ایک خاندان انگلینڈ کے شہر لیڈز کے نواحی علاقے راؤنڈ ھے کے ایک باغ میں اکٹھا ہوا۔ اس گروہ میں لوئس لی پرنس بھی تھے جن کے ہاتھ میں ایک عجیب سا لکڑی کا ڈبہ تھا۔ انہوں نے اپنے ساتھ موجود لوگوں جن میں ان کے بیٹے، ایک دوست اور ساس سسر شامل تھے، ان سے کہا۔

"آپ لوگ ڈبے کے سامنے ایک دائرے کی شکل میں چلیں۔ یہ ڈبہ لوئس لی پرنس کا کیمرا تھا۔ اس کیمرے سے بنائی گئی ایک چھوٹی سی خاموش فلم اس خاندان کے لوگوں کے علاوہ دوسروں نے بھی دیکھی۔ یہ فلم ایڈیسن اور لومیئرز کے منظر عام پر آنے سے بہت پہلے بنائی گئی تھی۔

ولکنسن نے ایک فلم بنائی ہے جس کا ٹائٹل "دی فرسٹ فلم" ہے جس میں لی پرنس کو حرکت کرتی ہوئی تصاویر کا موجد کہا گیا ہے۔ ڈیوڈ ولکنسن مشہور فلمساز اور ڈسٹری بیوٹر تھے۔ بریڈ فورڈ کے نیشنل میڈیا میوزیم کی ایسوسی ایٹ کیوریٹر ٹونی بوتھ اس دعوے کی حمایت کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ اس کے لیے بہت مضبوط دلیل موجود ہے۔ اس میوزیم میں لی پرنس کا تاریخی کیمرا اور فلم بھی محفوظ ہے۔

کیمرے کے کام کرنے کے متعلق ٹونی بوتھ بتاتی ہیں۔ "اگر آپ اس کیمرے کا میکنیزم یا کام کرنے کا طریقہ دیکھتے ہیں تو یہ اس کے بعد آنے والے حرکت کرتی ہوئی تصاویر کے کیمروں سے بہت ملتا جلتا ہے۔ یہ ایک فلم رول ہے جو ایک چرخی سے دوسری چرخی پر شٹر سے گھومتا ہے اور سلسلہ وار تصاویر لیتا ہے۔ جن کو بعد میں اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ وہ حرکت کرتی ہوئی لگیں۔ لائیو ایکشن کی حرکت کرتی تصاویر کو ریکارڈ کرنے والی چیز کے حوالے سے میں کہوں گی کہ لی پرنس وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے یہ کیا تھا۔"

لوئس لی پرنس کون تھے؟ اس بارے میں بھی جانکاری ضروری ہے۔ قصہ کچھ یوں ہے کہ لی پرنس شمال مشرقی فرانس کے شہر میٹز میں پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے یونیورسٹی سے فزکس اور کیمسٹری کی تعلیم حاصل کی اور بطور فوٹو گرافر اور پینٹر کام کرنے لگے۔

کی باتیں سن رہی تھی، خاموش نہ رہ سکی۔ "بھلا ذاہی بابا کو کیسے پتا چل گیا کہ گل خان مرنے والا ہے اور وہ بھی ایک جھگڑے میں۔"

"ہاں میں نے بتایا نا ذاہی بابا نے کبھی میرے اس سوال کا جواب نہیں دیا۔"

"پھر کیا ہوا؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"جیسے جیسے میری عمر بڑھتی گئی میرا اندازہ بھی درست ہوتا گیا۔ اب میں یہ اندازہ لگا لیتا تھا کہ اب ہم کس کی قبر کھود رہے ہیں اس وقت میں ہائی اسکول میں پڑھ رہا تھا۔ مجھے اندازہ ہو جاتا تھا کہ اب ذاہی بابا مجھ سے کب ملیں گے اور ہم اگلی قبر کس کی کھودیں گے۔ اب ذاہی بابا گویا مجھے محنت کا صلہ بھی دینے لگے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ میرا حق ہے۔"

"میرا بھائی اشرف ہائی اسکول کی تعلیم مکمل کر چکا تھا اور اس کی شادی ہو گئی تھی اور میں پڑھنے کے ساتھ ساتھ ذاہی بابا کے ساتھ مل کر قبریں کھدوانے میں مصروف تھا۔ یونہی وقت گزرتا گیا۔ پھر جب میرے گریجویشن میں ایک ماہ رہ گیا تھا میں اپنے کالج میں جیم خانہ کے باہر کھڑا تھا کہ اچانک ایک درخت کے پیچھے سے نکل کر ذاہی بابا میرے سامنے آ گئے۔

"انوار کیسے ہو؟"

"تم یہاں کیوں آئے ہو؟" میں نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہاں کوئی اور اسے

اس کے بعد لیڈز کے ایک انجینئرنگ کمپنی جان وٹیلیز نے انہیں نوکری دی۔ لیڈز آنے کے تین سال بعد انہوں نے کمپنی کے مالک کی بیٹی ایلزبتھ وہیٹلے سے شادی کر لی۔ یہ وہ وقت تھا جب فوٹوگرافی مشہور ہونا شروع ہوئی اور لی پرنس حرکت کرتی ہوئی تصاویر کے لیے تجربے کرنے لگے تھے۔

1880 تک وہ ان موجدوں کی صف میں شامل ہو چکے تھے جو اس ٹیکنالوجی پر کام کر رہے تھے جسے بعد میں فلم کہا گیا۔ لی پرنس کے پہلے کیمرے کے 16 لینسز تھے لیکن لی پرنس نے باغ کے منظر اور لیڈز کے پل پر آتے جاتے لوگوں کو فلم بند کرنے کے لیے ایک لینس والا کیمرا استعمال کیا تھا۔ انہوں نے کامیابی سے متحرک مناظر (ایکشن) کو فلم بند کیا لیکن ان کی اس ایجاد کا کسی کو پتا نہ چلا۔ کیونکہ کسی نے یہ ایجاد دیکھی ہی نہیں۔

وہ اپنے تجربات کرتے رہے اور 1890ء میں نیویارک میں پبلک اسکریننگ کروانے والے ہی تھے کہ وہ کہیں غائب ہو گئے۔ انہوں نے ستمبر 1890ء میں دو دوستوں کے ہمراہ دیجون سے پیرس کے لیے گاڑی پکڑی تھی لیکن اس کے بعد وہ پھر کبھی نظر نہ آئے۔ ان کی موت یا گمشدگی کے بارے میں کافی مفروضے ہیں۔ ان کی بیوی لزی کہتی ہیں کہ ایڈیسن نے انہیں مروا دیا تا کہ وہ ان کے راستے سے ہٹ جائیں۔ کچھ کہتے ہیں لی پرنس نے خودکشی کر لی تھی کیونکہ وہ تقریباً دیوالیہ ہونے والے تھے یا پھر وہ جان بوجھ کر غائب ہو گئے اور کہیں اور نئی زندگی شروع کر دی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کے بھائی البرٹ نے انہیں جائیداد کے تنازعے پر قتل کر دیا ہے۔

ڈیوڈ ولکنسن کہتے ہیں۔ اگر وہ غائب نہ ہوتے تو ان کی فلم نیویارک میں دکھائی جاتی۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ ممتاز سامعین سے اتنی رقم اکٹھی کر لیتے کہ وہ اس کی مینوفیکچرنگ بہت بڑے پیمانے پر شروع کر دیتے۔ وہ وہی کرتے جو ایڈیسن اور لومیئرز نے کیا لیکن وہ ان سے پہلے کر لیتے اور مشہور ہو جاتے۔

لی پرنس کی موت کے بارے میں ان کی سکڑ پوتی لائری سانڈرز اپنی یادداشت میں لکھتی ہیں۔ ''میرے خاندان میں کئی مفروضے ہیں، کچھ کا خیال ہے کہ ایڈیسن کا اس میں کوئی ہاتھ تھا۔ کچھ سمجھتے ہیں کہ وہ خود ہی غائب ہوئے۔ میرے خیال میں ان کی پہلی گاڑی چھوٹ گئی تھی اور انہوں نے لیٹ ٹرین لی جو کہ رات گیارہ بجے پیرس پہنچی۔ وہاں سے ورک شاپ جانے کے لیے انہوں نے ٹیکسی لی ہوگی۔ ڈرائیور اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں کہیں دور دریائے سین کے کنارے لے گیا ہوگا اور ان کے سر پر کچھ مار کر سین میں پھینک دیا ہوگا۔ اس زمانے کے دو مضامین کے مطابق بتایا گیا ہے کہ چور اکثر اکیلے مسافروں کو نشانہ بناتے تھے اور لی پرنس غلط جگہ پر غلط وقت میں تھے۔ اس لیے یہ قیاس اغلب ہے کہ ایسا ہی ہوا ہوگا۔''

مرسلہ: عائشہ انور۔ کراچی

دیکھے۔

''مجھے پھر کل تمہاری مدد کی ضرورت ہوگی انوار۔'' ذاہی بابا نے کہا۔

''اس بار کس کا نمبر ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں شرط لگا سکتا ہوں کہ اس بار تم اندازہ نہیں لگا سکو گے۔'' ذاہی بابا نے مجھے چیلنج کیا۔

''ٹھیک ہے پھر مجھے اشارے بتاؤ۔'' میں نے کہا۔

''وہ قبرستان کے قریب رہتا ہوگا۔'' ذاہی بابا نے کہا۔

''تو پھر غفور کی ماں ہوگی وہ بہت بیمار ہے۔'' میں نے کہا۔

''نہیں تمہارا اندازہ غلط ہے۔''

''ٹھیک ہے کل صبح میں آ جاؤں گا۔'' میں نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔

اس رات میں دیر تک جاگتا رہا۔ میں سوچتا رہا کہ اب کس کی باری ہے لیکن اس بار میں ناکام ہو گیا اور اندازہ نہ لگا سکا۔ دوسری صبح میری ملاقات قبرستان میں ذاہی بابا سے ہوئی ان کے پاس پہنچ کر میں خاموشی سے ان کا ہاتھ بٹانے لگا۔ وہ ہمیشہ کے مقابلے میں زیادہ خوش نظر آ رہے تھے اور خوب گنگنا رہے تھے۔ جب میں نے قبر مکمل کی تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ ذاہی بابا نے قبر میں کھڑے کھڑے اور مسکرا کر میری طرف دیکھا۔

"میں نے اپنا کام مکمل کر دیا اور میں تمہارا قرض دار بھی نہیں ہوں۔" انہوں نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں حیرت سے انہیں دیکھنے لگا اس سے پہلے انہوں نے کبھی ایسی بات نہیں کی تھی۔ وہ قبر سے باہر آ گئے تھے۔

"تم گھر جاؤ اور آخری رسومات کی تیاری کرو۔" انہوں نے مجھ سے کہا اور میں ان کی طرف حیرت سے دیکھنے لگا گویا اس بار موت نے میرے دروازے پر دستک دی تھی۔

میں تقریباً دوڑتا ہوا گھر پہنچا گھر میں میری بھابی تھیں جنہوں نے بتایا کہ میری امی اور ابو کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اشرف بھی ان کے ساتھ ہی تھا۔ اسپتال میں میری ملاقات اشرف سے ہوئی اسے معمولی چوٹیں آئی تھیں جب کہ میرے ابو کا انتقال ہو گیا تھا اور میری والدہ زخمی اور بے ہوش تھیں۔

دوسری صبح میرے ابو کو دفن کر دیا گیا۔ میری دنیا اجڑ گئی۔ مجھے کئی روز تک اپنا ہوش نہیں رہا۔ پھر حالت ذرا بہتر ہوئی تو میں اپنی ماں کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گیا۔ میرا بھائی اور بھابی بھی ان کا خاص خیال رکھتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ ذاہی بابا کے ساتھ مل کر میرا کام کا سلسلہ بھی جاری رہا لیکن اس بار میرا مقصد کچھ اور تھا۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ میں اپنی ماں کی قبر کب کھودنا شروع کروں گا۔ ذاہی بابا نے مجھ سے میرے والدین کو پیش آنے والے حادثے کے بارے میں بات نہیں کی تھی۔ نہ ہی میرے والد کی موت کا تذکرہ کیا تھا۔ ہم ہمیشہ عام انداز میں قبروں کو کھودنے کا کام کرتے تھے اور میں خود کو خوش ظاہر کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

ایک رات میں اور میری والدہ گھر میں تنہا تھے اور میرا خیال ہے کہ میری والدہ نے جان بوجھ کر ایسا موقع فراہم کیا تھا کہ میں ان کے ساتھ گھر میں تنہا تھا۔

"انوار۔" انہوں نے مجھے پکارا۔ "میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"کس سلسلے میں؟" میں نے وضاحت چاہی اور اپنی کرسی ان کے قریب کھسکا لی۔

"میرا خیال ہے کہ میری دیکھ بھال کی وجہ سے تم کالج کی بہت چھٹیاں کر چکے ہو۔ میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے تمہاری پڑھائی کا کوئی نقصان ہو۔" وہ کمزور اور بوڑھی نظر آ رہی تھیں۔

"کالج جانے کے لیے عمر پڑی ہے۔" میں نے کہا۔

"نہیں، وقت برباد مت کرو۔" انہوں نے نصیحت کی۔

"لیکن میں آپ کی خدمت کرنا چاہتا ہوں اور ماں کی خدمت کرنے سے وقت برباد نہیں ہوتا۔"

"تمہارا کہنا درست ہے جب تم میرے قریب ہوتے ہو تو مجھے بھی سکون ملتا ہے لیکن تمہاری پڑھائی بھی ضروری ہے۔" انہوں نے ہمیشہ کی طرح مجھے سمجھایا۔

"لیکن؟"

"بس! اب میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔" انہوں نے مجھے چند لمحے دیکھتے رہنے کے بعد کہا۔ "انوار میں جو کچھ کہنا چاہتی ہوں کہہ نہیں سکی ہوں۔" وہ رونے لگیں۔

"کیا بات ہے امی۔" میں نے پوچھا۔

"میں نے ایک خواب دیکھا۔" انہوں نے کہا وہ مجھ سے نظریں چرا رہی تھیں۔ "میں نے دیکھا ہے کہ ایک سانولی سی رنگت کا بوڑھا سا شخص ہے اس نے نیلی اور سفید دھاری والا کرتہ پہنا ہوا ہے۔ سفید پگڑی اور پاجامہ میں ہے۔ وہ میرے پاس آیا ہے اور اس نے مجھ سے کہا ہے کہ وہ میرے ساتھ کچھ دیر چہل قدمی کرنے آیا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ میں چل نہیں سکتی لیکن اتنا کہنے کے بعد میں اٹھی اور چلنے لگی۔"

"وہ کوئی اچھا آدمی لگتا ہے امی۔" میں نے کہا۔

"میں نے یہ بھی دیکھا کہ وہ مجھے ایک ڈھلان کی طرف لے گیا ہے اس نے مجھ سے کہا کہ میں تمہیں ایک راز بتانا چاہتا ہوں پھر وہ مجھے ایک ہموار زمین تک لے گیا جہاں دور دور تک خوب صورت رنگ برنگے پر نکلے ہوئے تھے یوں لگ رہا تھا جیسے یہاں پر اگائے گئے ہوں۔ وہ منظر بہت خوب صورت تھا، انوار۔ ان پروں کے رنگ دھنک جیسے تھے پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ پر بڑے بڑے ہو گئے۔ میں اس شخص کی طرف مڑی اور میں نے اس سے کہا کہ میں ان پروں کے درمیان لیٹنا چاہتی ہوں۔ وہ میری بات سن کر مسکرانے لگا اور اثبات میں سر ہلایا پھر اس نے پروں کے درمیان جانے میں میری مدد کی اور میں ایک ہموار جگہ دیکھ کر

وہاں لیٹ گئی۔ میں پروں میں چھپ گئی تھی۔ وہ بہت نرم و گداز تھے۔ مجھے سب کچھ بہت عجیب لگ رہا تھا۔'' انہوں نے اپنی بات ختم کر کے میرا ہاتھ تھام لیا۔

''جب میں اس شخص کا شکریہ ادا کرنے کے لیے مڑی تو وہ وہاں نہیں تھا پھر میں نے دیکھا کہ میں کسی بڑی سی پروں والی چیز پر بیٹھی ہوئی تھی اور فضا میں اڑ رہی تھی۔'' انہوں نے میرا ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا اور رومال سے اپنی آنکھیں صاف کرنے لگیں۔ ''بس مجھے اتنا ہی یاد ہے۔''

''یہ تو بہت اچھا خواب ہے امی۔'' میں نے کہا۔

''نہیں، ایسا نہیں ہے تم غلط انداز میں سوچ رہے ہو۔ یہ خواب کوئی اور معنی رکھتا ہے۔''

''کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے میں جلد ہی تم لوگوں سے رخصت ہو جاؤں گی۔'' انہوں نے کچھ دیر بعد کہا۔

''نہیں۔''

''ہاں انوار اور بہت جلد شاید کل یا ہو سکتا ہے کہ اس میں کچھ وقت لگے لیکن یہ ہوگا ضرور اور میں چاہتی ہوں جب ایسا ہو تو تم میرے قریب نہ ہو۔''

''ہو سکتا ہے کہ آپ کا کہنا درست ہو۔''

''میں صحیح کہہ رہی ہوں۔''

''جی۔'' میں نے اتنا ہی کہا اور خاموش ہو گیا پھر میں اور امی کافی دیر خاموش بیٹھے رہے تھے۔ رات آہستہ آہستہ گزرتی جا رہی تھی پھر میں شب بخیر کہہ کر اپنے بستر پر چلا گیا تھا۔

اگلے روز جب میں قبرستان کے قریب واقع ویران مکان میں گیا تھا تو ذاہی بابا موجود تھے۔

''صبح بخیر انوار۔'' انہوں نے کہا۔ ''کل مجھے تمہاری ضرورت ہوگی۔''

''میں جانتا ہوں۔'' میں نے جواب دیا اور ان کے قریب بیٹھ گیا۔

''یہ قبر امی کی ہوگی نا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں کبھی یہ نہیں بتاتا کہ میں کس کے لیے کھود رہا ہوں۔''

''اگر ہم قبر نہ کھودیں تو کیا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''لیکن ہمیں قبر کھودنا ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''پھر بھی اگر ہم نہ کھودیں؟''

''انوار، میں قسم کھا سکتا ہوں جب مجھے علم ہو جاتا ہے تو میں اس سے انحراف نہیں کر سکتا۔''

''اوہ۔'' مجھے حیرت ہوتی تھی۔

''تم کل آؤ گے نا؟'' ذاہی بابا نے پوچھا۔

''ہاں میں پہنچ جاؤں گا۔''

دوسری صبح میں ذاہی بابا سے قبرستان میں ملا تھا اور ان کے ساتھ مل کر قبر کھودی تھی۔ ذاہی بابا مجھ سے باتیں کرنے کی بجائے زیادہ وقت گنگناتے رہے تھے۔ پھر ہم نے ساتھ ہی دوپہر کا کھانا کھایا تھا اور کچھ دیر آرام کرنے کے بعد اپنے کام میں مصروف ہو گئے تھے۔ ہمیشہ کی طرح سورج غروب ہونے کے وقت ہمارا کام مکمل ہوا تھا اور میں چھلانگ لگا کر کھدی ہوئی قبر سے باہر آ گیا تھا۔ ذاہی بابا نے مجھے کھدائی کے اوزار تھمائے تھے اور اسی لمحے میرے ذہن میں خیال آیا تھا کہ ذاہی بابا یونہی قبر کھودتے رہیں گے اور لوگ یونہی مرتے رہیں گے چنانچہ قبریں کھودنے کے سلسلے کو بند ہونا چاہیے پھر میں نے ایک لمحے کی بھی دیر نہیں کی تھی اور کھتی سر سے اونچی اٹھا کر ذاہی بابا کے سر پر دے ماری تھی۔ پھر میں نے کئی وار کیے تھے اور ذاہی بابا قبر میں گر گئے تھے۔ ان کے سر سے خون نکل کر زمین پر پھیل رہا تھا۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ پھر میں نے کھتی ہاتھ سے پھینک دی تھی وہ بھی قبر میں ذاہی بابا کے برابر گری تھی اور میں نے دوزانو ہو کر قبر میں مٹی ڈالنا شروع کر دی تھی۔ پھر اپنا کام مکمل کر کے میں وہیں ڈھیر ہو گیا تھا اور دیر تک روتا رہا تھا اس کے بعد میں نے قبریں کھودنے کا سامان درختوں میں چھپا دیا تھا اور واپس گھر آ گیا۔

''پھر ذاہی بابا اور اس کام سے تمہاری جان چھٹ گئی ہو گی؟'' میں نے انوار بابا سے پوچھا۔

''نہیں۔'' انہوں نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''پھر...... پھر کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''جب میں گھر آیا تو میری امی کی طبیعت زیادہ خراب تھی اور ڈاکٹر اسی وقت انہیں دیکھ کر گیا تھا اس نے ناامیدی کا اظہار کیا تھا۔ میں کافی دیر تک اپنی ماں کی دیکھ بھال کرنے کی غرض سے ان کے پاس بیٹھا رہا تھا۔ پھر اٹھ کر گھر سے باہر نکل گیا تھا۔ میں کچھ دیر کھلی فضا میں چہل قدمی کرنا چاہتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس طرح میرے دل پر موجود بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ کچھ دیر بعد جب میں واپس گھر کی طرف آ رہا تھا تو میری نظر اپنے گھر پر پڑی جو شعلوں کی لپیٹ میں تھا۔ میں تیزی

سے بھاگتا ہوا وہاں پہنچا تو وہاں موجود لوگوں نے مجھے جلتے گھر میں جانے سے روک دیا۔ گھر میں آگ لگی تھی اور گھر سے باہر میری امی، بھائی اور بھابی کی جلی ہوئی لاشیں رکھی تھیں۔ اب میرے سامنے کوئی راستہ نہیں تھا میں نے ذاہی بابا کو اس خوف سے مار دیا تھا کہ ان کے قبریں کھودنے کی وجہ سے لوگ مرتے تھے میں سمجھتا تھا کہ قبریں نہیں کھدیں گی تو لوگ نہیں مریں گے لیکن ایسا نہیں ہوا تھا اب کوئی قبر نہیں کھدی تھی لیکن میرے سامنے تین لاشیں دفنائے جانے کی منتظر رکھی تھیں۔

میں تھکے ہوئے قدموں سے قبرستان کی طرف چل دیا۔ وہاں جا کر میں نے ذاہی بابا کا قبریں کھودنے کا سامان درختوں میں سے نکالا اور قبریں کھودنے لگا۔ مجھے کچھ ہوش نہیں تھا کہ میں کتنی دیر کھودتا رہا تھا۔ میرے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے تھے۔ میرا جسم درد سے ٹوٹ رہا تھا۔ میرے پاؤں قبر میں کھڑے کھڑے دکھ گئے تھے۔ جب میں ایک قبر کھود چکا تو آرام کی غرض سے ایک طرف بیٹھ گیا۔ اچانک مجھے گنگنانے کی آواز آئی اور میں آواز کی سمت مڑا چاند کی روشنی میں ایک درخت کے نیچے مجھے ذاہی بابا کا ہیولا نظر آیا وہ درخت سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ انہوں نے بالکل سفید لباس پہنا ہوا تھا۔

"کیسے ہو انوار؟" انہوں نے مخصوص انداز میں پوچھا۔

"ٹھیک ہوں ذاہی بابا۔" میں نے شرمندگی سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"تم نے بہت محنت کر لی اب بس کرو۔" وہ جیسے ہوا میں اڑتے ہوئے میرے قریب آ گئے۔

"تمہیں آج رات بہت کام کرنا ہے کچھ دیر آرام کر لو۔"

"لیکن رات تھوڑی رہ گئی ہے اور صبح ....."

"میں جانتا ہوں میں بھی تمہاری مدد کروں گا۔" ذاہی بابا نے کہا۔

"آخر تم نے بھی تو اتنے عرصے میری مدد کی ہے۔"

پھر جب کچھ دیر آرام کرنے کے بعد میں نے دوبارہ کام شروع کیا تو زمین جیسے پہلے سے نرم ہو گئی۔ میرے اوزاروں کا وزن کم ہو گیا تھا۔ میں خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا اور میرا کام بہت جلدی ہو رہا تھا۔ دوسری قبر میں نے پہلی کے مقابلے میں جلدی مکمل کر لی تھی پھر جب میں نے تیسری قبر مکمل کی تھی تو سورج نمودار ہو رہا تھا۔ ذاہی بابا وہاں موجود نہیں تھے۔

صبح ہوتے ہی میں نے لوگوں کے ساتھ مل کر اپنے خاندان کی آخری رسومات ادا کی تھیں۔ پھر میں نے پڑھنا چھوڑ دیا تھا اور قبریں کھودنے کے پیشے کو ہی اپنا لیا تھا۔ میں دنیا میں تنہا رہ گیا تھا لیکن ذاہی بابا کبھی کبھی مجھ سے ملنے آتے تھے۔ وہ خاص خاص موقعوں پر آتے تھے۔ کبھی میری سالگرہ پر کبھی اپنی سالگرہ پر کبھی اپنے یوم وفات پر کبھی میری والدہ کی برسی پر۔"

"اب آپ اکیلے ہی قبریں کھودتے ہیں؟" میں نے انوار بابا سے پوچھا۔

"ہاں، اب میری عمر چھیانوے سال ہو چکی ہے اور میں اب تک نو سو پندرہ لوگوں کو دفن کر چکا ہوں جن میں میرا بھائی، میری ماں، میری بھابی، میرے والد اور میرے بہت سے دوسرے رشتہ دار بھی شامل ہیں۔ میں نے ایسے لوگوں کو بھی دفن کیا ہے جنہیں میں نہیں جانتا تھا بعض اوقات میں قبر کھود لیتا تھا لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ اس میں کون دفن ہوگا اور کسی شخص کے دفن ہو جانے کے بعد بھی مجھے پتا نہیں چلتا تھا کہ اس میں کون دفن ہونے والا تھا۔

"کیا اب بھی؟ اس عمر میں بھی آپ کام کرتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں لیکن اب میری رفتار بہت سست ہو گئی ہے۔"

"آپ کا کبھی کوئی اور شوق نہیں رہا؟"

"نہیں اور اب میں تھک گیا ہوں۔" انہوں نے ایک گہری سرد آہ بھری۔ "میں اس رات ہی تھک گیا تھا۔ جب میں نے اپنی ماں، اپنے بھائی اور اپنی بھابی کی قبریں کھودی تھیں۔ میرے وہ دن بہت اچھے ہوتے تھے جب مجھے قبر نہیں کھودنا ہوتی تھی۔ ان دنوں میں اپنی والدہ اور ذاہی بابا کی قبروں پر پھول چڑھاتا تھا۔" انوار بابا نے کہا اور پھر رک کر میری طرف دیکھنے لگے۔

"تم نے محسوس کیا میں اپنے لیے ماضی کا صیغہ استعمال کر رہا ہوں یعنی کرتا تھا، کھودتا تھا۔ اس کی وجہ بھی شاید تم سمجھ گئی ہو گی اگر نہیں تو میں بتائے دیتا ہوں مجھے احساس ہو رہا ہے کہ اب میں جو قبر کھودوں گا وہ میری ہو گی لیکن مجھے فکر صرف یہ ہے کہ آئندہ میری جگہ کون لے گا؟"

انوار بابا اپنی بات کر کے نڈھال سے ہو کر دیوار سے ٹک گئے تھے اور میں بوجھل قدموں سے گھر کی طرف لوٹ گئی تھی۔

پہیلی

محترم مدیر اعلیٰ
السلام علیکم
یہ واقعہ جو ارسال خدمت ہے یہ میری نہیں کسی اور پر گزری سچ بیانی ہے لیکن ہے دلچسپ۔ اسی لیے میں نے تمام واقعات کو جمع کر کے کہانی کے انداز میں بیان کر دیا ہے۔

راحت وفا راجپوت
(لاہور)

کچھ عرصہ قبل انڈیا کی ایک فلم ''ڈان'' کا دوسرا حصہ بنا تھا جس کا ہیرو شاہ رخ خان تھا۔ اس کا ایک ڈائیلاگ بہت مشہور ہوا تھا جو کہ اس طرح تھا۔ ''ڈان کو پکڑنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے'' اس ڈائیلاگ کو سن کر ہمیشہ میرے ذہن میں یہ جملہ آتا ہے۔ ''عورت کو سمجھنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے''۔

یہ بات سچ ہے کہ عورت کے دل میں کیا ہے اس کا پتا چلانا بہت مشکل ہے۔ بڑے بڑے دانش وروں اور مفکروں

نے عورت کو ایک پہیلی قرار دیا ہے اور میں بھی یہی سمجھتا ہوں کہ عورت ایسی پہیلی ہے جسے بوجھ لینا مرد کے بس میں نہیں ہے۔''

آپ کو یقین نہیں آ رہا۔ تو میری کہانی سن لیں۔

میرا نام سنی ہے اور تعلق سیالکوٹ سے ہے۔

میٹرک کرنے کے بعد میں نے لاہور کے ٹیکنیکل کالج میں داخلہ لینے کا سوچا۔ ابا اور امی نے مخالفت نہیں کی کہ میں سب بہن بھائیوں میں چھوٹا اور لاڈلا تھا۔ لاہور میں رہائش کا مسئلہ امی نے خود حل کر دیا۔ لاہور میں میری سگی خالہ رہتی تھیں۔ انہی کے ہاں مجھے ٹھہرنا تھا۔ یوں میں ٹیکنیکل کالج میں داخل ہو گیا۔ جہاں فریج، ٹی وی اور اے سی وغیرہ ٹھیک کرنے اور انہیں سیٹ کرنے کے مختلف کورسز کروائے جاتے تھے۔ میں نے دو سالہ کورس میں داخلہ لیا تھا۔

خالہ کے تین بچے تھے۔ دو بڑی بیٹیاں اور ایک چھوٹا بیٹا۔ خالو ریلوے میں ملازم تھے اور زیادہ تر گھر سے باہر ہی رہتے تھے۔ خوش حال اور آسودہ گھرانا تھا۔ ان کی بیٹیاں نائلہ اور شائلہ بالترتیب نویں اور دسویں میں پڑھ رہی تھیں۔ بیٹا پانچویں کلاس میں تھا۔

دونوں بہنوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ نائلہ شوخ وشریر اور بے باک قسم کی لڑکی تھی۔ بہترین تراش کے کپڑے پہنتی تھی جن میں اس کی جسمانی خوب صورتی نمایاں ہوتی تھی۔ سیاہ لمبے بال، گورا رنگ اور اسمارٹ جسم تھا۔

شائلہ اس سے ڈیڑھ برس بڑی تھی اور دسویں جماعت میں پڑھ رہی تھی۔ سنجیدہ مزاج لیے دیئے رہنے والی، کم گو لڑکی تھی۔ اس کا رنگ سانولا تھا بال اس کے بھی سیاہ اور لمبے تھے اور جسم بھی اسمارٹ تھا۔ زیادہ تر وہ مطالعے میں غرق رہتی۔ اس کے برعکس نائلہ فلموں اور گانوں کی دیوانی تھی۔

خالہ خوش مزاج عورت تھیں۔ بچوں کو لاڈ پیار میں رکھا ہوا تھا۔ میں فطرتاً شرمیلا تھا۔ لڑکیوں سے زیادہ بے تکلفی سے بات نہیں کر سکتا تھا۔ نائلہ اکثر مجھے ''پینڈو'' کہہ کر چھیڑا کرتی تھی۔ میں لمبا اونچا، خوب صورت لڑکا تھا۔ فلموں، گانوں سے مجھے زیادہ دلچسپی نہیں تھی میں کتابیں پڑھنے کا شوقین تھا خاص کر شاعری کی کتابیں۔

میرے دل کا ورق ابھی تک سادہ ہی تھا۔ کسی لڑکی نے مجھے اپنی طرف متوجہ نہیں کیا تھا اور یہاں آ کر یہ حادثہ بھی ہو گیا۔

مجھے نائلہ سے محبت ہو گئی۔

اس کی بے ساختہ اور خوب صورت ہنسی میرے دل میں آگ لگانے لگی۔ وہ بے تکلفی سے میرے قریب بیٹھ جاتی تھی تو میرا وجود جلنے لگتا۔ بے دھیانی میں میرا ہاتھ تھام لیتی تو میرا سارا جسم لرز اٹھتا۔

میری محبت یک طرفہ ہی تھی۔ وہ تو ایسی ہی بے تکلفی سے اپنے دوسرے کزنز سے بھی بات کرتی تھی۔ اس کی پھوپو کا گھر قریب ہی تھا۔ پھوپو کا بیٹا اسد گھر آتا جاتا رہتا تھا۔ نائلہ اس کے ساتھ بھی ہنستی مسکراتی، کیرم کھیلتی اور لطیفے سنایا کرتی تھی۔ میں دل ہی دل میں جلتا کڑھتا رہتا تھا۔

شائلہ میرے سارے کام کرتی تھی۔ کپڑے دھونا، استری کرنا، میرے لیے چائے اور کھانا لانا، میرے کہے بغیر ہی اس نے ساری ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی۔ میں بھی خالہ کے باہر کے کام بخوشی کرنے لگا تھا۔ سودا سلف لاتا، بل جمع کراتا، نائلہ اور شائلہ کو کسی سہیلی کے گھر یا بازار لے کر جاتا، یہ سب میرے ذمے تھے۔

☆......☆

یہاں آنے کے کچھ دن بعد کا ذکر ہے مجھے بہت تیز بخار ہو گیا تھا۔ خالہ ڈاکٹر کے پاس لے گئیں۔ دوا کھا کر میں تقریباً نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ جب میں نے اپنے ماتھے پر کسی کے ہونٹوں کا لمس محسوس کیا۔ کمرے میں نیم تاریکی تھی۔ زیرو کا بلب جل رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں آنکھیں کھول کر اسے دیکھتا وہ کمرے سے نکل گئی۔

پتا نہیں وہ کون تھی۔ میں سوچتے سوچتے گہری نیند میں چلا گیا۔ اگلی صبح اٹھا تو بخار اتر چکا تھا۔ رات کی بات کسی خواب کی طرح یاد تھی۔ میں نے نائلہ اور شائلہ دونوں کے چہرے دیکھے وہ روزانہ کی طرح نارمل تھیں۔ میں نے کالج سے چھٹی کر لی تھی۔ نہ جانے کیوں نائلہ نے بھی چھٹی کر لی تھی۔ وہ میرے لیے چائے اور ڈبل روٹی لے کر آئی تھی۔ دوا کھا کر پھر مجھ پر غنودگی طاری ہو گئی۔ غنودگی کی حالت میں پھر میں نے اپنے چہرے پر کسی کے نرم ہونٹوں کا لمس محسوس کیا اور جلدی سے آنکھیں کھول دیں۔

''نائلہ'' میں نے پکارا۔ وہ جاتے جاتے مڑی۔ مجھے جاگتا دیکھ کر وہ ذرا بھی نہیں گھبرائی۔

''سنی تم تو دل کی بات کہو گے نہیں مگر مجھ سے صبر نہیں ہوتا۔ جب مجھے چاہنے لگے ہو تو بتاتے کیوں نہیں اظہار کیوں نہیں کرتے۔'' وہ میرے بستر کے قریب رکھی کرسی پر

بیٹھ گئی تھی۔''

''میں تمہاری ناراضگی سے ڈرتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ خوشی سے میرا دل قابو میں نہیں رہا تھا۔

''بھلا محبت سے بھی کوئی ناراض ہوتا ہے۔'' وہ بڑی ادا سے بولی۔ ''جب پیار کیا تو ڈرنا کیا۔'' وہ گنگنانے لگی اور ہم دونوں ہنس پڑے۔

نائلہ کی محبت میرے لیے ڈھیروں خوشیاں لائی تھی۔ وہ بھی بہت خوش تھی۔ کسی تتلی کی طرح اڑتی پھرتی تھی۔ سب کی موجودگی میں معنی خیز جملہ بول دیتی۔ میں دوسروں کی موجودگی میں محتاط رہتا تھا۔ تنہائی میں بھی میں زیادہ بولتا نہیں تھا۔ مجھے اسے سننا اچھا لگتا تھا۔ وہ بات بات پر روٹھ جاتی۔ میں منتیں کرتا۔ ہاتھ جوڑتا تب وہ ہنس دیتی۔ اس کی ناراضی سے میری جان پر بن آتی تھی۔

مجھے لاہور آئے ہوئے آٹھ ماہ ہو چکے تھے۔ اب تو میرا امی ابو سے ملنے جانے کو دل بھی نہیں کرتا تھا۔ چھٹیاں ہوتیں تو بھی میں وہیں رہتا۔ میں جنون کی حد تک نائلہ سے محبت کرنے لگا تھا۔

اس دن خالہ کے بیٹے فہد کی سالگرہ تھی۔ کافی لوگ آئے ہوئے تھے۔ چھت پر سارا انتظام کیا گیا تھا۔ سب لوگ وہیں بیٹھے تھے۔ گلابی نیٹ کے فراک پاجامے میں نائلہ کوئی اپسرا لگ رہی تھی۔ کیک آ چکا تھا۔ کیک کاٹنے کی رسم شروع ہونے والی تھی کہ نائلہ نے میرے قریب آ کر مجھ سے کہا۔ ''سنی مجھے گجرے لا دو میں نے ہاتھوں میں ڈالنے ہیں۔''

''اس وقت۔'' میں نے کہا۔

''ہاں اسی وقت۔'' وہ ضدی لہجے میں بولی۔

''اچھا میں لے کر آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں چھت سے نیچے آ گیا۔ باہر جا کر گجرے لیے اور واپس آیا تو نائلہ نیچے ہی میرا انتظار کر رہی تھی۔

''باندھ دو۔'' اس نے دونوں کلائیاں میرے آگے کر دیں۔ میں جھجک رہا تھا کہ کوئی نیچے نہ آ جائے۔ جلدی جلدی گجرے باندھے۔

''شکریہ۔'' وہ میرے قریب آ کر بولی۔ اس کے جسم سے اٹھتی مہک سے میں مدہوش سا ہونے لگا۔ اسی وقت آہٹ ہوئی۔ میں تیزی سے پیچھے ہٹا۔ دروازے پر شمائلہ کھڑی تھی۔ شرمندگی سے میرا وجود پانی پانی ہو گیا مگر نائلہ پرسکون تھی۔

یرموک

مشہور جنگ جو 13ھ میں دریائے یرموک کے کنارے ہرقل سے لڑی گئی۔ دمشق، اردن اور حمص کی فتوحات کے بعد حضرت خالد دریائے یرموک کے کنارے پہنچے۔ دوسرے سرداروں کے ماتحت دوسری فوجیں بھی جمع ہو چکی تھیں۔ عیسائی فوج کی تعداد دو لاکھ چالیس ہزار تھی۔ مسلمان فوج کے چار گروہ تھے جن کی سپہ سالار عمرو بن العاص، یزید بن ابی سفیان، ابوعبیدہ بن جرح اور شرجیل بن حسنہ تھے۔ ان کی تعداد تیس ہزار کے لگ بھگ تھی۔ بعد میں حضرت ابوبکرؓ نے بعض مصلحتوں کے پیش نظر حضرت خالدؓ کو سپہ سالار اعظم بنا کر بھیجا تھا۔ ان کے ساتھ دس ہزار فوج بھی تھی۔ حضرت خالد نے تمام فوج کو اٹھائیس دستوں میں تقسیم کرتے ہوئے 18 دستے حضرت ابوعبیدہ کی زیر قیادت درمیان میں رکھے۔ دس دستے دائیں طرف حضرت شرجیل بن حسنہ کی قیادت میں' بائیں جانب دس دستے حضرت یزید بن ابی سفیان کی قیادت میں رکھے۔ رومیوں نے بھی صفیں جمالیں۔ رومیوں نے بھی خوب صورتی سے صفیں جمائیں مگر جنگ چھڑنے پر مسلمان تیر اندازوں نے انہیں زبردست شکست دی۔ چونکہ بھاگنے کے راستے مسدود تھے۔ ایک طرف پہاڑ، ایک جانب دریا اور سامنے مسلمان فوج تھی۔ اس لیے انہیں بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ جنگ میں ایک لاکھ رومی اور تین ہزار مسلمان ہلاک ہوئے۔ یرموک کی شکست سے ان کے حوصلے پست ہوئے۔ ہرقل شام سے مستقلاً روم چلا گیا اور مختصر سی مدت میں شام مکمل طور پر مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا۔

مرسلہ: نوشتہ گلزار سرائے مہاجر (بھکر)

''امی بلا رہی ہیں۔'' شمائلہ اتنا کہہ کر پلٹ گئی۔

شمائلہ کیا سوچے گی۔ میں پریشان تھا۔

''کیا ہوا، ڈر گئے۔'' نائلہ مجھے چڑانے لگی۔

''نہیں۔ چلو اوپر چلتے ہیں۔''

تمام وقت میں شرمسار سا رہا مگر شمائلہ کا رویہ نارمل ہی تھا۔

کچھ دن اور گزر گئے۔

احکامِ الٰہی

اے ایمان والو! صبر کرو اور صبر دلاؤ، اور تعلق پیدا کرو اور خدا سے ڈرو تاکہ تم نجات پاؤ۔
اس قرآن کا مقصد لوگوں کو سمجھانا ہے، لیکن ہدایت اور نصیحت تو اس سے وہی لوگ پکڑتے ہیں جن کے دل میں خدا کا خوف ہے۔
ہم کسی نفس کی طاقت سے زیادہ اس پر بوجھ نہیں ڈالتے، اگر تم اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہو تو شرط فرمانبرداری یہ ہے کہ اسی پر بھروسا رکھو۔
مال اور اولاد دنیا کی چند روزہ زندگی کے بناؤ سنگھار ہیں اور نیک اعمال جن کا اثر دیر تک باقی رہنے والا ہے۔
تم اونچی جگہ پر بے ضرورت یادگاریں بناتے ہو اور بڑی بڑی صنعت کے محل تعمیر کرتے ہو، کیا تم ہمیشہ دنیا ہی میں رہو گے؟

محلے میں کوئی شادی تھی جس میں خالہ کی ساری فیملی مدعو تھی۔ خالہ نے مجھے بھی کہا مگر میں نے انکار کر دیا۔ اجنبی لوگوں میں میرا کیا کام۔ مہندی کی رات تھی۔ سب تیار ہو کر جا چکے تھے۔ میں کچھ دیر پڑھتا رہا۔ پھر سونے اٹھا تھا کہ نائلہ آگئی۔ سبز اور پیلے سوٹ میں وہ دمک رہی تھی۔

''کیا ہوا اتنی جلدی کیوں آگئیں۔'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔
''بس طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔'' وہ میرے قریب آکر بیٹھ گئی۔ میں ڈر گیا، ہم دونوں اکیلے تھے۔
کوئی آجاتا تو کتنا بڑا طوفان کھڑا ہو جاتا۔ پتا نہیں وہ خالہ سے کیا بہانہ کر کے آئی تھی۔
''نائلہ پلیز تم چلی جاؤ۔ خالہ کے ساتھ ہی گھر آنا۔'' میں نے کہا۔ مگر اس نے ان سنی کر دی۔ وہ میرے اور قریب آگئی اور میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔
''سنی ایسا موقع پھر نہیں ملے گا۔ آج جی بھر کے پیار کرنے دو۔'' اس کا لہجہ خمار آلود ہو گیا۔
میں نے اسے پیچھے کیا۔ وہ میرے ساتھ چمٹ گئی۔ مجھ پر بھی مدہوشی طاری ہونے لگی مگر جب اس کی بے باکی بڑھنے لگی تو میں نے اسے جھٹکے سے پیچھے کیا اور کھڑا ہو گیا۔ وہ حیران رہ گئی۔ اس کی سانسیں بے ترتیب ہو رہی تھیں آنکھوں میں سرخی اتر آئی تھی۔

''نائلہ اپنے آپ کو سنبھالو۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔''
وہ آگے بڑھی اور میرے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی۔
''نائلہ۔'' میں نے کچھ کہنا چاہا تھا کہ اس کا ہاتھ اٹھا اور پوری قوت سے میرے گال پر پڑا۔ میں ششدر رہ گیا۔
''تم مرد نہیں ہو۔ میری غلطی تھی جو تم سے محبت کرنے لگی تھی۔ تم مجھے مطمئن ہی نہیں کر سکتے۔ تم پیار کیا کرو گے۔ بزدل۔'' اس نے ایک بار پھر مجھے گالی دی۔
''نائلہ۔'' میں نے تڑپ کر کہا۔ ''ناراض نہ ہو۔ میں اب سیالکوٹ جاؤں گا تو امی کو ساتھ لے کر آؤں گا۔ پھر ہم ایک رشتے میں بندھ جائیں گے۔ شادی کے بعد میں تمہیں ڈھیروں پیار کروں گا۔''
''شادی اور تم سے۔'' وہ ہنسی۔ اب وہ پُرسکون ہو چکی تھی۔ ''تم نے میری توہین کی ہے، عورت اپنی توہین کبھی نہیں بھولتی۔'' وہ دروازے کی طرف بڑھی۔
''نہیں نائلہ میں تمہیں محبت کے نام پر آلودہ نہیں کرنا چاہتا۔ میں تم سے پاک صاف محبت کرتا ہوں۔'' میں نے التجا کی۔

''بس۔'' اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''ہمارا رشتہ ختم ہو چکا ہے۔ آج کے بعد ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔''
''خدا کے لیے نائلہ مجھے معاف کر دو۔'' میں نے ہاتھ جوڑ دیے۔ ''میں تمہارے بغیر مر جاؤں گا۔ مجھے نہ چھوڑنا۔ مجھے معاف کر دو۔'' میں نے اپنی انا، مردانگی اور عزت نفس اس کے قدموں میں ڈال دی تھی۔ میں منتیں کرتا رہا مگر وہ نہ مانی اور مجھے وہیں بیٹھا چھوڑ کر چلی گئی۔ میں خالی ہاتھ رہ گیا۔

اس دن کے بعد نائلہ نے مجھے مخاطب کرنا چھوڑ دیا۔ مجھے جہاں وہ اکیلی نظر آتی میں اس سے معافی مانگنے لگتا مگر وہ نہ مانی۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ میں نے اس کی عزت خراب نہیں کی، اس کی پاکیزگی پر داغ نہیں لگنے دیا، اپنی محبت کو ہوس سے آلودہ نہیں کیا پھر بھی وہ ناراض ہے۔ کیا

عزت کی حفاظت کرنے والا، دوشیزگی کو داغدار نہ کرنے والا نامرد ہوتا ہے۔ میں تو سمجھتا تھا کہ عورت کو چاہت کے نام پر لوٹنے والا مرد نہیں ہوتا مگر نائلہ نے اسے اپنی توہین سمجھ لیا تھا۔ میں نے اس کی پیش قدمی کو ٹھکرا دیا تھا۔ تو وہ انسلٹ فیل کر رہی تھی۔

میرے بار بار معافی مانگنے پر اس نے ایک دن یہ کہہ دیا کہ اگر اب میں نے اس سے اس معاملے پر بات کرنے کی کوشش کی تو وہ خالہ کو بتا دے گی کہ سنی نے میری عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

میں چپ ہو گیا۔ گم صم ہو گیا۔ میرا کھانا پینا کم ہو گیا۔ میرا وزن بھی کافی گر چکا تھا۔ میری پہلی محبت کا یہ انجام مجھے راتوں کو رلاتا تھا۔ میں زخم زخم ہو گیا تھا مگر وہ خوش تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اس کی بے توجہی نے میرا پڑھنے سے دل اچاٹ کر دیا۔ دوسروں کے سامنے تو مجھ سے بے تکلفی سے مخاطب ہوتی تھی مگر تنہائی میں اجنبی بن جاتی۔

پھر اس نے اپنی پھوپو کے بیٹے اسد کے ساتھ مزید بے تکلفی کا مظاہرہ کرنا شروع کر دیا۔ وہ اتنی لگاوٹ سے بات کرتی کہ میرا خون کھولنے لگتا۔ ایک دن اس کی پھوپو اسد کا رشتہ لے آئیں۔ خالہ نے ہاں کر دی اور میرے سامنے ہی اس نے اسد کے نام کی انگوٹھی پہن لی۔ منگنی کے بعد اسد زیادہ بے تکلفی سے گھر آنے لگا تھا۔

☆......☆

میں زخم زخم تھا۔ بیمار اور کمزور ہو گیا تھا۔ خالہ نے ڈاکٹر کو دکھایا۔ دوائیاں بھی کھائیں مگر میں بجھ گیا تھا۔ اس دوران شمائلہ نے میرا بہت خیال رکھا۔ میں تو اتنا بددل ہو گیا تھا کہ پڑھائی چھوڑ کر واپس جانے کا ارادہ کر لیا مگر شمائلہ نے سمجھایا کہ اپنا مقصد حاصل کیے بغیر واپس جاؤ گے تو تمہارے گھر والے کیا کہیں گے۔

ایک شام نائلہ، اسد کے ساتھ بازار گئی ہوئی تھی۔ خالہ کچن میں تھیں۔ شمائلہ میرے کپڑے استری کر کے لائی۔ میں اس کا شکر گزار تھا۔ میں نے شکریہ ادا کیا تو اس نے کہا۔

”مجھے آپ کا کام کرنا اچھا لگتا ہے۔“

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے رنگ تھے۔ پھر وہ کہنے لگی۔ ”نائلہ کا غم اپنے دل و دماغ سے نکال دیں۔ جب اسے پرواہ نہیں ہے تو آپ کیوں خود کو ہلکان کر رہے ہیں۔“

میں حیران رہ گیا۔ وہ مسکرائی۔ ”میں سب جانتی ہوں

ادبی لطائف

جگر مراد آبادی

مشاعرے میں ایک مسلم الثبوت استاد نے ایک طرح مصرعہ دیا...... باغ سے آ رہی ہے بوئے کباب

سبھی شاعروں نے طبع آزمائی کی لیکن کوئی گرہ نہ لگا سکا۔ ان میں سے ایک شاعر صاحب ہر صبح دریا کے کنارے نکل جاتے اور اونچی آواز سے الاپتے...... باغ سے آ رہی ہے بوئے کباب......

ایک روز ادھر سے ایک کم سن لڑکا گزر رہا تھا جوں ہی شاعر نے یہ مصرعہ پڑھا، وہ لڑکا بول اٹھا۔

کسی بلبل کا دل جلا ہوگا

یہی لڑکا بڑا ہو کر جگر مراد آبادی کے نام سے مشہور ہوئے۔

جوش ملیح آبادی

جوش ملیح آبادی مولانا ابوالکلام آزاد سے ملاقات کے لیے ان کی کوٹھی پر پہنچے...... وہاں ملاقاتیوں کا ایک جم غفیر پہلے سے موجود تھا۔ کافی دیر تک انتظار کے بعد بھی جب ملاقات کے لیے جوش صاحب کی باری نہ آئی تو انہوں نے اکتا کر ایک چٹ پر یہ شعر لکھ کر چپراسی کے ہاتھ مولانا کی خدمت میں بھجوایا۔

نامناسب ہے خون کھولانا
پھر کسی اور وقت مولانا

مولانا شعر پڑھ کر مسکرائے اور فوراً جوش صاحب کو اندر بلا لیا

☆☆☆

عبدالحمید عدم کا کسی صاحب نے جوش سے تعارف کراتے ہوئے کہا۔

”آپ عدم ہیں......“

عدم کافی تن و توش کے آدمی تھے۔ جوش نے ان کے ڈیل ڈول کو بغور دیکھا اور کہنے لگے ”عدم یہ ہے تو وجود کیا ہوگا؟“

مرسلہ: ارشد بشیر، پھالیہ

آپ اسے بہت چاہتے تھے مگر کاش آپ یہ دیکھ پاتے کہ آپ کو پریشان دیکھ کر کوئی اور بھی دکھی ہے۔ کسی اور کو بھی آپ کی پرواہ ہے۔'' اتنا کہہ کر وہ رکی نہیں، میں سمجھ گیا تھا کہ شمائلہ مجھے چاہنے لگی ہے۔ یہ انکشاف میرے لیے حیران کن تھا۔

جب میں اپنی محبت نہ پا سکا تو میں نے سوچا اس پُرخلوص لڑکی کو ہی خوشی دے دوں جس نے کسی صلے کے بغیر مجھے چاہا تھا۔ مجھ سے کچھ نہیں مانگا تھا۔ میں نے شمائلہ کے سامنے اقرار کرلیا کہ میں اس کی محبت کا احترام کرتا ہوں اور اسے خوش رکھنے کی کوشش کروں گا۔ وہ پُرخلوص لڑکی میری اتنی سی بات پر خوشی سے رو پڑی تھی۔

شمائلہ کی محبت نے مجھے اعتماد اور سکون دیا۔ اب میں نے نائلہ کی طرف دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔

میرا ارادہ تھا کہ میں امی سے شمائلہ کے بارے میں بات کروں تاکہ وہ خالہ سے رشتہ مانگ لیں۔ میرا کورس مکمل ہونے میں چند ماہ رہ گئے تھے۔ شمائلہ اب فرسٹ ایئر میں پڑھ رہی تھی۔ اس کی سانولی رنگت میری محبت پا کر کھل اٹھی تھی۔ وہ کھلی کھلی رہنے لگی تھی۔ ہم دونوں ڈھیروں باتیں کرتے۔ مستقبل کے پلان بناتے۔ نائلہ، اسد میں گم تھی اس نے شاید ہمارا قریب ہونے کا نوٹس ہی نہیں کیا تھا۔

☆......☆

خالو گھر آئے ہوئے تھے۔ سب خوش تھے۔ وہ مجھ سے بھی بہت پیار سے ملتے تھے۔ اسد کی امی نے دعوت کی تھی۔ میں نے انکار کردیا۔ نائلہ پہلے ہی ان کی طرف جا چکی تھی۔ میں نے طبیعت خراب ہونے کا بہانا کیا تھا۔ شام کو سب چلے گئے۔ کھانا بنا ہوا تھا۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ شمائلہ چلی آئی۔ ''امی کہہ رہی تھیں کہ آپ کو کھانا اور چائے دے کر آؤں۔''

میں ٹی وی کے آگے بیٹھ گیا۔ وہ کھانا گرم کر کے لائی۔ چائے بنا کر تھرماس میں ڈالی اور کہنے لگی۔ ''اب میں جاتی ہوں۔''

وہ شاید نہائی تھی۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے۔ خوب صورت پرنٹ والے سوٹ میں وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''ذرا ٹھہرو تو۔''

وہ سرخ پڑ گئی۔ میں نے اس کے گیلے بالوں کو چھوا۔ ایک عجیب سی خوشبو نے مجھے اپنے حصار میں لے لیا۔ شاید وہ بھی مدہوش ہوگئی تھی۔ ایک گہرا سکوت چھا گیا تھا۔ میں نے اسے کندھوں سے تھام کر اپنے قریب کرلیا۔ اس نے میرے سینے پر سر رکھ دیا۔ میں نے سوچا کہ کہیں خالہ یا خالو اسے بلانے نہ آجائیں۔ ہم دونوں تنہا ہیں۔ میں اسے پیچھے کرنے لگا تھا کہ مجھے یاد آگیا کہ نائلہ نے میرے پیچھے کرنے پر کتنی توہین محسوس کی تھی۔ کہیں شمائلہ بھی برا نہ مان جائے۔ کیونکہ وہ بھی اس وقت بہت جذباتی ہو رہی تھی۔ میں نے اسے اپنی بانہوں میں زور سے کس لیا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے پوری طاقت سے اپنے آپ کو چھڑایا اور پوری قوت سے میرے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ میں ہکا بکا رہ گیا۔

''شمائلہ۔'' میں نے کہنا چاہا۔ وہ دہاڑی۔ ''میں آپ کو بہت اچھا سمجھتی تھی مجھے نہیں پتا تھا کہ دوسرے مردوں کی طرح آپ بھی ہوس کے مارے ہیں۔ اب مجھے سمجھ میں آیا کہ نائلہ نے کیوں آپ کو چھوڑ دیا تھا۔ آپ نے اسے بھی اپنی گندی فطرت کا شکار بنانا چاہا ہوگا۔ آپ محبت کو ہوس سے آلودہ کرنا چاہتے ہیں۔ میں آپ کی پوجا کرتی تھی۔ اپنا محافظ سمجھتی تھی۔ آپ تو لٹیرے نکلے۔ نفرت ہے مجھے آپ سے۔'' یہ کہہ کر وہ روتی ہوئی باہر بھاگ گئی۔ میں اس کی غلط فہمی دور نہ کرسکا۔

قسمت کی ستم ظریفی پر مجھے رونا آگیا۔ نائلہ اور شمائلہ دونوں نے مجھے طعنہ دیا تھا۔

میں اسے ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اسے نہیں روکا اور یہ ہوگیا۔ دونوں بار محبت میرے ہاتھ سے نکل گئی۔

اب آپ بتائیے میں کیا کرتا۔ جی ہاں میں نے وہی کیا جو آپ سوچ رہے ہیں۔ اگلی صبح خالہ کا گھر چھوڑا اور اپنے گھر واپس آگیا۔ اپنے ابا کے جنرل اسٹور پر بیٹھنے لگا ہوں۔ جس سے بھاگ کر لاہور گیا تھا۔

مگر آج بھی رات کی تنہائیوں میں ایک ہی سوال اپنے آپ سے پوچھتا ہوں۔

کیا میں غلط ہوں؟

آپ ہی بتائیے میں کیا ہوں؟

اس بات کو پانچ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ نائلہ کی شادی پر میں نہیں گیا۔ اب سنا ہے شمائلہ کی بھی شادی ہونے والی ہے۔ میرے گھر والے میرے لیے بھی لڑکی دیکھ رہے ہیں اور میں یہی سوچتا رہتا ہوں کہ عورت کو سمجھنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔
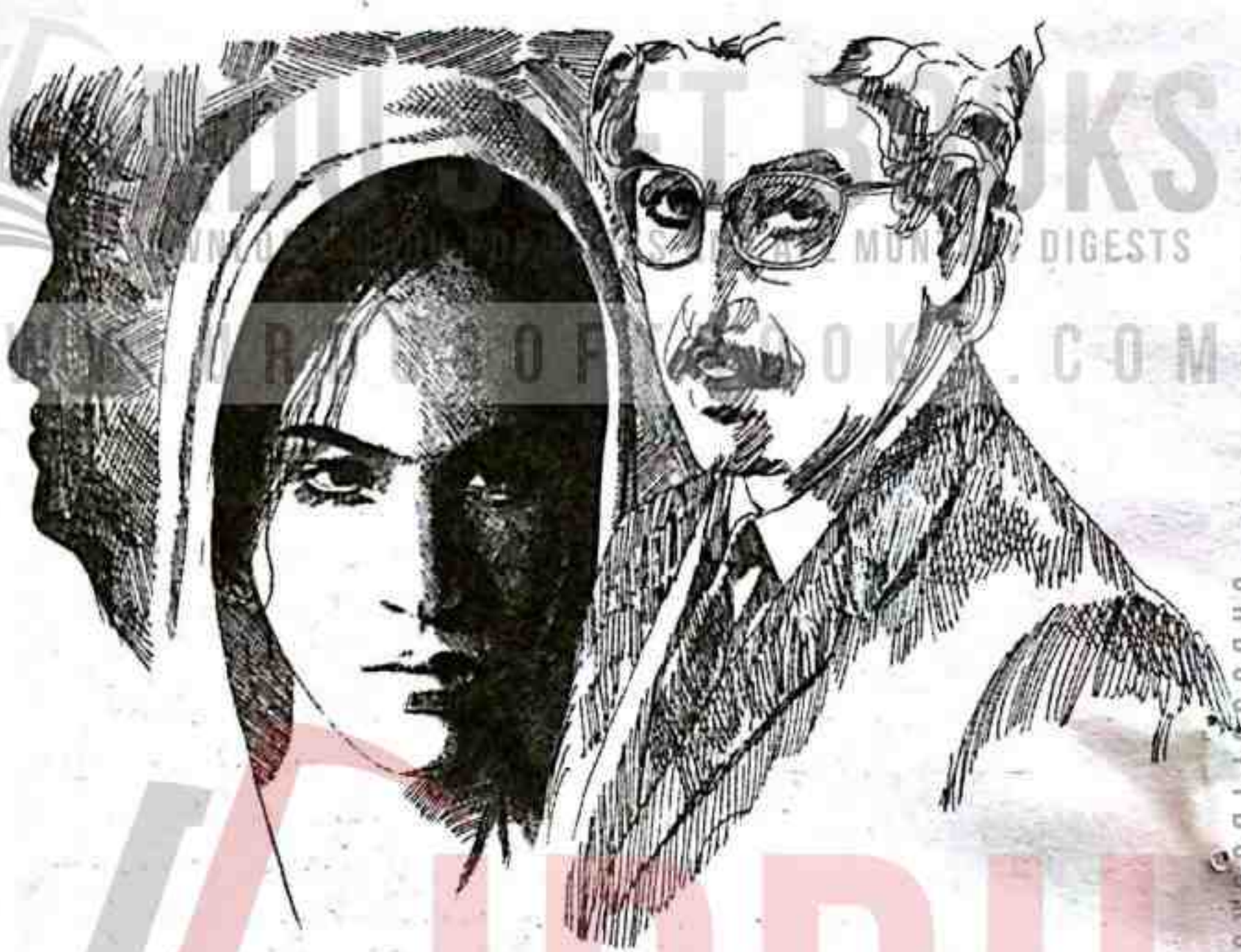
فیروزہ

محترم ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم
ایک سچا واقعہ ارسال کررہا ہوں۔ یہ میری ایک کلائنٹ کی سرگزشت ہے۔ اکیلی عورت کو کیا کیا دکھ جھیلنے پڑتے ہیں یہ سب آپ کو اس سرگزشت میں مل جائیں گے۔

ناصر علی بھٹیو
(حیدرآباد)

جب وہ میرے کمرے میں آئی اور میں نے اس کی آنکھوں کو دیکھا تو مجھے نہ جانے کیوں یہ یقین ہوگیا کہ اس کا نام غزالہ ہی ہوسکتا ہے۔

میں ایک وکیل ہوں اور وہ کوئی مشورہ کرنے میرے پاس آئی تھی۔

میرا پیشہ ایسا ہے کہ میرا لوگوں سے رابطہ رہتا ہے۔ عام طور پر ان کے بارے میں میرے اندازے درست ہوا کرتے ہیں۔ اس لیے میں نے اس کو دیکھتے ہی اندازہ کرلیا۔

تھا کہ اس کا نام غزالہ ہوگا۔

لیکن اگر نیاگرا آبشار کا پانی بھی میرے سر پر گرنے لگتا تو مجھے اتنی حیرت نہیں ہوتی، جتنی حیرت یہ جان کر ہوئی کہ اس کا نام غزالہ نہیں فیروزہ تھا اور وہ کسی عامر کی بیوی تھی۔ یعنی وہ فیروزہ عامر تھی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ ایک عدد بچے کی ماں بھی تھی اور اس کا وہ بچہ فیروزہ کے چچازاد بھائی کے ساتھ باہر موجود تھا۔

میں اس کے معصوم چہرے اور غزالی آنکھوں کی طرف دیکھتا رہا۔

اس نے میرے سامنے بیٹھ کر اپنے بارے میں بتایا۔

اس کی شادی تین سال پہلے عامر سے ہوئی تھی جس کو وہ امر پکارا کرتی تھی۔ عامر ایک کامیاب کاروباری شخص تھا۔ نوجوان اور شکل وصورت کا بھی اچھا۔

ان دونوں کی ملاقات ایک نمائش میں ہوئی وہ اپنی ماما کے ساتھ ایک اسٹال کے پاس کھڑی تھی کہ کسی کی آواز آئی۔ ''واہ کیا خوب صورتی ہے۔''

فیروزہ نے پیچھے مڑ کر دیکھا، اس کے پیچھے عامر کھڑا تھا جو بظاہر تو ایک طرف ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے اپنے دوست سے کہہ رہا تھا۔ ''واہ کیا خوب صورتی ہے۔'' لیکن اس کی نگاہیں فیروزہ پر لگی ہوئی تھیں۔

نہ جانے کیوں فیروزہ کی رنگت تبدیل ہونے لگی۔

یہ تھی عامر سے پہلی ملاقات۔ اور دوسری ملاقات پانچ منٹ کے بعد ہی چوڑیوں کے ایک اسٹال پر ہوگئی تھی۔

فیروزہ اسٹال پر چوڑیاں پہننے کے لیے رک گئی تھی اور جس وقت دکان دار چوڑیاں پہنا رہا تھا اس وقت اس نے پھر وہی آواز سنی۔ ''واہ! کتنی خوب صورت ہیں۔''

فیروزہ کی ماما نے بھی عامر کو دیکھ لیا تھا اور اس کی یہ بات سن لی تھی۔ وہ فیروزہ کا ہاتھ تھام کر اسے نمائش سے باہر لے آئیں۔

باہر آکر دونوں نے ایک رکشا کر لیا۔ رکشا چلا تو ایک گاڑی نے پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ وہ گاڑی عامر ہی کی تھی۔ فیروزہ شمسی گارڈن میں رہتی تھی۔ عامر نے اس کا گھر دیکھ لیا تھا۔

فیروزہ کا باپ متوسط طبقے کا فرد تھا۔ شمسی گارڈن کا یہ گھر کرائے کا تھا۔

یہ گھر فیروزہ کے باپ کے سیٹھ شکور کا تھا لیکن ظاہر یہ کرتا تھا کہ یہ گھر اس کے بھائی کا ہے۔ شمسی گارڈن کے علیحدہ علیحدہ بلاک میں اس کے چار گھر تھے۔

یہ چاروں گھر اس نے ایک اسکیم کے تحت حلف نامے داخل کرتے ہوئے لیے تھے۔ جس میں قسم کھائی گئی تھی کہ کراچی یا اندرون سندھ میں اس کی کوئی جائیداد نہیں ہے اور نہ ہی اس کے بیٹوں کی ہے۔ اس طرح اس نے چار گھر اپنے نام کروائے اور چاروں کو کرائے پر دے دیا تھا۔

فیروزہ انٹر سائنس کی طالبہ تھی۔ ایک بار اس نے عامر کو اپنی ایک دوست نعیمہ کے ساتھ دیکھ لیا اور اس دن پتہ چلا کہ عامر نعیمہ کا بھائی ہے۔

آہستہ آہستہ نعیمہ کی معرفت دونوں ایک دوسرے سے قریب ہونے لگے۔ وہ عامر کے تحائف قبول کرنے لگی اور کچھ دنوں کے بعد اس کے ذریعے دونوں میں ملاقاتیں ہونے لگیں۔ آخر کار ان دونوں کی شادی ہوگئی۔

شادی کے کچھ دنوں کے بعد فیروزہ کے ماں باپ کا انتقال ہوگیا۔ ڈیڑھ سال بعد ان کے یہاں بیٹا پیدا ہوا جس کا نام انہوں نے ناصر رکھا۔

اور تین سال بعد دونوں میں علیحدگی بھی ہوگئی۔ اس کی وجہ عامر کی بے راہ روی تھی۔ اس نے لڑکیوں کا تعاقب کرنا نہیں چھوڑا تھا۔ اس کی اوباش فطرت اپنی جگہ قائم رہی۔

فیروزہ اپنی تنہائی سے تنگ آکر اپنی خالہ کے یہاں چلی جایا کرتی جو عامر کے مکان سے کچھ فاصلے پر رہتی تھی۔

ابتداء چھوٹی چھوٹی شکایتوں سے ہوئی پھر نوبت مار پیٹ تک پہنچ گئی اور پھر فیروزہ نے طلاق مانگ لی۔

عامر کے لیے یہ توہین کی بات تھی۔ اس نے اپنی انا کا پرچم سربلند رکھنے کے لیے یہ شرط لگا دی کہ وہ ناصر کو اپنے ساتھ رکھے گا۔

فیروزہ کے لیے یہ ناقابل برداشت تھا۔ اس نے عامر سے جان چھڑانے کے لیے قانون کا سہارا لینے کی کوشش کی۔

وہ ایک دفتر سے دوسرے دفتر کے چکر لگاتی رہی اور ہر جگہ کے بڑے آفیسر نے اس سے یہی کہا کہ اگر اسے جلدی چھٹکارا پانا ہو تو اس کے گھر آجائے۔

فیروزہ نے سب کو منع کر دیا اور اب وہ اپنا کیس لے کر میرے پاس آئی تھی۔ یہ تھی اس فیروزہ کی داستان جو میرے لیے غزالہ تھی۔

وہ چاہتی تھی کہ میں اس کا کیس لڑوں۔ میں نے جب

سارے اخراجات بتائے تو اس کی غزالی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں اس کی خوب صورت غزالی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میرے اندر کا شاعر میرے کاروبار پر غالب آگیا۔

میں نے اس کا کیس لڑنے کا فیصلہ کرلیا اور کلرک سے عامر کے نام ایک ڈرافٹ تیار کروایا۔ جس میں یہ کہا گیا تھا کہ وہ چار ہزار روپے مہینے کے حساب سے فیروزہ کے نان نفقے کا خرچ برداشت کرے۔

ڈرافٹ تیار کرکے لفافے میں بند کیے، اس پر ٹکٹ لگائے اور عامر کا پتا لکھ کر فیروزہ کے ہاتھ میں دیا کہ وہ کل ہی عامر کے پتے پر اس لفافے کو روانہ کردے۔

جاتے وقت فیروزہ نے اپنے بوسیدہ پرس میں سے ایک سو بیس روپے نکال کر میری طرف بڑھا دیئے۔ میں نے وہ روپے واپس اس کے پرس میں ڈال دیئے۔

پھر جب وہ جانے کے لیے دروازے تک پہنچی تو میں نے آواز دے کر اسے روک دیا۔ وہ جھجکتی ہوئی میرے پاس آگئی۔

"سنو میں اگر تمہیں فیروزہ کے بجائے غزالہ کہوں تو تمہیں اعتراض تو نہیں ہوگا؟"

اس نے سر جھکا کر انکار کا اشارہ کیا۔ شاید اسے اس بات پر حیرت ہو رہی ہوگی کہ میں نے اسے اپنے گھر بلانے کے لیے اپنا ایڈریس نہیں دیا تھا۔

میں ساری رات فیروزہ اور اس کے شوہر کے حوالے سے سوچتا رہا۔ کیا ایسے بھی بے حس لوگ ہوتے ہیں جو حسن کی قدر نہ جانتے ہوں۔ جو فیروزہ جیسی اچھی بیوی کو چھوڑ کر اوروں کے چکر میں رہتے ہوں۔

دوسری بار جب وہ میرے پاس آئی تو اس کا بیٹا اور ایک چچازاد بھائی اس کے ساتھ تھا لیکن وہ دونوں میرے آفس کے کمرے سے باہر ہی رہ گئے تھے۔

اندر آتے ہی فیروزہ لڑکھڑا گئی لیکن اس نے خود کو سنبھال لیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔

اس نے قدم آگے بڑھایا تو گرنے لگی اور اس سے پہلے کہ وہ گر جاتی میں نے آگے بڑھ کر اسے سنبھال کر کرسی پر بٹھا دیا۔

اس کے لیے واٹر کولر سے پانی نکال کر دیا گلاس لیتے وقت میں نے محسوس کیا کہ اس کے ہاتھ واضح طور پر کانپ رہے تھے اور آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔

نصیر ترابی

ہم ادبی منظرنامے پر نگاہ ڈالیں تو ہمیں یہ دکھائی دیتا ہے کہ شاعری کی مختلف اصناف میں اظہار خیال کا سفر جاری ہے اور اس میں مختلف شعراء اپنے انداز میں صلاحیتوں کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ شاعری میں کلاسیکی غزل کی اپنی ایک اہمیت ہے۔ موجودہ ادبی منظرنامے میں نصیر ترابی ایسے ہی ایک شاعر ہیں جو کلاسیکی غزل کے حوالے سے مستند اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے خیال میں موجودہ عہد تک ادب میں بھی بہت سی بنیادی تبدیلیاں ہوئی ہیں جن سے ادب کا شعبہ متاثر ہوا ہے مگر اچھی ساعت اچھا شعر کہلواتی ہے اور ہمارا موجودہ ادبی نظام "لابنگ سسٹم" میں ڈھل گیا ہے۔ نصیر ترابی ایک علمی اور مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں آپ کو گھر سے ادبی فضا ملی اور اپنے عہد کے تمام بڑے لوگوں سے گہرے مراسم رہے۔ دور حاضر میں ہونے والے مشاعروں اور دیگر سرگرمیوں سے آپ نے کنارہ کشی اختیار کر رکھی ہے کیونکہ ان کا کہنا ہے کہ تخلیق کاری میں خیال موجود ہوتا ہے اور تشکیل کاری میں خیال تراشا جاتا ہے اور اب زیادہ تر ادب کے نام پر تشکیل کاری ہو رہی ہے۔

مرسلہ: رعنا فیصل، کراچی

"کچھ کھاؤ گی؟" میں نے نرم لہجے میں اس سے پوچھ لیا۔

پہلے تو وہ خاموش رہی پھر دھیرے سے بولی۔ "ہاں میں نے پچھلے تین دنوں سے کچھ نہیں کھایا۔"

میں نے دفتر کے کلرک کو پیسے دیئے کہ وہ فوراً سامنے والے ہوٹل سے بریانی اور روٹی سالن وغیرہ لے کر آجائے۔

ہمارے درمیان بالکل خاموشی رہی۔

شاید اس کے پاس بتانے کے لیے کچھ نہیں تھا یا شاید میں نے اس کے بارے میں اندازے لگائے تھے۔ کھانے کے دوران بھی وہ خاموش رہی۔

کھانے کے بعد اس نے اجازت چاہی ایسا لگا جیسے آج اس کے آنے کا مقصد یہی تھا کہ اس نے تین دنوں سے

کچھ نہیں کھایا تھا۔

میں نے اس کے برقعے کے اندر ابھار سے اندازہ لگا لیا کہ وہ بچا ہوا کھانا دوپٹے کے پلو میں باندھ کر اپنے ساتھ لے جا رہی ہے۔

میں نے دس روپے کا ایک نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے لرزتے ہوئے ہاتھ سے وہ نوٹ لیا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

ایک ہفتے کے بعد جب آئی تو اس کے ہاتھ میں طلاق نامہ تھا جو اس کے شوہر نے بھیجا تھا۔ اس وقت وہ خوش نظر آ رہی تھی۔

میں نے جب اس سے اس کی آئندہ زندگی کے بارے میں پوچھا تو اس نے اس شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا جو اس کے ساتھ آیا کرتا تھا۔ یہ مشکور میرا رشتے دار نہیں ہے۔ میری خالہ کے پڑوس میں رہتا ہے۔ یہ بہت اچھا درزی ہے۔ اس کے پاس اپنی مشین ہے، یہ کپڑے سی کر اپنا گزارا کر لیتا ہے۔ میری خالہ کا کہنا ہے کہ میں اس سے شادی کر لوں لیکن میں تو ابھی الجھی ہوئی ہوں ابھی کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی۔ بعد میں سوچوں گی۔"

جاتے وقت اس نے اپنے برقعے کے اندر سے مٹھائی کا ایک ڈبہ نکال کر میز پر رکھ دیا۔ "یہ آپ کے لیے ہے۔"

میں نے بہت انکار کیا تھا لیکن اس نے کہا۔ "کیا ایک غریب کا حقیر سا تحفہ بھی قبول نہیں کریں گے۔ میں آپ کا احسان قیامت تک نہیں اتار سکوں گی۔"

میں نے مٹھائی کا ڈبہ کھول کر ایک بالوشاہی نکال کر ڈبہ اسے واپس کر دیا اور جب وہ جانے لگی تو میں بے ساختہ بول اٹھا۔ "خدا حافظ غزالہ۔"

اس نے اپنی غزالی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ خدا حافظ کہا اور باہر چلی گئی۔ اس کے بعد بہت دنوں تک اس کے بارے میں مجھے کچھ نہیں معلوم ہو سکا۔

پھر کئی مہینوں کے بعد شادی کا ایک کارڈ ملا۔ وہ کارڈ فیروزہ اور مشکور کی شادی کا تھا۔ وہی مشکور جو اس کے ساتھ آیا کرتا تھا۔ جس کے بارے میں فیروزہ نے بتایا تھا کہ وہ درزی ہے اور اس کی خالہ مشکور سے شادی کے لیے کہہ رہی ہیں۔

اس کارڈ کے ساتھ ایک خط بھی تھا۔

وہ خط فیروزہ کا تھا۔ اس نے شادی میں شریک ہونے کی تاکید کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا تھا کہ مشکور کی اب ٹیلرنگ کی ایک دکان ہے۔ پہلے سے بہتر گزر بسر ہو رہی ہے۔ خط میں اس نے اپنا نام فیروزہ، غزالہ لکھا تھا۔

نہ جانے کیا بات تھی کہ میں اپنی خواہش کے باوجود اس کی شادی میں شریک نہیں ہو سکا تھا۔ اس کے بعد بہت دن گزر گئے اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہو سکا۔

بس کبھی کبھی اس طرح یاد آ جاتی جیسے آسمان پر ذرا سی دیر کے لیے بجلی کوند کر غائب ہو جائے۔

ایک دن کالا برقع پہن کر ایک کمزور سی عورت میرے کمرے میں داخل ہوئی۔

میں نے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں پہچان نہیں پا رہا تھا کہ وہ کون ہے۔ پھر جب اس نے اپنا نقاب الٹا تو میں نے اس کی آنکھوں سے اسے پہچان لیا۔

بہت بری حالت تھی اس کی۔ ہونٹ سوکھ گئے تھے۔ گالوں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ بال مرجھائے ہوئے تھے۔ رنگ بہت زیادہ زرد ہو گیا تھا۔ صرف اس کی آنکھیں ویسی ہی تھیں۔

"غزالہ! یہ تم ہو؟" میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"فیروزہ کہیں۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"یہ حال کیسے ہو گیا؟"

"اپنے بیٹے کی پرورش کے لیے مجھے تین گھروں میں کام کرنے پڑتے ہیں۔" اس نے اپنے دونوں ہاتھ آگے کر کے دکھائے۔

اس کی ہتھیلیاں برتن مانجھتے مانجھتے کھردری ہو چکی تھیں۔

"لیکن یہ سب ہوا کیسے تمہاری تو شادی ہو گئی تھی۔"

"اب یہ سب نہ پوچھیں سائیں۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "بہت طویل داستان ہے۔ پھر کبھی سناؤں گی۔ اس وقت تو ایک عرض لے کر آئی ہوں۔"

"ہاں کہو۔"

"میں نے ایک ایک پیسا جمع کر کے اپنے لیے ایک جھونپڑی بنائی تھی۔" اس نے بتایا۔ "کچھ لوگ بے دخل کر رہے ہیں۔ ان کو روکوا دیں۔"

"اور وہ مشکور۔"

"نام مت لیں اس بے غیرت کا۔ دلال کہیں کا۔" اس کے لہجے کی بے پناہ نفرت نے سب کچھ سمجھا دیا تھا۔

مکرمی جناب معراج رسول
السلام علیکم
میرا نام حمید نسیم ہے اور میں سرگزشت عرصہ سے پڑھ رہا ہوں۔ دوسروں کی زندگی کے حالات پڑھ پڑھ کر مجھے بھی شوق ہوا کہ میں بھی اپنی زندگی کا ایک عجیب سا واقعہ لکھوں۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ ڈاکٹر رتھ فاؤ کی کوشش سے کوڑھ کا مرض ختم ہو گیا لیکن یہ واقعہ تب کا ہے جب کوڑھ کے مریض ہر جگہ مل جاتے تھے۔ یہ.... مکروہ بیماری کیسے دو دلوں کی دوری کا باعث بنی یہی اس سچ بیان کا محرک ہے۔

حمید نسیم
(لاہور)

اچھوت

(نہ جانے اس ویرانے میں یہ مکان کیوں بنا ہوا تھا۔

بہرحال ایسی تیز بارش میں وہ مکان میرے لیے زندگی کی نوید بن کر سامنے آگیا تھا۔ اپنے ایک دوست کی عیادت کے لیے مجھے راجن پور جانا تھا۔

اس دوست کے بارے میں یہ اطلاع تھی کہ وہ بہت بیمار ہے اور مجھے یاد کرتا رہتا ہے۔ اس کا آبائی گھر راجن پور ہی میں تھا۔

ہم دونوں ایک ہی دفتر میں کام کرتے تھے۔ نشان علی

کے گھر والے راجن پور میں رہتے تھے۔ وہ جوان آدمی تھا لیکن ایک موذی مرض نے اس کو گھیر رکھا تھا۔

دفتر میں وہ صرف مجھ ہی سے بے تکلف تھا اور اپنے دکھ درد شیئر بھی کرلیتا تھا۔ وہ ایک باحوصلہ انسان تھا۔ وہ یہ جانتا تھا کہ اس مرض کے ہاتھوں اس کی زندگی بہت مختصر سی ہے پھر بھی وہ ہنستا بولتا رہتا تھا۔

بہرحال کچھ دنوں کے بعد اس کی طبیعت جب زیادہ خراب ہوئی تو اس کو اسپتال میں ایڈمٹ کرا دیا گیا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ اسپتال سے ڈسچارج ہوگیا تھا۔

پھر وہ دفتر نہیں آیا بلکہ راجن پور اپنے آبائی گھر کی طرف چلا گیا۔ گاہے گاہے اس کی خبر ملتی رہتی تھی اور اب یہ پتا چلا کہ اس کی طبیعت بہت خراب ہے اور وہ مجھے یاد کررہا ہے۔

میں اس سے ملنے کے لیے راجن پور کی طرف روانہ ہوگیا۔ مجھے یہ بتایا گیا تھا کہ ہائی وے سے ایک راستہ اندر کی طرف جاتا ہے۔ اسی راستے پر آگے جاکر راجن پور ہے۔

میں اس راستے پر آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک بارش شروع ہوگئی۔ بہت تیز بارش تھی۔ اس قسم کی چوایشن کا اندازہ وہی لگاسکتے ہیں جو ایسے حالات سے گزرے ہوں۔

ویران راستہ، پریشان کردینے والا، دونوں طرف آبادی کا کوئی نشان نہیں، تیزی سے ڈھلتا ہوا دن۔ پھر تیز بارش اور اچانک گاڑی بھی خراب ہوجائے۔ تو ایسی صورت میں کیا ہوسکتا ہے۔

میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ گاڑی رک گئی تھی اور تیز بارش نے راستے دھندلا دیے تھے۔ نہ جانے راجن پور یہاں سے کتنی دور تھا۔

بے پناہ مایوسی اور خوف کی کیفیت تھی۔ ایسے میں وہ مکان دکھائی دے گیا۔ اچھا خاصا مکان تھا۔ ایک منزلہ، اس راستے سے ہٹ کر بنا ہوا تھا لیکن سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس مکان میں کون رہتا ہوگا۔ اس وقت اندھیرا غالب آچکا تھا اور اس گھر کی ایک کھڑکی سے آتی ہوئی روشنی یہ بتارہی تھی کہ مکان غیر آباد نہیں ہے۔ کوئی نہ کوئی یہاں ضرور رہتا ہے۔

میں آگے بھی نہیں جاسکتا تھا اور رات گاڑی میں بھی بسر نہیں ہوسکتی تھی۔ اسی لیے گاڑی سے اتر کر اس مکان کی طرف بڑھ گیا۔

مکان تک آتے آتے بری طرح بھیگ چکا تھا۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ کچھ نہیں ہوا۔ دوبارہ دستک دی۔ اس بار کسی عورت کی آواز آئی تھی۔ ”کون ہے؟“

”ایک مسافر ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میری گاڑی خراب ہوگئی ہے۔ بارش بھی ہورہی ہے۔ آپ کا مکان دیکھا تو پناہ لینے چلا آیا۔“

کچھ دیر خاموشی رہی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ عورت اس مکان میں اکیلی ہو۔ اس لیے وہ دروازہ کھولنے سے ہچکچا رہی تھی۔

میں نے اسے یقین دلانے کے لیے کہا۔ ”محترمہ، میرا یقین کریں۔ میں ایک شریف انسان ہوں۔ راجن پور کی طرف جارہا ہوں کہ راستے میں یہ سب ہوگیا۔“

”کیا تم راجن پور میں رہتے ہو؟“ اس عورت نے پوچھا۔

”نہیں، وہاں میرا ایک دوست بیمار پڑا ہوا ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”اس کو دیکھنے جارہا ہوں۔“

”میں راجن پور کے ہر شخص کو جانتی ہوں۔ کیا نام ہے تمہارے دوست کا؟“

”نشان علی۔“ میں نے بتایا۔ ”وہ میرے ساتھ دفتر میں کام کرتا ہے۔“

پھر خاموشی۔ اس کے بعد اس عورت نے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ میں نشان علی کو جانتی ہوں۔ تمہارے لیے دروازہ کھول رہی ہوں۔ لیکن تم دومنٹ کے بعد اندر آنا۔ میں دوسرے کمرے میں چلی جاؤں تب تم اندر آنا۔ میں پردہ دار ہوں اس لیے میں تمہارے سامنے نہیں آسکتی۔“

”ٹھیک ہے محترمہ۔ میرے لیے اتنا ہی بہت ہوگا کہ رات بھر کے لیے اس بارش سے پناہ مل جائے گی۔ آپ بے فکر ہوکر دروازہ کھول دیں۔“

بارش رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی اور میں کھڑا ہوا بھیگ رہا تھا۔ اس عورت نے دروازہ کھولنے میں دیر لگا دی تھی۔ نہ جانے کیا بات تھی۔ بہرحال اس وقت ایسی باتوں پر سوچنے کا موقع نہیں تھا۔ حال تو یہ تھا کہ کسی طرح پناہ مل جائے۔

بہرحال دروازہ کھول دیا گیا لیکن اس نے کہا تھا کہ دومنٹ کے بعد اندر آنا۔ میں نے دومنٹ انتظار کے بعد دروازے کو دھکا دیا جو اندر کی طرف کھل گیا تھا۔

میں کمرے میں داخل ہوگیا۔ بارش سے نجات مل گئی۔

تھی۔ ویسے سر سے پاؤں تک بھیگا ہوا تھا۔ کمرے کی حالت عجیب سی ہو رہی تھی۔

دو کرسیاں تھیں۔ ایک طرف ایک پرانی میز تھی۔ بلب تو جل رہا تھا لیکن اس کی روشنی بہت مرجھائی مرجھائی سی تھی۔

اس کمرے کے برابر ایک اور کمرا تھا۔ دونوں کمروں کے درمیان ایک پردہ لٹک رہا تھا۔ کمرے میں کچھ عجیب سی بُو تھی جو اس وقت سمجھ میں نہیں آسکی تھی۔ ایک کرسی پر ایک تولیہ رکھا ہوا تھا۔ میں نے تولیہ کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا کہ اس عورت کی آواز آئی۔ ''نہیں، بالکل نہیں۔ تم یہ تولیہ استعمال نہیں کرسکتے۔''

شاید وہ پردے کے پیچھے سے دیکھ رہی تھی۔

''محترمہ، میں بری طرح بھیگا ہوا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''تولیے سے اپنے آپ کو خشک کرنا چاہتا ہوں۔''

''کچھ بھی ہو۔ تم تولیہ استعمال نہیں کرسکتے۔ بلکہ کسی بھی چیز کو استعمال نہیں کرو گے۔'' اس نے کہا۔ ''تم کو صرف بارش تک رکنے کی اجازت دی گئی ہے۔ بارش رک جائے تو پھر چلے جانا یہاں سے۔''

''جانا بھی تو مشکل ہو گیا ہے۔ میری گاڑی خراب کھڑی ہے۔''

''راجن پور یہاں سے بس تین چار کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔'' اس نے کہا۔ ''تم پیدل جاسکتے ہو۔ وہاں تمہیں مکینک مل جائیں گے۔ ان کو لے آنا، وہ تمہاری گاڑی ٹھیک کردیں گے۔''

''میں کسی کرسی پر بیٹھ تو سکتا ہوں۔'' میں نے جل کر پوچھا۔ ''یا اس کی بھی اجازت نہیں ہے؟''

''ہاں۔'' وہ ہنس پڑی۔ بہت ہی کھنک دار ہنسی تھی اس کی۔ وہ یقیناً جوان ہی ہوگی۔ اس کی آواز بھی بتا رہی تھی۔ ''ہاں، تم بیٹھ سکتے ہو۔''

''شکریہ۔'' میں دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔

بدبو کا احساس اور شدید ہونے لگا تھا اور اس وقت یاد آیا کہ یہ کس چیز کی بدبو ہوسکتی ہے۔ یہ گندھک کی بو تھی۔ اس کمرے میں شاید گندھک رکھی ہوئی تھی۔

کچھ دیر بعد پھر اس کی آواز آئی۔ ''مسافر! تم اگرچہ بھیگے ہوئے ہو۔ ٹھنڈ بھی لگ سکتی ہے۔ اس کے باوجود میں تمہیں چائے بنا کر نہیں دوں گی۔ بلکہ اگر تم پانی بھی پینا چاہو تو یہاں سے نہیں پی سکو گے۔''

''تم بے فکر رہو۔'' میں جھلا کر بولا۔ ''میں تمہاری مہمان نوازی کا قائل ہو چکا ہوں۔ بس اتنا بتا دو کہ کیا ساری رات مجھے اسی کرسی پر بیٹھے رہنا ہوگا؟''

''ہاں یہ مجبوری ہے۔'' اس نے کہا۔ ''معاف کردینا مجھے۔''

نہ جانے کیوں اس بار اس کی آواز میں پہلے والی کھنک نہیں تھی بلکہ نڈھال سی آواز تھی۔ کانپتی ہوئی۔

''کوئی بات نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''میں ساری رات اسی طرح گزار سکتا ہوں۔''

''تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔ کیا نام ہے تمہارا۔ نشان علی کو کب سے جانتے ہو؟''

''میرا نام حمید تسلیم ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''میں لاہور میں رہتا ہوں۔ ایک بڑی فرم میں ملازمت کر رہا ہوں۔ نشان علی میری فرم میں میرے ساتھ کام کرتا تھا۔''

''کام کرتا تھا اس سے کیا مراد ہے۔ کیا اب وہ کام نہیں کرتا؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں، میں نے بتایا نا کہ وہ بیمار رہنے لگا ہے۔ اس نے اسی لیے جاب چھوڑ دی اور راجن پور جا کر رہنے لگا۔ میں اسی سے ملنے جا رہا تھا کہ راستے میں یہ افتاد آگئی اور مجھے یہاں پناہ لینی پڑی۔ بس یہ ہے کُل کہانی۔''

دوسری طرف خاموشی رہی۔

پھر میں نے آواز دی۔ ''کیا آپ چلی گئیں؟''

''نہیں، میں وہیں کھڑی ہوں۔'' اس نے کہا۔

''اب آپ اپنے بارے میں تو بتائیں؟'' میں نے پوچھا۔ ''آپ کون ہیں؟ اس ویرانے میں کیا کر رہی ہیں۔ نام کیا ہے آپ کا؟''

''میرا خیال ہے کہ آپ کو سب بعد میں پتا چل جائے گا۔ اس لیے اب آپ خاموشی اختیار کریں اور اس کرسی پر بیٹھے رہیں۔ میں بھی سونے جا رہی ہوں۔ ہاں، ایک بات بتا دوں۔ آپ دروازے سے اندر آنے کی حماقت مت کیجیے گا۔ صبح ہو جائے تو پھر چلے جائیے گا۔''

عجیب عورت تھی۔ اتنی پتھر دل۔ آدمی ان حالات میں اگر کسی کے یہاں پناہ لے تو کچھ نہ کچھ اس کا خیال کیا ہی جاتا ہے لیکن خیال تو بہت دور کی بات، اس نے اپنا تولیہ تک استعمال کرنے سے منع کر دیا تھا۔ لیٹنے کے لیے کوئی بستر بھی نہیں دیا تھا۔ بہرحال اتنی مہربانی بہت تھی کہ اس نے دروازہ کھول کر اندر بلا لیا تھا۔

رات بھر کرسی پر بیٹھے بیٹھے میری حالت خراب ہوگئی۔ میری کمر تختہ ہوگئی تھی۔ پریشان ہوکر کمرے میں ٹہلنے لگتا۔ پھر کرسی پر جاکر بیٹھ جاتا۔ اس دوران بارش رک چکی تھی۔ لیکن میں نکل کر جا نہیں سکتا تھا۔ بہت گھپ اندھیرا تھا۔

مجھے یہاں سے نکلنے کے لیے صبح ہونے کا انتظار کرنا تھا۔

خدا خدا کرکے صبح ہوئی تو جان میں جان آئی۔ میں نے اندر والے کمرے کے دروازے پر دستک دے کر بلند آواز میں بتایا۔ ''میں جارہا ہوں۔''

کوئی جواب نہیں ملا تو میں اس کمرے سے باہر آگیا۔ بارش کی وجہ سے راستہ بہت خراب ہوگیا تھا۔ میری گاڑی اسی جگہ کھڑی تھی۔ اس ویرانے میں کون اس گاڑی کو لینے آتا۔

اتنا تو اندازہ تھا کہ یہی راستہ آگے چل کر راجن پور سے مل جاتا ہے۔ مکان والی عورت نے بتایا تھا کہ راجن پور اب تین چار کلومیٹر سے زیادہ دور نہیں ہے۔ میں بہ آسانی اتنا فاصلہ پیدل طے کرسکتا تھا لہٰذا خدا کا نام لے کر میں پیدل چل پڑا۔

زیادہ دشواری راستے کی خرابی کی وجہ سے ہورہی تھی۔ ورنہ فاصلہ اتنا زیادہ نہیں تھا۔ شاید تین یا چار کلومیٹر کے بعد بستی کے آثار دکھائی دینے لگے۔ راستہ بھی کئی راستوں میں تقسیم ہوگیا تھا۔

ایک مکینک کی دکان شروع ہی میں تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ شہروں میں تو دکانیں بارہ ایک سے پہلے نہیں کھولی جاتیں۔ لیکن چھوٹے علاقوں میں لوگ روزگار کی تلاش میں سویرے سے بیٹھ جاتے ہیں۔

مکینک کے پاس ایک ٹریکٹر اور ایک ٹرک کھڑا ہوا تھا۔ ایک بائیک بھی تھی۔

اس نے ایک اجنبی کو بڑی حیرت سے دیکھا تھا۔

''بھائی، میری گاڑی اس راستے پر خراب ہوگئی ہے۔ وہاں سے میں اتنی دور پیدل چلتا ہوا آیا ہوں۔''

''آپ اس علاقے میں نئے معلوم ہوتے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں پہلی بار آیا ہوں۔ اپنے دوست کے پاس۔ نشان علی نام ہے ان کا۔''

''اوہ تو آپ نشان بھائی کے مہمان ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''میں اس کا بہنوئی ہوں۔''

ہم نے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا تھا۔ اس نے اپنا نام سلیم بتایا تھا۔ ذرا سی دیر میں میرے لیے چائے بھی آگئی تھی۔ پھر اس نے ایک آدمی کو میرے ساتھ کردیا۔ جو مجھے نشان علی کے گھر تک لے گیا تھا۔

نشان علی مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ ''یار تم یہاں کیسے؟''

''ظاہر ہے میں تمہیں دیکھنے آیا ہوں۔'' میں نے بتایا۔ ''اب ماشاء اللہ تم صحت مند دکھائی دے رہے ہو۔''

''ہاں یار، ایسا ہی سمجھ لو۔''

میرا ہاتھ تھام کر مجھے اندر مکان میں لے آیا۔ کئی کمروں کا مکان تھا۔ جیسا اس قسم کے گھر ہوا کرتے ہیں۔ ان میں آنگن اور صحن وغیرہ بھی ہوتے ہیں۔ وہ مجھے بیٹھک میں لے آیا تھا۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کس وقت نکلے ہوگے اتنے سویرے یہاں پہنچ گئے؟'' اس نے کہا۔

''میرے بھائی، میں رات کو یہاں پہنچ گیا تھا۔'' میں نے بتایا۔

''تو پھر کہاں رہے رات بھر؟''

میں نے اسے گاڑی کے خراب ہونے اور بارش سے لے کر اب تک کی ساری کہانی سنادی۔ وہ کرسی سے اٹھ کر بے چینی سے ٹہلنے لگا تھا جیسے اس کے بدن میں آگ سی لگ گئی ہو۔

''کیا بات ہے۔ کیا تم اس عورت کو جانتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت اچھی طرح۔'' وہ میرے سامنے آکر بیٹھ گیا۔ ''بہت اچھی طرح جانتا ہوں اس کو۔ اس کا نام سلمٰی ہے اور......''

وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

''اور کیا؟ بتاؤ؟''

''وہ میری محبت ہے۔'' اس نے انکشاف کیا۔ ''میں اسے کبھی بھلا نہیں سکوں گا، کبھی نہیں۔'' وہ رونے لگا تھا۔

میں نے اس کے شانے پر تھپکیاں دیں۔ احساس ہورہا تھا کہ وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ رہا ہے۔ پھر اس نے مجھے سلمٰی کے بارے میں بتایا۔

☆☆☆

''کیا خوب صورت دن تھے جب ہم ایک دوسرے کی محبت میں سرشار تھے۔

ہمارے علاقے میں صرف ایک ہی اسکول ہے۔ ہم ساتھ ہی پڑھتے تھے۔ سلمیٰ مجھ سے دو تین سال چھوٹی ہوگی۔ اس لیے وہ دوسری میں تھی جبکہ میں پانچویں میں تھا۔

ہمارے گھر بھی قریب قریب تھے۔ اسکول سے واپسی میں ساتھ آتے۔ شام کو بھی ہم ساتھ ہی کھیلا کرتے۔ ایک دوسرے کے گھروں میں بھی آنا جانا تھا۔

چھوٹے علاقوں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ سب گھر جیسے اپنے ہی ہوتے ہیں۔ کہیں بھی چلے جاؤ۔ کسی کے یہاں جاؤ کھانا کھاؤ یا سو بھی جاؤ۔ کسی کو اعتراض نہیں ہوتا۔

ہر عورت چاچی، یا ماسی ہوتی ہے۔ اور ہر مرد چاچا، اور ماموں۔ خود سوچ لو کیسے ماحول میں ہماری محبت پروان چڑھ رہی ہوگی۔

ویسے ہم دونوں کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ ہمارے درمیان کچھ نہ کچھ ہے ضرور۔ کوئی تعلق، کوئی رشتہ، کوئی کشش، جو ہمیں ایک دوسرے کی طرف کھینچ رہی ہے۔

ویسے اور بھی بہت سی لڑکیاں تھیں لیکن جس انداز کا کھنچاؤ میں سلمیٰ کے لیے محسوس کرتا تھا۔ ویسا کسی اور کے ساتھ نہیں ہوتا تھا۔ اس کا بھی وہی حال تھا۔ جو میرا تھا۔

اگر کسی دن وہ اسکول نہیں آتی تو میں بے چین ہو کر اس کے گھر پہنچ جاتا۔ مجھے یاد ہے وہ ایک بار اپنے گھر والوں کے ساتھ اپنے کسی رشتے دار کے یہاں گئی ہوئی تھی۔ اس کی واپسی آٹھ دس دنوں کے بعد ہوئی تھی اور یہ آٹھ دس دن میرے لیے قیامت کے تھے۔

اتنی بے چینی تھی کہ میں بتا نہیں سکتا۔ اسکول سے واپس آکر اس کے گھر کے سامنے چکر لگایا کرتا۔ اس نے بھی واپس آکر اپنے بارے میں بتایا۔

”نشان علی، میرا تو وہاں تمہارے بغیر دل ہی نہیں لگ رہا تھا۔“

”اسی لیے تم نے وہاں اتنے دن لگا دیے۔“

”تو کیا کرتی، خالہ زاد بہن کی شادی جو تھی۔ سب کے ساتھ ہی واپس آنا تھا۔ ورنہ میں تو اڑ کر تمہارے پاس آجاتی۔“

تو ایسی محبت تھی ہماری۔ کسی قسم کے خطروں سے بے نیاز۔ ہمارے درمیان کوئی رقیب بھی نہیں تھا اور ایک دوسرے کو حاصل کرنے کی راہ میں کوئی رکاوٹ بھی نہیں تھی۔

پھر یہ ہوا کہ ہم نے ایک ساتھ میٹرک کرلیا۔ اب ہم

اچھے خاصے بڑے ہو چکے تھے۔ لیکن ہماری محبت اسی طرح قائم تھی۔ بلکہ اس میں اور بھی شدت آ گئی تھی۔

تم دیکھ رہے ہو۔ راجن پور ایک چھوٹا سا علاقہ ہے۔ ہم پورے راجن پور میں لیلیٰ مجنوں کے طور پر مشہور ہو گئے تھے۔ کیونکہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ دیکھے جاتے۔

ہمارے گھر والوں نے بھی ایک دوسرے کو بہو اور داماد کے طور پر قبول کر لیا تھا۔ کم از کم وہ ذہنی طور پر تیار تھے۔

پھر یہ ہوا کہ میں تعلیم حاصل کرنے کراچی چلا گیا۔ جہاں میری خالہ رہتی تھیں جبکہ سلمیٰ وہیں راجن پور میں رہ گئی۔ راجن پور میں چونکہ اعلیٰ تعلیم کا انتظام نہیں تھا۔ اس لیے مجھے کراچی آنا پڑا تھا۔ میرے دوست تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ ہم کس طرح ایک دوسرے سے جدا ہوئے ہوں گے۔ ہم نے کس طرح ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا ہو گا۔"

"ہاں یار، مجھے اس کا اندازہ ہے۔" میں نے کہا۔ "تم نے جس انداز سے اپنی محبت کی کہانی سنائی ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہو گیا ہے کہ تم نے ایک دوسرے سے بے پناہ پیار کیا تھا۔"

"ہاں۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "آج کے دور میں ایسی محبت کا تصور احمقانہ لگتا ہے لیکن یہ سچائی ہے۔ تم خود دیکھ لو، کیا کراچی میں کسی سے ملنے کے امکانات نہیں تھے؟"

"کیوں نہیں ہوں گے۔ مجھے یاد ہے دفتر کی نغمہ تم پر بری طرح فریفتہ تھی۔"

اس کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ "ہاں، اور بھی تھیں۔ اس کے باوجود میرے دھیان میں تو صرف سلمیٰ تھی۔"

"کیا کراچی جانے کے بعد تمہارا اس سے رابطہ نہیں ہوتا تھا؟"

"کیوں نہیں ہوتا تھا۔ ہم ایک دوسرے کو خط لکھا کرتے۔ جن میں پیار بھری باتیں ہوتیں۔ اپنی محبت کی شدت کا یقین دلایا جاتا۔ پھر یہ ہوا کہ بہت دنوں سے اس کا کوئی خط نہیں آیا۔ خدا جانے کیا بات تھی۔ میں نے اسے کئی خط روانہ کیے لیکن کسی کا کوئی جواب نہیں آیا۔ بہر حال جب میری بے قراری بہت بڑھ گئی تو میں دفتر سے پندرہ دنوں کی چھٹی لے کر راجن پور آ گیا۔"

"ہاں یاد ہے مجھے۔ تم راجن پور آتے ہوئے کتنا خوش ہو رہے تھے۔" میں نے کہا۔

"یہاں آتے ہی میں نے پہلا سوال اپنے گھر والوں سے یہی کیا تھا۔ سلمیٰ کیسی ہے۔ اس کا کیا حال ہے؟"

"بیٹا۔ وہ بیمار ہے۔" اماں نے بتایا۔

"بیمار ہے لیکن کسی نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟"

اماں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں گھر سے نکل کر سلمیٰ کے گھر کی طرف چل پڑا۔ اگر وہ بیمار تھی تو مجھے کیوں نہیں بتایا گیا اور یہ کیسی بیماری تھی کہ مجھے خط بھی نہیں لکھ سکتی تھی۔

سلمیٰ کے گھر میں اس کے ابا موجود تھے۔ مجھے اچانک دیکھ کر وہ حیران رہ گئے تھے۔ "بیٹا! تم...... تم کب آئے؟"

"آج ہی آیا ہوں چاچا، اماں سے مجھے سلمیٰ کی بیماری کا پتا چلا۔ اس کو دیکھنے چلا آیا ہوں۔"

"بیٹا! تم اس کو دیکھ نہیں سکو گے۔" اس کے ابا نے کہا۔ اس کے لہجے میں بے پناہ اداسی تھی۔

"آخر کیوں، کیوں نہیں دیکھ سکوں گا۔" میں غصے سے بولا۔ "ایسی کون سی مصیبت آ گئی ہے اس پر۔"

"میں نے کہا نا کہ تم اس سے نہیں مل سکتے اور تمہارے لیے یہی بہتر ہو گا کہ تم اس کو بھول جاؤ، چھوڑ دو اس کو۔"

"چاچا، یہ آپ کیسا مشورہ دے رہے ہیں۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ ہم کب سے ایک دوسرے کے ساتھ ہیں۔ ہم کس طرح ایک دوسرے کو......"

"ہاں ہاں سب جانتا ہوں میں۔" اس کے باپ نے میری بات کاٹ دی۔ "لیکن میں پھر یہی کہوں گا کہ تم بھول جاؤ اس کو وہ اب......" وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا تھا۔

"ہاں چاچا بتاؤ، کیا بات ہے۔ تم بولتے بولتے رک کیوں گئے؟" میرا دل دھڑکنے لگا تھا۔

"وہ اب ہمارے قابل نہیں رہی۔" اس کے باپ نے اپنی بات پوری کر دی۔ "بلکہ وہ اب کسی کے بھی قابل نہیں رہی۔ ہم نے اسے گھر سے نکال دیا ہے۔ اس سے ہمارے سارے رشتے ختم ہو چکے ہیں۔ تم بھی اس کو بھول جاؤ تو بہتر ہو گا۔"

یہ سب سن کر میری آنکھوں کے آگے اندھیرے پھیل گئے۔ ہمارے یہاں ایسا اس وقت ہوتا ہے جب کوئی لڑکی بدکردار نکل آئے۔ جب رنگے ہاتھوں اسے پکڑ لیا جائے تو اس وقت ہمارا معاشرہ اسے خود سے الگ کر دیتا ہے۔ گھر والے اس سے اپنے سارے رشتے ختم کر لیتے ہیں۔ تو کیا

سلمٰی بھی ایسی تھی؟

یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ سلمٰی کبھی ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا باپ جھوٹ بول رہا تھا۔ تو پھر ماں کیوں خاموش ہو گئی تھی۔ اس نے صرف اتنا بتایا تھا کہ سلمٰی بیمار ہے۔ اس کے علاوہ اس نے کچھ نہیں بتایا تھا لیکن سلمٰی نے ایسا کیوں کیا؟ کیا اسے میری وفا پر یقین نہیں تھا۔ کیا وہ بے وفا تھی؟

میں بہت ہی اداس اور پریشان سا گھر واپس آ گیا تھا۔ بے شمار سوالات تھے۔ پہلا سوال تو یہی تھا کہ وہ کون تھا جس کی خاطر سلمٰی نے مجھ سے بے وفائی کی تھی۔ دوسرا سوال یہ تھا کہ جب راجن پور والوں نے اسے نکال دیا تھا تو پھر وہ کہاں گئی۔ کیا وہ اس کے ساتھ تھی جس کے لیے اس نے میری محبت کی بھی پروا نہیں کی۔ گھر آیا تو گھر والے کھانے پر انتظار کر رہے تھے۔

''کہاں گیا تھا بیٹا؟'' ماں نے پوچھا۔

''سلمٰی کی طرف۔'' میں نے بتایا۔ ''ماں، مجھے یہ پتا چلا ہے کہ اس کے باپ نے اسے گھر سے نکال دیا ہے۔ وہ بیمار نہیں تھی۔ بلکہ گھر سے نکال دی گئی تھی۔''

''ہاں بیٹا، ایسا ہی ہوا ہے۔'' ماں نے بتایا۔ ''وہ اپنے گھر ہی سے نہیں بلکہ راجن پور سے بھی نکال دی گئی ہے۔''

''لیکن وہ ہے کہاں؟'' میں نے پوچھا۔ ''کم از کم اتنا تو پتا چلے کہ وہ کہاں گئی۔ میں ایک بار اس سے مل کر اتنا تو پوچھ لوں کہ اس نے ایسا کون سا جرم کیا تھا جس کی سزا اسے ملی ہے۔''

اس وقت میرا بڑا بھائی بول پڑا۔ ''نشان علی، بہتر یہی ہے کہ بھول جاؤ اس کو۔ تم کھانے پر دھیان دو۔ دیکھو اماں نے تمہارے لیے کیا کیا بنایا ہے۔''

وہ سب مجھے اس طرح بہلا رہے تھے جیسے کسی ضد کرتے ہوئے بچے کا دھیان کسی اور طرف لگایا جاتا ہے۔ ان سب کو بہت کچھ معلوم تھا۔ یہ بھی جانتے تھے کہ سلمٰی نے جس شخص سے تعلق قائم کیا تھا وہ بھی راجن پور ہی کا رہنے والا تھا لیکن وہ کون ہو سکتا ہے؟ بچپن کے تو ہمارے بہت سے دوست تھے۔

لیکن سلمٰی تو میرے علاوہ کسی سے بات بھی نہیں کرتی تھی۔ تم یقین کرو سوچتے سوچتے میرے دماغ کی رگیں پھٹنے لگیں۔ پھر مجھے ناصر کا خیال آ گیا۔ نہ جانے کیوں۔ وہ پہلے میرے دھیان میں کیوں نہیں آیا تھا۔''

''اور یہ ناصر کون تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''اسی راجن پور کا رہنے والا۔ میٹرک ہم نے ایک ساتھ کیا تھا اب وہ راجن پور میں ایک دکان چلا رہا تھا۔ وہ ایسا بندہ تھا جو مجھے سلمٰی کے بارے میں سب کچھ صاف صاف بتا سکتا تھا۔''

شام کے وقت میں اس کی دکان پر پہنچ گیا۔ مجھے دیکھ کر وہ حیران بھی ہوا تھا۔ لیکن بہت گرم جوشی سے ملا۔ ''یار، بہت دنوں کے بعد چکر لگایا ہے تم نے۔''

''ہاں یار، فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ شہر تو اپنے آپ میں الجھا کر رکھ لیتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''بھائی ناصر، میں تمہارے پاس ایک بہت ضروری کام سے آیا ہوں۔''

''ہاں، ہاں کیوں نہیں۔ چلو بشیر کے ہوٹل کی طرف چلتے ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''وہاں اطمینان سے باتیں ہوں گی۔''

بشیر کا ہوٹل اسی علاقے میں تھا۔ ہم وہیں پہنچ گئے۔

اس نے چائے منگوالی تھی۔ ''ہاں اب بتا کیا ضروری کام ہے۔ ویسے میں کسی حد تک سمجھ رہا ہوں۔''

''دیکھ ناصر، تو میرا دوست ہے۔ خدا کے لیے مجھے اندھیرے میں مت رکھنا۔ جو کچھ بھی ہے۔ صاف صاف بتا دینا۔ میں سب کچھ برداشت کرنے کو تیار ہوں۔ تو مجھے اس آدمی کا نام بتا دے۔ کون ہے وہ؟''

''تو کس کا پوچھ رہا ہے؟''

''وہی، جس کے ساتھ سلمٰی نے منہ کالا کیا تھا؟'' میں نے کہا۔

''کیا تو پاگل ہو گیا ہے۔ سلمٰی کے لیے ایسا سوچنا بھی نہیں۔''

''تو پھر...... پھر کیا ہے یہ سب۔ اسے کیوں گھر سے، خاندان سے الگ کر دیا گیا ہے۔ کیا جرم ہے اس کا؟''

''یار تجھے بتا ہی دوں۔ ورنہ تو پاگل ہو جائے گا۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''سلمٰی کوڑھ کی مریضہ ہو گئی ہے۔''

''کیا؟'' مجھے ایک شاک سا لگا تھا۔ ''یہ کیسے؟ یہ کیسے ممکن ہے؟''

''ہاں میرے دوست، اس بے چاری کے ساتھ ایسا ہی ہوا ہے۔ پہلے اس کی انگلیاں گلنی شروع ہوئیں۔ پھر پیر گلنے لگے۔ ناک بیٹھ گئی۔ یہ سمجھ لے اس کا پورا جسم سڑ گیا۔''

''تو کیا اس کا علاج؟'' میری آواز ڈوبنے لگی تھی۔

''تو جانتا ہے اس موذی بیماری کا کوئی علاج نہیں ہے۔ اس کو کچھ دنوں تک شہر کے ایک اسپتال میں بھی رکھا گیا۔ اس کے بعد اس کو الگ کر دیا گیا۔''

''الگ کر کے کہاں رکھا ہے اس کو؟'' میں نے پوچھا۔

''نسیم کے گھر میں۔''

''نسیم کا گھر راجن پور سے کچھ فاصلے پر ہے۔'' نشان علی نے کہا۔ ''وہی گھر جہاں تم کل رات پناہ کے لیے گئے تھے۔ وہ گھر نسیم نام کے ایک بندے نے بنوایا تھا۔ لیکن اس کو وہاں رہنا نصیب نہیں ہوا۔ کچھ دنوں کے بعد اس کی موت ہو گئی تھی۔ پھر وہ گھر خالی رہا اور اب سلمٰی کو اس گھر میں رکھ دیا گیا ہے۔ اس کو پورے معاشرے، خاندان اور گھر سے کاٹ دیا گیا ہے۔ سیکڑوں برسوں سے یہی ہوتا چلا آیا ہے۔ جو اس مرض میں مبتلا ہو جائے اس کو خود سے الگ کر دیتے ہیں کہ کہیں یہ مرض ان کو بھی نہ ہو جائے۔ اسے اچھوت سمجھا جاتا ہے۔ تو میری سلمٰی اچھوت ہو گئی تھی۔ وہ بے وفا نہیں تھی۔ نہیں تھی بے وفا۔''

''میرے دوست، اب میری سمجھ میں آ گیا کہ اس عورت نے مجھ پر اتنی پابندیاں کیوں لگائی تھیں کہ میں گھر کی کسی چیز کو استعمال نہ کروں۔ ایک کرسی پر بیٹھا رہوں۔''

''ہاں، اور وہ اسی لیے تمہارے سامنے نہیں آئی ہو گی۔ تم اس کو دیکھ کر برداشت نہیں کر سکتے تھے جس طرح میں برداشت نہیں کر سکا تھا۔''

''کیا تم اس سے ملنے گئے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، جب میں نے اس کے بارے میں سن لیا کہ وہ کہاں ہے تو پھر مجھ سے برداشت کہاں ہو سکتا تھا۔ میں اس گھر میں پہنچ گیا۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ بڑی دیر کے بعد اس نے دروازے کے پیچھے سے پوچھا کہ کون ہے۔ میں نے جب اپنا نام بتایا تو رونے لگی۔ کہنے لگی کہ چلے جاؤ۔ میں نہیں مل سکتی۔ میں نے اپنی محبت کا واسطہ دیا۔ اس کو قسمیں دیں۔ تب جا کر اس نے دروازہ کھولا تھا۔ اس کے بعد پھر میں کہاں رہا تھا۔ میں تو ایک چیخ بن گیا تھا۔ خدا کی پناہ۔ وہ کیسی ہو گئی تھی۔ اس نے ایک جھلک دکھلا کر دروازہ بند کر دیا تھا اور کہا تھا کہ میں اس کی یادوں سے محبت کروں۔ کبھی اس سے ملنے کی کوشش نہ کروں تو بہتر ہے میرے پاس اب صرف اس کی یادیں ہیں۔ صرف یادیں۔''

نشان علی اپنی کہانی ختم کر کے رونے لگا تھا۔ میں بھی بوجھل ہو گیا تھا۔ کیسی مجبوری تھی۔ یہ کیسی داستان تھی۔

اسے معلوم تھا کہ اس کی محبت کہاں ہے۔ وہ ہزار خواہش کے باوجود اس سے مل نہیں سکتا تھا۔ اس کو دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے صرف اتنا کیا تھا کہ خود بیمار ہونے کے بعد شہر میں بیٹھا رہا بلکہ راجن پور آ گیا تھا۔ تاکہ کسی حد تک اس کے قریب رہ سکے۔

میں تو دوسرے دن راجن پور سے واپس آ گیا تھا۔ میری گاڑی بنا دی گئی تھی۔ واپسی کے سفر میں اس مکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے تھے۔

کئی مہینوں کے بعد پتا چلا کہ نشان علی کا انتقال ہو گیا ہے۔ اور اس کی خواہش پر اسے اسی مکان کے سامنے دفن کر دیا گیا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ اب سلمٰی بغیر جھجک اس کی قبر پر چلی جاتی ہو۔
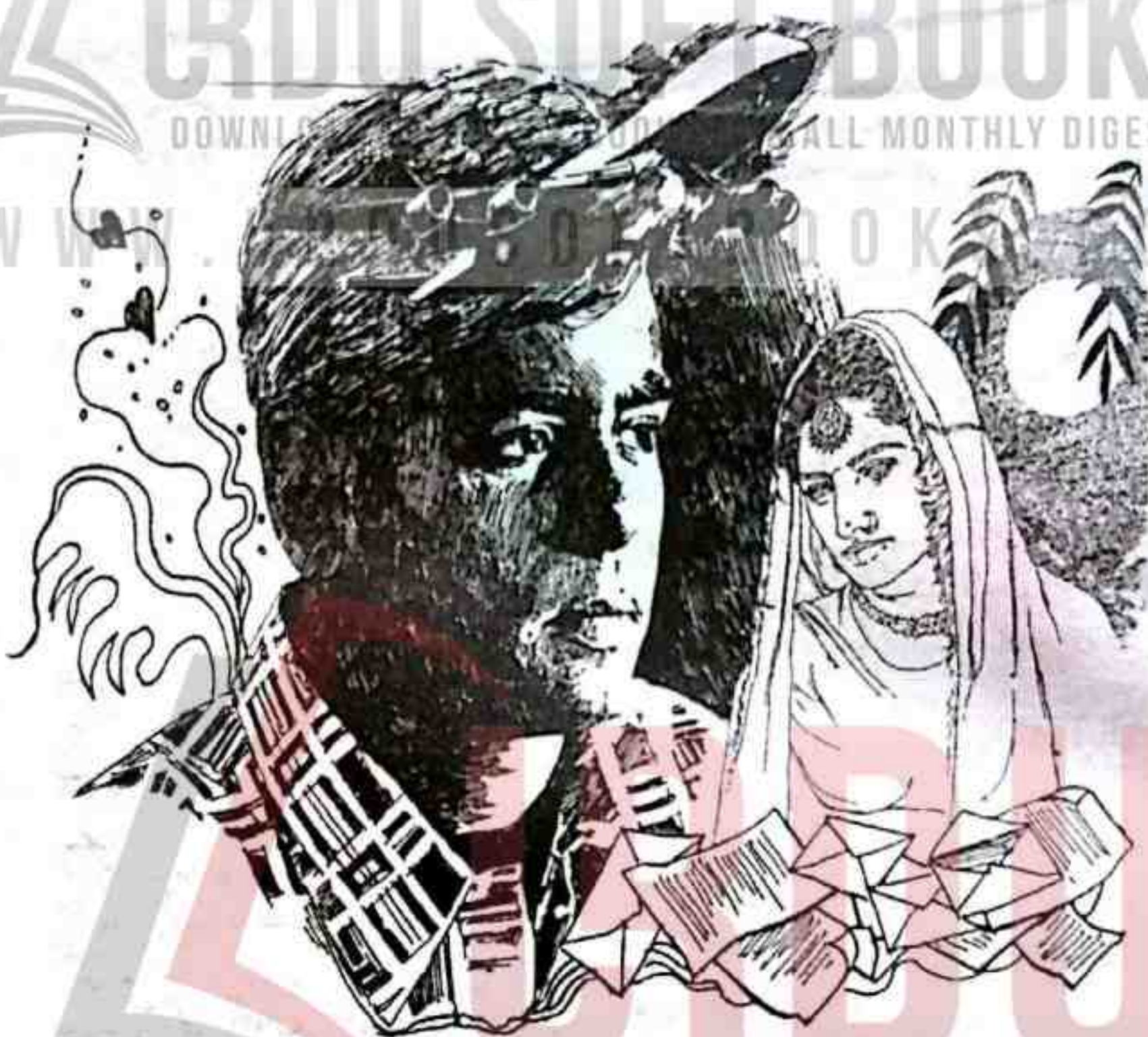
عشق ناکام

محترمہ عذرا رسول

السلام علیکم

لندن میں آپ کے تمام ڈائجسٹ گروسری اسٹورز پر مل جاتے ہیں۔ میں آپ کے چاروں ڈائجسٹ پابندی سے لیتا ہوں۔ دوسروں کی آپ بیتاں پڑھ پڑھ کر مجھے بھی شوق ہوا ہے کہ میں اپنی آپ بیتی لکھوں۔ مختصراً وہ تمام واقعات کہانی کی شکل میں لکھ دیے ہیں۔

ناصر جمال

(لندن یو کے)

میرا نام ناصر ہے۔ ان دنوں میں انگلینڈ میں اپنی بیوی اور چار بچوں کے ساتھ رہتا ہوں۔ مجھے پاکستان چھوڑے پندرہ سال ہو چکے ہیں۔ پاکستان میں میرا تعلق رحیم یار خان سے ہے۔

لیکن کہتے ہیں ناں کہ انسان جہاں چاہے چلا جائے مگر اس کا سایہ ساتھ رہتا ہے۔ پاکستان سے آنے کے بعد محبت میرے ساتھ آگئی تھی۔ لیکن مجسم نہیں، اس کی یاد سمایہ بن کر آئی تھی۔ جب جب میں اکیلا ہوتا اس کی یاد ذہن کے

کینوس پر پھیل جاتی اور تب میں نے اسے ڈھونڈنا ضروری سمجھا کیونکہ انٹرنیٹ کی سہولت نے کسی بھی معروف شخصیت کی تلاش آسان کردی ہے۔ فیس بک، ٹوئٹر اور دوسری سماجی سائٹس پر کوئی اکاؤنٹ بنا لیتا ہے۔ بس اسی نکتے کو ذہن میں رکھ کر میں نے نگہت کو دو سال پہلے گوگل پر تلاش کرنا شروع کیا جب وہ شدت سے یاد آتی تو اسے ڈھونڈنے لگتا اور جب نہ ملتی تو تب مایوس ہو جاتا اور پھر اپنی زندگی کی ہماہمی میں مصروف ہو کر دل بہلانے لگتا۔

معلوم نہیں میں اسے دوبارہ کیوں تلاش کر رہا تھا۔ کبھی اسے خیالوں میں پا کر اداس ہو جاتا اور کبھی مسکرانے لگتا۔ مجھے وہ کبھی بھولی نہ تھی۔ اس کی یادوں کو میں نے ختم ہونے نہ دیا تھا۔ اس کی یاد کی ایک چنگاری میں نے اپنے دل میں چھپا رکھی تھی۔ وہ چنگاری مجھے خاکستر نہ کرتی تھی بلکہ یادوں کے گھپ اندھیرے میں کوئی اجالا کیے رہتی۔

پہلے یہ بتادوں کہ نگہت کون تھی۔ نگہت وہ لڑکی تھی جس کو دیکھے بغیر میں اس کے پیار میں گرفتار ہوا تھا اس کا نام اور تذکرہ ایک بار سنا تو وہ مجھے مانوس سی لگنے لگی تھی۔ وہ شکل کی کیسی ہے، وہ کس طرح کی باتیں کرتی ہے اور اس کے خیالات کیسے ہیں؟ مجھے ان سوالوں سے کوئی غرض نہ تھی۔ ایک دوبار اس کا تذکرہ سنا تو اسی کا ہو کر رہ گیا۔ عجیب سا قصہ تھا جسے صرف میری طرح پیار کرنے والا دل ہی سمجھ سکتا تھا۔

میں نے اس کا ایک تصوراتی خاکہ بنا رکھا تھا۔ اس خاکے کو ہر وقت ذہن میں رکھے، اسے چاہنے لگا تھا۔

میرا بھائی پنجاب یونیورسٹی میں پڑھتا تھا ان دنوں اس کا ایک دوست فاروق اس سے ملنے آیا کرتا تھا۔ اس بار وہ آیا تو اس نے بتایا کہ چند ماہ پہلے اس نے شادی کر لی ہے۔

اس نے اپنی بیوی ڈاکٹر زاہدہ کی تصویر دکھائی۔ وہ شکل وصورت کی اچھی تھی اور فاطمہ جناح میڈیکل کالج میں فائنل ایئر میں پڑھ رہی تھی۔

فاروق سے ملنا جلنا بڑھا تو اس کی ذات کی بہت سی خوبیاں سامنے آئیں۔ وہ اکثر میرے ساتھ ہوتا یا پھر اپنی کمپنی کے دوستوں کے ہمراہ ہوتا تھا۔ گھر وہ صرف اس وقت جاتا جب وہ دوستوں کی محفلوں سے تھک جاتا یا اس کے دوست تھک جاتے۔

میں ابھی تک اس کی بیوی زاہدہ بھابی سے نہیں ملا تھا۔

ایک شام اس نے مجھے کہا۔ ”میرے گھر چلو، رات کا کھانا وہیں کھائیں گے۔“

میں نے سوچا کہ اسی بہانے زاہدہ بھابی سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ انہیں شادی کی مبارک باد بھی دے دوں گا۔

میں اس کے ہمراہ ماڈل ٹاؤن میں اس کے گھر چلا آیا۔ جو انہوں نے کرائے پر لیا ہوا تھا۔ گرمیوں کے دن تھے اور ہم باہر ٹیرس پر آبیٹھے۔ پھر وہ یہ کہہ کر اندر گیا کہ تمہاری بھابی سے کھانے کا بول کر ابھی آیا اور پھر واپس آکر اپنی ٹانگیں میز پر رکھے اپنے قصے سنانے لگا۔ پھر کچھ دیر بعد دوبارہ اندر گیا اور ٹرے میں سالن اور کپڑے میں لپٹی روٹیاں لے آیا۔

ہم دونوں نے ابھی کھانا شروع کیا ہی تھا کہ فاروق نے آواز دی۔ ”زاہدہ یار پردہ کیسا باہر آجاؤ۔“ زاہدہ بھابی باہر آئیں تو چہرے سے لگا جیسے وہ رو رہی ہوں۔

ان کا ستا ہوا چہرہ دیکھ کر میں گھبرا گیا۔ فاروق کا چہرہ بھی سرخ ہو گیا تھا لیکن وہ خاموش تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”بھابی ایسا کیا ہو گیا؟“

زاہدہ بھابی نے بتایا۔ ”یہ صبح سے نکلا ابھی گھر آیا اور مجھے نوکروں کی طرح حکم دیا کہ جلدی سے ہمارے لیے کھانا تیار کرو۔“

پھر کہنے لگیں۔ ”پورا دن میں گھر میں اکیلی ہوتی ہوں اور یہ گھر سے باہر دوستوں کے ساتھ گھومتے رہتے ہیں۔“ اس طرح کے اور کچھ شکوے کر کے وہ زیادہ رونے لگیں۔

میں اب حیران و پریشان بیٹھا یہ سمجھنے کی کوشش کرتا تھا کہ میں تو زاہدہ بھابی کے لیے اجنبی ہوں اور یہ میرا نام جانے بغیر ہی مجھ سے اپنے شوہر کے گلے کیوں کر رہی ہیں؟ میں یہ بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ فاروق شادی کے صرف چار ماہ بعد ہی انہیں کیوں نظر انداز کر رہا ہے۔ بمشکل انہیں چپ کرایا اور بعد میں جو باتیں زاہدہ بھابی نے مجھے سنائیں تو مجھے فاروق کی زیادہ غلطیاں محسوس ہوئیں۔ میں نے وہیں زاہدہ بھابی سے وعدہ کیا کہ آج سے میں آپ کا بھائی ہوں اور فاروق سے کوئی بھی شکایت ہو تو مجھے بتائیں۔

زاہدہ بھابی نے نم آنکھوں سے میرا شکریہ ادا کیا اور اندر چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد بھی میں سکتے میں

تھا مگر فاروق ہنس ہنس کر کھانا کھا رہا تھا۔

اس کے بعد میں اسی کوشش میں رہتا کہ فاروق وقت پر گھر چلا جائے، دوسرے دوستوں میں رات دیر تک نہ بیٹھا رہے۔ زاہدہ بھابی کی جب وہ شکایت کرتا تو میں اس کو بغیر سنے زاہدہ بھابی کی طرف داری کرنے لگتا۔ اس پر فاروق اکثر کہتا کہ تم تو میری ساس کا کردار ادا کر رہے ہو۔

ایک بار وہ بتانے لگا۔ ”زاہدہ کی چھوٹی بہن لیاقت میڈیکل کالج جام شورو میں سیکنڈ ایئر میں پڑھتی ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”کیا وہ بھی بھابی کی طرح معصوم اور سیدھی سادی ہے؟“

”نہیں یار! وہ بہت عقلمند اور ذہین ہے۔“

نام پوچھا تو بولا۔ ”نگہت نام ہے اس کا۔“

معلوم نہیں کیوں میں نگہت کے بارے میں سوچنے لگا شاید اس لیے کہ زاہدہ بھابی مجھے بہت معصوم لگتی تھیں اور میں نے سوچ رکھا تھا کہ جب بھی میں شادی کروں گا تو کسی ایسی لڑکی سے کروں گا جو فطرتاً معصوم ہو۔

جب بھابی فائنل ایئر کے امتحان دینے والی تھیں تو ان کے ہاں ایک بیٹا ہوا۔ اسی دوران فاروق کی جاب کراچی کی ایک کمپنی میں ہو گئی اور وہ لوگ کراچی شفٹ ہو گئے جہاں فاروق کا اپنا گھر تھا۔ زاہدہ بھابی کے والدین بھی کراچی میں رہتے تھے۔

انہی دنوں بھائی کو ڈگری مل گئی اور جاب کے لیے وہ پنڈی چلا گیا۔ گھر میں اب میں اکیلا رہ گیا تھا۔ کبھی خود کھانا بناتا اور کبھی باہر کسی ہوٹل سے کھا لیتا۔ ایک کمرا سوائے ایک چارپائی کے خالی پڑا تھا۔ دوسرے کمرے میں میرا بیڈ تھا۔ ایک لوہے کی الماری تھی جس میں میرے کپڑوں کے علاوہ کچھ کتابیں اور فیشن میگزین رکھے تھے۔

ایک دن فاروق کا خط آیا۔ لکھا تھا کہ بچے کی ولادت پر زاہدہ کے جو دو پیپرز فائنل ایئر کے رہ گئے تھے، وہ دینے ہم لاہور آ رہے ہیں اور ساتھ نگہت بھی ہے جو بچے کا خیال رکھے گی۔ انہیں میرے گھر میں رہنا تھا۔ نگہت کے ساتھ آنے کی خبر پر میں بہت زیادہ خوش تھا۔ پہلے تو اس کا صرف نام سنا تھا اور اب اسے دیکھنے کا موقع بھی مل رہا تھا۔

اتفاق سے جس دن انہیں لاہور پہنچنا تھا اس سے ایک دن پہلے بھائی کا فون آ گیا کہ انہیں چند کاغذات کی فوری ضرورت ہے۔ وہ کاغذات انہیں فوراً پنڈی پہنچا دوں۔ میں نے فاروق کو فون کیا کہ آپ کو میں گھر کی چابیاں ریلوے اسٹیشن پر دے کر وہیں سے پنڈی نکل جاؤں گا اور میری واپسی تین دن بعد ہو گی۔

میں خواب دیکھنے کی عمر سے گزر رہا تھا، اس لیے تصور میں نگہت کے خاکے بناتا اور پھر سوچتا کہ وہ ملے گی تو کیا کہوں گا؟

گرمیوں کے دن تھے۔ میں نے پنڈی جانے کے لیے اپنا بیگ تیار کیا اور چابیاں لے کر ریلوے اسٹیشن کے لیے نکل پڑا۔ ایک دوست اپنی بائیک پر مجھے ریلوے اسٹیشن لے گیا۔ وہ باہر کھڑا رہا اور میں اندر ویٹنگ روم کی جانب بڑھ گیا۔

گرمی میں وہ شدت نہ تھی جو ان مہینوں میں لاہور میں ہوتی ہے مگر میں پسینے میں شرابور تھا اور اس پسینے نے مجھے ایک قابل اسٹوڈنٹ کی بجائے فقیر سا بنا دیا تھا۔ میں ویٹنگ روم میں دھڑکتے دل سے داخل ہوا تو وہ تینوں سامنے بیٹھے تھے۔ زاہدہ بھابی نے اپنے کورس کی کوئی کتاب کھولی ہوئی تھی اور فاروق سب سے بے پروا اپنی سوچوں میں گم تھا۔ نگہت نے بچے کو اپنی گود میں اٹھا رکھا تھا گویا ایک روشن چہرہ اپنی معصومیت لیے بیٹھا اپنی نظریں بچے پر رکھے ہوئے تھا..... اس نازک سی لڑکی نے میرے آنے اور سلام کرنے پر بھی میری جانب توجہ نہ دی۔ میں نے فاروق کو گھر کی چابیاں دیں تو اس نے نگہت سے میرا تعارف کروایا۔ ”وہ یہ میرا دوست ناصر ہے۔“

دو آنکھیں میری جانب ایک لمحے کو اٹھیں اور پھر بے پروائی میں دوبارہ سے بچے پر جھک گئیں۔ اس ایک نظر نے مجھ پر جادو سا کر دیا۔ میں فنا ہو چکا تھا۔ سفید رنگت میں کٹی نگہت میرے دل میں ایک سنسناتے ہوئے تیر کی مانند پیوست ہو گئی یا ایک تلوار اتنی چمک کوندی اور میں وہیں کھڑا کھڑا ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ میں اب خوف سے اس کی جانب دیکھ بھی نہ رہا تھا کہ کہیں دوبارہ سے بھسم نہ ہو جاؤں۔

میں نے سلام کیا اور تین دن بعد آنے کا کہہ کر تیزی سے باہر نکل گیا۔

دوست نے مجھے پنڈی کی بس پر بٹھایا اور میں خواب لیے بس کی رفتار سے بھی زیادہ تیزی سے اپنے پیار کو رنگوں سے سجاتا چلا گیا۔

پنڈی پہنچا تو بھائی کو ان کے کاغذات دیے۔ دل شدت سے چاہ رہا تھا کہ ابھی واپس ہو جاؤں۔ واپس جانے کا قصد کیا تو بھائی نے کہا۔ ”رات رک جاؤ کل چلے

جانا۔" پوری رات کل کے انتظار میں کاٹی۔ بار بار ذہن میں وہی جھکا چہرہ ابھرتا۔ اپنی جانب اٹھتی نظریں چاروں جانب مجھے دکھائی دیتیں۔ وہ نظریں جو ایک بار میری جانب اٹھ کر دوبارہ انجان بن گئی تھیں، میں انہیں اپنی تقدیر بنا چکا تھا۔

صبح ہوئی تو جلدی سے میں نے ناشتا کیا۔ بھائی مجھ سے مل کر جاب پر جا چکے تھے میں بس اسٹیشن کی جانب اس طرح آیا جیسے کمان سے نکلا تیر۔

بس کا سفر خواب بنتے کٹ گیا۔ لاہور پہنچا تو موسم کل کی طرح مہربان تھا۔ ہوا چل رہی تھی۔

بس اڈے پر اترا اور رکشا لے کر سیدھا گھر گیا۔ بیل بجائی تو فاروق نے دروازہ کھولا۔ مجھے دیکھ کر حیران ہوا اور بولا۔ "تم نے تو دو دن بعد آنا تھا۔ جلدی کیسے آ گئے؟"

میں نے بہانا بنایا کہ کسی چیز کی آپ لوگوں کو ضرورت نہ ہو۔

فاروق نے میری آنکھوں میں غور سے جھانکا تو اپنا جھوٹ چھپانے کے لیے میں نے نظریں نیچی کر لیں۔

میں اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہوا تو نگہت میرے بیڈ پر تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی اور ہاتھوں میں وہی فیشن میگزین تھے جو الماری میں رکھے تھے۔ زاہدہ بھابی اپنے بچے کو ساتھ [illegible] نیچے گدے پر بیٹھیں اپنی کورس کی کتاب پڑھ رہی تھیں۔ نگہت نے ایک بار پھر میری جانب دیکھا، سلام کیا، نظریں جھکائیں اور پھر سمٹ گئی۔ زاہدہ بھابی نے اپنا دوپٹا درست کیا اور میری خیریت دریافت کی۔

میں اپنے گھر میں اجنبی بنا کھڑا تھا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا بات کروں۔ میں شرم سے نگہت کی جانب دیکھ بھی نہیں پا رہا تھا۔ فاروق کے کہنے پر میں بھی نیچے بیٹھ گیا۔ دوپہر کے کھانے کا میں نے پوچھا تو وہ باہر ہوٹل سے کچھ لا کر پہلے ہی کھا چکے تھے۔ مجھ سے پتا نہیں کس نے پوچھا۔ "آپ نے کھانا کھایا۔"

بھوکا ہونے کے باوجود میں نے کہا کہ میں کھا کر آیا ہوں۔ فاروق اور بھابی شاید میری جانب دیکھ رہی تھیں اور میں شرم سے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ میں یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا کہ میں کچھ دیر آرام کر لوں۔

دوسرے کمرے کی جانب جاتے جاتے میں نے چور نظروں سے نگہت کی جانب دیکھا جو میگزین کے صفحے پلٹ رہی تھی۔ میری چوری رنگے ہاتھوں پکڑی گئی۔ میں نے گھبرا کر چال تیز کر دی اور میں دوڑنے کی حد تک تیز چال سے باہر نکلا اور دوسرے کمرے میں پڑی چارپائی پر آ کر ڈھیر ہو گیا۔

نظروں کی تپش لڑکیاں فوراً محسوس کر لیتی ہیں۔ ادھر میری نظریں اٹھیں، ادھر اس نے بھی نگاہیں اٹھا دیں۔ نظروں کے اس تصادم نے مجھے شرمانے پر مجبور کر دیا۔ اس وقت میری حالت دیدنی تھی۔

میں بے مقصد پڑا رہا۔ ان کے پاس جاتے ہوئے بھی گھبرا رہا تھا۔ میں ایسا تاثر بھی نہیں دینا چاہتا تھا کہ میں نگہت کے لیے اس کمرے کا چکر لگا رہا ہوں۔ جاتا بھی تو اپنی ازلی شرم نے مجھے گھیر لیا تھا اس لیے اداس لیٹا چھت کو خالی نظروں سے تکتا رہا تھا۔

کافی وقت گزر چکا تھا کہ فاروق نے کمرے میں جھانکا۔ مجھے دروازے کی طرف دیکھتے پا کر اس نے کہا۔ "اب اٹھ بھی جاؤ۔ رات کے کھانے کا انتظام کرنا ہے۔"

میں نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھ گیا اور اس کے ساتھ جا کر بازار سے کھانا لے آیا۔ ساتھ میں صبح ناشتے کا سامان بھی لے لیا۔ کھانے کا شاپر بھابی کے ہاتھ میں دے کر میں کمرے میں آیا اور اپنی چارپائی باہر صحن میں لے آیا۔

فاروق میرے ساتھ چارپائی پر بیٹھ کر اپنی سنانے لگا۔ میری نظریں بار بار کچن کی کھڑکی کی جانب اٹھ رہی تھیں جہاں سے نگہت ٹرے میں کھانا لگاتی مجھے نظر آ رہی تھی۔ وہ میری جانب سے مکمل انجان تھی۔ ایک بار بھی اس نے میری طرف نہ دیکھا تھا پھر بھی مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے گھر میں چاندنی اتر آئی ہے۔ در و دیوار سے مسرتیں پھوٹ رہی تھیں۔

نگہت میرے اور فاروق کے لیے وہیں کھانا لے آئی اور پھر واپس چلی گئی۔

ہم کھانا کھا چکے تو فاروق نے نگہت کو بلایا۔ وہ خاموشی سے آئی، ٹرے اٹھائی اور واپس کمرے میں چلی گئی۔ اپنے وقار کو ملحوظ رکھتے ہوئے میں نے گھر میں بیٹھنا گوارا نہ کیا۔ دوستوں سے ملنے کا بہانہ کر کے باہر نکل آیا۔ بہت دیر تک بلا مقصد سڑکوں پر گھومتا رہا۔

کافی دیر بعد گھر لوٹا تو وہ سب سو چکے تھے۔ میں صحن میں بچھی چارپائی پر لیٹ کر اس کے بارے میں سوچنے لگا پھر نہ جانے کب نیند کی وادی میں اتر گیا۔

صبح اٹھا تو پتا چلا زاہدہ بھابی پیپر دینے جا چکی ہے۔

نگہت نے مجھے اور فاروق کو چائے بنا کر دی اور پھر میں یونیورسٹی جانے کا کہہ کر گھر سے نکل آیا۔ یونیورسٹی گیا ضرور مگر کوئی کلاس لینے کا دل نہ کیا۔ بلا مقصد ادھر ادھر بھٹکتا رہا اور شام سے پہلے گھر لوٹ آیا۔

گھر میں وہی ماحول تھا۔ نگہت کمرے میں بند، بچے کو سنبھالے بیٹھی تھی۔ فاروق کہیں گیا ہوا تھا۔ نگہت میرے لیے چائے بنا لائی۔

اس کی جھجک اب پہلے سے کم ہو چکی تھی۔ اسے شاید میری شرافت پر اعتبار آ چکا تھا یا میں یہی سمجھ رہا تھا۔ میرے ہاتھوں میں چائے کا کپ تھما کر وہ مڑی تھی کہ میں نے کہا۔ ”شکریہ!“

اس نے پلٹ کر پہلی بار میری جانب کچھ ٹھہری نظروں سے دیکھا۔ اس کا اس طرح سے دیکھنا مجھے معراج پر پہنچا گیا۔ میں نے پوچھا۔ ”آپ بور تو نہیں ہوئیں؟“

”میں تو آپ کے میگزین کل سے پڑھ رہی ہوں۔ بور تو نہیں ہوئی بلکہ۔“

اب میں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا کہ وہ کچھ ہچکچا کر بولی۔ ”یہ فیشن میگزین آپ نے کیوں جمع کیے ہوئے ہیں۔ یہ تو لڑکیوں کے دیکھنے کے لیے ہوتے ہیں۔“ میرے پاس اس سوال کا نہ کوئی جواب تھا اور نہ میگزینز کے اپنے پاس رکھنے کا جواز تھا۔ میں سر جھکا کر خاموش ہو رہا۔

دوسرا دن بھی میرا ایسے ہی گزرا جیسے آج کا دن گزرا تھا۔ ہم میں کوئی بات نہ ہوئی۔ وہ ایک دو بار کچن کی جانب جانے کے لیے میرے سامنے سے گزری مگر میں نظریں نہ اٹھا سکا۔ زاہدہ بھابی نے ایک بار مجھ سے پوچھا۔ ”آپ اتنے شرمیلے کیوں ہیں؟ لڑکے تو بہت تیز طرار ہوتے ہیں۔“

میں سر جھکائے بیٹھا رہا کیونکہ اس سوال کا جواب میرے پاس نہ تھا۔ بھابی کہنے لگی۔ ”کل میرا آخری پیپر ہے اور دو تین دن بعد پریکٹیکل ہوگا۔“

فاروق ساتھ بیٹھا تھا۔ اس نے بتایا کہ کل نگہت کی سالگرہ بھی ہے۔

یہ سن کر نگہت بھی اتنی خوش نہ ہوئی ہوگی جتنا میں ہوا۔ میں نے کہا۔ ”کل میں اس خوشی میں آپ لوگوں کو باہر کسی ہوٹل میں دعوت دینا چاہتا ہوں۔“

زاہدہ بھابی کہنے لگیں۔ ”ہم پہلے ہی آپ کے گھر مہمان بنے ہوئے ہیں۔ آپ یہ زحمت نہ کریں۔“

میں بولا۔ ”آپ لوگوں کے لیے تو میں نے کچھ نہیں کیا۔ کھانا آپ کی بہن بنا دیتی ہے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ میں آپ لوگوں کا مہمان ہوں۔“ یہ کہہ کر کل شام کی دعوت میں نے پکی کر دی۔

وہ دن میرے لیے اتنی خوشیاں لے آیا کہ مجھ سے سنبھالے نہیں سنبھلتی تھیں۔ میں پورا دن یونیورسٹی میں آوارہ پھرتا رہا۔ دوستوں سے بات بھی نہ کی۔ کلاس میں بیٹھنے کا تو سوال ہی نہ تھا۔ میں نے آوارہ گردی میں دن گزارا اور شام سے پہلے مہ خانے پہنچ گیا۔ اپنا گھر مجھے مہ خانہ لگنے لگا تھا نگہت کی دید مجھ پر نشہ سا طاری کر دیتی تھی۔

بھابی والے کمرے کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ بھٹکتی ہوئی پیاسی نظروں نے نگہت کو دیکھ لیا۔ اس نے میرون رنگ کا سوٹ پہنا ہوا تھا اور شیشے کے سامنے کھڑی اپنے کانوں میں جھمکے پہن رہی تھی۔ چمکتی رنگت پر وہ کپڑے خوب جچ رہے تھے۔ میں اسے دیکھ کر وہیں بت بنا کھڑا رہ گیا۔ ایسا لگا جیسے میں اپنے ہوش و حواس کھو چکا ہوں۔ لڑکی تھی اسی لیے میری نظروں میں چھپی چاہت کو پہچان گئی اور حیران نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ اسے کیا معلوم تھا جسے وہ اپنے راستے پر چلنے والا کوئی اجنبی سمجھتی ہے، وہ اسے پیار میں ڈوب کر دیکھتا ہے۔ میرے اس طرح دیکھنے پر وہ بوکھلا سی گئی اور پھر اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور یہ کہہ کر کمرے میں چلی گئی۔ ”میری سالگرہ پر آپ کی دعوت کا پیشگی شکریہ۔“

میں اپنی جگہ کھڑا تھا۔ لگن کی قوت نے مجھے جکڑ لیا تھا۔ چاہتوں کا لبالب بھرا پیالہ اپنے کناروں سے چھلکنے لگا اور میری آنکھیں نم ہو گئیں۔

میں اس کی چاہت کا بھکاری تو تھا مگر میں بھکاری لگنا نہیں چاہتا تھا۔ اسی لیے اس دن میں نے اچھا لباس زیب تن کیا۔ اس کی نظروں کی ایک جھلک نے مجھے جو خود اعتمادی بخشی تھی، اسی خود اعتمادی کی چادر میں نے اوڑھ لی اور سب کے ساتھ گھر سے باہر نکل گیا۔ ہم ایک چائنیز ریسٹورنٹ میں آئے۔ ویٹر کھانے کا مینو لے کر آیا تو میں نے کہا۔ ”جو آپ لوگ آرڈر دیں گے، وہ مجھے بھی پسند ہوگا۔“

نگہت نے میری جانب شوخ نظروں سے دیکھا۔ تبھی فاروق بولا۔ ”آج جس کی سالگرہ ہے، وہی آرڈر دے گی۔“

نگہت نے اپنی پسند کی ڈشیں آرڈر کیں۔ میں اب

فاروق سے باتیں کر رہا تھا مگر چور نظریں نگہت کا رہ رہ کر طواف کر لیتیں۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ نگہت بھی میری جانب چوری چوری دیکھ رہی ہے مگر میں جب اس کی نظروں کو بھانپ کر اسے دیکھتا تو وہ اپنی نظریں جھکا دیتی تھی۔ بھی بھابی کی گود میں سویا بچہ بری طرح رونے لگا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ کوئی ٹین کے ڈبے میں پتھر ڈالے اسے زور زور سے بجا رہا ہے۔ نگہت بھی.... اس کے رونے سے خجل ہو کر لاچارگی سے بولی۔ ''اس بچے نے سارے ماحول کا ستیاناس کر دیا ہے۔''

اس کی یہ کیفیت مجھے اشارہ کر گئی کہ اس کے اندر بھی میرے لیے ایک چنگاری بھڑک اٹھی ہے۔ میرا یہ گمان بھی ایک طرح سے میری منزل تھی یا منزل کی جانب جانے کا راستہ یہیں سے شروع ہوتا تھا۔

ہم ڈنر کر کے ریسٹورنٹ سے باہر آئے تو خلاف توقع ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ہم سب پیدل ہی گھر کی جانب چل پڑے۔ فاروق اور میں پیچھے تھے اور وہ دونوں آگے تھیں۔ میری نظریں ٹھہر ٹھہر کر اس کے دودھ میں دھلے مرمریں ہاتھ دیکھتیں اور کبھی اس کا چاندنی میں نہایا تاباں چہرہ دیکھتا۔ فاروق کا روتا بچہ اب خاموش ہو چکا تھا فضا میں آسودگی اور رحم اتر آیا تھا۔ ہم سب خاموش تھے۔

ہم اپنے محلے میں پہنچ چکے تھے۔ میرے گھر کے قریب کولڈ ڈرنک کی دکان تھی اس کے باہر پڑی کرسیاں خالی تھیں۔ بھابی فاروق سے بولیں۔ ''یہاں بیٹھ کر کیا ہم کولڈ ڈرنک پی سکتے ہیں؟''

ہمیشہ کی طرح فاروق کا جواب اثبات میں تھا۔ ٹیبل کے آمنے سامنے دو دو کرسیاں رکھی تھیں، دو کرسیوں پر فاروق اور بھابی بیٹھ گئیں۔ دوسرے ٹیبل کی کرسیوں پر ہم اور نگہت بیٹھ چکے تھے۔ فاروق نے سیون اپ کا آرڈر دیا تو بھابی نے بھی اپنے لیے سیون اپ کا کہا۔ میں نے کوک کا آرڈر دیا تو نگہت نے بھی اپنے لیے کوک منگوائی۔ اس پر بھابی کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔ ''میری اور فاروق کی پسند ایک ہے۔'' پھر ہم دونوں کی جانب دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ان دونوں کی پسند بھی ایک ہے۔''

یہ سن کر ایک لمحے کو میں سناٹے میں آ گیا مگر دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ نگہت کی جانب دیکھا تو وہ مجھے ہی دیکھ رہی تھی، اس کی آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں۔ میں نے تصور میں نگہت کو اپنا بنایا کہ بھابی نے مہر ثبت کر دی۔ وہ لمحہ جب اس نے مسکراتی شوخ آنکھوں سے مجھے دیکھا تھا، وہ سالوں گزرنے کے بعد بھی میں نہیں بھول پایا ہوں۔

بھابی پوچھنے لگیں۔ ''ماسٹر کرنے کے بعد کیا ارادہ ہے؟''

''میں بہاولپور یونیورسٹی سے ایم فل کرنا چاہتا ہوں۔''

میرے ارادوں کو نگہت بھی بغور سن رہی تھی۔ اس چاندنی رات میں پاس بیٹھی نگہت کی قربت میری گزری زندگی کے تمام لمحوں پر حاوی ہو چکی تھی۔ اس کا چہرہ ایسے دمکتا تھا کہ جیسے نور کا ایک ہالہ اس کے چہرے کو گھیرے ہوئے ہے۔

دوسرے دن میں یونیورسٹی سے گھر پہنچا تو نگہت کچن میں کھڑی پورے انہماک سے کچھ بنا رہی تھی۔ مجھے ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے ہی گھر میں کھڑی میرے لیے کھانا تیار کر رہی ہے۔ بھابی کمرے میں کل کے پریکٹیکل کی تیاری کر رہی تھی۔ فاروق بچے کو لے کر باہر گیا ہوا تھا۔ میں کچن کی کھڑکی کے پاس آ کھڑا ہوا۔ کھڑکی میں لوہے کی سلاخیں لگی تھیں۔ میں سلاخوں کے پار تھا یا وہ سلاخوں کے پیچھے تھی۔ میں آج ہمت کر کے اس سے اپنے دل کی بات کرنا چاہتا تھا کیونکہ کل اسے میرے گھر کو ویرانیوں میں ڈال کر واپس کراچی چلے جانا تھا۔

میں نے اپنی پوری توانائی اور خود اعتمادی کو جمع کر کے پوچھا۔ ''اگر آپ کو ہمیشہ کے لیے اس گھر میں رہنا پڑے تو کیا آپ رہنا چاہیں گی؟''

میرا بے تکلف اظہارِ محبت سن کر وہ ایک لمحے کو گڑبڑا گئی۔ اس کے چہرے پر سرخی آئی اور چلتے ہاتھ تھم گئے۔ مجھے ایک نظر بھر کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں چاہت کے سائے تھے۔ وہ کچھ لمحے انہی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی اور پھر بولی۔ ''میں تو کچھ کہہ نہیں سکتی۔'' مگر اس کے لہجے اور آنکھوں کی چمک کو میں سمجھ چکا تھا۔ مجھے یہی جواب چاہیے تھا۔ میرا اتنی بات کرنا بھی میری یادوں کو بسانے کے لیے بہت تھا۔ مجھے اس سے نہیں، اس کی روح سے محبت ہو گئی تھی۔ اسے کل چلے جانا تھا اور پھر اس سے ملاقات ہو یا نہ ہو، مجھے اس سے غرض نہیں تھی، اس کا میری جانب پیار سے دیکھنا ہی میری منزل تھی۔

دوسرے دن وہ سب شام کی ٹرین سے واپس چلے گئے۔ میں اجڑ گیا۔ میرا گھر کھنڈر نما بن گیا۔ میرے پاؤں

تکیے کی زمین بنجر ہوگئی۔

میں پھر سے ملنگ بن گیا۔ بڑ مردہ افسردہ رہنے لگا۔ میری دنیا سونی ہو چکی تھی۔ اداسی میرا پیرہن بن گئی تھی۔ مجھے سنبھلتے سنبھلتے ہفتوں لگے۔ میں نے اس کی یادوں کو اپنے اندر بسا لیا تھا۔ وہ رات کو میرے بیڈ پر سوئی تھی میں اسی بستر پر پڑا رہتا۔ تکیے کو اپنے سینے سے لپٹائے اس کی خوشبو سونگھتا۔ میں نے اپنے رات دن اس کی یادوں سے سجا رکھے تھے۔

ایک سال گزر گیا۔ میری ڈگری مکمل ہوئی اور میں نے بہاولپور یونیورسٹی میں ایم۔فل کے لیے داخلہ لے لیا۔ فاروق سے بھی کبھار فون پر بات ہوتی۔ میں نگہت کے بارے کچھ پوچھنے سے کتراتا تھا مگر ایک ہمت جمع کر کے کہہ دیا۔ ''تو کیسا دوست ہے جو میرا رشتہ نگہت سے نہیں کروا سکتا۔'' مگر اس نے میری بات کو ہنسی میں اڑا دیا۔

مجھے فیکلٹی والوں نے ریسرچ کے لیے دو ماہ کی ٹریننگ پر کراچی بھیجا۔ میں بہت خوش تھا کہ اسی بہانے شاید نگہت سے ملاقات ہو جائے گی۔ ہمیں وہاں ایک گورنمنٹ کے ہاسٹل میں ٹھہرایا گیا۔ فاروق کو میں نے اپنے آنے کی اطلاع کر دی تھی۔ لیبارٹری کی وین ہر روز صبح مجھے اور دوسرے فیلوز کو ہاسٹل سے لے کر لیب پہنچاتی۔ کراچی میں میرا ایک اور دوست تھا اس نے اپنی بائیک مجھے دے دی تھی کہ کہیں آنے جانے میں دشواری نہ ہو۔ فاروق ناظم آباد میں رہتا تھا۔ وہ ایک ٹیکسٹائل مل میں انجینئر تھا زاہدہ بھابی نے کلینک کھول لیا تھا۔ میں اپنے پہلے ویک اینڈ پر ان کے گھر گیا۔ میری بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ نگہت سی ویو کے آس پاس اپنے والدین کے ساتھ رہتی تھی۔ مگر ان دنوں وہ لیاقت میڈیکل کالج جامشورو میں اپنے چوتھے سال میں تھی۔ مجھے اس سے ملنے کی کوئی امید نظر نہ آتی تھی۔ نہ اس کا کچھ پتا تھا کہ کب کراچی آئے گی اور اگر معلوم بھی ہوتا تو میں اس کے گھر کس طرح جا سکتا تھا؟ میں ہر اسی الجھن میں گھرا ہوا تھا۔ شدید بے چینی کا شکار تھا۔ مجھے معلوم کرنا تھا کہ جن پیار بھری نگاہوں نے مجھے دیکھا تھا، کیا ان میں وہ شوخی ابھی تک بھری ہے یا وقت کی آندھیوں نے کہیں اسے دھندلا تو نہیں دیا۔ ایک سال ہونے کو تھا اور مجھے نگہت کی کوئی خبر نہ تھی۔ کوئی رابطہ نہ تھا۔ میں اکثر یہ بھی سوچتا تھا کہ کیا مجھے وہ بھی اسی طرح یاد کرتی ہے جس طرح میں اسے بھلا نہ سکا تھا۔ کبھی یہ سوچتا کہ کیا میری اس سے بات بھی ہو سکے گی؟ پھر اپنے آپ کو تسلی دیتا کہ اگر بات نہیں بھی ہوئی تو کم از کم اسے ایک نظر دیکھ تو لوں گا۔

ایک دن فاروق کا فون آیا کہ زاہدہ بھابی کے بھائی نے میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا ہے۔ ان کے گھر اگلے ویک اینڈ پر فنکشن ہے، زاہدہ تم کو بھی دعوت دے رہی ہے۔ مجھے اپنی طرف سے یہ امید تھی کہ نگہت اپنے بھائی کی کامیابی کی تقریب میں ضرور شریک ہوگی۔ میں اپنے آپ کو اس دن کا دولہا تصور کرنے لگا۔

ویک اینڈ کا میں بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ عجیب سی بے چینی کا شکار تھا۔ میں اس اجنبی جگہ پر اپنے آپ کو کس طرح پیش کروں گا۔ کیسے تعارف کراؤں گا کہ میں کون ہوں کیوں آیا ہوں اور ان سے کیا مانگنے آیا ہوں۔ زاہدہ بھابی نے باقاعدہ دعوت تو دی تھی مگر یہ تو ان کے بھائیوں اور ماں باپ کا گھر تھا۔ ان کے رشتہ داروں کی بھیڑ میں تو اپنے آپ میں بالکل تنہا ہوں گا۔

آخر کار میں نے اپنی تمام ہمتوں کو یکجا کیا اور نگہت کا چہرہ سامنے رکھ کر موٹر بائیک پر روانہ ہو گیا۔ راستہ ایک گھنٹے کا تھا اور میں پہلے ہی لیٹ ہو چکا تھا۔ چار بجے کا بلاوا تھا اور سوا چار مجھے ہاسٹل میں ہو گئے تھے۔

میں سمندر کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے ہوئے اس سے آتی ہواؤں کے ٹھنڈے جھونکے بدن میں اترتے محسوس کر رہا تھا۔ نمبر پڑھتا ہوا اس کے گیٹ تک پہنچ گیا۔ گیٹ سے اندر جانے کے دروازے کے سامنے ایک چھوٹا سا لان تھا۔ اس میں پھول کھلے تھے اور نگہت وہیں کھڑی گیٹ کی جانب دیکھ رہی تھی۔ میری بائیک جیسے گیٹ کے اندر داخل ہوئی وہ جلدی سے پیٹھ پھیر کر پودوں کو ٹھیک کرنے لگی۔ میں نے جان لیا کہ وہ میرا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے دیکھا تو اپنی جانب سے انجان بن گئی۔

میں نے موٹر بائیک لان کے ساتھ کھڑی کی اور اس انتظار میں تھا کہ وہ پلٹ کر میری جانب دیکھے اور وہ میری آواز کی منتظر تھی لیکن میں شرارت سے اس کے پیچھے سینے پر ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ اس نے ہلکے نیلے رنگ کا لباس پہنا تھا۔ میرے آواز نہ دینے پر وہ بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ آخر کار اس نے ہار مان لی اور مڑ کر دیکھا تو میں مسلسل اسی کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر مصنوعی حیرت کا اظہار کیا اور کہا۔ ''آپ کب آئے؟ آپ تو ایم۔فل کرنے گئے تھے۔''

وہ اپنے ہاتھ مل رہی تھی کہ میں اس سے کچھ کہوں گا مگر کچھ کہہ نہ سکا۔ میں کچھ بول کر ان پاکیزہ لمحوں کے رنگ پھیکے نہ کرنا چاہتا تھا۔ میرے سارے سوال گم ہو گئے تھے اور مجھے میرے سارے جوابات... مل چکے تھے جن کے لیے میں یہاں آیا تھا۔ مجھے معطر فضاؤں نے بتا دیا تھا کہ وہ میرے لیے لان میں کھڑی تھی۔ مسکراتے پھول اشارے کر رہے تھے کہ یہ تمہارے لیے ہی ہے۔ اس کا گھبرانا اور گھبرا کر اپنے ہاتھ ملنا سمجھا گیا تھا کہ وہ پیار کرنے لگی ہے۔ مجھے میرے سارے سوالوں کے جواب مل چکے تھے۔ آج کے دن ہماری اتنی ہی بات ہو سکی تھی۔ میں خوش صرف اس لیے تھا کہ وہ میرے آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ میں آیا تو پھر بیٹھ کر کے میرے بولنے کا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے چمک دیکھی تھی۔ مسرت اس کے چہرے پر پھوٹ رہی تھی۔ میرا آنا رائیگاں نہیں گیا تھا بلکہ میں اپنی بقیہ زندگی اس کے چہرے پر پائی گئی اپنی چاہت کے سہارے اور اسی یاد کو لیے گزار سکتا تھا۔

اتنے میں فاروق دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ اس نے ماحول کا سارا سحر توڑ دیا تھا۔ مجھے لیے وہ گھر کے اندر چلا آیا۔

گھر کے لوگوں نے بڑھ چڑھ کر میرا استقبال کیا۔ اتنی دیر میں نگہت نے کھانے کی میز چیزوں سے سجا دی تھی۔ جب میری جانب دیکھتی تو میری نظریں اسی پر لگی ہوتی تھیں۔ وہ مسکرا کر قریب سے گزر جاتی۔ اس کی ماں نے مجھے کچھ کھانے کا کہا تو وہ فروٹ چاٹ کی پلیٹ میرے ہاتھوں میں تھما گئی۔ میں موج سرور کے لمحوں میں تھا۔ وہ چند گھنٹے میرے لیے یادگار بن گئے۔ ایک بار وہ مجھے سیڑھیوں کے پاس مل گئی۔ مجھے دیکھا تو دھنک کا رنگ اس کے چہرے پر چھا گئے۔ وہ مجھے سامنے پا کر شرمائی اور سمٹ گئی۔ میں آج اسے جی بھر کے دیکھ رہا تھا۔ نظروں نے ہم دونوں کے راز عیاں کر دیے تھے۔ اتنے میں فاروق آ دھمکا اور گھسیٹ کر دوبارہ اندر لے گیا۔

رات دیر تک میں اس کے بھائیوں اور والد کے ساتھ بیٹھا رہا۔ وہ اب نظر نہیں آ رہی تھی میں واپس ہاسٹل چلا آیا۔

اب میں اٹھتے، بیٹھتے اور اپنے بستر کے تکیے پر سر رکھے اسی کے بارے میں سوچتا رہتا۔ میرے دن رات اسی کی یاد کے سہارے سہانے ہو گئے تھے۔

دو ماہ کی ریسرچ مکمل ہو رہی تھی اور اب مجھے واپس بہاولپور جانا تھا۔ جانے سے پہلے میں ایک بار اس کو دیکھنا چاہتا تھا۔ زاہدہ بھابی کو فون کر کے اپنے واپس جانے کا بتایا۔ انہوں نے کہا کہ جانے سے پہلے ایک دن ہمارے ہاں گزار دو۔ میں نے کہا۔ ”میں جانے سے پہلے آپ کے والدین سے مل کر ان کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ انہوں نے مجھے بہت عزت دی تھی۔“

وہ کہنے لگیں۔ ”ہم نے بھی اس ویک اینڈ پر وہاں جانا ہے، تم بھی آ جانا۔ رات کا کھانا بھی وہیں کھائیں گے۔“

مجھے یاد ہے کہ اس دن میں نے براؤن پینٹ پر گول گلے والی نیلی جرسی پہنی تھی۔ میں ان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ اس کے والدین اور بھائی سب موجود تھے۔ کوئی پھیلی خوشبو مجھے بتلا رہی تھی کہ نگہت بھی یہیں کہیں ہے۔ ہم باتیں کر رہے تھے کہ اچانک وہ سیڑھیاں اترتی مجھے دکھائی دی۔ ہمیشہ کی طرح اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ یاد نہیں اس نے کس رنگ کے کپڑے پہنے تھے۔ بس اس کے مرمریں ہاتھ اور مجھے دیکھ کر حیرت و خوشی سے اس کے چہرے کا تمتمانا یاد ہے۔ ایک سرخی اس کے چہرے سے پھوٹ رہی تھی۔ ”آپ کہاں رہ گئے تھے؟“ پھر اپنے سوال کو آگے بڑھایا۔ ”کہیں واپس تو نہیں جا رہے؟“

اس کے بیباک سوال پر میں نڈر بن کر بولا۔ ”ہاں میں واپس جا رہا ہوں اور آج صرف تم سے ملنے آیا ہوں۔“ پہلے تو میرے واپس جانے کی خبر پر اس کا چہرہ فق ہوا اور پھر وہ ہمیشہ کی طرح سنبھل گئی۔ اسے اور مجھے بھی اپنے اس جواب کی توقع نہ تھی۔ اس کے والدین میرے جواب پر سر جھکائے خاموش رہ گئے مگر فاروق کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تیر گئی تھی۔

وہ گھبرا کر دوبارہ سیڑھیاں چڑھتی اوپر چلی گئی۔ اب میں سر جھکائے مجرموں کی طرح بیٹھا تھا۔ میں ایسے بیٹھا تھا کہ جیسے کسی بڑے گناہ کا مرتکب ہو گیا ہوں۔ پھر مجھ سے بیٹھا نہ گیا۔ کسی نہ کسی طرح کھانا کھایا۔ وہ پھر نیچے نہ اتری اور نہ میں اس کی بلندی تک اوپر پہنچ سکا۔ میں واپس ہاسٹل آ گیا اور دو دن بعد میں بہاولپور میں تھا۔ مجھے یہ امید تھی کہ ایک دن وہ میری ہو کر رہے گی۔ مجھے اپنی تعلیم مکمل کرنی تھی۔

میں اپنے تھیسس میں مشغول ہو گیا اور اسی میں سال گزر گیا۔ پھر میری ایم۔فل کی ڈگری مکمل ہو گئی۔ یونیورسٹی

نے مجھے ریسرچ آفیسر کی جاب دے دی۔ ان دنوں۔۔۔۔۔ میں نے فاروق سے اور نہ زاہدہ بھابی سے رابطہ کیا اور نہ ہی انہوں نے کیا۔

جاڑا شروع ہوا تھا۔ مجھے کچھ دنوں کے لیے کراچی جانا پڑ گیا۔ نگہت کی یاد میرے دل میں بیٹھی تھی۔ میں اس کو کبھی بھی نہ بھول سکا تھا۔ مجھے خدشہ نہیں بلکہ یقین تھا کہ اگر میں اس کی یادوں میں تھا تو اس نے بھی مجھے اپنے دل و دماغ میں بسا رکھا ہوگا۔ کراچی پہنچ کر میں نے پہلے اپنے کام مکمل کیے اور جانے سے پہلے فاروق سے ملنے ان کے گھر ناظم آباد پہنچ گیا۔

بھابی اور فاروق مل کر بہت خوش ہوئے۔ گلہ بھی کیا کہ میں رابطے میں نہیں رہتا۔ ان کا بیٹا اب تین سال کا ہو چکا تھا۔ میں اس سے بیٹھا کھیل رہا تھا کہ فاروق نے مجھے یہ اندوہناک خبر دی کہ زاہدہ کے چھوٹے بھائی کو بلڈ کینسر ہو گیا ہے اور نگہت ہر ہفتے جام شورو سے کراچی آتی ہے بھائی کو کیموتھیراپی کرانے وہی اسپتال لے جاتی ہے۔ یہ وہی بھائی تھا جس کی میٹرک میں اچھے نمبر لینے پر ان کے گھر میں فنکشن ہوا تھا۔ میں یہ خبر سن کر وہیں ساکت ہو گیا۔ بھابی بتا رہی تھیں کہ نگہت اس کا بہت خیال رکھتی ہے۔ اکیلی اسے اسپتالوں میں لیے پھرتی ہے۔

میں بے چین ہو گیا۔ وہ اپنے بھائی کے دکھ اکیلی سہہ رہی تھی اور مجھے خبر بھی نہ تھی۔ فاروق سے پوچھا کہ وہ ان دنوں کہاں ہے تو اس نے جواب دیا۔ ''حیدر آباد میں لیاقت میڈیکل کالج کے زیب النساء ہاسٹل میں رہتی ہے۔''

میں اس کے بھائی کے لیے دکھی تو تھا مگر نگہت کے دکھ اور تکلیف نے مجھے کاٹ کے رکھ دیا تھا۔ میں بے چین ہو گیا۔ مجھ کو کچھ بھی اچھا نہ لگ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ میری کوئی قیمتی شے کھو گئی ہے۔ مجھے اب اس سے بات کرنی تھی۔ میں اٹھ کر واش روم میں آیا تو آنسو میری آنکھوں سے چھلک پڑے۔ میں اس دکھ کو محسوس کر رہا تھا جب وہ اپنے بیمار بھائی کو اکیلے اسپتال لے جاتی ہوگی۔ میں اپنے آپ کو کوس رہا تھا کہ میں اس سے مل کر مہینوں اس کے پیار میں ڈوبا تو رہتا ہوں مگر اس کی کوئی خبر نہیں لیتا۔ اس کی آنکھوں میں اتنے خواب سجانے کے بعد میں اس سے اتنا بے خبر کیوں رہا۔

دوسرے دن میں نے بس لی اور شام سے پہلے حیدر آباد پہنچ گیا۔ وہاں میرا ایک دوست تھا۔ اسے اپنے آنے کی خبر فون پر دے دی تھی۔ وہ مجھے لینے آیا اور اپنے گھر کے مہمان خانے میں میرے ٹھہرنے کا انتظام کیا ہوا تھا۔ وہ مجھے اچانک حیدر آباد آنے کی وجہ سے حیران تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اپنے دل کی بات بتانی پڑی۔ وہ میری کہانی بغور سن کر بولا۔ ''اب کیا کرو گے؟''

مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ آیا اس سے ملنے جاؤں یا فون پر بات کروں۔ اس نے مشورہ دیا کہ ابھی ملنے مت جاؤ صرف فون پر بات کرو۔

کھانے کے بعد وہ مہمان خانے میں فون لے آیا اور مجھے زیب النساء ہاسٹل کا نمبر بھی آپریٹر سے معلوم کر کے بتایا، اور خود کمرے سے باہر نکل گیا۔

یہاں سے کہانی ایک نیا موڑ لیتی ہے۔ یہاں سے ایسا سفر شروع ہوتا ہے۔ جس نے وصال سے شروع ہو کر فراق پر ختم ہونا تھا۔

دو تین بار تو فون مصروف ملا اور پھر بالآخر نمبر لگ گیا۔ فون اٹھانے والی عورت سے میں نے ڈاکٹر نگہت سے بات کروانے کا کہا تو وہ فون کا ریسیور نیچے رکھ کر اسے بلانے چلی گئی۔ اس کے جاتے قدموں کی آواز کے ساتھ ساتھ میرا دل بھی دھڑک رہا تھا۔ پھر فون کی جانب بڑھتے قدموں کی آواز بتدریج بلند ہوتی گئی اور ادھر میرا دماغ سن اور زبان گنگ ہو چکی تھی۔ مجھے دھڑکا یہ لگا تھا کہ کیا وہ مجھے ابھی تک یاد رکھے ہوئے ہے یا بھلا چکی ہے۔ میں وسوسوں میں گھرا قدموں کی چاپ فون کی طرف بڑھتے ہوئے سن رہا تھا۔

ریسیور اٹھایا گیا اور اس کے ہیلو کہنے پر پہلے میں نے سلام کیا اور اس نے جواب میں میرا نام پوچھا۔ جب اپنا نام بتایا تو کہنے لگی۔ ''میں نے پہچانا نہیں آپ کون ہیں؟''

میں نے اپنا تعارف لاہور سے شروع کیا اور اس کے بھائی کے فنکشن پر آ کر ختم کیا لیکن میرے دل میں وہم تھا کہ جسے میں اتنا چاہتا ہوں اس نے مجھے میرے نام سے پہچانا بھی نہیں۔ میں نے اپنا تعارف اتنی تفصیل سے کروایا کہ اس کی ہنسی میرے کانوں میں جلترنگ بجا گئی۔ کہنے لگی۔ ''اتنا لمبا تعارف کروانے کے بجائے صرف یہی کہہ دیتے کہ میں فاروق بھائی کا دوست ہوں۔ پھر ہنس کر بولی کہ پہچان تو میں گئی تھی مگر رسماً مجھے پوچھنا تھا۔''

میں نے اس کے بھائی کی بیماری کا افسوس کیا اور کہا۔ ''مجھے فاروق نے جب بتایا کہ آپ اپنے بھائی کو علاج کے لیے اسپتال میں خود لے جاتی ہیں، اسی لیے میں

حیدرآباد آپ کو تسلی دینے خود آیا ہوں۔''

حیران ہو کر پوچھنے لگی۔ ''آپ حیدرآباد صرف مجھے فون کرنے آئے ہیں؟'' میں نے ہاں میں جواب دیا تو دوسری جانب کچھ لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔ پھر توقف کے بعد آواز آئی۔ ''آپ مجھے بہاولپور سے بھی فون کر سکتے تھے۔'' میں خاموش رہا تو پھر اس نے پوچھا۔ ''کیا واقعی آپ مجھے فون کرنے حیدرآباد آئے ہیں۔''

اب میری ہمت بھی بڑھ گئی تھی۔ میں نے کہا۔ ''آپ پریشانی میں ہوں تو میں کیسے چین سے بیٹھ سکتا تھا۔''

دوسری جانب پھر خاموشی چھا گئی۔ وہ بولی۔ ''مجھے یقین نہیں آرہا۔'' میں نے دوست کا نمبر دیا اور کہا۔ ''آپ اس پر فون کر کے اپنا یقین پختہ کر لیں۔''

کہنے لگی۔ ''نہیں مجھے یقین ہے۔ آپ جھوٹے بھی نہیں ہو سکتے۔'' پھر پوچھا۔ ''آپ کی ڈگری مکمل ہوئی ہے یا پھر آگے پڑھنے کا ارادہ ہے؟''

میں نے کہا۔ ''معلوم نہیں۔ میرے پروگرام پہلے سے طے شدہ نہیں ہوتے، جو وقت مجھے دے دیتا ہے، اسی کو تھام لیتا ہوں۔''

ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ کچھ دیر ہم دونوں چپ رہے اور پھر میں نے پوچھا۔ ''آپ کیسی ہیں؟''

جواب دیا۔ ''اب بڑی ہو گئی ہوں۔''

پھر بولی۔ ''اور آپ کیسے ہیں۔''

میں نے جواب دیا۔ ''میں آپ سے بھی بڑا ہو گیا ہوں۔'' اس بات پر ہم دونوں ہنس پڑے۔

اس کے بعد میرے پاس الفاظ ختم ہو گئے۔ آخر میں یہ کہا۔ ''اگر میں آپ کو خط لکھنا چاہوں تو کیا جواب دیں گیں؟''

ایک وقفہ آیا اور پھر مجھے میرا جواب مل گیا جس کا میرے دل کو انتظار تھا اس نے ٹھہر کر کہا۔ ''ہاں! دوں گی۔''

میں نے اس کا ایڈریس لیا اور اب میرے کلمات تمام ہو چکے تھے اور پھر میں نے خدا حافظ کہہ کر فون رکھ دیا۔

میرا چہرہ پسینے میں شرابور ہو چکا تھا، سانس بے ترتیب تھے جیسے میں کوئی لمبی منزل مار کر آیا ہوں۔ میرا دوست کمرے میں آیا تو میرا چہرہ دیکھ کر بولا۔ ''اتنا پڑھ لکھ گئے مگر ایک لڑکی کے آگے بکھر کر رہ گئے ہو۔''

وہ رات میری آنکھوں میں سوچتے سوچتے کٹی۔ میں نے اپنے اس سفر کی ایک ایک منزل کو ناپا جو لاہور میں میرے گھر سے شروع ہو کر یہاں اس کمرے تک آ پہنچی تھی۔ دو ڈھائی سال میں میرے اندر نگہت کا پیار ختم کیا مدھم بھی نہ پڑ سکا تھا اور آج ایک آگ کی مانند مجھے اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ یہ انتہا نہ تھی بلکہ ابتدا تھی اس سفر کی جس کا انجام مجھے ہمیشہ کے لیے درد اور خلش دے گیا تھا۔

دوسرے دن میں بذریعہ ٹرین بہاولپور لوٹ گیا۔ اگلے دن مارکیٹ گیا اور نگہت کے لیے کچھ کپڑے خریدے۔ وہ کپڑے میں اپنے سینے سے لگاتا اور چومنے لگتا تھا۔ محبت چیز ہی ایسی ہوتی ہے کہ ہر ایک کو ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ ساری دنیا اچھی لگنے لگتی ہے۔ ہر چہرہ خوش دکھائی دیتا ہے۔ یہی محبت کا معجزہ ہوتا ہے۔

رات کو اپنے ہاسٹل کے کمرے میں اپنے بستر پر رضائی میں لپٹا بیٹھا اسے خط لکھ رہا تھا۔ معلوم نہیں کتنے صفحوں میں کتنے فسانے لکھے؟ کتنی کہانیاں لکھیں؟ دکھ کی کیفیتیں بیان کیں، آزردگی کے قصے لکھے، سوچوں کے سمندر لکھے، پربت کے بہتے دریا لکھے، لو کی آنچ لکھی، الفت کے پہر لکھے اور پیار کی شامیں لکھیں۔ آخر میں لکھا کہ مجھے نہیں معلوم پیار کیا ہوتا ہے۔ اگر یہی ہوتا ہے جو میں نے اوپر سب لکھا ہے تو سمجھو میرے دل کو تم سے پیار ہو گیا ہے۔ اور یہ معاملہ دل کا ہے جس پر میرا بس نہیں اور اس میں، میں قصوروار نہیں ہوں۔

مجھے اپنے بارے میں معلوم تھا کہ سامنے بیٹھ کر میں اس سے ایک بات بھی نہ کہہ سکوں گا۔ اسی لیے دور بیٹھ کر سب باتیں کہہ ڈالیں۔ دوسرے دن وہ سب تحائف اور خط میں نے کوریئر سے اسے روانہ کر دیے۔

دوسرے دن رات کو اسے فون کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ میرا بھیجا پارسل اسے مل گیا ہو گا۔ فون اٹھانے والی عورت نگہت کو بلانے گئی اور فون کی جانب آتی وہی مخصوص قدموں کی چاپ مجھے سنائی دینے لگی۔ اس نے فون پر ہیلو کہا اور پھر میری آواز سنی۔ پھر جو وہ بولی تو مجھے صاف محسوس ہوا کہ... میرے پیار کی حدت سے پگھل چکی ہے۔ میرے خط نے اسے میرا کر دیا تھا۔ ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ میں فون پر بول رہا تھا اور وہ سن رہی تھی۔ میرے کہے الفاظوں میں وہ شدت نہ تھی جو میرے لکھنے میں ہوتی ہے۔ میرے لکھے حرفوں کی زد میں وہ آ چکی تھی۔ میں اسے اپنا بنانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ گو کہ وہ اظہار نہ کرتی تھی پر اس کی

آواز کی لرزش اس کی اندرونی کہانی بیان کر رہی تھی۔

اب میں اسے خط لکھتا تھا اور وہ اسی دن میرے خط کا جواب کئی صفحوں میں دیتی۔ ہر ہفتے میں دو تین خط لکھا کرتا اور دو تین بار گھنٹوں فون پر باتیں ہوتیں۔

میں ہاسٹل میں تنہا رہنے لگا۔ ہاسٹل کی کینٹین کے پیچھے بچھی چارپائیوں پر بیٹھا اس کے خط پڑھتا رہتا۔ وہ اپنے کالج کی باتیں لکھتی، اپنی سہیلیوں کا ذکر کرتی جن میں شبنم سرفہرست تھی اور میں ان لمحات کو بیان کرتا جب میں اس کی سوچوں میں ڈوبا ہوتا تھا۔

سردیاں ختم ہونے کو تھیں کہ ایک دن اس کا خط ملا جس میں وہ مجھے ملنے کا کہہ رہی تھی۔ مجھے اپنی عادت کا پتا تھا کہ جو میں کہہ نہیں سکتا وہ لکھ کر بیان کر لیتا تھا۔ اس کے سامنے جب میں جاؤں گا تو میری زبان گنگ ہو جائے گی۔ مجھے خدشہ تھا کہ کہیں میرے بارے میں شش و پنج میں نہ پڑ جائے۔ لیکن مجھے اس سے ملنے جانا تھا اور ایک شام میں حیدر آباد اپنے دوست کے گھر پہنچ گیا۔ اسے آنے کی اطلاع کر دی تھی اور وہ لینے ریلوے اسٹیشن پر آیا ہوا تھا۔ اس کو اپنے آنے کا مقصد بتایا تو وہ بولا کچھ نہیں بلکہ مجھے خاموش نظروں سے دیکھنے لگا۔

دوسری صبح میں اس کی بائیک پر زیب النساء ہاسٹل کے باہر کھڑا تھا۔ چوکیدار کو کہا کہ نگہت کو میرے آنے کا پیغام دے آؤ۔ اسی دوران میں بائیک کو اسٹینڈ پر لگائے اس کی سیٹ پر بیٹھا اس کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ سادہ کپڑوں میں آئی تھی۔ پاؤں میں سینڈل تھے اور چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ میری جانب دمکتے چہرے اور گھبرائی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

وہ اکیلی نہیں آئی تھی بلکہ اس کی سہیلی شبنم بھی ساتھ تھی۔ شبنم نے میرا احوال پوچھا اور کچھ اور باتیں کیں۔ مجھے بعد میں نگہت نے بتایا تھا کہ وہ تمہیں جانچ رہی تھی۔ وہ میرا ایک طرح سے ٹیسٹ لینے آئی تھی کہ میں کوئی لوفر لفنگا تو نہیں ہوں۔ کچھ دیر مجھ سے سوالات کرتی رہی اور میں بائیک کی سیٹ پر بیٹھا مختصر طور پر جواب دیتا رہا۔ پھر نگہت مجھے انتظار کرنے کا کہہ کر خود اندر چلی گئی۔

کچھ دیر بعد وہ باہر آئی تو اس نے وہی سوٹ پہنا تھا جو میں نے اسے پہلی بار بھیجا تھا۔ وہ اس نگہت سے کہیں زیادہ پیاری تھی جو لاہور میرے گھر آئی تھی کیونکہ وہ اب میری بن کر آئی تھی۔ اب وہ جھجک نہیں رہی تھی۔ وہ میرے پیچھے بائیک کی سیٹ پر بیٹھی اور پھر اپنا دایاں ہاتھ میرے کندھے پر رکھا۔ اس کا لمس میرے بدن میں پھیل گیا۔ میں بے یقینی میں گھر گیا کہ وہ مجھے چھو رہی ہے؟ میں یقین اور بے یقینی کے درمیان الجھ گیا تھا۔ میرے اندر کے صحرا میں نخلستان در آئے۔ میرے اندر سوکھے جل دھارے بہنے لگے۔ میرا منتشر وجود جڑنے لگا۔ میرا مضطرب دل گنگنانے لگا۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ”جانا کہاں ہے؟“

کہنے لگی۔ ”میں آپ کو راستہ بتاتی ہوں۔“

پھر مجھے سندھ یونیورسٹی کی کچھ سڑکوں پر گھمایا اور ہم ایسی جگہ آ گئے جہاں دور دور تک ایک ویرانہ تھا۔ سامنے ایک چبوترے پر ایک گنبد کے نیچے مزار تھا۔ بہت سے درخت اس پر جھکے تھے۔

کہنے لگی۔ ”یہ ایلسا قاضی کا مزار ہے اور ہم یہیں سیڑھیوں پر بیٹھیں گے۔“

بعد میں معلوم ہوا کہ اس کی سہیلی شبنم نے اسے سمجھا دیا تھا کہ اگر کسی پُرسکون جگہ بیٹھنا ہے تو ایلسا قاضی کے مزار سے بہتر کوئی جگہ نہیں ہے۔ ہم آ بیٹھے۔ ابھی دوپہر ہونے میں کچھ وقت تھا اور سیڑھیوں پر بیٹھی نگہت مجھے بتا رہی تھی کہ یہ مقبرہ محبت کی نشانی ہے۔ یونیورسٹی کے وائس چانسلر اے اے قاضی نے باہر جا کر ایلسا سے شادی کی تھی۔ وہ ایلسا سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ ایلسا ایک دن مر گئی۔ یہاں اس کا مقبرہ بنا اور اے اے قاضی نے دریا میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی۔

موسم جاڑے سے بہار کی جانب آ رہا تھا۔ ہم سیڑھیوں پر ایک ساتھ بیٹھے تھے۔ ہمارے اوپر بہت سے درخت کھڑے تھے جن کی شاخوں سے دھوپ اور چھاؤں کا رقص زمین پر اترتا تھا۔ چاروں جانب ایک خاموشی تھی اور ہم بات کرتے تو یہ جمود ٹوٹتا۔ میں اس کی بائیں جانب بیٹھا تھا اور نظریں سامنے پھیلے ویرانوں پر تھیں۔ میں محبت کا ایک سفر طے کر کے ملاپ کے اولین لمحوں میں آ بیٹھا تھا۔ باتوں باتوں میں اس کا نازک ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا تو پہلے وہ ذرا سا گھبرائی اور پھر شرم کی سرخی اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ مجھے کہنا چاہیے تھا کہ تمہارے ہاتھ بہت نازک ہیں مگر میں ایک دیہاتی انسان عشق کی نازکی کو کیا جانوں۔ میں کہہ بیٹھا۔ ”تمہارے ہاتھ کتنے کمزور ہیں۔“

اس پر وہ رو پڑی اور میں دیر تک وضاحتیں دیتا رہا۔ اس کی آنکھوں سے چھلکتے آنسو مسکرا پڑے۔ اس نے

اپنا سر میرے کندھے پر رکھا اور میں نے بازوؤں کا حلقہ بنا کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ وہ مجھ میں سمٹ گئی اور میری گرفت مضبوط ہوتی گئی۔

ہم بہت گھنٹے بیٹھے رہے۔ پوچھنے لگی۔ ''یہ لمحے تمہیں یاد آئیں گے؟''

میں نے کہا۔ ''بھولوں گا تو یاد کروں گا۔'' ہم اسی قسم کی باتیں کر رہے تھے کہ ایک پھول سی بچی، دور پرے گھروں سے بھاگتی چلی آرہی تھی۔ قریب پہنچی تو اس کے ہاتھ میں پھول تھا۔ وہ ہمارے سامنے کھڑی ہوگئی اور پھول عقیدت سے نگہت کو دیا۔ میں حیران بیٹھا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ نگہت نے وہ پھول لیا تو اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ شاید ان گھروں میں سے کسی نے یہ پھول بچی کے ہاتھ ہمیں بھیجا تھا۔ وہ بچی جس طرح بھاگتی آئی تھی اسی طرح دوڑتی واپس چلی گئی۔ میں نے نگہت کا پھول والا ہاتھ چوم لیا اور اس کا پھول جیسا ہاتھ میرے ہونٹوں کی حدت سے سرخ ہوگیا۔

وہ کہہ رہی تھی اور میں سن رہا تھا۔ ''تم دور تھے مگر میرا دل تم سے جڑا تھا۔ میں سوچتی تھی کہ یہ لڑکا مجھے پیار بھری نظروں سے دیکھتا ہے مگر کچھ کہہ نہیں سکتا۔'' پھر میرا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ ''دوری کے باوجود آخر دل کس طرح سے قریب ہوجاتے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''یہ دل ہی تو ہوتے ہیں جو قریب لے آتے ہیں اور کبھی تو آتے آتے دور بھی چلے جاتے ہیں۔''

وہ شدت سے کانپ گئی۔ ''ایسی باتیں کیوں کر رہے ہو؟ وعدہ کرو! مجھ سے دور کبھی نہ ہوگے۔''

میں نے وعدہ کیا اور اس کا چہرہ میرے کندھے سے لگا کپکپا رہا تھا۔

کہنے لگی۔ ''خطوں میں تو بہت کچھ لکھ جاتے ہو مگر سامنے آکر بولتے نہیں۔'' میں نے کہا کہ واپس جا کر اپنے سب احساسات خط میں لکھ کر بھیج دوں گا۔ وہ میری کم گوئی کو جان گئی تھی اس لیے خاموش رہ گئی۔ وہ بھی مجھ سے لپٹ کر بیٹھی تھی۔

اندھیرا پھیلا تو ہم واپس ہاسٹل آئے۔ وہ مجھے اندر لے آئی۔ گیٹ کے قریب ایک لکڑی کی بینچ تھی۔ مجھے اس پر چوکیدار نے بٹھایا وہ اندر ہاسٹل میں چلی گئی۔ واپس آئی تو اس کے ہاتھوں میں چائے کے دو مگ تھے۔ اس نے اپنے کپڑے تبدیل کر لیے تھے۔ ہم چائے پیتے ہوئے باتیں بھی کر رہے تھے کہ اس نے پوچھا۔ ''سامنے آکر تم بہت شرمیلے ہوگئے ہو۔''

''یہ شرم نہیں، پیار کا احترام ہے۔ میں تمہاری جانب زیادہ دیر تک دیکھ بھی نہیں سکتا۔''

اس کی آنکھوں کے دیے جلنے لگے۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی اور میں اسے ایک نظر دیکھ کر دوبارہ سے چائے پینے لگا۔

شام رات میں بدل چکی تھی۔ ہم گیٹ سے باہر آگئے۔ باہر سناٹا تھا۔ چاند آسمان سے چاندنی برسا رہا تھا۔ ہم دور تک ٹہلتے ٹہلتے نکل گئے۔ واپسی میں شام پر رات کی کالی چادر پڑ چکی تھی۔ چاند کی چاندنی ہر سو پھیل کر دنیا کو منور کر رہی تھی۔ نگہت کا ہاتھ میری کمر سے لپٹا تھا اور میرا بازو اس کی گردن کے گرد تھا۔ ایک مقام پر وہ رکی اور میرے سینے سے لگ گئی۔ میں نے اپنے ہونٹ اس کی نازک گردن پر رکھ دیے اور پھر چاروں جانب شہنائیاں بجنے لگیں۔ ہوائیں بھی اسے بوسہ دینے لگیں۔ جب ہم ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اس تنہائی میں خاموشی سے چلنے لگے۔

کچھ دور جانے کے بعد میں نے کہا۔ ''تم بھی کیا سوچتی ہوگی، کس طرح کے پینڈو سے پالا پڑا ہے۔''

''نہیں تم پینڈو نہیں۔ تم بے ضرر اور معصوم انسان ہو۔'' پھر اپنی بات آگے بڑھائی۔ ''میں تمہارے ساتھ اکیلی تھی، صرف ہم دونوں تھے مگر تم نے لحاظ رکھا۔ ایک فاصلہ رکھے رکھا جب تک میں خود تمہارے پیار میں تمہارے قریب نہ آئی۔ تم نے اپنی نظریں نیچی رکھیں اور یہی بات مجھے تمہاری چاہت میں ڈبو گئی۔'' وہ بولتی رہی۔ ''تم جب مجھے اپنے گھر میں پیار بھری نظروں سے دیکھتے تھے تو میں جان چکی تھی، تم مجھ سے پیار کرنے لگے ہو۔ میں نے جب ایک دو بار تمہاری جانب دیکھا تو تم نے اپنی نظریں جھکا لی تھیں۔ میں انتظار کرتی رہی کہ تم اظہار کرو گے مگر تم انتہائی شرمیلے تھے بلکہ پینڈو تھے۔''

اس وقت ہم دونوں تھے، تنہائی تھی، چاند کی چاندنی تھی اور دھیرے سے چلتی ہوا تھی۔ وہ میری روح کا حصہ بنی ہوئی تھی۔ کہنے لگی اور شام کے منظر اس کو سننے لگے۔ ''میں نے تمہیں دیکھ کر ہی پسند کر لیا تھا۔ مگر میں جان گئی ہوں کہ تمہارے پیار میں شدت ہے اور یہی شدت آہستگی سے مجھ میں اترتی چلی گئی۔ تم کچھ نہ کہتے ہوئے بھی سب کچھ کہہ جاتے تھے۔'' وہ پھر میرے سینے سے لگ گئی۔ اس کا

ہاتھوں کی گرفت میرے کندھوں پر سخت ہونے لگی تھی۔ اس کی بھیگتی آنکھوں کی نمی میں اپنے کاندھے پر محسوس کر رہا تھا۔ وہ مجھ میں جذب ہونا چاہتی تھی۔ کہیں کھو جانا چاہتی تھی۔ روہانسی ہو کر کہنے لگی۔ ”تم نے اظہار کرنے میں مہینوں کیوں لگا دیئے؟ مجھے آخر اتنا انتظار کیوں کروایا؟“

میں آج خاموش تھا کہ میرا بولنا کہیں اسے چپ نہ کرا دے۔ میں چاہتا تھا کہ وہ ندی کی طرح بہتی رہے، گنگناتی رہے۔ میں اس کے پیار اور چاہت کی پھوار سے بھیگتا رہوں۔

گیٹ کے پاس ہم تنہائی میں زمین پر بیٹھ گئے۔ پھر میری سالوں کی محبت ایک دن میں رنگ لے آئی اب وہ میری تھی۔ صرف میری۔ رات گہری ہو چکی تھی۔ میں واپس جا رہا تھا اور مجھے وہ واپس نہیں جانے دیتی تھی۔ مجھ سے لپٹ جاتی۔ کبھی ہنسنے لگتی۔ کبھی آنسو بہنے لگتے اور پھر میرے سینے سے لگ جاتی۔ میں وہاں سے چلا تو وہ مجھے بھیگتی آنکھوں میں مسکراہٹ سجائے رخصت کرنے پر مجبور ہوگئی۔

دوسرے دن میں لوٹ گیا۔ اسے اپنے خوابوں کی تعبیریں لکھ بھیجیں۔ جو کھویا تھا وہ نہیں لکھا اور جو پایا تھا وہ لکھا۔ یہ نہیں لکھا کہ وہ میری بانہوں میں قید تھی، یہ لکھا کہ وہ سارے لمحے میرے اندر قید ہو گئے ہیں۔ میں اسی طرح خط لکھتا تھا اور دوسرے دن اس سے فون پر گھنٹوں باتیں کرتا۔ وہ جب بھی بلاتی تو میں تمام کام چھوڑ کر بائی ایئر پہنچ جاتا۔ پھر ہم فلم دیکھتے اور کبھی کسی ریسٹورنٹ میں کھانا کھاتے۔ میں اس کے لکھے خط اپنے ساتھ لے جاتا اور وہ میرے لکھے خط لے آتی۔ میں اسے پڑھ کر سناتا اور وہ مجھ سے لپٹی، میرے سینے پر سر رکھے مجھے سنتی رہتی۔ میں اس کے ماتھے کے بوسے لیتا اور وہ اپنی بانہیں میرے گلے میں ڈال دیتی۔ میں میں نہ ہوتا اور وہ وہ نہ رہتی۔ میں اسے تحفے دیتا اور وہ انہیں پا کر خوش ہوتی۔

گرمیوں کے مہینے تھے۔ ایک دن حسب معمول میں نے فون کیا۔ وہ بتا رہی تھی کہ ہماری کلاس کی کچھ لڑکیاں سمر کیمپ پر ناران جا رہی ہیں اور شبنم میرے پیچھے پڑی ہے کہ میں بھی سب کے ساتھ ناران چلوں۔

میں نے پوچھا۔ ”کیا تم نہیں جانا چاہتی؟“ وہ کہنے لگی۔

”میں اب اسپتال اور اپنے گھر کے علاوہ کہیں جانا بھی چاہوں تو نہیں جا سکتی مجھے تمہاری اتنی عادت ہوگئی ہے کہ کہیں اور جانا ہو تو مجھے ایسے لگتا ہے کہ تم سے دور ہو چلی ہوں۔“

میرے ذہن میں اسی لمحے ایک سوچ اتری۔ میں نے اس سے کہا۔ ”اگر میں بھی ناران آجاؤں تو......؟“ وہ یہ سن کر ایک لمحے کے لیے خاموش ہوگئی اور پھر بولی۔ ”تم مذاق تو نہیں کر رہے؟“

جب میں نے یقین دلایا تو خوشی سے اس سے بات نہیں ہو رہی تھی۔ بار بار پوچھتی۔ ”تم آؤ گے ناں؟“

میں اسے بار بار یہی کہتا کہ تم ناران جانے کی تیاری کرو اور میں تم سے پہلے وہاں پہنچ جاؤں گا۔

وہ بہت خوش تھی اور کہنے لگی۔ ”میں ابھی شبنم کو یہ خوش خبری سناتی ہوں۔“

میں اس سے ایک دن پہلے ناران پہنچ گیا تھا۔ میں نے وہ پورا دن دریا کنہار کے کنارے بیٹھ کر گزارا۔ دریا کے پانی سے اٹھتی خنک ہوائیں اس کے آنے کی نوید سنا رہی تھیں۔ میں اپنی زندگی کے بہترین لمحوں میں تھا۔ ناران کی خاموش فضاؤں نے اس کے آنے سے پہلے ہی اس کا لمس محسوس کر دیا تھا اور اب وہ ہوائیں خوشی سے مجھے چھو رہی تھیں۔

وہ دوسرے دن آئے اور ان سب کا پڑاؤ ...... ناران سے ذرا پہلے ایک گورنمنٹ ہاسٹل تھا۔ میں پورا دن اس کے آنے کا انتظار کرتا رہا تھا وہ شام ہونے سے پہلے پہنچے جب آس پاس کے پہاڑ سبز سے سرمئی ہو چکے تھے۔ ہواؤں کا شور تھا اور پہاڑوں سے آتی خاموشی اس شور کو پُروقار بناتی تھی۔

میں اسے ملنے گیا۔ وہ نیچے گیٹ پر آئی۔ اس پر کپکپی طاری تھی اور ہوائیں اسے سرد کرتی تھیں۔ ہم ملے تو جیسے ہوائیں رک سی گئیں۔ آسمان صاف تھا اور چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ میں ناران کی ایک دکان سے سرخ رنگ کی گرم شال لیتا آیا تھا۔ میں نے وہ شال اسے پہنائی تو اس کا چہرہ شال کی طرح سرخ ہو گیا۔ ہم کچھ دیر ٹہلتے رہے۔ وہ مجھے یہاں پا کر بہت خوش تھی اور میں اسے خوش دیکھ کر شاد تھا۔ اس کی کچھ سہیلیاں شبنم کے ساتھ مجھ سے ملنے آگئیں۔ ہر چہرہ ہمیں دیکھ کر کھلتا تھا۔ وہ تھکی سی لگ رہی تھی۔ ایک لمبا سفر کر کے پہنچی تھی۔ شبنم کہنے لگی کہ ہم کل جھیل سیف الملوک جائیں گے۔ میں نے وہیں ملنے کا کہا اور واپس چلا آیا۔ جب تک میں نظروں سے اوجھل نہ ہوا۔ وہ اپنی جگہ کھڑی مجھے دیکھتی رہی۔

میں جب بھی ناران آتا تو جھیل سیف الملوک سب سے پہلے پہنچنے والا میں ہی ہوتا تھا۔ صبح کی پہلی کرن کو اس جھیل پر دیکھنا مجھے ایک اور ہی دنیا میں لے آتا تھا۔ نئے دن کی نوید پہاڑوں کی چوٹیوں پر کسی نور کی صورت اتر رہی تھی۔ جب ایک جیپ مجھے جھیل کی جانب لے جانے کے لیے ہوٹل کے باہر کھڑی تھی۔ جھیل سے ذرا پہلے جیپ کو میں نے واپس بھیج دیا۔ میں اس منظر میں اکیلے اترنا چاہتا تھا۔ خنکی کی وجہ سے میں نے گرم جیکٹ پہن رکھی تھی اور میں کھڑا دور سے جھیل سیف الملوک کو دیکھ رہا تھا۔ تنہا جھیل کے پانیوں میں برف پوش پہاڑوں کا عکس میرے علاوہ کوئی نہ دیکھتا تھا۔ صبح کے رنگ اتر رہے تھے۔ ہواؤں میں خوشبو تھی کیونکہ آج میری چاہت یہیں کہیں موجود تھی۔

میں جھیل کنارے لیٹا برفانی بلندیوں کو پانی میں ڈوبے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ مجھے نگہت کا انتظار تھا۔ میں اسے یہ سب کچھ خود دکھلانا چاہتا تھا۔ اسے بتانا چاہتا تھا کہ میری محبت ان ہواؤں کی طرح ہر قسم کی آلودگی سے پاک ہے۔ اسے بتانا چاہتا تھا کہ میری چاہت ان برفوں کی طرح اُجلی ہے۔ اسے بتانا چاہتا تھا کہ میرا پیار ان پانیوں کی طرح گہرا ہے۔ اسے بتانا چاہتا تھا کہ میری زندگی اس کے بغیر اس جھیل کی طرح تنہا ہے۔

بہت سی لڑکیاں جھیل کے کناروں پر نمودار ہوئیں تو وہ سب سے نمایاں تھی۔ میں اسے بن دیکھے محسوس کر سکتا تھا مگر اب تو وہ سب سے نمایاں تھی۔ وہ الگ ہو کر جھیل کی جانب بڑھ رہی تھی جہاں میں گھاس پر لیٹا تھا۔ اس نے شوخ رنگ کا سویٹر پہنا تھا۔ سر پر اسی رنگ کی ٹوپی تھی جو اس کے بالوں کو ہواؤں سے بکھرنے سے بچاتی تھی وہ میرے ساتھ گھاس پر بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔ ”تم مجھے اپنے کتنے رنگ دکھاؤ گے؟“

میں چونک پڑا۔ ”کون سے رنگ؟“

برف کے عکس پانیوں میں تیرتے ہوئے دیکھ کر بولی۔ ”مجھے تم ان سب رنگوں میں نظر آتے ہو۔“

میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا اور ہوائیں گنگنانے لگیں۔ جھیل کے پانی جلترنگ بجانے لگے۔

میں نے اسے ساتھ لیا اور جھیل کے کناروں کے ساتھ ساتھ ہم چلنے لگے۔ بادل ملکہ پربت کی چوٹیوں کے اوپر لہرا رہے تھے۔ نیلے، کاسنی، سبز اور دھانی رنگ سب کے سب اپنے نظارے کروانے آ چکے تھے۔ اس کا ہاتھ میرے ہاتھوں میں تھا۔ ہم بہت دور پہاڑوں کے دامن سے لگ کر چل رہے تھے۔ بائیں ہاتھ جھیل کے خاموش اور نرم پانی تھے۔ برف پوش پہاڑوں نے اپنا سارا حسن جھیل کے حوالے کر دیا تھا اور جھیل ہم سے باتیں کر رہی تھی۔ میں نے نگہت سے کہا۔ ”کوئی تو بات کرو۔“

وہ جواب میں بولی۔ ”ان ہواؤں کی باتیں سنو، یہی میری باتیں ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”کوئی وعدہ ہی لے لو۔“

کہنے لگی۔ ”تم نے اپنا عہد ایفا کر دیا ہے۔ میں تم سے اور کیا مانگوں؟“

آس پاس تنہائی کے ڈیرے تھے۔ دور پرے کے لوگ مناظر میں کھوئے تھے اور مناظر ہم میں کھو گئے تھے۔ جب وہ میرے سینے سے لگی تھی۔ میری بانہوں کے گھیرے اسے لپیٹے کھڑے تھے۔ میں اس سے کہتا۔ ”مجھے چھوڑ تو نہیں جاؤ گی؟“

وہ ذرا سی کسمسائی، اپنے آپ کو ذرا سا میرے سے الگ کیا اور میری جانب اپنی آنسوؤں بھری نظروں سے دیکھا پھر بولی۔ ”اپنی زندگی تمہارے سپرد کر دی ہے۔ اب اسے سنوار دو یا پھر بگاڑ دو۔ گلا بھی نہ کروں گی۔“

ہم نے جھیل کنارے چکر لگایا۔ میں اس سے اپنے وعدے دہرا رہا تھا۔ انہیں پورا کرنے کی قسمیں کھا رہا تھا اور وہ چپ تھی۔ کوئی وعدہ نہیں لیتی تھی۔ کوئی قسم نہیں سنتی تھی۔ بس سرگوشیوں میں یہی کہتی۔ ”کیا اب بھی ہمیں وعدے کرنے کی ضرورت ہے؟“

دن ڈھلنے لگا تو میں نے اسے اس کی سہیلیوں کے سپرد کیا۔ شام کے بعد ملنے کا کہا اور پیدل ہی جھیل سے ناران آیا۔ میں سڑک سے نہیں گاؤں کی پگڈنڈیوں سے اترتا آیا تھا۔ میں فاتح بن کر چلتا تھا۔ راستے میں بہت سے پھول توڑ کر ایک گلدستہ بناتا آیا تھا۔ وہ سارے رنگ میں نے اچک لیے تھے جو نگہت کے تھے۔ ان رنگوں میں اپنے پیار کی خوشبو ڈالی اور پھر پورا جہان مہکنے لگا تھا۔ شام کے رنگ اتر آئے تھے۔ سونے جیسے رنگ پھیکے ہوئے تو گہرے نیلے رنگ ہر جانب پھیلتے چلے گئے۔ آسمان پر کہکشائیں اترنے لگیں۔ چاند ابھی طلوع نہیں ہوا تھا مگر اس کی تابناکی پھیلی تھی جب میں نگہت کو لینے ہاسٹل کے گیٹ پر کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا وہ آئی اور چاند طلوع ہوا۔ میں مخمصے میں تھا کہ چاندنی چاند سے نکلتی ہے یا نگہت کے چہرے سے پھوٹتی ہے اس نے شال اوڑھ رکھی تھی جو میں نے اس کو دی تھی۔ میں

نے وہ گلدستہ اس کو دیا تو اس نے مجھ سے لے کر مجھ ہی کو یہ کہہ کر دے دیا۔
"تم ہی اسے سنبھال کر رکھو۔ اس کی حفاظت تم ہی کر سکتے ہو۔"
ہم چلتے ہوئے ناران کے بازار کی جانب آئے۔ ہم زیادہ باتیں نہ کرتے تھے۔ خاموش تھے۔ ایک چھپر ہوٹل آیا۔ کالج کی لڑکیاں اور لڑکے کوئلے جلائے ان کے گرد بیٹھے تھے۔ ایک لڑکا گٹار کی سروں پر نغمہ گا رہا تھا۔ سب گرم چادروں اور شالوں میں لپٹے اسے قہوہ پیتے ہوئے سن رہے تھے۔ ہم بھی وہیں بیٹھ گئے۔ کچھ نظروں نے مسکرا کر ہمیں دیکھا اور ہم بھی وہی نغمہ سننے لگے۔

خاموش ہیں نظارے اک بار مسکرا دو
کہتی ہیں یہ بہاریں ہنسنا ہمیں سکھا دو
قدموں کو چھو رہی ہیں یہ جھومتی گھٹائیں
کرتی ہیں التجائیں یہ شام کی ہوائیں
چہرے سے گیسوؤں کا آنچل ذرا ہٹا دو
خاموش ہیں نظارے اک بار مسکرا دو

یہ نغمہ سن کر وہ سمٹ کر مجھ سے لگ کر بیٹھ گئی۔ چلتی ہوائیں اور اس ماحول نے ہمیں باندھ کر رکھ دیا تھا۔ انہی لڑکوں میں سے کسی نے ہمیں قہوے کے کپ تھما دیے تھے۔ پیار کے لمحوں نے سب کو اپنا قیدی بنا لیا تھا۔ سب ہمیں دیکھ کر خوش ہوتے رہے اور ہم انہیں دیکھ کر۔ شام بھیگتی رہی اور ہم سب اپنی اپنی جنتوں میں بیٹھے رہے۔
دوسرا دن ہم نے اکٹھے گزارا۔ اپنے ہوٹل کے مینیجر سے میں نے ٹراؤٹ انجلنگ کا پرمٹ منگوایا۔ ہم دونوں دریا کنہار کے کنارے ایک درخت تلے اپنی ڈوریں پانی میں ڈال کر بیٹھ گئے۔ فشنگ کا سامان ہمیں مینیجر نے مہیا کر دیا تھا۔ ہم دوپہر سے شام تک دریا کنارے بیٹھے رہے۔ نہ کوئی دکھ تھا اور نہ کوئی درد کی بات تھی۔ خوشبو کے ڈیرے تھے۔ ہواؤں کی مہک تھی اور خوشیوں کے سندیسے تھے۔ غنچے تھے جو مسکراتے تھے۔ سامنے اونچے پہاڑوں پر سبزوں کی بہاریں تھیں۔ دریا کے پانی شور مچاتے بہتے تھے۔ شام سے ذرا پہلے ہم چلے آئے تھے۔ کوئی ٹراؤٹ نہ ملی مگر ہمیں تو مچھلی کیا اپنی ڈوریں بھی یاد نہ تھیں جو ہم دریا میں ڈال کر بھول آئے تھے۔ ہوٹل کے مینیجر نے اپنے ایک ملازم کو ڈوریں لانے بھیجا تو دو ٹراؤٹ بھی ساتھ لایا۔ جو کب سے ڈور میں پھنسی ہوئی تھیں۔

کل اسے چلے جانا تھا۔ میں واپس اسے ہاسٹل چھوڑنے آیا تھا۔ چاروں جانب چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ آسمان پر چاند اس کو جھانک رہا تھا۔ ہمارے ہاتھوں میں یادوں کے جگنو تھے۔ دھیرے سے چلتی ہوا میں وہ کپکپاتی تو میں اسے اپنے ساتھ لپیٹ لیتا اور وہ زیادہ کپکپانے لگتی۔ پھر آہستگی سے اپنی حدت سے مجھے خاکستر کرنے لگتی۔ ہم دیر تک ہاسٹل کے باہر چاندنی میں کھڑے رہے۔ پھر وہ چلی گئی اور میں تنہا انہی راستوں پر یادوں اور رنگوں کے لمحے لیے واپس اپنے ہوٹل آ گیا۔ وہ دوسرے دن واپس چلی گئی تھی اور میں ان کے جانے سے پہلے ہی ناران چھوڑ چکا تھا۔
اس طرح ہمیں ملتے جلتے کچھ اور مہینے گزر گئے۔
اس کے فائنل کے امتحان ہو گئے۔ وہ حیدر آباد کے ایک اسپتال میں ہاؤس جاب کرنے لگی۔ اس نے مجھے آنے کا کہا اور دوسرے دن میں اس سے ملنے بائی ایئر پہنچ گیا۔ میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہوگی۔ وہ وارڈ سے جلدی آ گئی تھی۔ وہ دن ہم نے اکٹھے گزارا۔ وہ اب میری مانوس ہو چکی تھی، میری عادت سی بن گئی تھی۔ اس سے جدائی کا کوئی تصور بھی میرے ذہن میں نہ تھا۔
وہ بتلا رہی تھی کہ ہاؤس جاب کے بعد وہ کراچی چلی جائے گی۔
"تم کراچی جاؤ اور میں وہیں آ کر تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنا بنا لوں گا" میں نے جواب دیا۔
"مجھے کہیں چھوڑ کر تو نہیں چلے جاؤ گے؟" وہ افسردہ ہو کر بولی۔
"یہ سن کر میں اس کے ماتھے پر اپنے ہونٹ رکھ کر کہتا۔ ایسا تم سوچتی کیوں ہو۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا ہے کہ تم میری نہ بن پاؤ۔"
اس شام میں اس سے مل کر آیا تو اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے موتی تیر رہے تھے۔ میں بھی اس سے مل کر اتنا اداس نہ ہوا تھا جتنا اس رات تھا۔
میری جاب اسلام آباد میں ہو گئی تھی اور میں نے بہاولپور چھوڑ دیا تھا۔ اسلام آباد میں نئی جاب میری سوچوں سے بڑھ کر تھی۔ میں بہت خوش تھا کہ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ نگہت کو ہمیشہ کے لیے اپنا بنا لوں۔ اسی دوران گھر سے فون آیا کہ میری والدہ شدید بیمار ہیں۔ میں پریشانی میں

گاؤں پہنچا۔ انہیں ڈاکٹر کے پاس لے گیا تو ڈاکٹر نے کہا کہ میری ماں کی زندگی اب چھ ماہ سے زیادہ نہیں ہے۔ گردے بری طرح متاثر ہیں۔ والد صاحب چند سال پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ میری تین بہنیں تھیں جن کی شادی ابھی ہونی تھی۔ بڑے بھائی کی شادی ہو چکی تھی۔ میں اپنی والدہ کا سوچتا تو پاؤں تلے زمین نکل جاتی۔ اپنی بہنوں کا سوچتا تو کندھے پر ایک بھاری بوجھ محسوس کرتا۔

آخر ایک ٹھٹھرتی رات کو ماں نے میرے ہاتھوں پر دم دے دیا۔ مجھ پر سے ماں کا سایہ اٹھا تو جیسے آسمان مجھ پر آ ٹوٹا۔ بہنوں کی نظروں میں ماں کا غم تھا اور وہ اب سہارے کے لیے میری جانب دیکھتی تھیں۔

نگہت سے میرا رابطہ کم ہو گیا۔ وہ مجھے خط لکھتی اور میں صحیح سے جواب بھی نہ دے پاتا۔ وہ ہاؤس جاب کرنے کے بعد کراچی جا چکی تھی۔ وہاں وہ اب کسی اسپتال میں جاب کر رہی تھی۔ میری جانب سے خاموشی تھی۔ کیونکہ میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ نگہت کی محبت میں قید تھا کہ اب وقت کی زنجیروں نے جکڑ لیا تھا۔ میں بے وفائی کا مرتکب ہو رہا تھا۔

ایک دن نگہت کا خط آیا۔ اس نے خط میں لکھا تھا کہ اس کے والدین اس کا رشتہ کہیں کرنا چاہتے ہیں۔

میں اس کے بغیر اپنی زندگی کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ میری روح میں بس گئی تھی۔ میں جتنا سوچتا اتنا ہی بے تاب ہو جاتا۔ میری محبت پھر سے موجیں مارنے لگی تھی۔ بلکہ اب کی بار تو ان موجوں میں طوفانوں والا تلاطم تھا۔ اس کا خط پڑھ کر میں اس تصور سے بھی کانپ جاتا کہ میری نگہت کسی اور کی بانہوں میں ہو گی۔ میں نے پکا ارادہ کر لیا کہ اب میں اسے اپنا کر ہی دم لوں گا۔

میں نے اپنے گھر میں نگہت کے بارے میں بات کی۔ انہیں میری خوشی عزیز تھی۔ انہیں مجھ پر بھروسا بھی تھا کہ میں اپنی بہنوں اور بڑے بھائی کو اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔ میری بھابی اور بھائی نے کہا کہ ہمیں تمہاری خوشی عزیز ہے۔ سب گھر والے راضی تھے گویا مجھے میری محبت مل رہی تھی۔ میری بھابی کے بچوں کے امتحانات اگلے ماہ ہو رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ بچوں کے پیپرز کے بعد ہم سب کراچی جا کر نگہت کے لیے تمہارا ہاتھ مانگیں گے۔

دو دن بعد میں نے نگہت کو خط لکھا کہ ایک ماہ بعد میرے گھر والے باقاعدہ رشتہ مانگنے کراچی آ رہے ہیں۔ میں نے اسے تاکید کی کہ وہ اپنے ماں باپ کو تمہارا کہیں اور رشتہ کرنے سے کم از کم ایک ماہ روکے رکھے۔ خط پوسٹ کر کے میں مطمئن تھا۔ مجھے یہ یقین بھی تھا کہ نگہت با آسانی انہیں ایک ماہ تک روکے رکھے گی۔

خط پوسٹ کرنے کے تیسرے دن میں وین میں جاب پر جا رہا تھا۔ ڈرائیور موج میں تھا رفتار خاصی تیز تھی کہ سامنے سے ایک کار نمودار ہوئی اس کار کو بچاتے ہوئے اس نے دائیں جانب موڑ لیا لیکن وین پر قابو نہ رکھ سکا اور وہ کھڈے میں جا گری۔ مجھے ہوش تب آیا جب میں اسپتال کے بیڈ پر پڑا تھا۔ مجھے شدید چوٹیں آئی تھیں۔ میری ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ کندھے کی ہڈی کے ساتھ دو پسلیاں اور بازو کی ہڈی بھی ٹوٹ گئی تھی۔ جسم پر ان گنت زخم تھے کہ میں ذرا سا بھی ہلتا تو زخموں سے ایسی ٹیسیں اٹھتیں کہ دوبارہ بے ہوش ہو جاتا۔ میں لہولہان پڑا تھا۔ پھر میری ٹانگ اور بازو پر پلاسٹر چڑھا دیا گیا۔ کئی ہفتے اسپتال میں رہا۔

نگہت کا خیال آتا تو یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتا تھا کہ میرا خط اسے مل گیا ہو گا اور وہ ساری عمر میرا انتظار کرے گی۔ دایاں بازو ٹوٹ چکا تھا اور میں کچھ بھی لکھنے کے قابل نہ تھا۔ مگر میں نگہت پر اپنے یقین کو لیے مطمئن بیٹھا اپنے ٹھیک ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ مہینوں بعد میں بیٹھنے کے قابل ہوا۔ میں اسے ایک ماہ بعد آنے کا کہہ چکا تھا اور اب تین ماہ گزر چکے تھے۔

جب کچھ لکھنے کے قابل ہوا تو اسے خط لکھ کر اپنے ایکسیڈنٹ کا بتایا اور کہا کہ میرا انتظار کرے۔ میں جیسے ہی چلنے پھرنے کے قابل ہوا، اسی دن تمہارے پاس آ جاؤں گا۔ خط لکھ کر میں اپنے ٹھیک ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ مگر مجھے حیرت یہ تھی کہ اس نے میرے خط کا جواب نہ دیا تھا۔

جب میں چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو ٹرین سے اکیلا کراچی جا پہنچا۔ یہی سوچا کہ اب اس سے بات کر کے اپنی بہن اور بھائی کو بلوا لوں گا۔ میں نے نگہت کو اپنے آنے کی اطلاع نہ دی کیونکہ میں اسے سرپرائز دینا چاہتا تھا۔

میں کراچی کے کینٹ اسٹیشن پر اترا اور سیدھا فون بوتھ کی جانب گیا۔ نگہت کے گھر کا نمبر ملایا تو اسی نے فون اٹھایا۔ میری آواز سن کر تو حیرت سے وہ کچھ لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی۔ میں نے کہا۔ ”میں واپس آ گیا ہوں اور تم جاب پر کب جاؤ گی؟ میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔“

دوسری جانب خاموشی تھی۔ میں نے پھر اپنا سوال

دہرایا تو بولی۔ ''میں نے وہ جاب چھوڑ دی ہے'' ۔پھر کچھ توقف کے بعد بولی'' میں کل سے مایوں بیٹھ رہی ہوں۔ تین دن بعد میری شادی ہے'' ۔

ایسا لگا تھا کہ مجھے ہارٹ اٹیک ہو گیا ہے۔ چہرہ اور ہاتھ پسینا پسینا ہو گئے۔ میرے کانوں میں سائیں سائیں گونجنے لگیں۔ ہاں، میں لیٹ ہو گیا تھا۔ کم ہمتی اور شرمیلا پن مجھے لے ڈوبا تھا۔ میری عادت نے مجھے کہیں کا نہ چھوڑا تھا۔

ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں، ہر کام کرنے میں
ضروری بات کہنی ہو کوئی وعدہ نبھانا ہو
اسے آواز دینی ہو، اسے واپس بلانا ہو
ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں

''تم نے ایک ماہ بعد آنے کا کہا تھا مگر تم پھر بھی نہ آئے۔ میں نے تین ماہ انتظار کیا۔'' وہ رو کر بولی۔ ''میں خود تمہیں خط لکھ کر اپنی اور اپنی محبت کی تذلیل نہیں کرنا چاہتی تھی۔ بالآخر میں نے اس رشتے کے لیے ہاں کر دی'' ۔

''میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے ایکسیڈنٹ کی خبر دی تو تھی خط میں تمام تفصیل تھی۔ اور لکھا تھا کہ میرا انتظار کرو۔''

اسے ایک دم چپ لگ گئی۔ کچھ لمحے رک کر بولی۔

''مجھے تمہارا ایکسیڈنٹ والا کوئی خط نہیں ملا۔ میں تو ہر روز تمہارے آنے کا انتظار کرتی رہی۔'' پھر وہ رونے لگی۔

میں نے کہا کہ اب میں آ گیا ہوں۔ تم انکار کر دو لیکن وہ جواب دینے کی بجائے روتی رہی۔ ''اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ تم فون ہی کر دیتے۔ مجھ سے بات ہی کر لیتے'' ۔ اس کی ہچکیاں میں فون پر سن رہا تھا۔ وہ روئے جا رہی تھی اور یہی کہہ رہی تھی۔ ''تم ہمیشہ سے بے پروا رہے ہو۔ تم نے سب کچھ ختم کر دیا۔ تم تو میرا پیار تھے، مان تھے، بھروسا تھے۔ میں سوچتی تھی کہ ہماری زندگی کتنی پُر مسرت ہو گی مگر تم نے دیر کر دی؟'' وہ کچھ دیر روتی اور پھر کہا۔ ''میں تو سمجھی تھی تم کو پانا بھی محبت کی طرح آسان ہو گا۔ مگر نہ میری محبت آسان تھی اور نہ میں تم کو پا سکی۔''

میرا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ میں اس سے التجا کر رہا تھا کہ وہ اب بھی انکار کر دے مگر وہ کہہ رہی تھی۔ ''مجھے یہ صدمہ نہیں ہے کہ میں تمہاری نہ بن سکی۔ مجھے دکھ یہ ہے کہ تم میرے نہ ہو سکے''۔

پھر ہم دونوں مل کر رونے لگے۔ مجھے ایکسیڈنٹ سے زیادہ گہرے زخم لگ چکے تھے۔ میں فقیر بن کر جھولی پھیلائے کھڑا تھا اور اس کے پاس میرے خالی کشکول میں ڈالنے کو کچھ نہ تھا۔ پھر فون بند ہو گیا اور میں باہر آ گیا۔ بھیڑ کے سناٹے میں اجڑا کھڑا تھا اور نگہت کے یہ آخری الفاظ بازگشت کی مانند میرے کانوں میں گونجتے تھے۔ ''کچھ بات کرو ناں۔ شاید اس کے بعد ہم کوئی بات بھی نہ کر سکیں۔'' اس کی سسکیاں ہر طرف سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

میں نے آخر میں صرف یہ کہا تھا۔ ''میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں بچا۔''

وہ بولی۔ ''وعدہ کرو کہ میری شادی میں آؤ گے۔''

میں خاموش رہا۔ تو وہ بولی تھی۔ ''مجھ سے وعدہ کرو۔ میں تمہیں آخری بار دیکھنا چاہتی ہوں۔''

میں نے ہاں کہہ کر ریسیور رکھ دیا تھا۔

میں باہر کھڑا رو رہا تھا۔ میرا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ آتے جاتے لوگ میری جانب دیکھ رہے تھے۔ میری ساری خوشیاں مجھ سے روٹھ گئی تھیں۔ میں تنہا ہو گیا تھا۔ میں گناہگار بن چکا تھا۔

میں اپنا بیگ کندھے سے لٹکائے بہت دیر اسٹیشن پر آوارہ گردی کرتا رہا۔ جسے ایک اسٹیشن پر پایا تھا، اسے دوسرے اسٹیشن پر کھو دیا تھا۔ جسے چاند کی چاندنی میں پایا تھا، وہ سورج کی جھلستی دھوپ میں بچھڑ گئی تھی۔

مجھے یقین تھا کہ میرے خط کو کسی نے غائب کر دیا تھا۔ جب اس کا رشتہ طے کر دیا گیا تو اس کے بڑوں کی نظر میں میرا خط نری بدنامی ہی تھا۔ اب کیا ہو سکتا تھا۔ تقدیر نگہت کو مجھ سے چھین کر لے جا چکی تھی۔ میں نے رابطے ختم کر کے اسے بے وقعت کر دیا تھا اور آج خود اپنی نظروں میں گر کر بے وقعت کھڑا تھا۔

پورا دن سڑکوں پر آوارہ پھرتا رہا۔ آنسو خشک ہو گئے تھے۔ بگولے میرے اندر سے اٹھتے اور مجھی کو اڑائے چلے جا رہے تھے۔ رات ایک ہوٹل میں گزاری۔ دوسرے دن فاروق سے رابطہ کیا کیونکہ اس کی شادی میں جانے کا اپنا آخری وعدہ بھی نبھانا تھا۔ بھابی نے فون اٹھایا۔ میری آواز سن کر پہلے میری خیریت دریافت کی۔ وہ میری دل کی بات جانتی تھیں۔ کہنے لگیں۔ ''نگہت کا نکاح ہے، کیا تم بھی چلو گے؟''

میں نے ہاں کہا تو بولیں تو سامان ہوٹل سے اٹھا کر ہمارے گھر آ جاؤ۔ جب بہن کا گھر موجود ہے تو تمہیں ہوٹل میں جانا بھی نہیں چاہیے تھا۔

میں ان کے گھر چلا گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ میری ان

سے بھی آخری ملاقات ہے۔

نکاح کے دن وہ سب تیار ہو رہے تھے۔ فاروق نے پوچھا۔ ”تم کون سے کپڑے پہنو گے؟“

میں اس وقت پرانی شلوار قمیص میں تھا۔ میں نے جواب دیا۔ ”انہی کپڑوں میں جاؤں گا۔“

بھابی حیران ہوئیں اور سوال پر سوال کرنے لگیں مگر فاروق نے انہیں اشارے سے روک دیا۔

شادی ہال میں سامنے اسٹیج سجا تھا۔ میں چاک گریبان اور پاؤں میں چپل پہنے کھڑا تھا۔ اتنے میں نگہت کی دوست شبنم نے مجھے دور سے کھڑے دیکھا تو میرے پاس آ گئی۔ وہ رونے لگی۔ روتے ہوئے پوچھ رہی تھی کہ یہ سب کیسے ہو گیا، کیوں ہو گیا؟ تم تو اس سے بہت پیار کرتے تھے۔ وہ بھی تم کو ٹوٹ کر چاہتی تھی۔ شادی سے پہلے اس نے مجھے اپنے گھر بلایا تھا۔ میں رات اس کے پاس ٹھہری تھی۔ وہ تمہیں یاد کر کر کے بہت روئی تھی۔ اس نے تمہارے سب خط اپنے پاس رکھے ہوئے تھے۔ اسی رات مجھے اپنے گھر کے پچھلے لان میں لے گئی۔ وہیں اس نے سب خط جلا دیئے۔ جلا کر میرے کندھوں پر سر رکھے بہت دیر تک روتی رہی تھی۔

میں کھڑا یہ سب خاموشی سے سن رہا تھا اور اسٹیج پر بیٹھے دولہے کو گھور رہا تھا۔ اتنے میں نگہت کو سرخ جوڑے میں اسٹیج پر لایا گیا۔ اس کی نظریں کسی کو تلاش کر رہی تھیں۔ مجھے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی اور وہیں سے اس نے اپنی پلکیں ایک بار بند کر کے الوداعی سلام کہا۔ وہ مجھے دیکھے جا رہی تھی کہ شبنم آگے بڑھی اور مجھے بازو سے پکڑ کر دور لے گئی کیونکہ آج نگہت کسی اور کی ہو رہی تھی۔ کسی اور کا پیار لے کر اپنے گھر بسانے جا رہی تھی اور یہی شام میری محرومیوں اور میری بے وفائیوں کی یاد بن چکی تھی۔ میرا یہ دکھ کسی اور پر آشکار نہ ہو جائے اسی لیے شبنم مجھے ہال کے آخری سرے پر لے آئی تھی۔

نکاح ہوا اور پھر شادی کی رسمیں ہوئیں۔ زاہدہ بھابی میرے پاس آئیں اور مجھے اپنے ساتھ اسٹیج پر لے گئیں اور بولیں۔ ”اسے خود مبارک باد دو۔“

میں اسٹیج پر اس کے سامنے مجرموں کی طرح کھڑا تھا۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ نہ اس میں اور نہ مجھ میں ہمت تھی کہ ہم ایک دوسرے کی جانب دیکھ سکتے۔ میں نے اسے مبارک باد دی تو اس کی معصوم نگاہیں میری جانب اٹھیں۔ مجھے ایک بار دیکھا اور پھر جھک گئیں۔

وہ اپنے گھر چلی گئی اور میں اپنی ساری پونجی لٹا کے فاروق کے ساتھ غموں کے پہاڑ لیے پلٹ آیا۔

دوسرے دن میں غموں کے پہاڑ اٹھائے واپس چلا آیا۔ کچھ عرصہ اپنی قسمت اور اپنی بزدلی پر روتا رہا۔ ہر وقت اپنے کمرے میں تنہا پڑا رہتا۔ وقت سب سے بڑا مرہم ہوتا ہے۔ پھر میری بھی شادی ہو گئی اور میں لندن شفٹ ہو گیا۔ لندن جانے سے پہلے میں اس کے لکھے سارے خط دریا کنارے لے آیا۔ انہیں ٹکڑے ٹکڑے کیا اور پھر ان ٹکڑوں کو دریا میں بہا دیا۔

اس کے لکھے خط میں جلاتا کیسے
پیار بھرے خط میں جلاتا کیسے
یہ خط میں دریا میں بہا آیا ہوں
آگ بہتے ہوئے پانی میں لگا آیا ہوں

اور اب بیس سال بعد میں اسے تلاش کر رہا تھا کہ اس سے معافی مانگوں کہ میں نے اتنے برسوں تک فاروق سے بھی رابطہ نہیں کیا تھا مگر جب فاروق کا فون آیا کہ اس کا کوئی رشتے دار لندن شفٹ ہو رہا ہے میں اس کی مدد کروں۔

فاروق کی کال نے ہی مجھے ماضی یاد دلایا تھا اور میں نگہت کو ڈھونڈنے لگا کیونکہ میرے زخم پھر سے تازہ ہو گئے تھے۔ اسے گوگل پر تلاش کرتا رہا۔ پھر فیس بک کی جانب خیال گیا۔ بالآخر فیس بک پر ڈھونڈا تو مل گئی۔ میسج کرنے کی ہمت مجھ میں نہ تھی جس طرح بیس سال پہلے نہ تھی۔ کئی دن بعد ہمت کر کے ان باکس میں اپنا میسج بھیجا۔ تو اس نے لکھا۔ ”تم ہمیشہ سے ہی مجھے حیران کرتے رہے ہو۔“

میں نے میسج کیا۔ ”کیسی ہو۔“

جواب آیا۔ ”وہیں ہوں، جہاں پر تم چھوڑ گئے تھے۔ وہیں اب تک کھڑی ہوں کیونکہ عورت بار بار پیار نہیں کرتی۔ اگر کرتی ہے تو سودا کرتی ہے۔ میرے دل میں جو بیس سال پہلے بسا تھا، وہی آج اسی شدت سے اپنا گھر کیے ہوئے ہے۔“

میں یہ سوچتا رہ گیا تھا کہ شاید کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی مگر یہ بات میں جان چکا تھا کہ کوئی بھی کسی لڑکی پر وعدوں کا جال نہ پھینکے۔ وہ تا عمر اسی جال سے باہر نہیں آ پاتی ہے اور نہ کوئی میرے جیسا ہو کہ ہر کام میں دیر کر دے، کسی کو انتظار کی سولی پر لٹکا دے۔